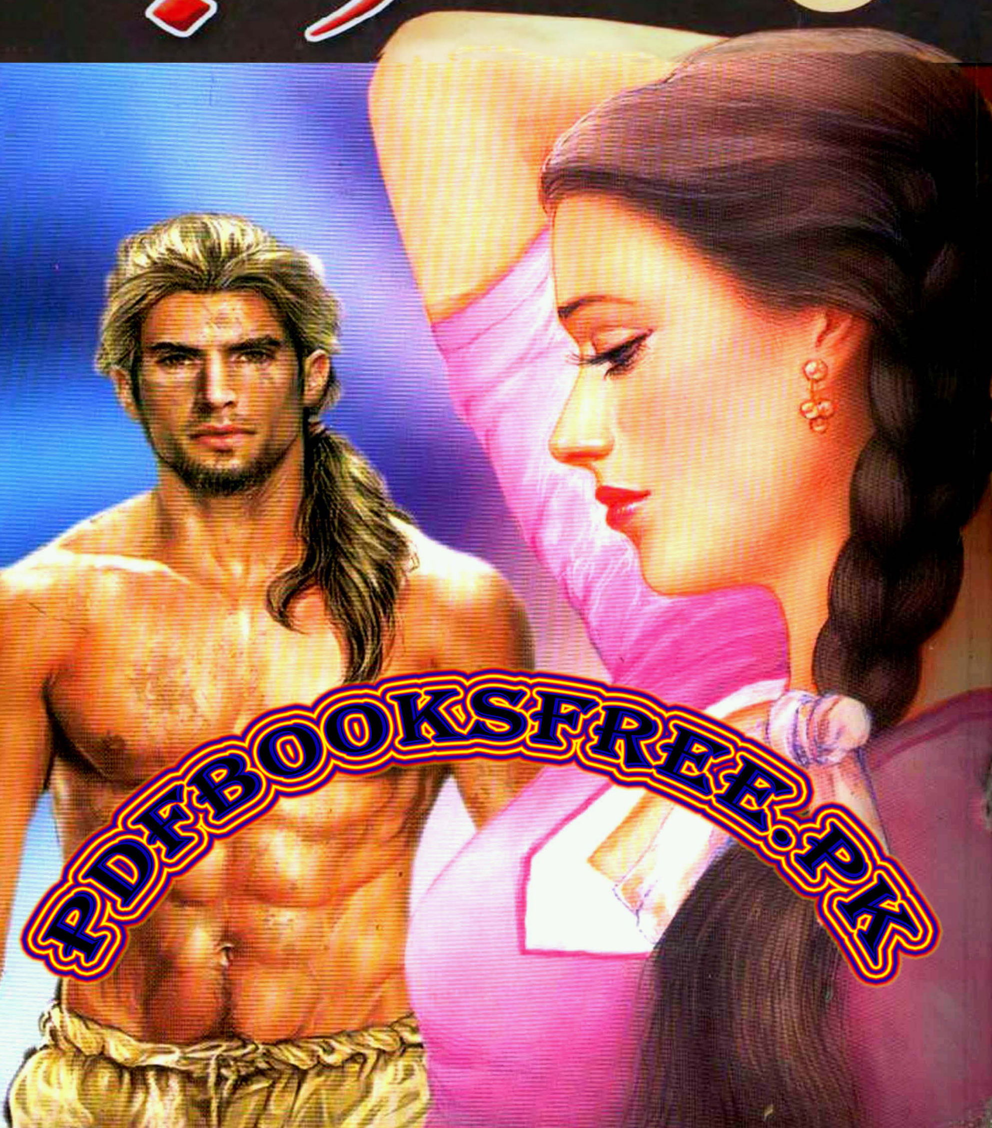
ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی تہلکہ خیز کہانی

سراب

راوی: شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

2

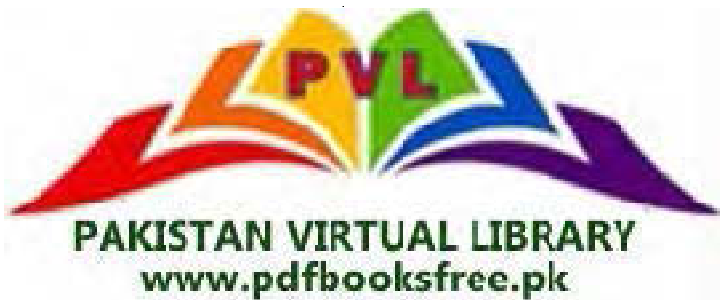


ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی ایک تہلکہ خیز کہانی

سراب

دوسرا حصہ

کاشف زبیر



علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون

بار اشاعت ——— اول

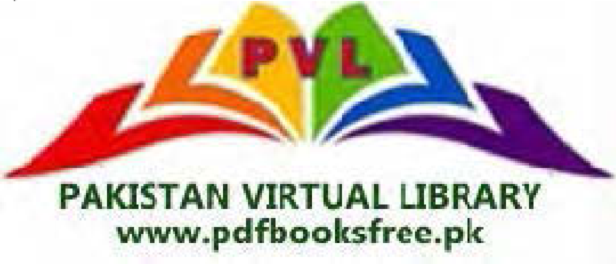
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور

کمپوزنگ ——— عاطف رحمٰن۔ لاہور

قیمت ——— 200 روپے

بیرون ملک ——— 10 برطانوی پونڈ

15 امریکی ڈالر



ISBN 978-969-517-320-6

Stokist:(U.K)

Azhar Enterprises

315, Dickenson Road
Longsight, Manchester, M13 ONR
Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ

علی بک سٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لا

بھاگ بھری نے شنازیہ اور اس کے بچوں کو گڑ شامل کر کے مکئی کے دانے کھانے کو دیے تھے۔ میں نے بھی ایک مٹھی پھکی لی۔ یہ خستہ اور مزے کی تھی۔ فائرنگ سے چولہا تباہ ہو چکا تھا اس لئے چائے بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن بھاگ بھری نے ہمت کی اور باہر جا کر لکڑی کا چولہا جلا کر چائے بنائی۔ بارود اور موت کی چھاؤں میں اس طرح کے معمولات زندگی عجیب لگتے ہیں لیکن یہی زندگی ہے جو کسی صورت امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی ہے۔ میں نے جان بوجھ کر فتح خان سے رحمت کے بارے میں نہیں پوچھا تھا اگر وہ نکلنے میں کامیاب رہا تھا تو یہ لوگ چوکنے ہو جاتے۔ اگر وہ مارا گیا تھا تو کچھ دیر میں صورت حال خود سامنے آ جاتی۔ میں نے چائے پی کر پیالہ رکھا تو نو بجنے میں چار منٹ باقی تھے۔ میں نے ایک بار پھر موم بتی روشن کر لی اور بھاگ بھری کو باہر بھیج دیا کہ وہ کوٹھری کے گرد چکر لگاتی رہے تو بجتے ہی میں نے چلا کر فتح خان کو آواز دی۔ "فتح خان نو بج گئے ہیں۔"

وہ جھاڑیوں میں سے نمودار ہوا۔ "شہباز کوئی حماقت مت کرنا...... ڈیوڈ شا آنے والا ہے راستہ آسان نہیں ہے۔"

"کتنی دیر لگے گی؟"

"بس دس منٹ اور......"

"ٹھیک ہے میں سوا نو بجے تک انتظار کروں گا لیکن یاد رکھنا اس کے بعد تمہاری کسی بات پر اعتبار نہیں کروں گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" فتح خان بولا اور میں واپس چلا گیا۔ کوئی چھ سات منٹ بعد وہ ایک کسی قدر بھاری مگر گٹھے ہوئے جسم کے مالک سفید فام کے ساتھ جھاڑیوں سے برآمد ہوا۔ سفید فام متوسط قد کا تھا۔ چہرہ عام سا مگر آنکھیں بے حد خطرناک تھیں۔ تیز اندر تک اتر جانے والی کیمرے کی جیسی نظریں۔ ان میں ایک سرد مہری اور سفاکی تھی کہ آدمی دیکھے تو لرز جائے اس نے جھاڑیوں سے برآمد ہونے کے بعد چند لمحے کے لئے رک کر ادھر ادھر دیکھا پھر اس کی نظریں کوٹھری پر مرکوز ہو گئیں۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ "مسٹر شے باز...... میں ڈیوڈ شا یہاں موجود ہوں۔"

"مسٹر ڈیوڈ شا...... اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر کے آگے آؤ لیکن صرف تم...... فتح خان وہیں رہے گا۔" وہ

ہاتھ اوپر کر کے احاطے کے اندر آیا اور برآمدے کے آگے رک گیا۔

''اس تصویر کے لئے میں تمہارا ہر مطالبہ ماننے کے لئے تیار ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''مجھے ہر مطالبہ منوانے کا شوق نہیں ہے تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' میں نے الفاظ جما کر کہا۔ ''مجھے اور میرے ساتھیوں کو زندگی کا حق چاہئے۔''

''میں تمہیں ہر ضمانت دینے کے لئے تیار ہوں۔''

''ضمانت نہیں...... مجھے یقینی راستہ چاہئے۔'' میں نے کہا اور رائفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ''ڈیوڈ شا اندر آ جاؤ۔''

''تم میرے ساتھ دھوکا کر رہے ہو۔'' اس کی آواز سپاٹ تھی۔

''نہیں اپنے تحفظ کی یقینی ضمانت چاہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تم سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے لیکن مجھے معلوم ہے تمہاری وجہ سے تمہارے آدمی مجھے دھوکے سے مارنے سے پہلے دس بار سوچیں گے۔''

وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا میں نے رائفل لوڈ کی۔ ''ڈیوڈ شا گزشتہ پندرہ گھنٹوں میں تمہارے کتنے آدمی میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اس لیے خودکشی کی کوشش مت کرو۔''

''شہباز۔'' فتح خان چلایا۔ ''تم دھوکا کر رہے ہو۔ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

''میں نے کہا ناں...... میں صرف اپنا تحفظ چاہتا ہوں۔ ڈیوڈ شا مجھے کسی محفوظ مقام تک پہنچا دے اور اس کے بعد تصویر لے کر چلا جائے۔''

''کیا تم واقعی تصویر میرے حوالے کر دو گے؟''

''ظاہر ہے مجھے اس کا اچار تو نہیں ڈالنا۔''

''اچار؟'' اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

''ہماری زبان کا ایک محاورہ ہے میرا مطلب ہے کہ اس تصویر کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے لہٰذا میں بخوشی اسے تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

فرض کرو میں تمہیں کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیتا ہوں اور تم پھر بھی تصویر مجھے نہیں دیتے۔''

''اس معاملے میں تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

اس نے چند لمحے سوچا پھر سر ہلایا۔ ''ویل...... میں تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے اپنے آدمیوں سے کہو کوئی بڑی جیپ لائیں۔ جس میں آٹھ نو افراد آرام سے آ جائیں اس کام کے لئے ان کے پاس صرف نصف گھنٹا ہے۔''

''ایسی ایک جیپ باہر موجود ہے میں اس پر آیا ہوں۔'' ڈیوڈ شا بولا۔ ''جیپ نیچے کھڑی ہے۔''

''ٹھیک ہے تم آگے آؤ میں تمہیں ڈھال بنائے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

''شہباز تمہیں میری زبان......''

''شٹ اَپ!'' میں غرایا۔ ''بکواس کرنے کے بجائے آگے آؤ ورنہ۔'' میں نے رائفل کو جنبش دی تو وہ بادل ناخواستہ آگے آیا تھا۔ ''اس طرف گھوم جاؤ۔'' میں نے کہا اور پستول نکال لیا۔ جیسے ہی وہ دوسری طرف گھوما

میں نے پستول اس کی کمر سے لگا دیا اور شازیہ سے کہا۔ ''بچوں کو اٹھاؤ...... بھاگ بھری اپنی ماں کو سنبھالو۔''

''ان لوگوں کو لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ڈیوڈ شا نے بھاگ بھری اور اس کی ماں کی طرف اشارہ کیا۔

''میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔ ''میں انہیں مرشد علی کے وحشی کتوں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ اب چلو۔''

سب سے آگے ڈیوڈ شا تھا۔ اس کے بعد میں اور میرے پیچھے باقی سب تھے۔ فتح خان غائب تھا شاید وہ باہر جا چکا تھا۔ میں پوری طرح چوکنا تھا میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ''اگر کوئی جھاڑیوں میں ہے تو دور چلا جائے۔ کسی چالاکی کا نتیجہ تمہارے اَن داتا کی ناگہانی موت کی صورت میں نکلے گا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' ڈیوڈ شا نے پوچھا۔

''تمہارے ساتھیوں کو بتا رہا ہوں کہ تمہاری موت کا سبب نہ بنیں۔''

''کوئی تمہارے راستے میں نہیں آئے گا۔'' اس نے آہستہ سے کہا تھا۔

میں نے برآمدے سے صحن میں قدم رکھا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں حرکت کا احساس ہوا اور مجھ پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ہل جانے کی وجہ سے وار براہ راست سر پر نہیں لگا تھا مگر میں چند لمحے کے لئے بلیک آؤٹ میں چلا آیا تھا۔ دشمن کبھی بے وقوف نہیں ہوتا۔ دشمنی چالاک لوگوں کا کام ہے۔ ڈیوڈ شا کے زرخریدوں نے اس طرف سے وار کیا تھا جہاں کے بارے میں مَیں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کوئی چالاک آدمی خاموشی سے کوٹھری کی چھت پر چڑھا اور جب میں صحن میں آیا تو اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے میں اوندھے منہ جا گرا تھا۔ ڈیوڈ شا نے پھرتی سے مڑ کر میرا پستول چھین لیا تھا۔ بازی پلٹ گئی تھی۔ شازیہ اور بھاگ بھری چلانے لگے تھے۔

''چپ کرو۔'' ڈیوڈ شا بولا۔ ''اسے دیکھو۔''

''آئی ایم کل اِٹ۔'' حملہ کرنے والے نے کہا اور پستول میری طرف سیدھا کیا۔

''نو...... لیو اِٹ۔'' ڈیوڈ شا نے حکم دیا۔ ''ان عورتوں اور بچوں کو اندر کرو، جلدی۔''

حملہ کرنے والے نے ان سب کو اندر دھکیل کر کوٹھری میں کر دیا تھا۔ اس وقت تک میں بلیک آؤٹ سے نکل رہا تھا۔ سر جھٹک کر میں نے اٹھنا چاہا لیکن چکر آ جانے کے باعث میں نے سر دوبارہ زمین پر ٹیک دیا اور گہرے سانس لے کر اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنے سر کی پشت پر مجھے خون سرسراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اگر یہ وار پوری طرح پڑتا تو شاید کھوپڑی ٹوٹ جاتی۔ آخر مجھ میں اتنی ہمت آئی کہ میں اٹھ سکوں لیکن میں پڑا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ میں نیم غشی میں ہوں، ہل سکتا ہوں لیکن اٹھنے کی ہمت نہیں ہے۔

''شہباز۔'' ڈیوڈ شا نے جھک کر کہا اور تصویر کا رول میری جانب لہرایا۔ رول اس نے میری قمیص سے نکال لیا تھا۔ ''بازی اب میرے ہاتھوں میں ہے۔''

مجھے نزدیک ہی فتح خان کی آواز آئی۔ ''اس کا کیا کرنا ہے جناب؟''

''فتح خان یہ کامیابی پر تمہارا انعام ہے۔'' ڈیوڈ شا نے جواب دیا۔

''شکریہ جناب...... میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور قسطوں میں قتل کروں گا۔'' فتح خان کا لہجہ سنگدلانا تھا۔ ''مجھے کبھی کسی شخص کو قتل کرنے کی اتنی خواہش نہیں رہی۔''

''فتح خان اسے ابھی ماردو...... ورنہ شاید کبھی نہیں مار سکو گے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں موقع مل جائے تو وہ بازی الٹ دیا کرتے ہیں۔'' ڈیوڈ شا نے مشورہ دیا۔

''میں اسے ایسے شکنجے میں جکڑوں گا کہ یہ کچھ کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔'' فتح خان پُرغرور انداز میں بولا۔ ''ان عورتوں اور بچوں کا کیا کرنا ہے؟''

''اس گھر کی مالک کی بیوی اور بیٹی کو غائب کردو اور وکیل کے بیوی بچوں کو کسی ایسی جگہ پہنچادو جہاں سے یہ اپنے گھر کو جاسکیں۔''

''انہیں چھوڑ دیں جناب؟'' فتح خان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں...... میں نے کیا کہا ہے۔'' ڈیوڈ کا لہجہ سخت ہوگیا تھا۔

''سوری سر...... میں سمجھ گیا۔'' فتح خان نے جلدی سے تابعداری سے کہا اور مجھ پر حملہ کرنے والے سے کہا۔ ''رحمت کی بیوی اور بیٹی کو ڈیرے پر پہنچادو...... وہاں ان کا فیصلہ کریں گے۔''

وہ بھاگ بھری اور اس کی بیمار ماں کو ہنکا کر لے جانے لگا۔ فتح خان نے میرے ماتھے کے بال پکڑ کر میرا سر اوپر کیا۔ ''شہباز ملک آخر تم میرے قابو میں آ ہی گئے۔''

میں نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا اور آنکھیں بند کر کے کراہنے لگا۔ ڈیوڈ شا بولا۔ ''اسے چھوڑ دو...... یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ جاکر روانگی کا بندوبست کرو۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔''

''جی جناب۔'' فتح خان نے میرے بال چھوڑ دیئے تھے اور وہاں سے چلا گیا۔ ڈیوڈ میرے پاس ٹہلنے لگا تھا۔ ''شہباز میرا خیال ہے تم سننے اور سوچنے کی حد تک ہوش میں ہو۔ جانتے ہو...... میں یا راجا عمر دراز اس تصویر کے دیوانے کیوں ہیں...... نہیں جانتے...... کوئی بھی نہیں جانتا...... راجا عمر دراز اور ولیم شا احمق تھے۔ اتنا بڑا راز اپنے سینوں میں دبائے رہے۔ ایسا راز جو انہیں دنیا کے خزانوں کا مالک بنادیتا۔ انہیں لافانی شہرت دلوادیتا۔ مگر یہ بے وقوف......'' اس کے لہجے میں حقارت آ گئی۔ ''بہرحال اب یہ تصویر میرے قبضے میں ہے۔'' اس نے پلاسٹک شیٹ کھولی تاکہ تصویر دیکھ سکے۔ ''اس کی مدد سے میں وہ سب حاصل کرلوں گا، جس کا میں اب تک خواب دیکھا کرتا تھا۔''

''شاید تم جہنم میں جانے کے خواب دیکھتے تھے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''کیونکہ اس تصویر کی وجہ سے کئی افراد وہاں جاچکے ہیں۔ تم بھی جلد ان میں شامل ہوسکو گے۔''

''تم کچھ نہیں جانتے......'' وہ ہنسا۔ ''یہ تصویر......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ ایک فائر کے ساتھ کسی کی چیخ کی آواز آئی تھی اور اس چیخ میں موت کا کرب رچا تھا۔ ابھی فائر اور چیخ کی بازگشت ختم نہیں ہوئی تھی کہ بے تحاشا فائرنگ ہونے لگی۔ ڈیوڈ شا کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اس نے جیب سے ایک چھوٹا سا جدید موبائل نما آلہ نکال کر کسی سے رابطہ کیا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے...... ہیلو جان...... جواب دو...... لعنت ہو۔'' اس نے موبائل بند کر کے

چاروں طرف دیکھا اور کوٹھری کے عقب کی طرف بڑھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو اس نے مڑتے ہوئے ریلغ مجھ پر فائر کر دیا۔ میں بال بال بچا تھا لیکن یوں ہی زمین پر ڈھیر ہو گیا جیسے مجھے گولی لگ گئی ہے۔ ڈیوڈ شا دوڑتا ہوا غائب ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ عقبی طرف کی جھاڑیوں میں اس راستے میں گھستا نظر آیا جو فتح خان کے آدمیوں نے بنایا تھا میں بھی دبے قدموں اس کے پیچھے تھا۔ جھاڑیوں میں گھسا تو سرسراہٹ کی آواز پر اس نے دو تین فائر اور کیئے اس بار بھی خدا نے مجھے محفوظ رکھا اور میں اس جگہ دبک کر ساکت ہو گیا۔ جب ڈیوڈ شا جھاڑیوں سے نکل آیا تو اس کے ایک منٹ بعد حرکت میں آیا۔ دو بار بال بال بچنے کے بعد میں تیسری بار خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جب میں جھاڑیوں سے نکلا تو ڈیوڈ شا غائب ہو چکا تھا۔ کچھ فاصلے پر گھنی جھاڑیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو پہاڑ کی بلندی تک جا رہا تھا اور دور نشیب تک پھیلا ہوا تھا۔ اگر ڈیوڈ شا ان جھاڑیوں میں گھس گیا تھا تو اسے تلاش کرنا، ناممکن حد تک محال تھا۔ اس کے باوجود میں ان کی طرف بھاگا۔ نزدیک آنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ جھاڑیاں میرے اندازے سے زیادہ گھنی تھیں اور ان میں گھسنا محال تھا۔ پھر مجھے شازیہ اور بچوں کی فکر بھی تھی۔ لہٰذا میں پلٹا اور بھاگتا ہوا رحمت کی کوٹھری کی طرف واپس آیا۔ شازیہ اور بچے اندر دبکے تھے۔

''بھابی یہاں سے نکلیں۔'' میں نے اس کی بچیوں کو اٹھا لیا۔

''تمہارے سر سے تو خون بہہ رہا ہے۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''ٹھیک ہے...... معمولی چوٹ ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا اور کوٹھری سے باہر نکلا تھا کہ سامنے سے جھاڑیاں ہٹیں اور ان میں سے ایک شخص نکلا۔ وہ شکیل تھا۔

''شہباز صاحب۔'' اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''خدا کا شکر ہے آپ ٹھیک ہیں۔''

میں بچیوں کو اتار کر اس کی طرف لپکا۔ ''شکیل...... شکر ہے...... کیا حملہ تم لوگوں نے کیا ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''مرشد علی کے آدمی مارے جا چکے ہیں یا فرار ہو گئے ہیں۔ جلدی کیجئے، اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ مدد لے کر آئیں ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''تمہیں ہمارے بارے میں کس نے بتایا؟''

''رحمت نامی شخص کی آپ کے موبائل سے کال آئی تھی۔ وہی ہمیں یہاں تک لایا ہے۔''

''خدا کا شکر ہے وہ زندہ ہے ورنہ میں اس کی بیوی اور بیٹی کو کیا منہ دکھاتا؟''

''اس کی بیوی اور بیٹی کہاں ہیں؟''

میں چونکا۔ ''کیا وہ باہر نہیں ملے...... فتح خان انہیں لے گیا تھا۔''

''نہیں...... وہاں کوئی عورت نہیں ہے۔ مرشد علی کے کچھ افراد فرار ہونے میں کامیاب ہوئے ہیں شاید وہ عورتوں کو ساتھ لے گئے ہیں۔''

''شکیل انہیں تلاش کرو، ہر قیمت پر...... ورنہ میں رحمت کو کیا کہوں گا وہ میری مدد کے لئے جان پر کھیل کر اور میں اس کی بیوی اور بیٹی کی حفاظت نہیں کر سکا۔''

اسی لمحے رحمت جھاڑیوں سے نمودار ہو کر اپنے گھر کی طرف لپکا تھا اور اپنی بیوی بیٹی کو پکارنے لگا۔

''بھاگ بھری...... تُو کہاں ہے بھاگ بھری کی ماں...... تُو کہاں ہے۔'' پھر وہ پلٹ کر میری طرف آیا اور میرا گریبان پکڑ لیا۔ ''صاحب! میں اپنی بچی...... بیوی تیرے سپرد کر کے گیا تھا...... وہ کہاں ہے صاحب؟''

میں نے سر جھکا کر کہا۔ ''رحمت...... میں شرمندہ ہوں...... وہ انہیں لے گئے۔ میں بے بس تھا انہوں نے مجھ پر قابو پالیا تھا۔''

رحمت کا سانولا چہرہ راکھ جیسا ہو گیا تھا۔ اس نے میرا گریبان چھوڑ دیا اور لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ ''میری بھاگ بھری...... صاحب وہ تو لڑکی تھی صاحب...... وہ درندے اسے کھا جائیں گے۔''

''رحمت ہمارے آدمی تعاقب کر رہے ہیں ان کا۔ وہ تمہاری بیوی اور بیٹی کو چھڑا کر لائیں گے۔'' شکیل نے اسے تسلی دی۔

''سچ صاحب۔'' رحمت کے لہجے میں زندگی آ گئی۔ ''صاحب انہیں لے آؤ۔ ان کے بغیر میں بے کار ہوں۔''

''رحمت فکر مت کر۔'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ان شاء اللہ ضرور ملیں گے۔''

ہم لوگ باہر آئے جہاں شکیل کے درجن بھر سے بھی زیادہ مسلح افراد موجود تھے۔ مرشد علی کے اتنے ہی لوگوں کی لاشیں وہاں بکھری تھیں اور باقی فرار ہو چکے تھے۔ میں شکیل کو بتانے لگا کہ ڈیوڈ شا نے کس طرح مجھ پر قابو پایا تھا اور تصویر لے کر فرار ہو گیا تھا۔ شکیل تصویر کے ذکر پر چونکا تھا لیکن اس نے زیادہ ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا البتہ اس نے چار ساتھیوں کو ان جھاڑیوں کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ کچھ دور تک ہمیں پیدل چلنا پڑا تھا۔ یہاں ان لوگوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شکیل نے مجھے شازیہ اور بچوں کو ایک گاڑی میں سوار کرایا تھا اور باقی افراد دوسری گاڑیوں پر لد گئے تھے۔ ان میں سے ایک گاڑی وہیں رہ گئی تھی۔ وہ باقی چار افراد کو لے کر آتی جو ڈیوڈ شا کی تلاش میں گئے تھے۔ ''ندیم کا کچھ پتا چلا۔'' میں نے آہستہ سے شکیل سے پوچھا۔

''جی وہ اسپتال میں ہیں۔'' اس نے بھی آہستہ سے بتایا۔ مقصد شازیہ کو بے خبر رکھنا تھا۔ مگر اس کے کان کھڑے تھے اس نے میرا سوال اور شکیل کا جواب دونوں سن لئے تھے۔ وہ تڑپ کر بولی۔

''کیا کہہ رہے ہو...... کیا ہوا ندیم کو...... ہاسپٹل میں کیوں ہیں؟''

شکیل نے اسے تسلی دی۔ ''معمولی زخمی ہیں۔ میں آپ کو وہیں لئے چلتا ہوں۔ آج شام تک وہ ڈسچارج ہو جائیں گے۔''

مگر شازیہ کی تسلی نہیں ہوئی وہ بار بار ندیم کی خیریت کے بارے میں پوچھتی ہی تھی۔ شکیل کو بھی اتنا پتا تھا کہ آج صبح وہ زخمی حالت میں ایک سڑک کے کنارے بے ہوش ملا تھا اور اس کی جیب سے اس کے کاغذات ملے تھے۔ پولیس نے اسے اسپتال پہنچایا تھا۔ زخم معمولی نوعیت کے تھے پھر بھی احتیاطاً ڈاکٹر نے اسے شام تک روک لیا تھا۔ ہم نصف گھنٹے بعد سڑک تک پہنچے تھے۔ شکیل نے میرے سر کے زخم پر رومال باندھ دیا تھا۔ میں نشست سے سر ٹکا کر آرام کرنے لگا۔ سر میں چوٹ اور مسلسل بے آرامی سے سر جیسے پھٹا جا رہا تھا۔ شازیہ اور بچوں نے رات کو آرام کیا تھا اس لئے ان کی حالت زیادہ خراب نہیں تھی۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ میں کب سو گیا۔ گاڑی رکی تو میری آنکھ کھلی۔ ہم ہاسپٹل کی پارکنگ میں تھے۔

''چلیں میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس چھوڑ کر انہیں ندیم کے پاس لے جاتا ہوں۔''

''نہیں میں بھی ندیم کے پاس چلوں گا۔ مرہم پٹی بعد میں کرا لوں گا۔'' میں نے انکار کیا اور شکیل کو میری بات ماننا پڑی۔ ندیم کمرے میں خاموشی سے آنکھیں بند کر کے لیٹا تھا۔ اپنے بیوی بچوں کی آواز سن کر وہ تڑپ کر اٹھا تھا۔ بچے بھاگ کر اس سے لپٹ گئے تھے اور شازیہ اس کے بازو پر سر ٹکا کر رونے لگی تھی۔ بے حد نجی منظر تھا۔ میں اور شکیل خاموشی سے باہر نکل آئے۔ ''چل یار پہلے ڈریسنگ کرا دے۔''

وہ ہنسا۔ ''میں اس وجہ سے بھی کہہ رہا تھا۔''

''بس یار سر پر چوٹ لگی ہے اور گزشتہ تیس گھنٹے سے جاگ رہا ہوں۔ اس لئے دماغ درست طور پر کام نہیں کر رہا ہے۔''

ایک نرس نے میرے سر کی ڈریسنگ کی۔ زبردستی دو انجکشن لگا دیئے اور ڈاکٹر نے سر کا ایکسرے کرانے کا مشورہ دیا۔ میں وہاں سے نکل بھاگا۔ شکیل ہنستا ہوا میرے پیچھے آیا۔ ''آپ تو یوں بھاگے جیسے وہ آپ کو زبردستی داخل کر لیں گے۔''

''نہیں دراصل مجھے خدشہ تھا کہ اگر میں کچھ دیر مزید رکا تو آپریشن روم میں لے جا کر میرا سر کھول کر معائنہ کرنے لگ جائیں گے۔''

ندیم، شازیہ اور بچوں کے چہروں پر ایسی خوشی اور شادمانی تھی جسے صرف محسوس کیا جا سکتا تھا بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے دیکھ کر ندیم اٹھنے لگا۔ ''لیٹا رہ......'' میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''اب طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ حرامیوں نے دبا کر مارا تھا۔''

''جب تُو موبائل پر انتخاب جیت جانے والے سیاست دان کی طرح کلف زدہ لہجے میں بات کر رہا تھا تب میں سمجھ گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے تیرے گھر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔

''ندیم اگر شہباز بھائی نہ آتے تو نہ جانے ہمارا کیا ہوتا۔''

''کچھ نہیں ہوتا بھابی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اپنے میاں کو سنبھالیں۔ میں باہر جا کر کچھ کھاؤں گا اور آرام کروں گا۔ سفیر اور مونا پریشان نہ ہوں۔''

''میری بات ہوئی تھی ان سے۔'' ندیم بولا۔ ''رات تک میں بھی آ جاؤں گا ابھی تُو جا۔''

''یار مجھے تیری طرف سے فکر ہے۔''

''فکر مت کر...... شکیل صاحب کے آدمی میری حفاظت کے لئے موجود ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تُو جا کر آرام کر باتیں پھر کریں گے۔''

سفیر اور مونا سے زیادہ مجھے راجا عمر دراز کی فکر کھائے جا رہی ہے میں اسے تصویر کے بارے میں کیا بتاتا اور جواب میں نہ جانے اس کا کیا ردِعمل ہوتا۔ مگر اس نے سکون سے میری بات سنی اور آہستہ سے بولا۔ ''شہباز جا کر آرام کرو اب اس معاملے کو میں دیکھ لوں گا اور میری وجہ سے تمہیں اور تمہارے جاننے والوں کو جو تکلیف ہوئی اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔''

''پلیز راجا صاحب...... شرمندگی تو مجھے ہے۔''

''اسے بھول جاؤ۔'' اس نے میرا شانہ تھپکا اور چلا گیا۔

سر دھوئے بغیر غسل کیا۔ مونا اور سفیر کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بمشکل کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہوتے ہی بے خبر سو گیا۔ میری آنکھ بھوک سے کھلی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ باہر بچوں کا شور بتا رہا تھا کہ ندیم اور اس کی بیوی آئے ہیں۔ ان کی محفل مہمان خانے کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں جمی تھی۔ سب اتنے عرصے بعد مل کر بیٹھے تھے یا ایسا لگ رہا تھا گزشتہ کچھ عرصے میں سب نے ہی جو حالات دیکھ لئے تھے اس کے بعد اس طرح مل کر بیٹھنا بھی کسی کے خواب وخیال سے کم نہیں تھا۔ میں نے کچن کال کر کے کھانے کی فرمائش کر دی تھی وہ سب کھانا کھا چکے تھے۔ مونا نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''شوبی...... جلدی سے اپنی کہانی سناؤ۔''

''کہانی نہیں...... یہ ایک دردناک آپ بیتی ہے۔ جسے سن کر خواتین چار چار آنسو بہائیں گی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن کہانی سنانے کے لئے جسم میں توانائی چاہئے اور توانائی مل سکتی ہے کھانے سے لہٰذا پہلے مجھے کھانا کھانے دیں۔''

کھانا لذیذ اور مرغن تھا۔ کھانے کے بعد کافی پر میں نے انہیں اپنی آپ بیتی سنائی۔ اگرچہ شاز یہ سب بتا چکی تھی لیکن وہ میرے منہ سے سننے کے متمنی تھے۔ سب کو تصویر اور رحمت کی بیوی اور بیٹی کے جانے کا افسوس تھا۔

''وہ بے چارہ بہت دکھی ہے۔'' سفیر نے بتایا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے ملا تھا۔''

''مجھے افسوس ہے لیکن اس وقت میں بے بس تھا انہیں بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔''

''خدا کرے وہ زندہ سلامت ہوں۔'' مونا بولی۔

''دعا کرو کہ عزت سے زندہ سلامت ہوں ورنہ وہ جن درندوں کے پاس ہیں عورت ان کے لئے شکار ہوتی ہے۔'' سفیر نے تلخی سے کہا۔ ''ممکن ہے شہباز اور ہمارا بدلہ بھی وہ ان غریب اور بے بس عورتوں سے لیں۔''

''شوبی! کیا کسی طریقے سے انہیں واپس لا سکتے ہیں؟''

''لانے کی ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''میں ڈیوڈ شا سے بات کرتا ہوں وہ غیر ملکی ہے اور بلاوجہ قتل وغارت گری سے گریز کرے گا۔''

''تم اس سے کہاں رابطہ کرو گے۔''

''وہ میریٹ اسلام آباد میں ٹھہرا ہے۔'' میں نے کہا اور موبائل پر میریٹ کا نام ملایا۔ آپریٹر نے شیریں لہجے میں دریافت کیا۔

''یس سر واٹ کین آئی ڈو فار یو؟''

''پلیز کنیکٹ ٹو ڈیوڈ شا۔''

''یور نیم پلیز؟''

''شہباز ملک۔'' میں نے سوچ کر اپنا اصل نام بتا دیا۔

''ون منٹ ہولڈ پلیز سر!'' آپریٹر نے کہا اور میوزک سنائی دینے لگی۔ چند لمحے بعد ڈیوڈ شا لائن پر تھا۔

''کیا بات ہے مسٹر شہباز؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''مسٹر شا...... مجھے وہ لڑکی اور اس کی ماں واپس چاہئے۔'' میں نے بھی بلاتمہید کہا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ فتح خان کے پاس ہیں۔''

''مسٹر شا! فتح خان تمہارے اختیار میں ہے، اسے کہو ان مظلوم عورتوں کو چھوڑ دے۔ ان کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ سوائے اس کے کہ میں نے ان کے گھر پناہ لی تھی۔''

''اوکے۔'' اس نے کہا اور کوئی واضح بات کئے بغیر فون بند کر دیا۔ وہ بے حد چالاک آدمی تھا۔ فون پر ایسی کوئی بات منہ سے نہیں نکالنا چاہتا تھا جس سے وہ پھنس جاتے۔ سب سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ڈیوڈ شا اور اپنی گفتگو دہرائی۔ سفیر پُر امید لہجے میں بولا۔ ''شاید وہ فتح خان کے چنگل سے انہیں نکلوا دے۔''

''مشکل ہے۔ وہ عورتیں ایک طرح سے فتح خان اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ڈیوڈ شا کے خلاف گواہ ہیں۔''

''وہ تو شازیہ بھی ہے۔''

''شازیہ گواہ نہیں ہو سکتیں۔'' ندیم نے کہا۔ ''وہ ہم سے تعلق رکھتی ہے لیکن رحمت کی بیوی اور بیٹی اس کے خلاف گواہی دے سکتی ہیں۔''

''کیا ان غریب عورتوں کی گواہی ان کا کچھ بگاڑ سکتی ہے؟'' مونا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں اگر معاملہ عدالت میں چلا گیا تو ان کے خلاف گواہی مؤثر ہوگی۔'' ندیم بولا۔

''وہ لوگ کوئی خطرہ مول لینا گوارا نہیں کریں گے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ ''میں نے ایک چانس لیا تھا۔''

''ڈیوڈ شا نے تجھے ٹرخا دیا ہے۔'' ندیم بولا۔ ''یہ شرافت کی زبان سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں۔''

ایک ملازم اندر آیا۔ ''آپ کو راجا صاحب نے طلب کیا ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

ان لوگوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر میں ملازم کے ساتھ کوٹھی کے اندر اس نشست گاہ تک آیا جہاں راجا عمر دراز موجود تھا۔ ''بیٹھو شہباز...... تھکن اتر گئی۔ سر کی تکلیف کیسی ہے؟''

''آپ نے پوچھا تو یاد آیا میرے سر پر چوٹ لگی تھی۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور اس کے اشارے پر بیٹھ گیا۔

''شہباز! ڈیوڈ شا کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جتنا آپ نے بتایا تھا۔ ایک ملاقات میں وہ بے حد عیار اور ٹھنڈے دماغ کا شخص لگا۔ اس کی خطرناکی میں کوئی شبہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور راجا کو اس سے تھوڑی دیر پہلے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ اس نے سر ہلایا۔

''ڈیوڈ نے تمہیں ٹال دیا ہے لیکن وہ مجھے نہیں ٹال سکتا۔'' اس نے کہا اور فون اٹھا کر میریٹ ہوٹل کا نمبر ملایا۔ نمبر میں نے بتایا تھا۔ ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز کے نمبر مجھے از بر تھے۔ اس نے ڈیوڈ شا سے ملانے کو کہا۔ چند لمحے بعد وہ لائن پر تھا۔ رانا عمر دراز نے نہایت طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تصویر مبارک ہو۔''

ڈیوڈ شا نے اسے نہ جانے کیا جواب دیا، اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی۔ اس نے غرا کر کہا۔ ''تصو
حاصل کر کے یہ مت سمجھو کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ بہرحال ابھی میں نے اس لئے فون کیا ہے کہ ان دو عورتوں
چھوڑ دو۔ میں بھی تمہیں نظرانداز کر دوں گا۔'' راجا عمر دراز بولا اور دوسری طرف کی بات سن کر اس نے فون ر
دیا۔ ''رحمت کی بیوی اور بیٹی کل صبح تک اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔''

''کیا آپ کو یقین ہے ڈیوڈ شا اپنے الفاظ کا پاس رکھے گا۔''

''ہاں...... کیونکہ وہ جانتا ہے میں اس کے لئے کتنی مشکلات کھڑی کر سکتا ہوں۔''

''آپ اس کے خلاف رپورٹ نہیں کرا سکتے؟''

''کرا تو سکتا ہوں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسے غیر ملکی ہونے کے ناتے سفارتی تحفظ حاصل
ہے۔''

''آپ تصویر کی چوری کی رپورٹ تو کرا سکتے ہیں؟''

راجا عمر دراز سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ''بہرحال اگر اس نے رحمت کی بیوی اور بیٹی کو رہا کر دیا تو میں ا
وعدے کے پابندی کرنے پر مجبور ہوں گا۔''

اس کے بعد راجا عمر دراز پھر چپ ہو کر سوچ میں گم تھا۔ میں نے محسوس کیا اس نے مجھے کوئی خاص با
کہنے کے لئے بلایا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ مجھے اسٹڈی روم میں لایا اور ایک کونے میں رکھی تجوری کھول کر ایک بڑا سا موٹا لفافہ نکالا۔ میز پر رک
اس نے لفافہ کھولا اور اس سے جو چیز نکال کر دکھائی اسے دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا تھا۔ یہ وہی تصویر تھی جسے ڈیو
مجھ سے لے اڑا تھا۔ میں نے بمشکل کہا۔ ''یہ تصویر......''

''اس کی نقل ہے۔'' راجا عمر دراز بولا۔

''بہت اچھی نقل ہے لیکن کیا آپ کے لئے اصل جتنی اہمیت رکھتی ہے؟''

اس نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ ''تم ذہین آدمی ہو۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جذباتی طور پر
تصویر کی میرے لئے کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن اس کی دوسری اہمیت برقرار ہے۔''

''اور غالباً دوسری اہمیت ہے جس کی وجہ سے سارے ہنگامے ہیں۔''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔''

''راجا صاحب کیا اس تصویر سے کوئی بہت بڑا فائدہ وابستہ ہے؟''

''تم ایسا ہی کہہ سکتے ہو۔''

اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے تصویر کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا ہے اور مجھے بھی اس سے
دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اکتا کر کہا۔ ''راجا صاحب آپ نے مجھے کیوں طلب فرمایا ہے؟''

''شہباز تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا فی الوقت منظر عام پر آنا مناسب نہیں ہے۔''

''ہاں...... لیکن ہم کب تک روپوشی کی زندگی گزار سکتے ہیں؟''

''تمہیں روپوش رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ بیرونِ ملک چلو۔''

"بیرون ملک۔" میں چونکا۔ "کب...... کہاں...... کیوں؟"

"اس کب...... کہاں اور کیوں کا جواب مختصر سا ہے۔ لیکن پس منظر بہت تفصیلی ہے۔ میں چاہتا ہوں پہلے تم ایک دلچسپ کہانی سن لو۔"

"اگرچہ میں کہانی سننے کی عمر سے گزر چکا ہوں...... لیکن آپ کہتے ہیں تو سن لوں گا۔"

"بیٹھو۔" راجا عمردراز نے کاؤچ کی طرف اشارہ کیا اور انٹرکام اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "چائے، کافی، قہوہ؟"

"کافی۔" میں نے کہا تھا۔

☆======☆======☆

محمد علی نے بیٹے کو پیار سے گود سے اتار کر لاری پر سوار کرایا۔ وہ پہلی بار اس سے دور جا رہا تھا۔ خانو اس کا ایک ہی بیٹا تھا اس کی ساری دولت اور جائیداد کا اکلوتا وارث۔ جب محمد علی نے ہوش سنبھالا تو اس کے باپ نے تعلیم دلوانے کے لئے ملک کے بہترین استاد بلوائے تھے۔ مگر اب زمانہ بدل گیا تھا۔ اب اسکولوں اور کالجوں کا دور تھا۔ جدید تعلیم حاصل کرنے کے لئے بچے کو اسکول اور کالج بھیجنا لازمی تھا۔ لہٰذا اس نے خانو کو شہر کے اسکول میں داخل کرانے کا فیصلہ کیا تو اس کے پس پشت دو عوامل تھے۔ ایک تو خانو شہر کے طور طریقے سیکھے اور دوسرے جدید دنیا کے بارے میں جانے۔

ان کا گاؤں پہاڑوں کی بے حد محدود دنیا تھی۔ وہ لوگ اپنے علاقے سے باہر بہت کم جاتے تھے اور شہر دیکھنے کا اعزاز صرف چند لوگوں کو حاصل تھا۔ ان میں ایک محمد علی بھی تھا۔ جب وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کو شہری رنگارنگ اور جدید دنیا کی کہانی سناتا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں۔ ریل گاڑی، موٹریں، سینما اور بجلی سے چلنے والے دیے۔ یہ سب ان کے لئے پرستان سے کم نہیں تھا۔ ان میں سے بعض تو ایسے تھے جو کبھی گاؤں سے باہر نہیں گئے تھے۔ ان کے لئے ان سب چیزوں کا تصور بھی محال تھا۔ ممکن ہے محمد علی کی جگہ کوئی اور یہ سب باتیں بتاتا تو وہ اسے جھوٹا قرار دیتے مگر محمد علی گاؤں کے مالک کا اکلوتا بیٹا تھا اور اب اس کا اکلوتا لڑکا خانو تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہر جا رہا تھا۔ محمد علی نے بیٹے کے لئے پشاور کے ایک ایسے اسکول کا انتخاب کیا جو مسلمانوں نے اپنی مدد آپ کے تحت مسلمان بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے قائم کیا تھا۔ خانو کو ہاسٹل میں رہنا تھا اس کے ساتھ محمد علی نے دو نوکر بھی بھیجے تھے جو ہاسٹل میں اس کا خیال رکھتے۔ ماں کی بیماری کی وجہ سے محمد علی خود اپنے جگر کو چھوڑنے نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی محبت اور شفقت کا عادی خانو جاتے جاتے بھی اس سے لپٹا رہا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ باپ سے مطالبہ کر سکتا اسے اتنی دور نہ بھیجا جائے۔ وہ اس سے...... حویلی سے...... ماں سے دور اپنے شاہ زور سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ شاہ زور محمد علی کی چہیتی گھوڑی کا بچہ تھا جو پیدا ہوتے ہی خانو کا ہو گیا تھا اور اب ایک سال کا تھا۔ خانو اس سے بے پناہ پیار کرتا تھا جس روز وہ کئی گھنٹے شاہ زور کے ساتھ نہیں گزارتا تھا اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ باپ نے اسے لاری میں بٹھایا تو اپنی آنکھیں اس سے چھپا لیں جن میں نمی آ رہی تھی۔ خود خانو منہ چھپا کر رو رہا تھا۔

راستے میں اس کا زیادہ وقت رونے دھونے میں گزرا تھا اس لئے وہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ لاری کہاں کہاں

سے گزر رہی ہے۔ چھوٹے موٹے قصبوں کے بعد لاری پشاور میں داخل ہوئی اس وقت تک خانو کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی تسلیم کر لیا تھا کہ اب اسے آنے والے چودہ پندرہ سال گھر سے دور گزارنے تھے، اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ گرمیوں میں اسے دو مہینے حویلی میں گزارنے کا موقع ملتا۔ اس نے آنکھیں صاف کر کے دیکھا تو وسیع وعریض پشاور دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ صاف ستھرے پختہ راستے، شاندار بنگلے، بازاروں میں لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہجوم، لوہے کی پٹڑی پر دوڑتی لمبی دھواں اڑاتی ٹرین۔ ایک ایک شے اس کے لئے ایک عجوبہ تھی۔ لاری اڈے سے تانگا لے کر وہ اسکول کے ہاسٹل روانہ ہوئے۔ خانو کا داخلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ دس سال کی عمر تک اس نے ایک استاد سے اردو، انگریزی، حساب اور جغرافیہ پڑا تھا۔ شہر کی بہت ساری چیزیں اس کے لئے اجنبی نہیں تھیں۔ اس کے باوجود شہر کا رعب اور دبدبہ الگ شے تھی جو صرف دیکھنے سے محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اسے چوتھی کلاس میں داخلہ ملا تھا۔ کیونکہ اسکول کا پرنسپل اس کے باپ کے دوستوں میں سے تھا۔ محمد علی جب پشاور آتا اس کے ہاں ٹھہرتا تھا اس کے باوجود اس نے محمد علی سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس کا بیٹا معیار پر پورا نہ اترا تو اسے نچلے درجے میں بھیج دیا جائے گا۔ اسے امتحان دینا تھا۔ ہاسٹل میں اسے اس کا کمرا دکھایا گیا جہاں تین دوسرے بچے بھی مقیم تھے۔ ہر کمرے میں چار لڑکے تھے۔ ہر لڑکے کے بستر کے ساتھ ایک چھوٹی سی الماری تھی جس میں طالب علم اپنا سامان رکھ سکتا تھا۔ ایک مشترکہ اسٹڈی ٹیبل اور اس کے ساتھ چار کرسیاں تھیں۔

خانو کے نوکروں کو ہاسٹل میں جگہ نہیں مل سکتی تھی اس لئے انہوں نے رات سرائے میں گزاری۔ اگلے روز خود پرنسپل نے خانو کا امتحان لیا تھا اور جب اس نے خانو کے تحریری جوابات دیکھے تو انہیں یقین نہیں آیا کہ لڑکا ایک ایسے علاقے سے آیا ہے جہاں تیس چالیس میل کی دوری تک کوئی اسکول نہیں ہے اور جہاں ہزار میں صرف ایک دو افراد پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ خانو کی تعلیمی قابلیت کسی طرح چھٹی کلاس کے بچے سے کم نہیں تھی لیکن وا اسے چھٹی جماعت میں داخل نہیں کر سکتا تھا اس لئے اسے پانچویں کلاس سے داخلہ ملا تھا۔ خانو تعلیمی سال شروع ہونے کے دو مہینے بعد آیا تھا لیکن اس نے اپنی محنت سے پانچ مہینے میں کورس مکمل کر کے امتحان دے دیا اور اسے چھٹی جماعت میں داخلہ مل گیا۔

خانو کے ساتھ آنے والے نوکر ایک کمرے کا مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے تھے۔ اگرچہ ہاسٹل کی طرف سے خانو کو تمام سہولیات میسر تھیں اس کے باوجود وہ صبح سے شام تک اس کی خدمت کے لئے حاضر رہا کرتے تھے۔ دوسرے سال سے پرنسپل نے خانو کو ہاسٹل کے بجائے اپنے گھر میں رکھ لیا تھا اور نوکر بھی اس کے پاس آ گئے تھے۔ خانو نے اس دوران میں خود کو تعلیمی نظام سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔ وہ نصاب کے علاوہ بھی کتابیں پڑھتا تھا اور اسکول کی لائبریری اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ چار سال بعد اس نے میٹرک کر لیا تھا۔ محمد علی اس سے مطمئن تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اس کا لڑکا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اس وجہ سے اس نے اسے اسلامیہ کالج پشاور میں داخل کرایا۔ وہاں سے خانو نے انٹر کیا اور اب محمد علی اسے علی گڑھ بھیجنا چاہ رہا تھا۔ مگر تقدیر نے خانو کے لئے کچھ اور ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ ان دنوں برطانیہ کی سرکار ہندوستان میں فوج کا فضائی بازو منظم کر رہی تھی اور اس نے اخبارات میں بھرتی کے لئے اشتہار دیا تھا۔

خانو نے طیارہ ایک بار دیکھا تھا جب کمپنی سرکار نے شمالی سرحد کے حریت پسندوں پر بمباری کے لئے پہلی بار جنگی طیارے برصغیر میں استعمال کئے تھے۔ پشاور سے یہ طیارے پرواز کرتے تھے۔ ایسے ہی خانو نے ایک طیارہ دیکھا تھا اور اس مشین نے اسے مسحور کر دیا تھا جو انسان کو ہوا کے دوش پر لے جاتی تھی جب اس نے اخبار میں اشتہار دیکھا تو اس کے اندر بے اختیار فضائیہ میں شامل ہونے کی خواہش ابھری تھی۔ مگر اسے معلوم تھا کہ اس کا باپ اسے اجازت نہیں دے گا کیونکہ وہ اسے علی گڑھ بھیجنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اسے تحریک پاکستان کا سپاہی بنانا چاہتا تھا۔ خانو خود بھی دل و جان سے پاکستان کا حامی تھا اور کالج میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔

ان دنوں یورپ میں جنگ عظیم دوم عروج پر تھی اور جاپانیوں نے انگریزوں سے سوائے ہندوستان کے ان کی ساری ایشیائی کالونیاں چھین لی تھیں۔ ایسے میں ہندوستان برطانیہ کی امیدوں کا مرکز تھا۔ یہاں سے انہیں نہ صرف جنگ کے لئے دولت بلکہ افرادی قوت بھی مل رہی تھی۔ خاص طور سے شمالی مغربی ہندوستان سے دھڑا دھڑ بھرتیاں ہو رہی تھیں۔ غلام ہندوستانیوں کو برطانوی مفاد پر قربان کیا جا رہا تھا۔ غدار اور لالچی لوگ مقامی لوگوں کو بھرتی کرا کے وفاداری میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ خانو نے باپ سے پوچھے بغیر درخواست دے دی اور اس کو انٹرویو کے لئے بلا لیا گیا۔ جب کامیاب امیدواروں کا اعلان ہوا تو اس میں اس کا نام بھی شامل تھا اب اسے فکر ہوئی کہ یہ بات باپ کو کیسے بتائے اسے معلوم تھا کہ باپ آگ کی طرح بھڑک اٹھے گا۔ مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے گاؤں کے لئے رخت سفر باندھا۔ محمد علی اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس وقت اسے علی گڑھ میں ہونا چاہئے تھا اور وہ گاؤں چلا آیا تھا۔ ''کیا بات ہے خانو......تو اس طرح بے وقت کیوں آیا ہے؟''

''بابا......میں نے فضائیہ میں بھرتی دے دی ہے۔'' اس نے برملا اعتراف کر لیا تھا۔ مگر خلاف توقع محمد علی بھڑکا نہیں تھا۔

''پھر مجھے کیوں اطلاع دے رہے ہو؟'' محمد علی نے سرد لہجے میں کہا۔

''بابا مجھے شرمندگی ہے میں نے آپ کی اجازت کے بغیر یہ کام کیا۔''

''مگر اب تم کر چکے ہو تو کیا اس پر پچھتا رہے ہو؟''

''نہیں بابا...... یہ میرا شوق ہے۔ صرف آپ کی اجازت نہ ہونے کا پچھتاوا ہے۔''

''اگر تو مانگتا تو میں ضرور دے دیتا۔'' محمد علی نے سرد آہ بھری۔

خانو کو یقین نہیں آیا تھا اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''بابا اب آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟''

''نہیں خانو......میں بھلا تجھ سے ناراض ہو سکتا ہوں۔ تو نے میری اجازت کے بغیر فوج میں شمولیت کی ہے اب تیری سزا یہ ہے کہ تجھے سب سے آگے رہنا ہو گا۔ اچھی سے اچھی تربیت حاصل کرنا کہ جب ہم مسلمانوں کا اپنا ملک بن جائے تو تو اس کی خدمت کر سکے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں بابا۔'' اس نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ''اگر کبھی دوسرے نمبر پر آیا تو آپ کو منہ نہیں دکھاؤں گا۔''

''مجھے تجھ سے یہی توقع ہے بس اپنے خاندان کی ناک کا خیال رکھنا، ہم نے انگریزوں کی نوکری کرنی ہے غلامی نہیں کرنی ہے۔''

اس عزم کے ساتھ خانو ائیر مین شپ ٹریننگ کورس میں شامل ہوا کہ اسے کچھ بننا ہے۔ اپنے بیچ میں وہ واحد مسلمان تھا۔ باقی افراد ہندو، سکھ اور مقامی عیسائی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسے امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ خوش قسمتی سے ان کا انسٹرکٹر اچھا آدمی تھا اور محنتی افراد کی قدر کرتا تھا۔ جب اس نے خانو میں سیکھنے کا جذبہ دیکھا تو اسے دوسروں سے زیادہ اہمیت دینے لگا۔ اس پر اس کے ساتھی جل گئے تھے۔ کورس کے دوران انہوں نے اسے تنگ کرنے بلکہ ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مگر وہ استقامت سے ڈٹا رہا۔ ایک سال کی تربیت کے بعد اسے برما کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے بعد امریکا بھی جنگ میں کود پڑا تھا اور جاپانی اپنے مقبوضہ علاقوں پر گرفت کھو رہے تھے۔ ہر ملک میں خاص طور سے چین میں ان کے خلاف حریت پسند سرگرم تھے۔ جنہیں اتحادی مدد دے رہے تھے۔ ایک روز خانو اور اس کے ائیر مین گروپ کو واپسی کا حکم ملا اور جب وہ کلکتہ پہنچے تو ان کے نئے پوسٹنگ آرڈر تیار تھے انہیں آسام میں تبت کی سرحد سے کچھ فاصلے پر ایک ہوائی مستقر پر کام کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ خانو اور اس کے ساتھی حیران تھے کہ اس ہوائی اڈے پر ان کا کیا کام تھا جو کسی بھی محاذ سے دور واقع تھا۔ بہرحال حکم تھا اور انہیں جانا تھا۔

اسی ہوائی اڈے پر بڑے بڑے ٹرانسپورٹر طیارے تعینات تھے۔ وہاں اسلحہ اور دوسرا ساز و سامان کثیر تعداد میں تھا لیکن بظاہر کوئی جنگی سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر انہیں اولین مشن پر روانگی کا حکم ملا۔ خانو ائیر ڈراپ ٹیکنیشن تھا۔ یعنی وہ طیارے کے سامان پیراشوٹ کے ذریعے گرانے والے میکنزم کو چلاتا تھا۔ روانگی تک اسے علم نہیں تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ جب طیارہ فضا میں بلند ہوا تو انہیں بتایا گیا کہ انہیں کوہ ہمالیہ اور تبت کے بلند پہاڑوں کو عبور کر کے چین میں حریت پسندوں کے لئے اسلحہ اور سامان رسد گرانا تھا جو جاپانی فوج سے نبرد آزما تھے۔ طیارے میں خانو سمیت کل پانچ افراد تھے۔ ان میں دو پائلٹ اور دو مزید ٹیکنیشن تھے۔ مشن کمانڈر فلائنگ لیڈر ولیم شا نے انہیں مشن کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں سات گھنٹے دشمن فضاؤں میں گزارنے ہیں اس دوران جاپانیوں نے ہمیں دیکھ لیا تو ہمیں بھاگنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی یا طیارے میں کوئی خرابی ہوئی تو ایک ہزار میل تک طیارہ اتارنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ خود کو ہر قسم کے حالات کے لئے تیار رکھیں۔''

خانو اور اس کے ساتھی مشن کا سن کر کسی حد تک خوفزدہ ہوئے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان کا اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ برما میں کئی بار مشن کے دوران انہیں دشمن کا سامنا کرنا پڑا تھا بس فرق یہ تھا کہ وہ وہاں بے یار و مددگار نہیں تھے ان کے ٹرانسپورٹر طیارے کی حفاظت کے لئے لڑاکا طیارے ہوا کرتے تھے مگر اس مشن میں انہیں کوئی ایسا طیارہ دستیاب نہیں تھا جو اتنی دور تک ٹرانسپورٹر کے ساتھ جا سکتا۔ اگرچہ اس طیارے میں فضائی لڑائی بلکہ دفاع کے لئے گنیں لگی تھیں مگر ان کی کارکردگی محدود تھی اور یہ کسی طرح لڑاکا طیاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ جاپانی زیرو طیارے ویسے بھی اپنی پھرتی اور ڈاگ فائٹنگ کے لئے مشہور تھے۔ ڈاگ فائٹنگ سے مراد لڑاکا طیاروں کی فضا میں جھڑپ ہے ایک ٹیکنیشن جوگندر سنگھ تھا۔ اس نے فکرمندی سے کہا۔

''آپاں دی شادی وی نہیں ہوئی ہے۔''

''ہم بھی کنوارے ہیں یار۔'' خانو ہنسا۔

''میں نے سنا ہے جاپانی بڑے ظالم ہوتے ہیں۔''

''یار جاپانیوں نے ہمارا کیا لینا ہے، ہم تو انگریزوں کے غلام ہیں۔'' خانو آہستہ سے بولا۔ ان کا تیسرا ساتھی جوزف گپتا عیسائی تھا۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔

''انگریزوں نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ ورنہ ہم جانوروں کی زندگی گزار رہے تھے۔''

''دوسری اقوام کے بارے میں تم نے ٹھیک کہا لیکن مسلمان ہمیشہ سے متمدن قوم رہے ہیں۔ ہمیں انگریزوں سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں ہے سوائے آزادی کے۔''

جوزف گپتا اس جواب پر کھسیا گیا تھا اور طیارے کی محدود فضا میں خاموشی چھا گئی تھی۔ جس میں سوائے انجنوں کی گونج کے اور کوئی آواز نہیں تھی۔ ولیم شا اور اس کا آسٹریلین نائب ایلن بریڈ کیبن میں تھے۔ انہوں نے رات دو بجے ٹیک آف کیا تھا۔ نیچے سوائے تاریکی کے کچھ نہیں تھا۔ سامنے بلند اور برف سے ڈھکے ہمالیہ کے پہاڑ تھے۔ عظیم ہمالیہ...... اس جیسا کوئی پہاڑی سلسلہ روئے زمین پر نہیں پایا جاتا ہے۔ ہزاروں سال سے اس نے برصغیر کو چین سے الگ کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے آج تک قابل اعتماد اور سارے سال کھلا رہنے والا زمینی راستہ تشکیل نہیں دیا جا سکا ہے سوائے شاہراہ ریشم کے۔ جسے تعمیرات کی دنیا میں آٹھواں عجوبہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ راستہ بھی اکثر برف باری یا لینڈ سلائیڈنگ سے بند ہو جاتا ہے۔

طیارہ بلند ہوا اور سلسلہ ہمالیہ کے اوپر سے گزرنے لگا۔ اس کے بعد تبت کی پُراسرار زمین تھی۔ جہاں بدھ مت کے ماننے والوں کی عظیم خانقاہیں ہیں۔ یہاں بدھوں کا روحانی پیشوا دلائی لامہ رہا کرتا تھا۔ یہ سرزمین ابھی تک کسی بھی غیر ملکی تسلط سے آزاد تھی۔ خانو نے اس سرزمین کے بارے میں پڑھا تھا اور وہ اس سے متاثر تھا۔ ساڑھے چار بجے وہ تبت کو عبور کر کے چین کے علاقے میں داخل ہوئے اس کے ساتھ ہی کیبن کے اندر کی روشنیاں جلنے بجھنے لگی تھیں، یہ چوکس رہنے کا اشارہ تھا۔ سب نے اپنی اپنی ڈیوٹیاں سنبھال لی تھیں۔ جوگندر سنگھ اور جوزف گپتا مشین گنوں پر جا بیٹھے تھے۔ یہ شیشے کے بنے شفاف بکس تھے جن میں تین سو ساٹھ ڈگری زاویے پر گھومنے والی مشین گن نصب تھی۔ ایک میکنزم کی مدد سے یہ گول بکس طیارے کے پیندے سے باہر نکل گئے تھے۔ خانو ائیر ڈراپ میکنزم پر مستعد تھا اس کی نظر لائٹوں پر لگی تھی ایک سرخ بلب جلنے پر اسے طیارے کا عقبی خانہ کھولنا تھا اور دوسرا بلب جلنے پر سامان نیچے گرانا تھا۔ ان سے منسلک پیراشوٹ طیارے سے گرتے ہی خود کار طریقے سے کھل جاتا اور سامان بحفاظت زمین تک پہنچ جاتا۔

جیسے ہی ایک بلب روشن ہوا خانو نے دیوار میں لگا ہینڈل کھینچا اور طیارے کا عقبی حصہ کھلنے لگا۔ سامان تین قطاروں میں پھسلنے والی پٹریوں پر رکھا تھا۔ خانو بہ آسانی اسے دھکا دے کر گرا سکتا تھا۔ جیسے ہی دوسرا بلب روشن ہوا اس نے سامان کی پہلی قطار کو دھکا دیا۔ بنڈل ایک ایک کر کے تاریک خلا میں گرنے لگے۔ جب ایک قطار گر گئی تو اس نے دوسری قطار کو دھکیلا اور پھر تیسری قطار کے بنڈل بھی باہر گرا دیئے۔ ان کے مشن کا ایک حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے ہینڈل پرے کھینچ کر طیارے کا عقبی حصہ بند کر دیا۔ طیارے نے چکر لگایا اور واپسی کے لئے

پرواز کرنے لگا۔ مگر ابھی الرٹ ختم نہیں ہوا تھا، روشنیاں بدستور جل بجھ رہی تھیں اپنا کام کر کے خانو نے عقبی حصے میں لگی مشین سنبھال لی تھی۔ اس وقت صبح کے سوا پانچ بج رہے تھے۔ ان کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ جاپانی طیاروں کی آمد کا مطلب بڑی حد تک موت تھا۔ ان کے پاس سوائے فرار کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ جاپانی لڑاکا طیارے اس ٹرانسپورٹر طیارے سے زیادہ تیز رفتار تھے مگر خیریت رہی اور ان کا طیارہ اپنا مشن کامیابی سے مکمل کر کے ساڑھے چھ بجے تک چین کی فضاؤں سے نکل کر تبت کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اس وقت صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ سردیوں کے دن تھے اور سورج آٹھ بجے کے قریب نکلتا تھا۔ بلندی کی وجہ سے انہوں نے جلد روشنی دیکھ لی تھی۔

خطرے کی حد سے نکل کر انہوں نے کھانے پینے کا سامان کھولا۔ سینڈوچز، رولز، کیک پیس، بسکٹ اور چکن پیٹس تھے۔ ساتھ میں گرم کافی اور چائے تھی۔ پائلٹوں نے اپنی نشستوں پر ناشتا کیا۔ وہ اس تکلف سے آزاد تھے۔ ساڑھے سات بجے تک ناشتا کر کے خانو طیارے کی کھڑکیوں سے عظیم ہمالیہ کا نظارہ کرنے لگا جو رفتہ رفتہ نزدیک آ رہا تھا۔ اس نے ولیم سے پوچھا۔ ''سر ہم کب تک ہمالیہ کے اوپر ہوں گے؟''

''ابھی آدھا گھنٹا ہے۔ پہاڑ سو میل سے زیادہ دور ہیں۔''

حیران کن طور پر اتنے فاصلے سے پہاڑ اور ان کی برف صاف نظر آ رہی تھی۔ خانو نے طیارے میں لگے کیمرے سے ہمالیہ کی تصاویر لینے کی اجازت مانگی جو ولیم نے دے دی۔ اعلیٰ درجے کے اس کیمرے میں طاقتور لینس لگا تھا۔ جو طویل فاصلے سے بھی بالکل صاف تصویر لے سکتا تھا۔ یہ ایک جاسوس کیمرا تھا اور اس کا مقصد دشمن کے مورچوں اور تنصیبات کی تصویر لینا تھا۔ خانو ہمالیہ کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے موسم بالکل صاف تھا۔ نہ تو بادل تھے اور نہ ہی دھند تھی۔ آٹھ بجے وہ ہمالیہ کے عین اوپر تھے۔ نیچے ہمالیہ کی سفیدی تھی۔ صرف ان مقامات پر چٹانیں اور پہاڑ ننگے تھے۔ جہاں ڈھلان زیادہ ہونے کی وجہ سے برف کے ٹکنے کی گنجائش نہیں تھی۔ خانو نے کیمرا سنبھالا اور خاص لگنے والے مناظر کی تصاویر لینے لگا۔ وہ اچھا فوٹو گرافر تھا۔ اچانک طیارے کے انجنوں کی آواز میں تبدیلی آئی اور یکساں گونجتے آہنگ کے بجائے انجن کھانسنے کے انداز میں چلنے لگا۔ ساتھ ہی طیارہ نیچے آنے لگا۔ جوگندر کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ''گرو کرپا کرے۔''

''سر کیا ہو رہا ہے؟'' خانو نے بے ساختہ ولیم سے پوچھا۔ حالانکہ وہ اس سے سوال کرنے کا مجاز نہیں تھا۔

''انجن مسئلہ کر رہے ہیں۔'' ولیم کنٹرول پینل سے نبرد آزما تھا۔

یکا یک دائیں طرف کا انجن بند ہو گیا۔ طیارہ مزید تیزی سے نیچے جانے لگا۔ محض ایک کمزور پڑتے انجن کے سہارے وہ زیادہ دیر پرواز نہیں کر سکتا تھا۔ ان کو موت سامنے نظر آنے لگی تھی۔ اوّل تو اس جگہ طیارہ اتارنے کی گنجائش نہیں تھی اور وہ کسی نہ کسی طرح طیارہ اتار بھی لیتے تو بے پناہ سردی ان کی جان لے لیتی۔ اس ہنگامی صورتِ حال میں ولیم اور ایلین چیخ چیخ کر ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے۔ وہ انجنوں کو پھر سے پوری رفتار سے چلانے کی دیوانہ وار کوشش کر رہے تھے۔ مگر معاملہ خرابی کی انتہا کو پہنچ گیا جب دوسرا انجن بھی بند ہو گیا۔ اب طیارہ محض اپنے پروں کے سہارے ڈول رہا تھا۔ اوپر سے ایک آفت دھند کی صورت نازل ہو گئی۔ اب طیارے کے چاروں طرف سو فٹ آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ طیارہ اس وقت بیس ہزار فٹ کی بلندی پر تھا جو ہر گزرتے

لمحے کم ہوتی جا رہی تھی۔ سب کے ذہنوں میں ایک سوال تھا کہ اب کیا ہوگا۔

''ہم مرنے والے ہیں۔'' جوزف گپتا نے ہذیانی انداز میں کہا۔

''اپنے حواس قابو میں رکھو۔'' خانو سخت لہجے میں بولا۔ ''اس طرح رونے دھونے سے موت نہیں ٹل جائے گی۔ اپنی سیٹوں پر بیٹھ کر بیلٹ باندھ لو۔''

خانو کی نشست طیارے کے کاک پٹ کے عین پیچھے تھی اس نے بیلٹ باندھ لی اور ذرا آگے ہو کر دیکھنے لگا کہ ولیم شا اور اس کے نائب طیارے کے انجن دوبارہ اسٹارٹ کرنے کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ ایک منٹ میں طیارے کی بلندی پندرہ سو فٹ کم ہو چکی تھی اور طیارہ اس وقت ساڑھے اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ یہ خطرناک بلندی تھی کیونکہ ہمالیہ کی بیشتر چوٹیاں بیس ہزار فٹ یا اس سے زیادہ بلندی رکھتی تھیں۔ کسی بھی لمحے طیارہ کسی چوٹی یا گلیشئر سے ٹکرا سکتا تھا۔ طیارہ جیسے جیسے نیچے جا رہا تھا۔ تصادم کے امکانات بڑھتے جا رہے تھے۔ خانو کی نظریں بلندی بتانے والے آلے پر مرکوز تھیں۔ اس موقع پر ولیم شا نے طیارے کے کل پرزوں سے کام لے کر اس کے گرنے کی رفتار کو سست کیا اور اب طیارہ گلائیڈ کے انداز میں فی منٹ پانچ سو فٹ نیچے جا رہا تھا۔ دھند کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تین منٹ بعد وہ سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور حیران کن طور پر طیارہ کسی شے سے ٹکرایا نہیں تھا۔ ایلن بار بار انجن کا اسٹارٹر دبا رہا تھا۔ مگر ان کے پنکھے ساکت تھے۔

سولہ ہزار فٹ...... ساڑھے پندرہ ہزار فٹ...... پندرہ ہزار فٹ...... چودہ ہزار فٹ آلٹی میٹر بتا رہا تھا وہ زمین سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ خانو کی سمجھ میں طیارہ کی پہاڑی یا گلیشئر سے نہ ٹکرانے کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی کہ ابھی اللہ کو ان کی زندگی منظور تھی۔ ورنہ ہمالیہ کے تقریباً وسط میں اتنی کم بلندی شاید ہی کہیں پائی جاتی ہو اور جب طیارہ دس ہزار فٹ سے نیچے آیا مارے حیرت کے ان کی عقلیں خبط ہونے لگی تھیں۔ ''مجھے لگتا ہے جیسے ہم کنویں میں اتر رہے ہیں۔'' ولیم شا نے کہا۔ انجن بند ہونے کی وجہ سے طیارے میں ایسی خاموشی تھی کہ وہ ایک دوسرے کی سرگوشیاں بھی سن سکتے تھے۔

''ممکن ہے سر یہاں کوئی وادی ہو۔'' خانو نے کہا۔

''یہی امکان ہے۔'' ولیم شا نے اس کے خیال کی تائید کی۔

اس لمحے وہ بادلوں سے نیچے آ گئے اور زمین کا منظر صاف ہونے لگا۔ نو ہزار فٹ کی بلندی پر ایک حیران کن منظر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ دھند سے نکلے نیچے سبز رنگ نمایاں ہونے لگا۔ ان کا طیارہ ایک سرسبز گھنے جنگل پر گلائیڈ کر رہا تھا جو کم سے کم دو ہزار فٹ نیچے تھا۔ وہ سب مبہوت ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے حتیٰ کہ وہ یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کے طیارے کے انجن بند تھے اور وہ کریش ہونے جا رہا تھا۔ اچانک ایلن نے چونک کر پھر سے اسٹارٹر کا بٹن دبانا شروع کر دیا۔ چوتھی پانچویں بار دبانے پر انجنوں نے جھرجھری لی اور تیز گونجتے آہنگ کے ساتھ اس کے پر گھومنے لگے تھے ان کے منہ سے مارے حیرت کے چیخیں نکل گئی تھیں۔ ولیم شا نے انجنوں کو پوری طاقت دی اور طیارے کو وادی کے وسطی حصے کی طرف موڑ دیا اس وقت وہ سات ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ گھنے جنگل اور ان میں بھاگتے دوڑتے جانور صاف نظر آ رہے تھے لیکن یہ نامانوس سے جانور تھے۔ جنگل کے درمیان کہیں کہیں کھلے گھاس کے میدان تھے۔ اچانک خانو نے سامنے دیکھا اور چلایا۔ ''سر اس طرف کوئی شہر

ہے..... وہ دیکھیں۔"

وادی کے وسطی حصے سے ایک شہر ابھر کر سامنے آ رہا تھا۔ اس کی سنہری عمارتیں دور سے چمک رہی تھیں۔ اس پوری وادی میں عجیب سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ حالانکہ اوپر اتنی دھند تھی کہ سورج کی روشنی کا نیچے آنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے باوجود وادی کی ہر شے واضح تھی۔ شہر کے وسط میں ایک بڑی سنہری مندر نما عمارت تھی جس کے گنبد کے اوپر سنہرے رنگ کا کلس چمک رہا تھا۔ شہر کے گرد ایک فصیل بھی تھی۔ اندر خوب صورت اور پختہ عمارتیں نظر آ رہی تھیں جن کے درمیان صاف ستھرے راستوں پر انسان چل پھر رہے تھے۔

"یہ تو کوئی متمدن شہر نظر آ رہا ہے۔" ولیم شا بولا۔ "خانو اس کی تصویر لو۔"

خانو کو ہوش آیا اور اس نے طیارے کا کیمرا سنبھال لیا لیکن ابھی اس نے صرف دو تصویریں لی تھیں کہ نہ جانے کیمرے میں کیا مسئلہ ہوا اس نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ "سر کیمرا کام نہیں کر رہا۔"

"کیوں نہیں کر رہا؟" ولیم شا غصے سے بولا۔ "اسے ٹھیک کرو..... ہمارے پاس ایندھن کم ہے۔ زیادہ دیر اس جگہ پرواز نہیں کر سکتے۔"

"سر میں کوشش کر رہا ہوں۔" خانو بولا۔ وہ کیمرے کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ اس لئے شہر کا زیادہ نظارہ نہیں کر سکا تھا۔ یکا یک ایک طرف سے بادل چھٹ گئے اور سورج جھانکنے لگا تھا۔ یہاں دھوپ کی آب و تاب اور چمک معمول سے زیادہ تھی۔ پوری وادی جیسے روشنی میں نہا گئی تھی۔ شمال کی سمت میں انہیں کوئی بے حد تیز چمک محسوس ہوئی تھی۔ ولیم شا نے طیارہ اس طرف موڑ دیا تھا۔ خانو نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ کیمرے کے ساتھ ہلکان ہو رہا تھا۔ جبکہ جوگندر اور جوزف پلکیں جھپکائے بغیر ایک ایک منظر دیکھ رہے تھے۔ طیارے کے عین سامنے ہرے بھرے جنگل میں بلند ہوتی ڈھلان پر سنہرے رنگ کی اہرام نما عمارت تھی اس کی چوٹی ہیرے کی طرح مختلف رنگوں میں جھلملا رہی تھی۔ بے حد شاندار منظر تھا۔ خانو کیمرا بھول کر کاک پٹ پر جھک گیا۔

"خوب صورت۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"تم نے کیمرا ٹھیک کر لیا؟" ولیم شا نے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں سر..... میرا خیال ہے اس کے اندر کوئی خرابی ہو چکی ہے اور اسے کھولے بغیر درست کرنا ممکن نہیں ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اوہ....." ولیم شا کے لہجے میں مایوسی تھی۔ "ایلن فیول کتنا ہے؟"

"پون گھنٹے کی پرواز کا۔" ایلن نے جواب دیا۔

"دس منٹ میں اس وادی سے نکل جانا چاہئے۔" ولیم شا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

دس منٹ تک طیارے نے وادی پر چکر لگایا۔ عین ہمالیہ سلسلے کے وسط میں ایک سرسبز وادی کی موجودگی اتنی حیران کن نہیں تھی جتنی ایک متمدن شہر اور شہر میں شاندار عمارتوں کی موجودگی۔ دنیا کو اس وادی اور شہر کا علم نہیں تھا کیونکہ انہیں ہمالیہ کا جو نقشہ اور چارٹس مہیا کئے گئے تھے ان میں اس شہر کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ دس منٹ ہوتے ہی ولیم شا نے طیارہ بلند کیا اور وادی کی دیواروں کے ساتھ ہوتا بادلوں میں گھس گیا۔ دس ہزار فٹ کی بلندی پر وادی کی دیواروں پر برف نظر آنے لگی تھی۔ ان کے اندازے کے مطابق وادی کم و بیش تیس میل لمبی چوڑی تھی۔ اس

دیواریں کہاں تک بلند تھیں وہ نہیں دیکھ سکے تھے کیوں کہ وہ ایک بار پھر دھند میں سفر کر رہے تھے۔ تقریباً بائیس ہزار فٹ پر انہیں صاف موسم ملا تھا۔ ولیم نے اپنے چارٹ اور نقشوں پر وادی کے مقام پر ٹِک لگا دیا تھا۔

جب وہ سلسلہ ہمالیہ عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہو رہے تھے تو سوچ رہے تھے کہ انہوں نے ابھی جو دیکھا وہ سچ تھا یا ان کا وہم تھا۔ مگر بیک وقت پانچ افراد کو وہم نہیں ہو سکتا تھا۔ نو بجے کے قریب وہ آسام کے ہوائی مستقر پر اتر چکے تھے۔ طیارے کے انجنوں نے دوبارہ گڑبڑ نہیں کی تھی۔ رن وے پر اتر کر ولیم شا نے لاگ بک میں اپنی رپورٹ لکھی۔ اس میں اس نے طیارے کے انجنوں کی خرابی اور اس کے نیچے جانے کا ذکر کیا تھا لیکن اس بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا تھا کہ انہوں نے راستے میں کوئی وادی بھی دیکھی جہاں سرسبز جنگل تھے اور انسانوں سے آباد شہر تھا۔ ایک عجیب و غریب اہرام نما عمارت تھی۔ جب وہ اندر جانے لگے تو ولیم شا نے ان تینوں کو طلب کر کے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”ہم نے راستے میں جو دیکھا ہے اس کے بارے میں کسی سے ایک لفظ نہیں کہنا ہے۔ یہ مشن کمانڈر کی حیثیت سے میرا حکم ہے۔“

”یس سر۔“ ان تینوں نے کہا حالانکہ وہ جانتے تھے مشن کمانڈر مشن سے واپسی کے بعد اس قسم کا کوئی حکم دینے کا مجاز نہیں تھا۔ مگر فوجی تربیت میں افسران کا حکم ماننا سکھایا جاتا ہے۔ بعد میں جوگندر سنگھ نے خانو سے کہا۔ ”یہ گورا افسر بہت چالاک ہے۔ سارا نام اپنا کرے گا۔“

”کرے۔“ خانو بے پروائی سے بولا۔ ”ویسے ان تصویروں کی وہ کیا وضاحت کرے گا؟“

”وہ تصویریں غائب بھی کر سکتا ہے۔“

جوگندر سنگھ کا خدشہ درست ثابت ہوا جب کیمرے سے نکالی جانے والی ریل خالی پائی گئی۔ جبکہ اس میں خاصی تصویریں کھینچی جا چکی تھیں۔ خانو بعد میں فلائنگ لیڈر ولیم شا کے ساتھ مشن پر جاتا رہا تھا لیکن ولیم شا نے اپنی تفصیلی رپورٹ میں بھی اس وادی کا ذکر گول کر دیا تھا۔ ولیم شا نے نہ تو اس طرف سے طیارہ گزارنے کی کوشش کی اور نہ ان سے اس بارے میں بات کی۔ پانچویں مشن کے دوران برما اور تھائی لینڈ جاپانیوں سے واپس حاصل کر لئے گئے تھے اور اب چینی حریت پسندوں کی مدد وہاں سے کی جا رہی تھی۔ سنگاپور پر فیصلہ کن حملے کے لئے ان کے یونٹ کو برما بھیج دیا گیا تھا۔ ایک سال بعد جنگ ختم ہو گئی۔ برطانوی افسران واپس جانے لگے اور نچلے درجے کے ہندوستانی فوجیوں کو فارغ کیا جانے لگا۔ مگر خانو کا شمار ٹیکنیشن میں ہوتا تھا اس لئے اس کی ملازمت برقرار رہی لیکن اب وہ اس ملازمت سے اکتا گیا تھا۔ تحریک پاکستان عروج پر تھی اور ملازمت کی وجہ سے وہ گھٹن محسوس کرتا تھا۔ 1946ء کے مارچ میں اس کی تعیناتی بمبئی میں تھی۔ ایک روز وہ بیرک میں آیا تو دروازے پر ایک سپاہی اسے ملا۔ ”تم کو بلایا ہے۔“

”کس نے؟“ وہ حیران ہوا۔

”ہم نہیں جانتا۔“ سپاہی دیسی ہوتے ہوئے بھی گوراشاہی اردو بول رہا تھا۔ ”افسر لوگ ہے ادھر کار میں انتظار کرتا۔“

خانو اس کے ساتھ سڑک کے پاس کھڑی کار تک آیا اور ولیم شا کو دیکھ کر اس نے سلیوٹ کیا۔

”سر آپ اِدھر ہیں مجھے پتا نہیں تھا۔“

''بس کلکتے سے آیا ہوں۔'' ولیم شا نے بتایا۔''میرے ساتھ چلو مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

خانو اس کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ وہ اسے ایک اونچے درجے کے بار تک لایا خانو نے میز پر بیٹھتے ہی اسے بتادیا کہ وہ اب بھی نہیں پیتا ہے اس لئے ولیم شا نے اس کے لئے صرف سوڈا واٹر منگایا۔ اپنے لئے اس نے بیئر منگوائی تھی۔ خانو منتظر تھا کہ وہ موضوع کی طرف آئے جس کے لئے وہ اسے یہاں لایا تھا۔ بیئر کا گلاس ختم کر کے ولیم شا نے سگریٹ سلگائی۔''خانو میں ایک مہم لے کر ہمالیہ جارہا ہوں۔''

خانو ہمالیہ کے نام پر چونکا۔''ذاتی طور پر۔''

''نہیں ائیر فورس کی جانب سے...... یہ ایک سروے مہم ہے۔'' وہ بولا۔''ہمیں مستند نقشے تیار کرنے ہیں۔''

''خانو ہچکچایا۔''مہم کس طرف سے جائے گی سر؟''

''آسام سے...... تمہیں ہوائی مستقر یاد ہے...... ہم وہیں سے روانہ ہوں گے۔''

''ہم کون...... سر؟''

''میں اور ایلن...... ہندوستانیوں میں سے تم ہو گے۔''

''کیا آپ نے سرکاری طور پر میرا نام دیا ہے؟''

''نہیں...... میں بمبئی آیا تھا...... سوچا پہلے تم سے پوچھ لوں...... پھر نام دوں گا۔''

''کیا میں سوچ سکتا ہوں سر؟''

''کیوں نہیں...... پرسوں میری روانگی ہے تم جواب دے سکتے ہو...... ہم مئی کے آخر یا جون کے پہلے ہفتے میں روانہ ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے سر...... میں سوچ کر جواب دوں گا لیکن میں کیوں سر؟''

ولیم شا مسکرایا۔''کیونکہ تم باصلاحیت اور اپنے کام سے کام رکھنے والے شخص ہو۔''

خانو نے سوچا اور دو دن بعد ولیم شا کو اپنی رضامندی سے آگاہ کردیا۔ وہ خوش نظر آنے لگا۔''مجھے یقین تھا تم یہی فیصلہ کرو گے۔''

خانو کو ہمالیہ کا پُراسرار سلسلہ کوہ کشش کرتا تھا۔ خاص طور سے وہ اس انجانی وادی کے بارے میں سوچا کرتا تھا جس نے انہیں اپنی ایک جھلک دکھائی تھی۔ ہمالیہ کے برف زاروں کے عین وسط میں ایک ہری بھری وادی کی موجودگی کس قدر تعجب انگیز تھی۔ ولیم شا نے جانے سے پہلے اسے کہا۔''جلد تمہیں سرکاری طور پر مہم کے بارے میں مطلع کیا جائے گا۔ تنخواہ اور متعلقہ الاؤنس نہیں ملیں گے لیکن ان کی پرواہ مت کرنا۔''

''ان کی مجھے ویسے بھی پروا نہیں ہے نوکری میں نے ضرورت کے تحت نہیں کی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

ولیم مسکرایا۔''میں نے سنا ہے کہ تمہارا تعلق کسی نواب خاندان سے ہے۔''

''نواب تو نہیں لیکن ہمارا خاندان صدیوں سے اپنے علاقے میں حکمراں چلا آرہا ہے۔''

''ممکن ہے وسط مئی تک تمہیں آنا پڑے۔ بہتر ہے چھٹی لے کر گھر ہو آؤ۔ اس مہم میں نہ جانے کتنا عرصہ

لگ جائے۔"

"یہ بھی ممکن ہے سرے سے واپسی نہ ہو۔ میں پہاڑوں کا باشندہ ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ کسی کو آسانی سے راستہ نہیں دیتے ہیں۔"

جب خانو کو سرکاری طور پر مطلع کیا گیا تو اس نے مہم کے لئے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے چھٹی کی درخواست دی اور گھر چلا گیا۔ ایک مہینا وہاں گزار کر واپس آیا تو اس کا ریل ٹکٹ اس کا منتظر تھا۔ کلکتہ کے بجائے اسے براہِ راست آسام تک جانا تھا۔ ہوائی مستقر اب تقریباً ختم ہو چکا تھا اور وہاں برطانوی فضائیہ کے چند طیارے کھڑے تھے۔ بیشتر عملہ فارغ ہو چکا تھا۔ قبل از وقت بلانے کی وجہ ایک تربیتی کورس تھا جس میں مہم پر جانے والے افراد کو مختلف کام سکھائے جاتے۔ مہم میں کل پانچ افراد تھے۔ ولیم شا، ایلن بریڈ اور خانو کے علاوہ دو نیپالی پورٹر تھے۔ یہ خاص طور سے بلند علاقوں میں بوجھ اٹھانے کے لئے بے مثال سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں طیارے کے ذریعے ہمالیہ کے دامن میں ایک ائیر اسٹرپ پر اتارا جانا تھا جسے دوسری جنگ عظیم میں اتحادی فوج نے چین پر حملے کے لئے بنایا تھا لیکن اس کے استعمال کی کبھی کوئی نوبت ہی نہیں آئی۔

مئی کی آخری تاریخوں میں وہ روانہ ہوئے چھوٹے طیارے نے انہیں ہمالیہ کے دامن میں ائیر اسٹرپ پر اتارا۔ نو ہزار فٹ کی بلندی پر بے پناہ سردی تھی اور درجۂ حرارت رات کے وقت نقطۂ انجماد سے نیچے چلا جاتا تھا۔ مجموعی طور پر ان کے ساتھ دو سو کلوگرام سامان اتارا گیا تھا۔ جس میں خشک خوراک، ایندھن، خیمے، کمبل، دوائیں اور دوسرا ضروری سامان تھا جو اس مہم میں استعمال ہوتا۔ ہر نیپالی پورٹر ساٹھ ساٹھ کلوگرام وزن اٹھاتا اور ان کو تیس کلوگرام کے قریب وزن اٹھانا پڑتا۔ طیارے کے پائلٹ نے بتایا کہ وہ ایک ہفتے بعد چکر لگائے گا اور اس کے بعد ہر تیسرے دن یہاں آئے گا وہ اس وقت تک آتا رہے گا جب تک موسم اجازت دے گا۔

سر سے پاؤں تک وہ پوری طرح موسم کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ طیارے کی واپسی کے فوراً بعد انہوں نے آگے کا سفر شروع کر دیا تھا۔ ان کے پاس دو ہفتے کی خوراک تھی اور اس دوران میں انہیں ائیر ٹرپ تک واپس آ جانا تھا۔ پائلٹ نے ایک پیکٹ الگ سے اتارا تھا۔ جسے انہوں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ اگر واپسی تک ان کی خوراک ختم ہو جاتی اور پائلٹ طیارہ نہیں لایا ہوتا تو وہ اس محفوظ خوراک سے استفادہ کر سکتے تھے۔

خانو اس مہم میں خود کو ایک غیر متعلقہ فرد محسوس کر رہا تھا کیونکہ اسے قطعی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور ان کے کیا عزائم ہیں۔ ولیم شا اور ایلن اس سے دور آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے اور نقشے دیکھا کرتے تھے اور اسے اپنی کسی بات میں شریک نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے تین خیمے لگوائے تھے۔ نیپالی پورٹر رات کھلے میں کمبل میں گزارنے کے عادی تھے اور ان کے لئے خیمے لانے کا مطلب تھا کہ وزن میں مزید اضافہ کر لیا جاتا۔

رات کا کھانا کھاتے ہی وہ اپنے خیموں میں گھس گئے تھے۔ سردی ایسی تھی کہ گرم سلیپنگ بیگ میں بھی خاصی دیر تک ٹھٹھرتے کے بعد انہیں نیند آئی تھی۔ صبح خانو خیمے سے نکلا تو ولیم شا دھوپ میں دوربین سے دور نظر آنے والے برف زدہ پہاڑوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ خانو نے اسے صبح بخیر کہا۔ "آؤ دوست...... وہ دیکھو...... ہمیں اس جگہ ہمالیہ میں داخل ہونا ہے۔" اس نے خانو کو دوربین تھما دی۔

"سر، ہمارے پاس سروے کا سامان تو ہے نہیں۔" خانو نے دوربین لے کر مذکورہ درّہ دیکھا تو وہ اسے

جانا پہچانا لگا تھا۔ خاص طور سے اس کے اوپر مخروطی گنبد نما چوٹی......اس نے کہاں دیکھی تھی۔ پھر اسے یاد آیا جب وہ وادی سے نکلے تھے تو ہمالیہ اترنے سے پہلے اس نے یہ درّہ اور چوٹی دیکھی تھی اس کا شبہ پختہ ہونے لگا۔ ولیم شا کا اصل مقصد زمینی راستے سے اس وادی تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ یہ کام طیارے کی مدد سے زیادہ آسانی سے ہوسکتا تھا۔ مگر اوّل تو اسے ہمالیہ کی طرف طیارہ لے جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ دوسرے اس طرح سے وادی کا راز اور لوگوں کے علم میں آجاتا لہٰذا اس نے زمینی راستے سے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

''سر کیا ہم اس وادی کی طرف سفر کررہے ہیں؟''

ولیم شا چونکا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''سر یہ جو چوٹی نظر آرہی ہے یہ میں نے واپسی میں دیکھی تھی۔ مجھے یاد ہے۔''

''اس کا مطلب ہے میں نے تمہیں لے جانے کا فیصلہ درست کیا ہے۔'' ولیم شا نے خود سے کہا تھا۔ ''خانو مجھے یقین تھا تم اس سفر کے لئے موزوں ترین شخص ہو۔ ہاں میرا مقصد اس وادی کی طرف رسائی حاصل کرنا ہے۔ اس جگہ سے آنے کے بعد ہم دنیا کے مشہور ترین انسان ہوں گے۔''

''بشرطیکہ ہم واپس آسکے۔ میرے خیال میں زمینی سفر بے حد دشوار ہوگا۔ شاید طیارے کے سفر کا ایک منٹ ہمیں ایک دن کے برابر پڑے۔''

''دشواری ہوگی۔ مگر میں وہاں تک رسائی کا عزم لے کر جارہا ہوں۔''

''سر اس صورت میں پندرہ دن کی خوراک ناکافی ہوگی۔ ہمیں کم سے کم ایک مہینے کی خوراک رکھنی چاہئے تھی۔'' اس نے کہا۔

''اس صورت میں ہمیں مزید افراد لینا پڑتے اور میں کم سے کم افراد کے ساتھ یہ سفر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ شرپا نیپالی ہیں۔ واپسی پر ہم انہیں ائیر اسٹرپ سے فارغ کردیں گے اور وادی کا راز صرف ہم تین افراد کے پاس ہوگا۔''

''سر، اس وادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''ممکنہ طور پر یہ کوئی پرانا تمدن ہے۔ ہمالیہ کے برف زاروں کی وجہ سے اس کا رابطہ باقی دنیا سے کٹ گیا ہے اور یہ لوگ بس اس وادی کی حد تک جی رہے ہیں۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

''سر مجھے تو یہ کوئی طلسمی شہر لگتا ہے۔ اس کی کوئی شے نارمل شہروں کی طرح نہیں ہے۔ وادی میں بھاگتے دوڑتے جانور بھی عام جانوروں کی طرح نہیں تھے۔''

ولیم شاہ ہنسا۔ ''تم مشرقی ہر شے کو طلسم کی طرف لے جاتے ہو۔ دیکھو ناں وادی اتنے عرصے سے باقی دنیا سے الگ ہے تو وہاں کی ہر شے باقی دنیا سے الگ ہی ہوگی۔''

نیپالی شرپا ناشتا بنارہے تھے۔ ابلے ہوئے انڈے، دلیا اور کافی۔ انڈے وہ ابال کر لائے تھے۔ اب انہیں بس کھولتے ہوئے پانی میں ڈال کر گرم کرنا تھا۔ ناشتا کرکے انہوں نے سامان باندھا اور روانگی کے لئے تیار ہوگئے۔ دس ہزار فٹ کی بلندی پر برف کا علاقہ شروع ہوگیا تھا انہوں نے چھڑیاں نکال لیں اور خود کو ایک لمبی رسی سے باندھ لیا۔ ہر شخص دوسرے سے پانچ گز کے فاصلے پر چل رہا تھا تاکہ اگر کوئی برف میں چھپے گڑھے میں

گرے تو باقی محفوظ رہیں اور اسے بچالیں۔ وہ احتیاطاً برف میں چھڑیاں مار مار کر چل رہے تھے۔ بلندی بڑھنے کے ساتھ ہوا لطیف ہوتی جا رہی تھی اور اس میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ آگے بڑھنے کی رفتار بے حد سُست تھی۔ دو بجے وہ کھانے کے لیئے رکے تھے اگر چہ انہوں نے زیادہ وزن نہیں اٹھایا تھا۔ اس کے باوجود ان کی حالت نیپالی شرپاؤں سے زیادہ خراب تھی جنہوں نے ان سے زیادہ وزن اٹھا رکھا تھا۔ نصف گھنٹے بعد وہ پھر روانہ ہو گئے تھے اور شام تک گیارہ ہزار فٹ بلندی پر واقع اس درّے تک جا پہنچے تھے۔ مخروطی چوٹی کے نیچے کھڑے ہو کر انہوں نے درّے کے دوسری جانب دیکھا تو لامتناہی فاصلے تک برف ہی برف تھی اور اونچے نیچے پہاڑ تھے ہمالیہ اپنی ہیبت سمیت ان کے سامنے تھا۔

☆======☆======☆

راجا عمر دراز مسکرایا۔ ”جانتے ہو خانو کون تھا؟“

”جناب معاف کیجئے گا۔ بچگانہ سوال ہے کہ اس کا جواب ایک بچہ بھی دے سکتا ہے ظاہر خانو آپ ہی ہیں۔“ میں نے ادب سے کہا۔

راجا عمر دراز ہنسا۔ ”میری عمر تک آ کر آدمی کو کبھی کبھی بچہ بننے کا شوق ہو جاتا ہے۔ ہاں خانو میں ہی ہوں۔ یہ ہماری زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چھوٹے سردار کے ہیں۔“

”راجا صاحب مجھے یہ سب بتانے کا مقصد؟“

”مقصد ہے لیکن ابھی نہیں...... جب پوری داستان سنا دوں گا تو مقصد بھی بتا دوں گا۔ اب رات خاصی ہو گئی ہے تم جا کر آرام کرو۔“

”باقی کب بتائیں گے؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔ سچی بات ہے کہ میں راجا صاحب کی داستان میں نہ چاہتے ہوئے بھی دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا اور باقی آئندہ کا اعلان مجھے کھل رہا تھا۔

”اگر کوئی مصروفیت نہ ہوئی تو کل سنا دوں گا۔“

راجا نشست گاہ سے نکل گیا۔ شاید وہ بھی تھک گیا تھا۔ میں واپس مہمان خانے میں آیا تو سب سونے کے لئے اپنے کمروں میں جا چکے تھے اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بیٹھا بور ہوتا رہا چادر اوڑھ کر لان میں نکل آیا تھا۔ باہر خنکی تھی جو بھلی لگ رہی تھی۔ میں لان میں ٹہلتا رہا اور ایک بار ٹہلتا ہوا پائیں باغ کی طرف چلا گیا۔ اچانک ہی میری نظر رحمت پر پڑی وہ دبے قدموں دیوار کے ساتھ ساتھ لگا کوٹھی کی عمارت کے عقبی حصے میں جا رہا تھا۔ مجھے اس کا انداز مشکوک لگا۔ اسے آواز دینے کے بجائے میں دبے قدموں اس کے پیچھے جانے لگا۔ رحمت عقبی حصے کی طرف مڑا تو مجھے اس کے ہاتھ میں کسی ہتھیار کی جھلک نظر آئی تھی۔ میں چادر پھینک کر بے قدموں بھاگا۔ رحمت کیا کرنے جا رہا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ وہ چھوٹی سی منڈیر پر چڑھ کر ایک کھڑکی سے اندر جھانک رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا پستول والا ہاتھ بلند ہونے لگا۔ میں زندگی میں شاید کبھی اتنا تیز بھاگا ہوں گا جتنا اس روز بھاگا تھا۔ رحمت کے نزدیک جاتے ہی میں نے ہوا میں جست لگائی اور اسے لیتا ہوا زمین پر جا گرا۔ اسی لمحے اس نے فائر کر دیا تھا۔ جو کھڑکی کے شیشے پر لگا تھا۔ دوسرے فائر سے پہلے میں نے اس سے پستول چھین لیا تھا۔

''یہ کیا کیا پاگل آدمی؟'' میں نے اسے جھنجوڑا۔

''ہاں میں پاگل ہوں۔'' اس نے چلا کر کہا۔ ''میرے بیوی، بچے درندوں کی قید میں ہیں تم لوگ آرام سے بیٹھے گپیں مار رہے ہو۔''

اس دوران میں رات کے محافظ وہاں آ گئے تھے اور پھر کھڑکی سے راجا عمر دراز نمودار ہوا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''اس نے آپ پر فائر کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''اسے اندر لاؤ۔'' راجا عمر دراز نے محافظوں کو حکم دیا۔

میں بھی ان کے ساتھ اندر آیا۔ رحمت دیوانگی کے دورے سے باہر آ کر سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے راجا عمر دراز کے سامنے پیش کیا گیا۔ میں نے اسے تفصیل سے سارا واقعہ سنایا۔ اس نے رحمت کی طرف دیکھا۔

''تم نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کیوں کی؟''

''جناب انہوں نے میرے بیوی بچوں کو مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔'' رحمت گڑگڑایا۔

''کھل کر بات کرو۔'' راجا عمر دراز نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

''نہیں جناب۔'' وہ لرز گیا تھا۔ ''میں سچ سچ بتا دوں گا۔ کل مجھے شمشاد باہر لے گیا تھا وہ کوٹھی میں کام کرتا ہے اس نے میری دو آدمیوں سے ملاقات کرائی تھی۔ انہوں نے مجھے دھمکی دی اگر میں نے ان کے حکم پر عمل نہیں کیا تو میری بیوی اور بیٹی کو مار دیا جائے گا۔''

''شمشاد کو چیک کرو۔'' میں نے ایک محافظ سے کہا اور وہ باہر چلا گیا۔ ''تمہیں پستول کس نے دیا تھا؟'' میں نے رحمت سے پوچھا۔

''آج شام کو مجھے شمشاد نے باہر لے جا کر میری بیوی اور بیٹی کو دکھایا تھا وہ ایک کار میں تھیں مگر مجھے ان سے ملنے نہیں دیا تھا۔ واپسی پر شمشاد نے مجھے پستول اور حکم دیا کہ میں راجا صاحب کو قتل کر دوں۔ میں کیا کروں میں مجبور تھا۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا کہ وہ کن لوگوں کے کہنے میں آ کر یہ کام کرنے جا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا وہ کسی صورت میں اس کی بیوی اور بیٹی کو نہیں چھوڑیں گے۔ کم سے کم زندہ تو نہیں چھوڑیں گے۔ اس دوران میں محافظ نے آ کر بتایا۔

''شمشاد رات نو بجے سے کوٹھی سے نکلا ہوا ہے اور اب تک واپس نہیں آیا۔''

''شمشاد کیا کرتا ہے؟'' راجا عمر دراز نے پوچھا۔

''مالی کا نائب ہے۔'' محافظ نے بتایا۔

''مالی کو چیک کرو اور اسے پابند کرو کہ وہ باہر نہ جانے پائے۔'' راجا عمر دراز نے حکم دیا۔ ''اسے بھی لے جا کر بند کر دو اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔''

محافظ روتے بلکتے رحمت کو ساتھ لے گئے تھے میں ترس کھانے کے باوجود اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے راجا عمر دراز کی طرف دیکھا۔ ''جناب آپ نے اسے بیوی بیٹی چھوڑنے کو کہا تھا اور اس نے رحمت کو آلہ کار بنا لیا۔''

راجا عمر دراز کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ''ڈیوڈ شا کو دھوکا مہنگا پڑے گا۔''

''فی الحال تو آپ بال بال بچے ہیں......'' میں نے کہا تھا کہ باہر ایک شدید دھما کا سنائی دیا۔ میں اور راجا عمر دراز بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔

☆======☆======☆

راجا عمر دراز نے باہر جانا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ ''نہیں جناب آپ کا کھلی فضا میں جانا مناسب نہیں ہے۔ اپنے آدمیوں سے معلوم کریں۔''

بات راجا عمر دراز کی سمجھ میں آ گئی تھی، اس نے اپنے کارڈ لیس انٹرکام پر کسی سے رابطہ کیا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''میں اس کے پاس تھا اس لئے کارڈ لیس سے آنے والی آواز سن رہا تھا۔ کسی نے ہیجانی انداز میں کہا۔ ''جناب کسی نے مین گیٹ پر بم مارا ہے......ایک محافظ زخمی ہے......دوسرا اندر ہونے کی وجہ سے بچ گیا ہے۔''

''سب کو الرٹ کر دو۔'' راجا عمر دراز غرایا۔

اسی اثناء میں وسیم بھی اندر آ گیا تھا۔ اس کے زخم خاصی حد تک بھر چکے تھے اور وہ معمول کی حرکت کرتا تھا مگر ابھی تک اپنی ذمے داریاں نبھانے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ غالباً دھماکے نے اسے کمرے سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ''کیا ہوا ہے جناب عالی؟'' اس نے راجا عمر دراز سے پوچھا۔

''کسی نے مین گیٹ پر بم مارا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''ایک زخمی ہے، دوسرا اندر ہونے کی وجہ سے بچ گیا۔''

''وہ لوگ اب براہ راست حملوں پر اتر آئے ہیں۔'' وسیم نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''یہ جگہ غیر محفوظ ہے، سب کو دوسری جگہ منتقل ہو جانا چاہئے۔''

''کیا یہ مسئلے کا حل ہے؟'' راجا عمر دراز کے لہجے میں ناگواری تھی۔ ''یہ میرے وقار کا......''

''جناب، گستاخی معاف......ڈیوڈ شا جیسے مکار اور مرشد علی جیسے گھٹیا دشمن کے سامنے وقار کام نہیں آتا۔ مجھے رحمت کے حملے کا علم ہو چکا ہے۔ ڈیوڈ شا سے رابطہ غلطی تھی۔ اسے ہمارے ٹھکانے کا علم ہو گیا۔''

''وسیم درست کہہ رہا ہے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ ''افسوس مجھے خیال نہیں رہا کہ اب موبائل فون کا سراغ بھی لگایا جا سکتا ہے۔''

اسی لمحے شکیل اندر آیا تھا۔ اس نے وسیم کو رپورٹ دی۔ ''ایک کار سے راکٹ فائر کیا گیا ہے۔ مین گیٹ کا ستون تباہ ہو گیا اور اس کے پاس موجود گارڈ زخمی ہوا ہے تاہم اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

''اپنے سارے آدمیوں کو الرٹ کر دو۔'' وسیم نے کہا۔

اس دوران میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ دشمن نے ایسا بچگانہ قدم کیوں اٹھایا۔ چلتی کار سے راکٹ فائر کر کے کوٹھی کی چار دیواری کو ہی تباہ کر سکتا تھا۔ اندر والے محفوظ تھے۔ اچانک ایک بوکھلا دینے والا اندیشہ میرے ذہن میں آیا تھا۔ ''جناب......اتنے بڑے دھماکے کے بعد پولیس کا اس طرف آنا لازمی ہے اور نہ صرف میں بلکہ آپ اور اس کے ساتھی بھی پولیس کو مطلوب ہیں۔''

''شہباز صاحب درست کہہ رہے ہیں۔'' وسیم کے لہجے سے فکر مندی جھلکنے لگی تھی۔ ''ان کا یہاں ہونا او پولیس کا سامنا کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔''

''صرف شہباز کے لئے ہی نہیں تمہارے لئے بھی خطرہ ہے۔'' راجا عمردراز نے چند لمحے سوچنے کے بع فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ نکلو...... صرف چند افراد یہاں رکیں گے...... قادس بھی تمہارے ساتھ جائے گا شہباز کا علاج جاری رکھنا ضروری ہے۔''

راجا عمر دراز نے ہمیں جانے کا اشارہ کر کے کارڈ لیس پر بیگ کو طلب کیا تھا۔ میں، وسیم اور شکیل باہر گئے۔ ''میرا خیال ہے ندیم اور اس کے بیوی، بچوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔'' وسیم نے کہا۔ ''انہیں پولیس سے خط نہیں ہے۔''

''میں باہر جا کر مونا اور سفیر کو اٹھاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

شکیل مسکرایا۔ ''جناب اس وقت کوٹھی کا ہر فرد جاگ رہا ہے۔ دھما کا ہی ایسا تھا۔ مونا بی بی مجھ سے پو رہی تھیں۔''

مونا اور سفیر نہ صرف جاگ رہے تھے بلکہ یہاں سے نکل بھاگنے کے احکامات پر تبادلہ خیال بھی کر ر تھے۔ ''بس تیار ہو جاؤ......'' میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں نکلنا ہے اس سے پہلے کہ پولیس یہا آ جائے۔''

انہیں مختصراً راکٹ حملے اور اس کی پس پردہ وجہ سے آگاہ کر کے میں ندیم کے پاس آیا۔ وہ بھی بیوی بچو کے ساتھ جاگ رہا تھا۔ میری بات سن کر اس نے سر ہلایا۔ ''بالکل درست فیصلہ ہے اور مجھے ویسے بھی اکرم چٹ کے خلاف اغوا کی ایک ایف آئی آر اور کل عدالت میں ایک پٹیشن دائر کرانی ہے۔''

''مگر احتیاط کرنا...... بلکہ ایسا کر بھابی اور بچوں کو کچھ عرصے کے لئے کہیں بھیج دے۔''

''اچھا ہے اس بہانے ہی میکے جائے۔'' ندیم نے مسکرا کر بیوی کی طرف دیکھا تو وہ خفا ہو گئی۔

''میں کون سا آپ کے سر پر سوار رہتی ہوں!''

''سر پر نہیں...... اعصاب پر تو سوار رہتی ہو۔'' ندیم نے سرد آہ بھری اور بچوں کی طرف اشارہ کیا۔ نعمتیں اور رحمتیں اس کا ثبوت ہیں۔''

شازیہ جھینپ گئی تھیں ''آپ تو بس شروع ہو جاتے ہیں۔''

''میں چلتا ہوں...... ابھی یہاں سے نکلنا بھی ہے۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''میرے بارے میں واویلا مچا رکھنا اور کوشش کرنا مرشد علی اینڈ پارٹی کا نام منظر عام پر آ جائے لیکن رحمت یا اس کی بیوی اور بیٹی کی طرف غلط سے بھی اشارہ مت کرنا۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' ندیم نے سر ہلایا۔ ''لیکن رحمت خان نے حماقت کی ہے۔''

''مجبور آدمی ہے اس کے پاس بیوی اور بیٹی کے سوا ہے بھی کیا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے امید ہے راجا معاف کر دے گا۔''

''سفیر اور مونا وسیم کے ساتھ کوٹھی کی بڑی نشست گاہ میں تھے۔ وسیم نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''پولیس آ

والی ہے اس کے آنے سے پہلے ہمیں اپنے مخصوص اسلحے سمیت یہاں سے غائب ہو جانا ہے۔"

"نکلیں گے کیسے؟" میں نے پوچھا۔ "مرشد علی کے آدمی جب راکٹ فائر کر سکتے ہیں تو کوٹھی کی نگرانی بھی کر رہے ہوں گے۔"

"آپ فکر مت کریں، ہم ایک اور راستے سے نکلیں گے۔" وسیم نے کہا۔ "میرے آدمیوں نے کوٹھی کے عقبی حصے سے گزرنے والی ایک متروکہ سیوریج لائن دریافت کی ہے اس سے ذرا مشکل تو پیش آئے گی لیکن ہم بلاخوف وخطر گزر جائیں گے۔"

ہم کوٹھی سے باہر آئے تو وسیم کے آدمی راستہ کھول چکے تھے۔ مین ہول کا فولادی ڈھکن بظاہر کوٹھی کے سیوریج سسٹم کا ایک حصہ لگ رہا تھا وسیم اور شکیل جا رہے تھے، ان کے آدمیوں نے سامان کے بکس اٹھا رکھے تھے، وہ ایک ایک کر کے مین ہول میں اتر گئے۔ اسی اثنا میں ایک شخص رحمت خان کو لے آیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ جا رہا تھا۔ سب سے آخر میں، مَیں اترا اور اوپر سے ایک شخص نے ڈھکن لگا دیا تھا۔ مین ہول خشک اور صاف تھا ہلکی سی بو رچی ہوئی تھی۔ مگر یہ قابل برداشت تھی۔ چار فٹ قطر کے پائپ سے گزرنا مشکل نہیں تھا، بس ذرا سا سر جھکا کر سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ متروک لائن کا دوسرا سرا جنگل میں نکلا تھا۔ میرا خیال تھا، ہم نے اندر ہی اندر کوئی نصف کلومیٹر پیدل سفر کیا تھا۔ وسیم کے آدمیوں نے روشنی کا بھی معقول بندوبست کر رکھا تھا۔ اس لئے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ بس ذرا حبس کا احساس تھا، وہ بھی جنگل کی کھلی فضا میں نکل کر جاتا رہا۔ آکسیجن سے بھرپور نباتات سے ہلکی فضا میں سانس لے کر میں لمحوں میں تازہ دم ہو گیا تھا۔

سارا سامان ایک جگہ ڈھیر تھا اور وہیں مجھے حکیم قادس مع اپنے ساز و سامان کے نظر آیا تھا۔ وہ شاید سب سے پہلے آیا تھا۔ ہم سب کوئی پندرہ افراد تھے۔ وسیم اور شکیل ایک طرف کھڑے تھے میں...... ان کے پاس چلا آیا۔ "اب یہاں سے کہاں جانا ہے؟"

"ابھی گاڑیاں آ جائیں گی۔" وسیم نے بتایا۔ "مجھے شبہ ہے نہ صرف راجا صاحب کی کوٹھی کی بلکہ اس کے اردگرد کی سڑکوں کی بھی نگرانی کی جا رہی ہے۔ ہمیں نکلنے میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔"

"اس صورت میں مناسب ہوگا، اسلحہ تیار رکھا جائے۔" میں نے مشورہ دیا۔

شکیل عملی طور پر کمانڈر تھا، وہ اپنے ساتھیوں کو ہدایت دینے لگا۔ انہوں نے بکس کھول کر اس میں سے اسلحہ نکال لیا تھا۔ ان لوگوں نے روشنیاں گل کر دی تھیں اور چاند کی روشنی پر گزارہ کر رہے تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر سفیر اور مونا ایک طرف درخت کے سائے میں سرگوشیوں میں مگن تھے۔ اکتوبر کا آغاز تھا اور رات کو خاصی خنکی ہو جاتی تھی۔ کوئی نصف گھنٹے بعد شکیل کے موبائل پر کال آئی۔ "سب تیار ہو جائیں۔" اس نے کال سن کر کہا۔ "ہمیں سڑک تک چلنا ہے۔"

شکیل کی رہنمائی میں ہم سب چل پڑے تھے۔ ایک جگہ سڑک سے کچھ ہی دور شکیل ہمیں روک کر خود سڑک تک گیا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی جیپ، کار یا وین ہمیں لینے آئے گی لیکن جب دودھ کے ڈبوں سے لدا ایک کھڑکھڑاتا ٹرک سڑک کے کنارے رکا تو میں دنگ رہ گیا تھا۔ وسیم مسکرایا۔ "اس میں سفر کرنے پر بھلا کون شک کر سکتا ہے؟"

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس میں بیٹھیں گے کہاں؟'' میں نے ٹرک کا جائزہ لیا۔''یہ تو اوپر تک ڈبوں سے بھرا ہوا ہے۔''

''ابھی دیکھتے جائیں۔'' وسیم مسکرایا۔ شکیل ٹرک کے پاس گیا تھا، اس نے ڈرائیور سے کچھ کہا اور اس نے جانے کیا کیا کہ ٹرک کی ایک سائیڈ اوپر کی طرف کھلنے لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ حصہ اوپر اٹھتا چلا گیا تب پتا چلا کہ ٹرک پر رکھے جانے والے دودھ کے ڈبے صرف ایک دھوکا ہیں۔ ان کے عقب میں ایک اتنا بڑا خانہ تھا جس میں ہم سب مع سامان کے سما سکتے تھے۔ شکیل نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور سب بھاگ کر اس کھلے حصے میں گئے۔ ٹرک سڑک کے کنارے اس حالت میں کھڑا تھا کہ اس کا ایک حصہ کھل کر ہوا میں معلق تھا۔ کسی وقت بھی کوئی گاڑی آ سکتی تھی۔ خفیہ خانہ کھلنے کے ایک منٹ کے بعد ہم سب مع شکیل اس میں جا چکے تھے اور خانہ بند ہو گیا۔ ٹرک ایک گھڑ گھڑاہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہوا اور آگے روانہ ہو گیا۔ اندر روشنی تھی اور میں وسیم کے پاس بیٹھا تھا۔

''حیرت انگیز......تم نے محفوظ سفر کے لئے زبردست چیز بنا رکھی ہے۔''

''ہمیں ایسی چیزیں رکھنا پڑتی ہیں۔'' وسیم بولا۔''ان کے بغیر ہمارا کام نہیں چلتا ہے۔''

''اسی لمحے ٹرک رک گیا۔ شکیل نے اضطراب سے کہا۔''یہ کیوں رکا ہے؟''

اس نے اٹھ کر چھت کے پاس لگا ایک بٹن دبایا۔ یہ شاید کوئی مائیک سسٹم تھا کیونکہ فوراً ہی اندر ڈرائیور کی آواز گونجی تھی۔ وہ دیہاتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔''کی گل ہے سرکار......کیوں روکا ہے؟''

''اوئے ٹرک میں کیا ہے؟''

ڈرائیور ہنسا۔''کیوں مخول کرتے ہو سرکار......دودھ کے ٹرک میں کیا ہوگا......سبزی یا مرغی؟''

''بکواس نہ کر......'' بولنے والے نے ڈرائیور کو ایک فحش گالی دی تھی۔''جتنا پوچھا ہے اتنا بول۔''

''تو ناراض کیوں ہوتے ہو سرکار......بتایا ہے دودھ ہے۔''

''اس کی تلاشی لو......''

''نہ، تلاشی کیوں......تسی پولیس والے ہو؟''

ڈرائیور کو گالی دینے والے نے پولیس کی شان میں بھی گستاخی کی تھی۔''نیچے اتر......''

ڈرائیور نے مزاحمت کی اس پر انہوں نے اسے ٹرک سے اتار کر مارنا شروع کر دیا تھا۔ شکیل نے دانت پیسے۔''احمق ان سے الجھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ہماری آواز باہر جا رہی ہے؟'' میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

''نہیں لیکن اگر ہم چاہیں تو آواز باہر جا سکتی ہے۔'' شکیل نے کہا۔ وہ اور اس کے ساتھی متفکر نظر آنے لگے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ٹرک کو روکنے والے اور ڈرائیور کو زدوکوب کرنے والے ہمارے دشمن تھے۔ مجھے فکر تھی کہ اگر انہوں نے ڈرائیور کو بے ہوش کر دیا یا مار دیا یا پھر ساتھ لے گئے تو ہمارا کیا ہوگا۔

''ٹرک کا یہ خانہ اس جگہ سے کھولنے کا کوئی ذریعہ موجود ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بٹن کے دبانے سے یہ خانہ کھل جائے گا۔'' شکیل نے چھت پر لگے ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ڈرائیور اور ان لوگوں کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ شاید وہ اسے دور لے گئے تھے۔ ہم

ب سانس روکے انتظار کر رہے تھے۔ مونا نے سرگوشی میں سفیر سے پوچھا۔

''اب کیا ہوگا؟''

''وہی جو منظورِ خدا ہوگا۔'' فیسر نے روایتی جواب دیا، مونا اسے گھور کر رہ گئی۔

اس جگہ ہوا کی آمدورفت کا کوئی نظام تھا کیونکہ اتنے لوگ ہونے کے باوجود اندر گھٹن نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد شکیل نے اپنے آدمیوں کو تیار ہونے کو کہا۔ ''ہمیں باہر جانا ہوگا۔''

کیونکہ عملی طور پر اس وقت کمانڈر شکیل تھا، اس لئے وسیم نے اس کے کام میں مداخلت نہیں کی۔ البتہ اس کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شکیل کے فیصلے سے متفق نہیں تھا۔ شکیل اور اس کے دو ساتھی باہر جانے کے لئے تیار تھے۔ شکیل نے پہلے اندر کی روشنی بند کی اور پھر خانہ کھولنے والا بٹن دبایا تاکہ کھلنے والے خانے سے روشنی باہر نہ جا سکے۔ بٹن دبانے کے بعد بھی خاموشی رہی اور خانہ نہیں کھلا۔ شکیل نے اس بار روشنی کر کے بٹن دبایا۔ نتیجہ پہلے والا نکلا تھا۔ اس کے بعد وہ بار بار دباتا رہا۔

''خانہ نہیں کھلے گا۔'' اچانک وسیم نے اس سے کہا۔ ''اپنی توانائیاں ضائع مت کرو۔''

''کیوں؟'' شکیل نے پوچھا۔

''جب تک ٹرک کا انجن اسٹارٹ نہیں ہوگا، یہ سسٹم کام نہیں کرے گا۔''

شکیل کا منہ لٹک گیا تھا اور مونا نے خوف زدہ لہجے میں سرگوشی کی۔ ''میرے خدا! ہم اس جگہ قید ہو کر رہ گئے ہیں اگر کوئی مسئلہ ہو گیا تو کیا ہوگا؟''

اس کی بات زرا دیر سے میری سمجھ میں آئی تھی۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی تھی وہاں جان پر بنی تھی اسے فطری تقاضوں کی پڑی تھی۔ اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے اور کچھ دیر بعد باہر روشنی نمودار ہونے لگتی اس وقت یہ ٹرک لوگوں کی نظروں میں آ جاتا۔ بات پولیس تک جاتی تو ہمیں بازیاب ہونے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ وسیم کا ذہن بھی اسی نہج پر سوچ رہا تھا۔

''شہباز صاحب..... آپ کا پولیس سے بچنا لازمی ہے۔ راجا صاحب نے ہمیں یہ ذمے داری سونپی ہے۔''

''پولیس سے تو بچ جائیں گے پہلے اس قید خانے سے تو نکلیں۔''

''اس سے پہلے کبھی ایسا مسئلہ ہی نہیں ہوا۔'' شکیل نے کہا۔

''ہر مسئلہ کبھی نہ کبھی پہلی بار ہوتا ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

حکیم قادر اپنی زبان میں بڑبڑایا۔ اس کے نائب نے ترجمہ پیش کیا۔ ''حکیم صاحب فرما رہے ہیں، آپ کے ہاتھ کی مالش کا وقت ہو گیا ہے۔''

''اسے کھوفی الحال خاموش بیٹھے۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں شہباز صاحب، یہ ضروری ہے۔'' وسیم نے کہا۔ ''آپ مالش ضرور کروائیں۔''

ڈرائیور کو غائب ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا اور صورتِ حال سنگین تھی۔ اگر ڈرائیور کو لے جانے والے حقیقت سے واقف ہو چکے تھے تو جلد یا دیر ہم مرشد علی کے ہتھے چڑھنے والے تھے اور اگر انہوں نے حقیقت

جانے بغیر ڈرائیور کو مار دیا یا اپنے ساتھ لے گئے تھے تب بھی صورت حال کی سنگینی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہم بے بسی سے اس جگہ بند تھے۔ حکیم قادس نے میرے ہاتھ کی مالش شروع کر دی تھی۔ ساتھ ہی وہ معمول کے مطابق تقریریں بھی کر رہا تھا اور اس وقت اس کی یہ تقریر مجھ پر گراں گزر رہی تھی۔ تنگ آ کر میں نے خادم سے کہا۔ ''حکیم سے کہو چپ رہے، ممکن ہے دشمن اس وقت اس کی آواز سن لیں اور ہم سب مارے جائیں۔''

نائب کی بات سن کر حکیم قادس کی زبان کو فوری طور پر بریک لگی تھی اور میرے ساتھ دوسروں نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ''اس جگہ سے نکلنے کا کوئی اور طریقہ ہے؟''

''بہت مشکل ہے۔ اس خانے کو خصوصی طور پر بلٹ پروف فولادی چادر سے بنایا گیا ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں اسے توڑنا تقریباً ناممکن ہے۔''

''گویا ہم اپنے بنائے ہوئے دان میں خود قید ہو کر رہ گئے ہیں۔''

''آئی ایم سوری۔''

''ارے نہیں...... میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں ہے۔'' میں نے وسیم کو تسلی دی۔ ''ظاہر ہے یہ سب اتفاق سے ہوا ہے۔''

بظاہر تو میں خوش مزاجی دکھا رہا تھا لیکن اندر سے متفکر ہو چکا تھا کہ اگر ڈرائیور یا کوئی اور نہیں آیا تو ہمارا کیا ہو گا۔ امکان یہی تھا کہ پولیس اسٹیشن میں شایان شان استقبال ہو گا۔ اس دوران میں شکیل اپنے آلات مواصلات آزما رہا تھا۔ ریڈیو بے کار تھا کیونکہ اس کے پاس ایف ایم موڈ پر کام کرنے والے ریڈیو تھے اور موبائل فون کے سگنل اس خانے میں اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ ان سے کام لینا مشکل تھا۔ دو دفعہ شکیل نے کسی سے رابطے کی کوشش کی اور ناکام رہا تھا سب کے چہروں پر سوالیہ نشان بنا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ میں نے اچانک قہقہہ لگایا تو سب نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ مونا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''شوبی تم ٹھیک ہو؟''

''الحمدللہ۔'' میں نے ایک دم سنجیدہ ہو کر اور اسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ مزید ڈر گئی تھی۔ وہ جلدی سے سفیر کے پاس کھسک گئی اور جا کر بہ آواز بلند سرگوشی کی۔

''میں کہتی تھی ناں، یہ حکیم کا بچہ کچھ گڑبڑ کرے گا۔''

وسیم میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے شہباز صاحب۔''

''یار خیال ذرا ایسا آیا تھا اگر کوئی ٹرک چرا کر لے جائے تو ہماری بھی کتی ہو سکتی ہے۔''

بات وسیم کی سمجھ میں آئی تو اس نے بھی قہقہہ لگایا تھا۔ ''خیال تو واقعی انوکھا ہے۔ سب مل کر کسی چور کے لئے دعا کرتے ہیں۔''

مونا نے مجھے گھورا۔ ''تم نے ڈرا دیا تھا۔''

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ حکیم قادس مالش مکمل کر کے اپنی جگہ چلا گیا تھا۔ ''حالانکہ بی بی تمہیں ایک فرد سے ڈرنا چاہئے جو مستقبل میں تمہارا......''

''بس شروع ہو گئے۔'' مونا نے جھینپ کر کہا اور سفیر نے دانت نکال دیئے تھے۔

''ڈرنا تو مجھے چاہئے۔''سفیر نے بے چارگی سے اداکاری کی۔

''وسیم صاحب۔''اس بار مونا جھنجلا گئی تھی۔''ان دونوں کو چپ کرائیں یا کسی طرح خانہ کھولیں میں باہر جاؤں گی۔''

''فی الحال دونوں کام میرے بس سے باہر ہیں۔''وسیم مسکرایا۔

باتوں اور ہنسی مذاق سے ماحول کی کشیدگی کم ہوئی تھی۔ چھ بجنے والے تھے اور باہر یقینی طور پر روشنی ہو چکی تھی، ابھی سورج نکلنے میں ذرا وقت تھا۔ کئی گاڑیاں گزرنے کی آواز آ چکی تھی لیکن کوئی ٹرک کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ شکیل اور اس کے ساتھی موبائلوں سے الجھے ہوئے تھے ان کی کوشش تھی کہ کسی طرح ایس ایم ایس ہی چلا جائے۔

''میں نے سنا ہے موبائل کی لہریں بالکل بند جگہوں سے بھی گزر جاتی ہیں۔''میں نے کہا۔

''ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوہے کے ڈبے میں بند ہیں اور یہ دھات مقناطیسی میدان کو متاثر کرتی ہے۔ اس وجہ سے سگنل صحیح سے کام نہیں کرتے ہیں۔''شکیل نے وضاحت کی۔

اسی لمحے مائیک سسٹم پر ٹرک کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ہم سب چوکنا ہو گئے تھے۔ شکیل کے ساتھیوں نے بے اختیار ہتھیار سنبھال لئے تھے۔ پھر کسی کی آواز آئی۔''رشید یار ٹرک تو خالی ہے۔''

''اوئے خانے کی تلاشی لے۔''رشید نے کہا۔''ممکن ہے مال پانی مل جائے۔''

''اچھے لگتے ہیں۔''وسیم نے کہا۔

''یار اس میں تو چابی بھی لگی ہے۔''دوسرے کی آواز آئی۔''پھر اس نے خانے میں ہاتھ مارا۔''اوئے اس میں اسلحہ ہے۔ پستول اور اس کی گولیاں...... پیسا نہیں ہے۔''

رشید نے پستول کا معائنہ کیا تھا۔''سراجے...... پستول ہی قیمتی لگتا ہے۔ اس کے دس پندرہ مل جائیں گے۔ اب نکل جا......''

شکیل نے اوپر لگا ایک بٹن دبایا اور بولا۔''سنو ہم ٹرک کے پچھلے حصے میں قید ہیں...... ہمیں رہا کراؤ...... ہم تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔''

''یہ آواز کدھر سے آئی ہے۔''سراجے کی خوف زدہ آواز آئی۔

''ہم ٹرک کے پچھلے حصے میں ہیں۔''اس بار میں نے کہا۔''دو لاکھ روپے تو اب بھی ہمارے پاس ہیں۔ اس کے علاوہ جتنے چاہو مل جائیں گے۔''

''بھاگ چل...... مجھے تو یہ آسیب لگ رہے ہیں۔''سراجے نے کہا۔

''چپ کر۔''رشید نے اسے جھڑکا۔''کیا سچ مچ تمہارے پاس دو لاکھ روپے ہیں؟''

''ہاں، اگر ہم نے جھوٹ بولا تو تم گولی مار دینا تمہارے پاس اب پستول بھی ہے۔''

''بکواس کرتے ہیں۔''سراجے کی مدھم آواز آئی۔''ادھر صرف دودھ کے ڈرم ہیں۔''

''یار ڈبوں کے پیچھے ایک خانہ ہے۔ ہم اس میں قید ہیں۔ یقین نہیں آتا تو ٹرک اسٹارٹ کر کے دیکھ لو۔''

''رشیدے بھاگ چل، اس معاملے میں نہ پڑ۔''سراجے جس کا نام یقیناً سراج تھا، بولا۔''ایسا نہ ہو

پولیس آ جائے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"بکواس بند کر، بزدل!" رشید نے اسے جھڑک دیا اور ٹرک اسٹارٹ کرنے لگا۔ چابی گھومتے ہی انجن حرکت میں آ چکا تھا۔ میں نے شکیل کو اشارہ کیا اور وہ اس سے پہلے ہی حرکت میں آ چکا تھا۔ اس نے پھرتی سے خانہ کھولنے والا بٹن دبا دیا اور ہلکی سی گونج کے ساتھ خانہ کھلنے لگا۔ جیسے ہی اس کا پٹ اتنا اوپر اٹھا کہ اس میں سے اوپر نکلا جا سکے تو شکیل کے دو ساتھی جمپ کر کے باہر نکل گئے اور انہوں نے ایک منٹ سے بھی پہلے دونوں اچکوں پر قابو پا لیا تھا۔ خفیہ خانہ پوری طرح کھلا تو میں اور شکیل بھی باہر نکل آئے اور وسیم نے اٹھ کر بٹن دوبارہ دبا کر خانہ بند کر دیا۔

دونوں اچکے ٹرک کی آڑ میں زمین پر اوندھے منہ لیٹے تھے اور شکیل کے ساتھی ان کے سروں پر مسلط تھے۔ دور دور تک نہ تو کوئی گاڑی تھی اور نہ ہی کوئی فرد تھا۔ میں نے جھک کر ان سے پوچھا۔ "کون ہو تم دونوں؟"

"جی ہم بے قصور ہیں۔" سراج گھگھیایا میں نے اسے آواز سے شناخت کیا تھا۔

"بکومت، تم نے کب ٹرک دیکھا تھا؟"

"جی ہم علاقے کے چوکیدار ہیں...... صبح سے دوسری بار دیکھا تھا۔" سراج نے رو دینے والے انداز میں کہا تھا۔ "میں نے اس حرامی کو منع بھی کیا تھا کہ اس چکر میں مت پڑ مگر یہ سنتا کہاں ہے۔"

"ان کی تلاشی لو اور کھڑا کر دو...... اس طرح تماشا بن جائے گا۔" میں نے ان دونوں سے کہا۔ شکیل اس دوران میں ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک میں نے اسے جھاڑیوں میں جاتے دیکھا اس کا انداز یوں تھا جیسے اسے کوئی خاص شے نظر آئی ہو۔ میں اس کی طرف لپکا۔ وہ جھاڑیوں میں پڑے ڈرائیور کو دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا جیسے ڈرائیور کی لاش ہو لیکن شکیل نے بتایا۔ "زندہ ہے مگر حالت اچھی نہیں ہے اسے فوری طور پر اسپتال لے جانا ہے۔"

شکیل موبائل نکال کر کسی کو کال کرنے لگا، میں واپس آیا اور پستول نکالتے ہوئے دونوں نگرانوں سے کہا۔ "جھاڑیوں میں ڈرائیور بے ہوش پڑا ہے اسے جا کر نکال آؤ۔"

وسیم اندر ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے خانہ کھول دیا۔ جتنی دیر میں وہ ڈرائیور کو لے کر آئے خانہ کھل چکا تھا۔ ایک نے ڈرائیور کی قمیص اتار کر پہن لی اور ڈرائیونگ سیٹ پر چلا گیا۔ شکیل نے واپس آ کر ایک مخصوص جگہ کے بارے میں بتایا۔ "وہاں ٹرک روکنا ڈرائیور کو اسپتال لے جانے کے لئے گاڑی آئے گی۔ ان دونوں کو اندر بٹھاؤ۔" اس نے اچکوں کے بارے میں حکم دیا۔

احتیاطاً شکیل خود بھی ڈرائیور کے پاس چلا گیا تھا۔ ٹرک روانہ ہو گیا۔ حکیم قادس بے ہوش ڈرائیور کو دیکھ رہا تھا اس نے تشویش سے سر ہلایا اور جلدی سے اپنا چرمی بیگ کھول کر اس میں سے ایک ڈبیا برآمد کی اور اس سے مرہم نما شے نکال کر ڈرائیور کے سر پر آنے والے نیلگوں ابھار پر مالش کرنے لگا۔ ڈرائیور کو زبردستی لے جانے والوں نے اس کے سر پر کسی سخت شے کا وار کر کے اسے بے ہوش کر دیا تھا اور جب اسے ٹرک میں ڈالا گیا تو اس کی سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ یہی حال اس کی دل کی دھڑکن کا تھا۔ ہم سب خاموشی سے حکیم قادس کو مصروف عمل دیکھ رہے تھے۔ چوٹ ڈرائیور کے سر کے بائیں طرف اور آنکھ کے درمیان ذرا اوپر بالوں میں لگی تھی اور یہ

حصہ خاصا متورم تھا لیکن جب حکیم قادس نے اسے مرہم لگایا تو متورم حصہ چند سیکنڈ بعد پھولنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے سر اس جگہ سے کوئی تین انچ پھول چکا تھا۔ حکیم قادس نے مرہم والی ڈبیا رکھی اور اب اپنے بیگ سے ایک تیز دھار آلہ نکالا۔ یہ کوئی سرجری کا اوزار لگ رہا تھا۔ حکیم قادس یہ اوزار لے کر ڈرائیور کی طرف جھکا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟'' وسیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

حکیم قادس نے بے حد ناگواری سے کچھ کہا نائب نے اس کا ترجمہ پیش کیا۔ ''حکیم صاحب فرما رہے ہیں اگر زخمی کی جان بچانی ہے تو ان کے کام میں دخل نہ دیا جائے۔''

''وسیم اسے کرنے دو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اپنے کام کا ماہر ہے امید ہے ڈرائیور کے لئے بہتر کرے گا۔''

بادل نخواستہ وسیم نے حکیم قادس کا ہاتھ چھوڑ دیا جو کچھ دیر تک وسیم کو گھورتا رہا تھا پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے بے ہوش ڈرائیور کے پھول جانے والے مضروب حصے پر نشتر سے چیرا لگایا فوراً ہی خون کا فوارہ سا بلند ہوا تھا اور حکیم قادس کی زرتار قبا مزید رنگین کر گیا تھا لیکن وہ پروا کئے بغیر اپنا کام کرتا رہا اس نے متورم حصے کو ایک چیرا اور لگایا اور اس بار بھی خون کا فوارہ بلند ہوا تھا۔ وسیم مضطرب ہو گیا تھا۔

''اسے روکو...... کیا یہ اس کا سارا خون بہا دے گا؟''

''اسے کام کرنے دو۔'' اس بار میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ میں دیکھ رہا تھا اصل میں خون اتنا زیادہ نہیں نکلا تھا لیکن فوارے کی طرح ابلنے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت زیادہ خون نکل رہا ہو۔ دوسری بات میں نے نوٹ کی تھی خون رواں ہوتے ہی ڈرائیور کی رکی سانس تواتر کے ساتھ آنے لگی تھی۔ میں نے نبض دیکھی۔ اس میں بھی باقاعدگی آتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد حکیم قادس نے تیسرا چیرا لگایا اور اس بار بھی خون فوارے کی طرح نکلا تھا۔ فرش پر بھی خاصا خون پھیل گیا تھا۔ ڈرائیور کی کنپٹی کا ورم خاصی حد تک کم ہو گیا تھا۔ خون رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے پانچ منٹ بعد بالکل بند ہو گیا تھا۔ حکیم قادس نے ایک صاف موٹے سوتی کپڑے سے اس کے زخم صاف کئے اور ان پر فائنل ٹچ کے طور پر ایک راکھ نما سفوف چھڑک دیا۔ عام طور سے وہ دوران علاج تقریر کیا کرتا تھا۔ اس بار تقریر اس نے کام مکمل کرنے کے بعد کی تھی۔ نائب کے ترجمے کے مطابق ڈرائیور کے سر پر لگنے والی ضرب کی وجہ سے اندرونی جریان خون شروع ہو گیا تھا اور اگر حکیم صاحب اس کا بروقت علاج نہ کرتے تو وہ ہلاک بھی ہو سکتا تھا اور عمر بھر کے لئے آنکھ، کان، یا جسم کے کسی اور حصے سے معذور بھی ہو سکتا تھا۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔

''حیرت انگیز بات ہے۔'' میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ''جو بات سمجھنے کے لئے ڈاکٹر سی ٹی اسکین کا سہارا لیتے ہیں، وہ اس نے بغیر کسی اسکین کے جان لی اور بغیر آپریشن اس کا علاج بھی کر دیا۔''

وسیم نے سر ہلایا۔ ''یہ شخص مجھے ہمیشہ حیران کرتا ہے۔''

میں ہنسا۔ ''اس کے باوجود تم اس کے بارے میں مشکوک رہتے ہو۔ میں نے سنا ہے جب تمہیں زخمی حالت میں لایا گیا تھا تو تم نے حکیم قادس سے علاج کرانے سے انکار کر دیا تھا۔''

''ہاں کیونکہ میں اس قسم کے علاج کا قائل نہیں ہوں۔ اتنی تیزی سے اور ناقابل علاج قسم کے مسئلوں میں شفایابی کا کچھ نہ کچھ سائیڈ افیکٹ تو ہوتا۔''

''یار اس نے میرے ہاتھ کا علاج کر کے اسے بچا لیا ہے، اس کے بدلے میں کوئی بھی سائیڈ ایفیکٹ بھگتنے کو تیار ہوں۔''

ٹرک کی رفتار سست ہوئی اور پھر وہ رک گیا۔ شکیل کی آواز آئی۔ ''خانہ کھول دیں ڈرائیور کو اسپتال لے جانے والی گاڑی آ گئی ہے۔''

ٹرک کے پاس ایک وین کھڑی تھی۔ خفیہ خانہ کھلتے ہی دو افراد نے آ کر پھرتی سے بے ہوش ڈرائیور کو وین میں ڈالا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ سراجے اور رشید نے گڑ گڑا کر کہا۔ ''سانوں وی جان دو بادشاہو۔''

''چپ کر کے بیٹھو۔'' میں نے انہیں گھورا۔ ''ابھی تمہارا حساب کتاب بھی کرنا ہے۔''

مزید پندرہ منٹ کے سفر کے بعد ٹرک کی رفتار کم ہوئی تھی اور پھر وہ رک گیا۔ اس بار خانہ ٹرک کے ڈرائیونگ کمپارٹمنٹ میں موجود میکنزم سے کھولا گیا تھا۔ یہ ایک مناسب سائز کے احاطے والی کوٹھی تھی۔ عمارت درمیانے سائز کی اور سادہ تھی۔ جو درختوں اور پھولدار پودوں سے گھری ہوئی تھی۔ پاس ہی مجھے پہاڑوں کی جھلک نظر آئی تھی یعنی ہم مارگلہ ہلز کے قرب و جوار میں تھے۔ سب سے پہلے سراج اور رشید کو اندر لے جایا گیا تھا کہ وہ کوٹھی کے محل وقوع سے واقفیت حاصل نہ کر سکیں۔ مونا اور سفیر اردگرد دیکھ رہے تھے۔ مونا نے کہا۔ ''یہ پہاڑیاں جانی پہچانی لگ رہی ہیں۔ شاید یہاں کبھی ہم پکنک کے لئے آئے تھے۔''

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' میں نے وسیم سے پوچھا۔

''ہمارا ایک ٹھکانا ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''ایسا کریں...... اندر چلیں...... کچھ کھا پی کر آرام کریں...... گزشتہ رات تو بے آرام گزر گئی۔''

ہم کوٹھی کے اندر آئے۔ اندر سے یہ خاصی پُرتعیش تھی۔ کئی ملازم نظر آ رہے تھے۔ ہمارے پہنچنے کے پندرہ منٹ بعد بڑے سے ڈائننگ ہال میں ناشتا لگا دیا گیا تھا۔ ہم لوگ منہ ہاتھ دھو کر آ گئے مجھے زبردست بھوک لگ رہی تھی۔ اس لئے ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔ لیپ ختم ہو چکا تھا لیکن اس کے بھوک والے اثرات اب بھی باقی تھے۔ ناشتے کے بعد حکیم کا نائب میرے لئے جڑی بوٹیوں والا گرم پانی لایا جس میں ہاتھ ڈال کر مجھے سکائی کرنا تھی۔ میرا ہاتھ بظاہر پوری طرح بحال ہو چکا تھا۔ مگر کبھی کبھی بے جان سا ہو جاتا تھا یا اس کی محسوس کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی تھی۔ حالات ایسے چل رہے تھے کہ علاج میں وقفہ آ جاتا تھا اور حکیم قادر پہلے ہی واویلا مچا چکا تھا کہ اس طرح میرا ہاتھ متاثر ہو سکتا تھا۔ مجھے نیند آ رہی تھی لیکن اس سے پہلے میں جاننا چاہتا تھا کہ پولیس نے رات کیا کارروائی کی تھی۔ میں نے وسیم سے اس کا موبائل لے لیا اور ندیم سے رابطہ کیا۔ ''رات کیا صورتِ حال رہی؟''

''پولیس آئی تھی اور مزے کی بات ہے وہ نطفہ ناتحقیق اکرم چشتی پولیس پارٹی کے ساتھ تھا۔ میں نے اعتراض کیا وہ معطل تھا تو کس حیثیت سے پولیس پارٹی کے ساتھ تھا۔ اس نے ڈھٹائی دکھائی اور مجھے دبی زبان میں دھمکیاں دینے لگا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد اس کے موبائل پر کسی کی کال آئی اور وہ نو دو گیارہ ہو گیا۔ میرا خیال ہے راجانے اوپر بات کی تھی۔ بہر حال پولیس کا رویہ شریفانہ تھا اور وہ نامعلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر لکھ کر لے گئی۔''

راجانے مرشد یا کسی اور کا نام نہیں لیا۔'' مجھے کسی قدر مایوسی ہو گئی۔

"نہیں اور میرے خیال میں ٹھیک کیا...... اس طرح معاملات الجھتے چلے جائیں گے۔"

"میرے خیال میں تو یہ مرشد علی کے خلاف دباؤ بڑھانے کا سنہری موقع تھا۔"

"تو نہیں سمجھے گا اس طرح راجا صاحب ایک فریق بن جائیں گے اور تیری کھل کر مدد نہیں کر سکیں گے۔"

"تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"فی الحال تو یہیں رکنے کا ہے، عیش ہیں۔ بیوی بھی خوش ہے کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا تینوں ٹائم پکا پکایا مل جاتا ہے۔ بچے بھی زیادہ تر ملازموں کے ساتھ لگے رہتے ہیں اور پھر میں بھی اس کے قبضے میں ہوں۔ ایک عورت کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔"

"عورت نہیں بیوی کو۔" میں ہنسا۔ "مزے کر۔"

ایک شخص نے مجھے کمرا دکھایا تھا۔ مہمان خانہ کوٹھی سے الگ ایک چھوٹی سی عمارت میں تھا۔ ابھی میں لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر بادل نخواستہ پکارا۔ "آ جاؤ۔"

مونا اور سفیر اندر آئے تھے اور ان کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ وہ خاصی سنجیدہ قسم کی گفتگو کر کے آئے تھے۔ "جی فرمائیے...... کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

سفیر نے مونا کی طرف دیکھا تھا اور پھر سرد لہجے میں پوچھا۔ "یار شوبی یہ معاملہ کب تک چلے گا؟"

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "سب کچھ تمہارے سامنے ہے، میں حالات کے سامنے قطعی بے بس ہوں۔"

"یار میری بات کا غلط مطلب نہ لے۔" سفیر نے کہا۔ "لیکن یہ تو سوچ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوگا ہم کب تک ان سے لڑتے اور بھاگتے رہیں گے۔"

"تب بہتر ہوگا ہم مرشد علی کے سامنے حاضر ہو کر سر تسلیم خم کر لیں گے جو اس کے مزاج میں آئے ہم سے سلوک کرے، اس کی آتش انتقام کسی طریقے ٹھنڈی پڑ جائے تو مسئلہ بخوبی حل ہو جائے گا۔" میرے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے...... مگر تمہارے معاملات پھیلتے جا رہے ہیں اور ہم غیر ضروری طور پر دوسروں کے پھیلائے مسئلوں میں الجھتے جا رہے ہیں جیسے راجا عمر دراز...... کیا ضروری ہے کہ ہم تصویر کی بازیابی کے لئے اس کا ساتھ دیں۔"

"قطعی ضروری نہیں ہے۔"

"تب ہمیں اپنی راہ الگ رکھنی چاہئے۔"

"ضرور......" میں نے تسلیم کیا۔ "اب تم بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"کیا کرنا چاہئے؟" سفیر نے احمقانہ انداز میں مونا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اگر ہم راجا اور اس کی پارٹی سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں تو ہمیں لائحہ عمل بھی سوچنا ہوگا۔ ہم کہاں جائیں گے اور مرشد علی کے خلاف دفاع کے لئے کیا تدبیر کریں گے، نیز ہمارا وکیل ندیم احمد بھٹی اپنے بیوی بچوں کو لے کر اپنے مکان پر جانے پر مجبور ہوگا، اس کی حفاظت کون کرے گا؟"

''یہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔'' مونا نے سادگی سے کہا۔
''میں نے گہری سانس لی۔'' تو میرا اندازہ درست تھا بی بی۔ سفیر سے مجھے اس قسم کی احمقانہ بات کی توقع نہیں تھی۔''
مونا خفا ہو گئی۔ ''میں احمقانہ باتیں کرتی ہوں۔''
''اب سوچے سمجھے بغیر اس قسم کی بات کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ تمہیں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ بیٹھے بٹھائے اتنے طاقتور محافظ مل گئے جو ہماری خاطر مرشد علی جیسے شخص سے ٹکرا سکتے ہیں اور اسے ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو خدا ہی جانتا ہے ہمارا کیا حشر ہوتا۔''
''مگر یہ مسئلہ جلد حل ہوتا نظر نہیں آ رہا۔'' سفیر فکرمندی سے بولا۔ ''میرے تو گھر والوں کو بھی نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں اور کیا کرتا پھر رہا ہوں؟''
''میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔'' سفیر ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے، تو مونا کو لے کر اپنے گاؤں چلا جا۔ میں نے سنا ہے اپنے علاقے میں کوئی تم لوگوں کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کر سکتا...... تم اور مونا وہاں محفوظ ہو گے۔''
''میں نہیں صرف مونا۔'' سفیر نے جواب دیا۔ ''میں تیرا ساتھ کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا...... مونا کو گھر پہنچا کر آ جاؤں گا۔''
''سوری میں بھی شوبی اور تمہارے ساتھ رہوں گی۔'' مونا نے صاف انکار کر دیا تھا۔
میں ہنسا۔ ''پرنالہ وہیں رہا۔''
سفیر سنجیدہ ہو گیا۔ ''اس کی بات پر توجہ نہ دے...... اسے میں چھوڑ آؤں گا۔''
''مسٹر سفیر شاہان صاحب۔'' مونا نے چمک کر کہا۔ ''تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے میں کوئی بھیڑ، بکری نہیں ہوں جسے تم اپنے باڑے میں باندھ آؤ گے۔''
''مونا کے ساتھ تمہارا جانا ضروری ہے۔'' میں نے سفیر سے کہا۔ ''میں اکیلا بہتر طور پر مرشد علی اور ڈیوڈ شا کا سامنا کر سکتا ہوں۔''
سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ صرف تیرا نہیں بلکہ میرا اور مونا کا بھی معاملہ ہے اس لئے ہم تیرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔''
''ہاں، جو بھی گزرے گی، سب پر اکٹھے گزرے گی۔'' مونا اکڑ کر بولی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔
''اچھا بی بی مونا...... لیکن شکوے شکایت بھی مت کرنا۔'' میں نے کہا اور سفیر کو آنکھ سے اشارہ کیا وہ سمجھ گیا۔
''چلو مونا، شوبی کو سونے دو...... یہ تھکا ہوا ہے۔''
''ہاں...... ہاں...... تو میں نے کب روکا ہوا ہے؟'' وہ بے پروائی سے بولی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا۔ سفیر نے اس سے ریموٹ چھین لیا۔ ''مطلب یہ کہ یہاں سے کھسکو۔''
بادلِ نخواستہ مونا وہاں سے روانہ ہوئی تھی، ان کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ کر حالات پر غور کرنے

لگا۔ اگر چہ اب ہم آزاد تھے اور فی الحال پولیس کی پہنچ سے دور تھے۔ مگر حالات سدھرتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ مرشد علی کا پلا اس لحاظ سے بھاری تھا کہ وہ نقل و حرکت کرنے کے لئے آزاد تھا اور اسے اپنے مربی کے لئے وہ تصویر حاصل کر کے اس کی نظروں میں سرخرو ہونا تھا۔ اسے اعلیٰ سرکاری حلقوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس لحاظ سے وہ مجھ پر حاوی تھا لیکن اس کی زد میں آئے بغیر میں اس سے کمزور نہیں تھا۔ میری پشت پر راجا عمر دراز کی مضبوط شخصیت تھی۔ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا کہ وسیم کی ہمدرد حمایت مجھے کب تک حاصل رہے گی؟ لیکن ایک بات یقینی تھی کہ مشکل حالات میں یہ کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور توقع کے مطابق سفیر اندر آیا تھا۔ ''بڑی مشکل سے پیچھا چھڑا کر آیا ہوں۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''بیٹے! مجھے تیرا مستقبل جیل کے قیدی سے مختلف نظر نہیں آ رہا ہے۔ شادی تیرے لئے عمر قید کا آغاز ہو گی۔''

''کاش یہ سزا جلد ہو جائے۔'' اس نے سرد آہ بھری۔

میں اچک کر بیٹھ گیا۔ ''دیکھ یار، اب مونا کی ملازمت ختم سمجھ اور میں نہیں سمجھتا کہ شادی کے بعد وہ ملازمت کرے یا تم اس کی اجازت دو...... تو بہتر ہے تم اور مونا شادی کر کے باہر چلے جاؤ۔''

''میں اپنا ملک اور اپنی زمین نہیں چھوڑ سکتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''یار کہنے کو تو کراچی دور اور بڑا شہر ہے...... لیکن اتنا ہی غیر محفوظ بھی ہے...... مرشد علی جیسے لوگوں کے لئے وہ جگہ دور نہیں ہے۔''

''اسے بعد میں دیکھیں گے۔'' سفیر ٹالنے والے انداز میں بولا۔ ''فی الحال میں چاہتا ہوں مونا کو اپنی حویلی میں پہنچا دو...... وہاں وہ محفوظ رہے گی۔''

''ہاں لیکن وہ تیرے بغیر نہیں جائے گی اس لئے......''

''میں نہیں جاؤں گا۔'' سفیر نے میری بات کاٹی۔ ''یہ بات تو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لے۔''

''چل ٹھیک ہے......''

''لیکن مونا کو کیسے حویلی جانے پر رضامند کروں؟''

''ترکیب نمبر بارہ۔'' میں نے کہا۔ ''پہنچا دے اور پھر وہاں سے نو اور دو گیارہ ہو جا...... تیرے ساتھ وہ آسانی سے چلی جائے گی۔''

''یعنی اسے دھوکا دے کر لے جاؤں اور دھوکا دے کر بھاگ آؤں۔ اس کے بعد جانتا ہے مونا میرے ساتھ کیا کرے گی؟''

''تو اسے مستقبل کی شوہرانہ زندگی کی ریہرسل سمجھ کر قبول کر لینا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''مگر ابھی اسے اس سین سے ہٹانا ضروری ہے۔ اس سارے معاملے میں وہ ایک غیر ضروری ہستی ہے۔ اس کی موجودگی ہمیں مدد نہیں دیتی بلکہ پرابلم کرتی ہے۔''

''ہاں......'' سفیر بولا۔ ''میں نے وسیم سے بات کی ہے...... امید ہے ہم کل صبح روانہ ہو جائیں گے۔''

''وش یو گڈ لک......'' میں دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ ''میری بات پر غور کرنا...... اگر تو بھی چند دن اس

کشیدہ ماحول سے باہر گزار لے تو......"

"فوری واپسی تو ممکن نہیں ہوگی۔" اس نے میری بات کاٹی۔ "چھ مہینے سے حویلی نہیں گیا لیکن میں پندرہ دن سے زیادہ نہیں رکوں گا۔"

"ٹھیک ہے یار...... ابھی میرے ہاتھ کا علاج بھی جاری ہے۔ میں ندیم سے بات کر کے اپنے پولیس کے معاملات سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں...... باقی مرشد علی کتے کی دم ہے...... جب اس کی کوئی مجبوری ہوگی تب وہ ہمارے آگے جھکے گا یا سمجھوتا کرے گا۔"

"اور جب اس کی مجبوری ختم ہو جائے گی تو دوبارہ اپنی خباثت پر لوٹ جائے گا۔" سفیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب تُو سو جا...... تیری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔"

حکیم قادس نے اگرچہ اب مجھے گولیاں دینی بند کر دی تھیں۔ بکری کی مینگنی کے ہم رنگ، ہم وزن اور ہم بو جیسی ان گولیوں نے مجھ پر حیرت انگیز اثر کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میں اعصابی طور پر پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا تھا اور غیر متوقع حالات کا بھی مجھ پر زیادہ اثر نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے میں اب بھی سونے جاگنے والے معمولات پر حاوی تھا۔ اس وقت بھی میں نے چند گھنٹے کی پُرسکون نیند سونے کے بارے میں سوچا اور چند سیکنڈ میں سو چکا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو شام قریب تھی اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے انٹر کام پر کچن میں رابطہ کیا۔ تیسری کوشش میں میرا رابطہ ہو گیا۔

"کھانے میں کیا ہے؟"

"جو چاہیں سر۔"

"جو بھی پندرہ منٹ میں دو چائے کے ساتھ مل سکتا ہے لے کر مہمان خانے میں آ جاؤ۔" میں نے کہا اور اٹھ کر باتھ روم کا رخ کیا۔ نہا دھو کر میں نے پرانے کپڑے پہنے...... میرے پاس فی الحال یہی لباس تھا۔ جب میں باہر آیا تو ایک نوجوان لڑکا ٹرالی میں کھانے کا سامان چائے سمیت لا چکا تھا۔ سینڈوچز تھے، چکن رولز اور پیٹس تھے۔ گھر کے بنے سموسے تھے اور ساتھ میں رس ملائی تھی۔ میں نے سب کے ساتھ انصاف کیا آخر میں چائے کا کپ بنا کر پہلے سفیر کے کمرے میں جھانکا۔ وہ خالی تھا۔ مونا بھی اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ وہ دونوں باغ میں تھے۔ خوشگوار خنک ہوا چل رہی تھی اور آسمان پر سفید بادل تھے۔ خاصا رومانٹک موسم تھا اور ان دونوں پر پوری طرح اثر انداز بھی تھا۔ سفیر ذرا جھک کر سرگوشی کے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا اور مونا شرمیلے انداز میں ہنس رہی تھی۔ یہ منظر اتنا اچھا لگا کہ میں اس میں مخل ہونے کے بجائے خاموشی سے پیچھے ہو گیا۔ پھر لان کے ایک گوشے میں چہل قدمی کرتے ہوئے مجھے بے اختیار دو سیاہ آنکھیں یاد آ گئیں۔ وہ سیاہ آنکھیں جو کبھی میرے لئے ستاروں کی طرح چمکتی تھیں لیکن اب وہ کسی اور کی ہو گئی تھیں۔ میرے لئے اتنی محترم ہو گئی تھیں کہ ان میں جھانکنا تو درکنار ان کے سامنے آنکھ اٹھانا بھی میرے لئے گستاخی سے کم نہیں تھا۔ اچانک میں جھرجھری لے کر چونکا۔ کسی نے پاس سے مجھے پکارا تھا۔ ایک طرف سے وسیم میرے پاس آ رہا تھا، اس کے زخم تقریباً بھر چکے تھے اور اب وہ آسانی سے چل پھر رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے میرے پاس آیا تھا۔ "کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہیں شہباز صاحب...... میں آوازیں دے رہا تھا۔"

"بس یار ایسے ہی...... کوئی خاص بات۔"
"ہاں، آپ کے حکیم نے ہنگامہ کھڑا کیا ہوا ہے۔ اسے آپ کی تلاش ہے۔"
"اوہ، ہاں مالش کا وقت ہو گیا ہے۔"
وسیم نے غور سے میرا ہاتھ دیکھا۔ "سچی بات ہے شہباز صاحب مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ شاہی ...ہ نظر آنے والے اس شخص نے آپ کا ہاتھ بچا لیا۔"
"یقین تو مجھے بھی نہیں آتا ہے۔" میں نے کوٹھی کا رخ کرتے ہوئے کہا تھا۔
حکیم قادس سخت خفا نظر آ رہا تھا اور خلاف روایت اس بار اس نے علاج سے پہلے ہی تقریر شروع کر دی ...ھی۔ میں نے نائب کی طرف ترجمانی کے لئے دیکھا۔ وہ مسکرانے لگا۔ "حکیم صاحب جو فرما رہے ہیں اس کے ...ے کی ضرورت نہیں۔ آپ ان کے جذبات کو سمجھ جائیں۔"
"میری طرف سے معذرت کر لو۔" میں نے حکیم قادس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا۔
مالش کے دوران حکیم صاحب نے مزید فرمایا کہ میری علاج کی جانب سے بے پروائی رنگ لا سکتی ہے ... میں ہاتھ کی درست کارکردگی سے محروم ہو سکتا ہوں۔ سچی بات تھی ہاتھ بچ جانے کے بعد سے میں اس معاملے ...ں بے پروا ہو گیا تھا۔ یہ ہماری قومی عادت بھی ہے جیسے ہی کوئی افتاد سر پر پڑتی ہے، بھاگ دوڑ کرنے لگتے ہیں ... اب معاملہ ٹھنڈا پڑتا ہے تو خود بھی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ میں نے حکیم قادس سے پوچھا۔ "مجھے مزید کتنا ...ہ علاج کروانا ہو گا؟"
"کم سے کم ایک ہفتے...... روزانہ صبح شام مالش ہو گی۔" اس نے جواب دیا۔
اپنا کام مکمل کر کے اس نے میرے لئے جڑی بوٹیوں والا گرم پانی کا پیالہ منگوایا اور اپنا چرمی بیگ سمیٹ ... چلا گیا۔ اس دوران میں شکیل آ گیا تھا اور خاموش بیٹھا قادس کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ...لا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے فرحان کی رپورٹ آئی ہے۔"
"فرحان کون...... ڈرائیور؟"
"ہاں وہ ہمارا ایک بہترین کارکن ہے۔ اسپتال میں اس کے سر کا سی ٹی اسکین ہوا ہے۔ ڈاکٹر حیران ہیں ... اندرونی جریان خون کے باوجود وہ خون اس کے دماغ پر کیوں جمع نہیں ہوا اور جب انہیں فرحان کی بیرونی ...ری کے بارے میں بتایا گیا تو انہوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ دماغ پر کسی حادثے کی صورت میں جم ...لے والا خون صرف آپریشن سے ہی صاف ہو سکتا ہے اور بعض اوقات آپریشن سے بھی صاف نہیں ہوتا۔ ان ...مطابق بیرونی طریقے سے اس خون کو نکالنا ممکن نہیں ہے۔"
"اس دنیا میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جو عام مروجہ اصولوں یا طریقوں کے تحت ناممکن نظر آتا ہے۔ ان ...کیم قادس کا طریقہ بھی شامل ہے۔"
میں ہنسا۔ "لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ اوّل تو حکیم قادس جیسے لوگ اپنے طریقہ علاج یا ادویات کے بارے ...ی کو بتاتے نہیں ہیں۔ یہ چیز نسل در نسل چلتی ہے۔ دوسرے ہمارے ہاں سائنٹفک ریسرچ کا رواج نہیں

''اسی وجہ سے ایسی حیرت انگیز چیزیں دنیا سے مٹتی جا رہی ہیں۔''

''کیا میں باہر جا سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے وسیم صاحب سے پوچھ لینا بہتر ہوگا...... لیکن اپنی شکل صورت کے ساتھ آپ باہر نہیں سکتے ہیں۔ شہر کے ہر پولیس والے کو آپ کی تصویر مہیا کر دی گئی ہوگی۔ مرشد علی آپ اور آپ کے ساتھیوں لئے دیوانہ ہوا جا رہا ہے۔ آپ کو پکڑنے والے کے لئے اس نے پچاس لاکھ کے انعام کا وعدہ کیا ہے۔ آ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پولیس کو کتنی شدت سے آپ کی تلاش ہوگی۔''

''یہ اطلاع کب اور کس ذریعے آئی ہے؟''

''پولیس کے محکمے میں ... ہمارے بھی ہیں۔ ان سے ابھی اطلاع ملی ہے۔''

میں نے غور کیا۔ سرشداب پوری طاقت سے ہمارے سامنے آ گیا تھا۔ ڈیوڈ شا کی جانب سے وہ کسی دباؤ سے آزاد تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ ''راجا صاحب نے ڈیوڈ شا سے تصویر حاصل کرنے کے لئے اب کوئی قدم نہیں اٹھایا؟''

''ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں راجا صاحب اپنے طور پر کچھ کر رہے ہوں تو اور با ہے۔''

''راجا صاحب سے رابطہ ہو سکتا ہے؟''

''ہاں لیکن احتیاطاً ہم اس کوٹھی سے رابطہ کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ یہ بات یقینی ہے اور راجا صا کی کوٹھی سے کی جانے والی کالز چیک کی جا رہی ہوں گی۔''

''موبائل کالز بھی۔''

''کسی حد تک۔'' شکیل نے کہا۔ ''ایسی ٹیکنالوجی ہے جس سے پتا چلایا جا سکتا ہے کہ کال کہاں سے رہی ہے یا کہاں سے آ رہی ہے۔ ٹرانسمیٹر ٹاور کا تعین ہونے کے بعد تلاشی کا کام ایک چھوٹے سے علاقے محدود رہ جاتا ہے۔''

''ان دو لفنگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟''

شکیل ہنسنے لگا۔ ''وہ بھی ایک نمونے ہیں...... بہرحال ان کی وجہ سے ہمیں رہائی ملی تھی۔ وسیم صاحب انہیں دس، دس ہزار روپے انعام کے ساتھ بھیج دیا ہے۔ وہ رکنے اور ہمارے ساتھ رہنے پر بضد تھے۔ مگر ہم ان کا کیا کرتا تھا؟''

''یہ اچھا کیا۔ غیر متعلقہ آدمی جتنا دور رہیں اچھا ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''وسیم کہاں ہے؟''

وسیم اپنے کمرے میں ٹی وی کے آگے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔ ''آیئے...... ذرا ر دیکھیں۔''

ٹی وی چینل پر دارالحکومت اسلام آباد میں ہونے والی قتل و غارت گری کا ذکر کیا جا رہا تھا۔ میرے حملہ، سید گل کا قتل اور آتش زنی، پھر ندیم کے گھر پر حملہ...... مارگلہ کے دامن میں ہونے والے خونی جھڑپ میں درجن سے زیادہ افراد مارے جا چکے تھے۔ اس سے پہلے افغان ڈاکوؤں کا کوٹھی پر راکٹ حملہ...... ر

میں میرا، ندیم اور راجا عمر دراز کا ذکر تھا لیکن مرشد علی کا نام کسی نے نہیں لیا صرف اتنا کہا گیا کہ ان سارے ہنگاموں میں راولپنڈی کا ایک بارسوخ سیاسی خاندان ملوث ہے۔ ڈھکے چھپے انداز میں مرشد علی کے بھائی کی طرف اشارہ کیا تھا جو ان دنوں دبئی میں زیر علاج تھا۔ رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ ساری ہنگامہ آرائی آنے والے الیکشن میں برتری حاصل کرنے کے لئے کی جارہی تھی۔

''بکواس۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''کیا ان لوگوں کو نظر نہیں آتا کہ میں اور ندیم عام افراد ہیں، ہمارے نہ تو سیاسی عزائم ہیں اور نہ ہی کسی ایسی جماعت سے ہمارا تعلق ہے۔''

وسیم مسکرایا۔ ''سب جانتے ہیں...... ہم سے بھی زیادہ جانتے ہیں مگر کچھ مصلحتیں ان کا راستہ روکتی ہیں۔ سیاسی بے راہ روی نے اس میں اضافہ کیا ہے۔''

''یہ تو صحافتی خبریں ہیں...... تمہاری اطلاعات کیا ہیں؟''

''حالات تشویش ناک ہیں۔'' اس نے تسلیم کیا۔ ''مرشد علی دباؤ بڑھا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اعلیٰ پولیس حکام کا ایک وفد راجا صاحب سے ملا اور ان سے ہماری حوالگی کا مطالبہ کیا۔ میں نامعلوم مجرم ہوں اور آپ کے خلاف دہشت گردی کے الزام میں ایف آئی آر کاٹ دی ہے۔''

''میرے خدا......! میرے خلاف کیا کیس ہے؟''

''افغان ڈاکوؤں نے جو کارروائی کی تھی اس میں آپ کا نام شامل کر دیا ہے پولیس کا دعویٰ ہے آپ یہاں ان کی مدد کر رہے تھے۔''

میرے منہ سے بے اختیار گالی نکل گئی تھیں۔ ''بکواس کرتے ہیں یہ مرشد کے زرخرید۔''

وسیم مسکرایا۔ ''یہ بات مجھ سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا ہے...... بہر حال اب ندیم کے لئے بھی دشواری ہوئی ہے۔ اس نے آپ کی قبل از گرفتاری ضمانت کی جو درخواستیں دے رکھی تھیں، امکان ہے وہ مسترد ہو جائیں گی۔''

''یعنی اب مجھے مستقل روپوشی کی حالت میں رہنا پڑے گا؟''

''اگر ضمانت کی درخواست منظور ہو جائے تب بھی آپ منظر عام پر نہیں آسکتے ہیں...... مرشد علی کے گرگے آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔''

میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر کہا۔ ''میں چاہتا ہوں، مونا اور سفیر اس چکر سے نکل جائیں...... سفیر ایک بڑے زمیندار خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ مونا اور سفیر ان کے پاس محفوظ رہیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ سفیر کی حویلی میں چلے جائیں۔''

''اگر آپ چاہتے ہیں تو اس میں مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ وہ دونوں خود ہیں۔ سفیر مجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا ہے اور مونا اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ تمہیں بھی اندازہ ہوگا کہ ان دونوں کی شمولیت میرے لئے بوجھ ہے۔ میرے ساتھ مجبوری ہے۔ میں اپنی نارمل زندگی سے ہٹ چکا ہوں اور میری واپسی کا امکان خاصا کم ہے لیکن مونا اور سفیر پر کوئی الزام نہیں ہے اور انہیں سوائے مرشد علی کے کسی سے خطرہ نہیں ہے۔''

"آپ درست کہہ رہے ہیں انہیں اس معاملے سے نکل جانا چاہئے۔"
"مسئلہ یہ ہے وہ سیدھی طرح یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"
وسیم مسکرایا۔ "جو سیدھی طرح نہ مانے...... ان کے لئے ہمارے پاس دوسرے طریقے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مونا اور سفیر یہاں سوئیں اور ان کی آنکھ سفیر صاحب کی حویلی میں کھلے۔"
"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں...... میں نے سفیر کو راضی کر لیا ہے...... وہ دھوکے سے مونا کو حویلی چھوڑنے جائے گا...... اب کرنا صرف یہ ہے کہ اس کی واپسی سے پہلے میں غائب ہو جاؤں اور سفیر کو اطلاع ملے کہ میں ملک سے باہر جا چکا ہوں...... صرف سفیر کو ہی نہیں...... بلکہ مرشد علی کو بھی یہی معلوم ہونا چاہئے...... تاکہ یہ طوفان بدتمیزی تھم جائے۔"
"ہاں یہ ممکن ہے لیکن مکمل پلان بنانے کے لئے غور کرنا ہوگا۔" وسیم نے سر ہلایا۔
"میں سفیر سے بات کرتا ہوں...... وہ ابھی روانہ ہو جائے تو بہتر ہے، رات کا سفر ٹھیک رہے گا۔ تم ان کے ساتھ چند افراد بطور محافظ بھیج دینا۔"
"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ ان سے طے کر کے مجھے آگاہ کر دیں۔ گاڑی اور بندے پانچ منٹ کے نوٹس پر تیار ہوں گے۔"
میں اٹھ رہا تھا کہ مجھے خیال آیا۔ "یار، رحمت والے معاملے کا کیا ہوا؟ اس کی بیوی اور بیٹی کا پتا چلایا نہیں۔"
وسیم نے نفی میں سر ہلایا۔ "راجا صاحب نے کوشش کی تھی۔ البتہ یہ طے ہے کہ وہ دونوں ان کے قبضے میں ہیں۔"
"بے چارہ رحمت خان...... اس نے اپنی جان پر کھیل کر میری مدد کی تھی۔"
"آپ نے بھی اس کی بیوی اور بیٹی کی حفاظت کی پوری کوشش کی تھی۔" وسیم نے مجھے تسلی دی۔
"پھر بھی یار، میں خود کو قصوروار سمجھتا ہوں...... خاص طور سے اس کی لڑکی کی طرف سے فکر ہے۔ وہ اوباشوں کے قبضے میں ہے اور اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے یا ہو چکا ہوگا۔"
"خدا سے بہتری کی امید رکھیں۔" وسیم نے کہا۔ "مرشد علی جانتا ہے رحمت خان اور اس کی بیوی، بیٹی ان کے خلاف گواہ ہیں اور جب تک رحمت خان اس کی پہنچ سے دور ہے، وہ شاید ان ماں بیٹی کو نقصان پہنچانے سے گریز کرے۔"
"شاید۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "ویسے اتنے احتیاط پسند نہیں ہوتے مرشد جیسے لوگ...... یہ درندوں کی سی وحشت رکھتے ہیں...... شکار کو چیرنے پھاڑنے کے بعد سوچتے ہیں کہ اس کی لاش کا کیا کرنا چاہئے۔"
"ویسے رحمت خان اب پرسکون ہے، اس نے یہ سارا معاملہ تقدیر پر چھوڑ دیا ہے۔"
"پھر بھی اس سے محتاط رہو۔ اسلحہ اس کی پہنچ سے دور رکھو...... وہ سابق فوجی بندہ ہے...... اس کا دماغ گھوم گیا تو وہ کوئی بھی حرکت کر سکتا ہے۔"
"آپ نے اچھا کیا بتا دیا...... میں ابھی سب کو ہدایت کر دیتا ہوں۔"

مونا اور سفیر لان میں بیڈمنٹن کھیل رہے تھے، نہ جانے کہاں سے کھیل کا سامان ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ سفیر نے پرانا لباس پہن رکھا تھا البتہ مونا کو نیا لباس مل گیا تھا۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا اور رفتہ رفتہ تاریکی چھا رہی تھی۔ سفیر نے ایک شاٹ جان بوجھ کر نیچے کھیلا اور مونا ریٹرن نہ کر سکی۔

''یہ فاؤل ہے۔'' وہ چلائی۔

سفیر ہنستا ہوا میری طرف آیا۔ ''جب لوگ ہارتے ہیں تو یہی الزام لگاتے ہیں۔''

''سفیر میں نے وسیم سے بات کی ہے۔'' میں نے بلاتمہید کہا۔ ''تُو ابھی مونا کو لے کر نکل جا اور اسے بہلا کر واپس آ جانا۔''

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' مونا دوپٹے سے پسینہ خشک کرتی آئی۔

''میں اور تم آج رات حویلی جا رہے ہیں۔'' سفیر نے اسے آگاہ کیا۔

''اتنی جلدی۔'' مونا نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ''فیصلہ کب ہوا؟''

''ابھی۔'' میں نے کہا۔ ''میری وسیم سے بات ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے ابھی اس کے پاس بندے ہیں جو تمہارے ساتھ بطور محافظ جا سکتے ہیں۔ کل ان کی ضرورت نہ جانے کہاں پڑ جائے۔''

مونا کا منہ لٹک گیا تھا۔ ''شوبی...... میں تم سے......''

''پلیز یہ عام معاملہ نہیں ہے...... حالات تمہارے سامنے ہیں...... میں خود ابھی حالات کے دھارے پر ہوں۔ اگر ہم میں سے کسی کو بچ کر محفوظ جگہ جانے کا موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ جتنے لوگ خطرے سے دور ہوں گے، میں خود کو اتنا ہی طاقتور محسوس کروں گا۔''

سفیر نے کہا۔ ''ہم تیری بات سمجھ رہے ہیں۔ میں نے بھی مونا سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔''

''بس تو تم دونوں تیار ہو جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''رات کا کھانا کھاتے ہی روانہ ہو جانا۔''

''شوبی مجھے تمہاری فکر لگی رہے گی۔''

''میں بچہ نہیں ہوں اور ان لوگوں کے ساتھ بالکل محفوظ ہوں۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ مارا۔ ''میری ماں زندہ ہے، اللہ اسے سلامت رکھے اس لئے میری ماں بننے کی کوشش مت کرو۔''

آنسو چھپانے کے لئے مونا دوسری طرف گھوم گئی تھی۔ میں نے سفیر کو آنکھ ماری۔ ''دیکھ یار تُو نے اس کا پوری طرح خیال رکھنا ہے۔''

''وہاں کوئی خیال رکھنے دے گا تو میں رکھوں گا۔'' سفیر نے منہ لٹکا کر کہا۔ ''ہمارے ہاں زنان خانہ، مردانے سے بالکل الگ ہوتا ہے۔''

مونا جھینپ کر اندر چلی گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''تب تو تیرا کام آسان ہو جائے گا۔''

''ہاں لیکن ایسا نہ ہو اُدھر مونا کو دھوکا دے کر اور چپکے سے نکل کر آؤں اور اِدھر تُو کہیں اور نکل جائے۔''

سفیر نے خدشہ ظاہر کیا جو سچ بھی تھا میرا یہی ارادہ تھا۔

''یار میں نے کہاں جانا ہے!'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اپنے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے اور کیا تجھے مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔''

"بھروسا تو ہے مگر تُو ہمیں بچانے کے لئے ایسا کر گزرے تو بعید بھی نہیں ہے۔"

"سفیر کیا تیرے گھر والے مونا کو قبول کرلیں گے؟ میرا مطلب ہے اس سے کوئی غلط سلوک......!"

"یار تُو میرے ماں باپ، سب سے ملا ہے، کیا وہ اس قسم کے لگتے ہیں؟ بلکہ ماں جی تو مونا سے ملنے کے لئے بے تاب ہیں جب سے میں نے حویلی میں مونا کا ذکر کیا ہے۔"

"ہاں پھر بھی ہمارے معاشرے میں کسی لڑکی کا اس طرح لڑکے کے گھر پہنچ جانا اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ تیرے ماں باپ نہ سہی کوئی اور یہ بات کہہ دے تو، مونا کا سوچ...... وہ ویسے اندر سے حساس ہے اوپر سے بہادر بنتی ہے۔"

سفیر سوچ میں پڑ گیا تھا۔"یار میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ ماں جی سب سنبھال لیں گی۔"

"اگر تُو ایسا سمجھتا ہے تو ٹھیک ہے۔"

رات کا کھانا ہم نے کوٹھی کے ڈائننگ ہال میں ساتھ کھایا تھا۔ وسیم اور شکیل بھی شریک تھے کھانے کے بعد مونا اور سفیر تیار ہونے چلے گئے۔ وسیم اور میں باہر آ ئے۔ موسم بدل رہا تھا اور ہلکی سی خنکی محسوس کی جا سکتی تھی۔

"ایک پجیرو جیپ اور تین مسلح افراد جائیں گے۔" وسیم نے مجھے بتایا۔"ان میں سے ایک ڈرائیونگ کرے گا۔"

سفیر کا گاؤں اٹک میں دریا کے پار تھا۔ وہاں جانے کے لئے تقریباً دو گھنٹے لگتے۔ مونا اور سفیر تیار ہو کر آئے تو دونوں اداس تھے۔ میں نے سفیر کو گلے لگایا اور دل ہی دل میں اس سے معذرت کی اس دھوکے کی جو میں اسے دینے جا رہا تھا۔ مونا کو گلے لگایا تو وہ رونے لگی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹا۔"پگلی کوئی ہمیشہ کے لئے تھوڑی جا رہی ہے...... سمجھ لے رخصتی کی ریہرسل ہے، اصل رخصتی پوری شان سے بینڈ باجوں کے ساتھ ہوگی۔"

"بس فضول باتیں کروالو تم سے۔" مونا جھینپ گئی۔

سفیر اچانک بولا۔"یار شوبی تُو بھی چل......"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔"یہ مناسب نہیں ہوگا جلد ہی میں اشتہاری مجرم بن جاؤں گا اور تیری حویلی میں میری موجودگی مسئلہ بن جائے گی۔"

"شوبی تم ملک سے چلے جاؤ۔" مونا نے تجویز دی۔"پھر ہم تمہارے پاس آیا کریں گے۔"

"دیکھو فی الحال تو میں نے کچھ طے نہیں کیا ہے۔"

وسیم اپنے آدمیوں کو سمجھا رہا تھا کہ کسی غیر متوقع صورت حال میں انہوں نے کیا کرنا ہے۔"سمجھ لو ان کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی ہے اپنی جان سے بھی زیادہ۔" وسیم نے آخر میں کہا تھا۔

"آپ بے فکر رہیں سر......" ایک نے مستعدی سے کہا۔"ان پر اس صورت میں آنچ آئے گی جب ہم تینوں نہ رہیں۔"

مونا اور سفیر جیپ میں بیٹھے۔ ڈرائیور نے اپنی نشست سنبھالی اور جیپ گیٹ سے نکل گئی۔ ان لوگوں کا چلے جانا ہی ہم تینوں کے مفاد میں تھا اس کے باوجود میں اپنے دل میں ایک بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ ملک والوں سے تمام رابطے ختم کرنے کے بعد مونا اور سفیر ہی ایسے دو افراد تھے جنہیں میں اپنا کہہ سکتا تھا ان سے اپنے دل کی بات کہہ سکتا تھا۔ کہنے کو تو ندیم سے بھی دوستی اور بے تکلفی تھی لیکن وہ شادی شدہ اور بیوی بچوں والا تھا اس لئے

اں میں مونا اور سفیر والی بات نہیں تھی۔ اس شہر میں ہم تینوں ایک دوسرے کے سب کچھ تھے۔ گزشتہ چار سال
میں شاید ہی کوئی ایسا موقع آیا تھا جب ہم ایک دوسرے سے دور ہوئے ہوں۔ گرمیوں میں ہم لازماً شمالی علاقے
میں سے کہیں نہ کہیں ہائیکنگ یا ٹریکنگ کے لئے جاتے تھے۔ میں نے کاغان میں محکمۂ جنگلات کا ایک پرانا
اآلک ہاؤس نیلامی میں خرید کر اسے تزئین و آرائش کر کے گیسٹ ہاؤس میں بدل دیا تھا۔ وہاں کا چکر لگتا تو مونا
اور سفیر میرے ساتھ ہوتے تھے۔ سردیوں میں جب سفیر اپنے گاؤں جاتا اور وہاں پرندوں کا شکار کھیلتا تھا تو میں
بھی اس کے ساتھ جاتا تھا اس موقع پر مونا چند دن کے لئے ہم سے دور رہا کرتی تھی ایک بار ہم نے مل کر چین کا
دورہ بھی کیا تھا اور درہ خنجراب کے راستے کاشغر تک ہو آئے تھے۔

تقریباً روز ہی رات کو مونا اور سفیر میرے دفتر آ جاتے تھے۔ سید گل سے باہر سے کھانا منگوا کر بھرپور
لنچ کرتے تھے۔ گرمیوں کی راتوں میں پورے شہر میں جگہ جگہ گھوم کر آئس کریم کھاتے، چھٹی والے دن ڈوپہر
اندیم کے گھر دھاوا بولتے تھے۔ سارا دن گھوم پھر کر شام کو واپس آ جاتے تھے۔ وہ سب باتیں اب خواب کی
طرح محسوس ہوتی تھیں۔ حالانکہ زیادہ دن پرانی باتیں نہ تھیں لیکن مجھے لگ رہا تھا میں چند ہفتوں سے نہیں سالوں
سے اس چکر میں پڑا ہوں اور میری باقی عمر بھی شاید اسی میں گزر جائے گی۔

''اندر چلیں...... کب تک یہاں کھڑے رہیں گے؟'' شکیل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔

میں چونکا۔ ''نہیں یار ابھی میرا موڈ نہیں ہو رہا ہے، میں ذرا لان میں ٹہلوں گا۔''

شکیل سمجھ گیا میں فی الحال اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ وہ خاموشی سے اندر چلا گیا اور میں لان کی طرف بڑھ گیا
تھا۔ اب رات بارہ بجے میرے ہاتھ کی مالش کرانی تھی اور بارہ بجنے میں خاصا وقت تھا۔ لان میں جا بجا لوہے
کے پائپوں کے اوپر شیشوں کے سفید گلوبوں میں سفید بلب روشن تھے۔ ان کی وجہ سے پورا لان روشن ہو رہا تھا۔
میں خاموشی سے ٹہلتا رہا ایک بار ٹہلتے ٹہلتے باڑھ کے نزدیک گیا تو ایک سایا جدا ہو کر میری طرف آنے لگا۔ مجھے
شبہ ہوا وہ رحمت خان ہے، وہ قریب آیا تو شبہ درست نکلا۔ ''شہباز صاحب۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''رحمت خان۔'' میں اس کے قریب چلا آیا۔ ''کیسے ہو؟''

''بس صاحب زندہ ہوں۔'' اس نے پھیکے لہجے میں کہا۔ ''بھاگ بھری اور اس کی ماں کے بغیر......''

''رحمت خان میں تم سے شرمندہ ہوں۔ یقین کرو ان کی بازیابی کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی ہے لیکن
کامیابی نہیں ہوئی راجا صاحب تک نے ان سے بات کی تھی۔''

''میں شرمندہ ہوں...... اپنی بیٹی اور بیوی کی محبت کی وجہ سے میں نے راجا صاحب جیسے نیک انسان کو
مارنے کی کوشش کی...... مجھے معلوم تھا اس بدمعاش پیر کے غنڈے صرف دھمکی نہیں دیتے ہیں، اس پر عمل بھی
کرتے ہیں...... میں پہلے ہی ان کے ظلم کا شکار ہوں۔

میں چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''آپ نے میری بیوی کو دیکھا ہے...... اس کی حالت دیکھی ہے۔'' رحمت خان نے عجیب سے لہجے میں
سوال کیا۔

''ہاں دیکھی تو ہے مگر اس وقت میں توجہ نہیں دے سکا تھا۔'' میں نے ہچکچا کر کہا۔ ''وہ شاید بیمار ہے۔''

"بیمار نہیں صاحب وہ ذہنی مریض ہے۔ انیس سال سے خوف میں جی رہی ہے، ذرا سی بات اس کا د
الٹ دیتی ہے۔"

"اسے کیا بیماری ہے؟"

رحمت خان نے گہری سانس لی۔ "صاحب اسے وہ بیماری ہے جو ہر اس غریب عورت کو ہو سکتی ہے
عزت پیاری ہو اور اس کی عزت لٹ جائے ...... اس کے اپنے گھر میں لٹ جائے۔"

میں نے رحمت خان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "رحمت خان تمہارے انداز سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم
میں کوئی دکھ چھپائے بیٹھے ہو۔"

"ہاں صاحب...... یہ ناسور ہے جو ہماری زندگیوں کو اندر ہی اندر چاٹ رہا ہے۔ انیس سال ہو گئے
میاں بیوی ایک دوسرے سے آنکھ ملا کر بات بھی نہیں کر سکے۔"

"رحمت خان تم اپنا دکھ مجھ سے کہہ سکتے ہو اور کچھ نہیں تو تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

رحمت خان کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے اپنی ماضی کے ورق الٹنا شروع کیے۔

☆======☆======☆

رحمت خان اور نور بی بی مارگلہ کے دامن میں آباد ایک چھوٹے سے گاؤں کے رہنے والے تھے۔
نور بی بی سترہ سال کی ہوئی تو اس کے ماں باپ نے رحمت خان کا رشتہ قبول کر لیا۔ نور بی بی اور رحمت خان
باپ آپس میں گہرے دوست تھے اور یہی دوستی اس شادی کی وجہ بنی تھی۔ نور بی بی پُرکشش اور سلیقہ مند لڑکی تھ
رحمت خان ان دنوں فوج میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا۔ چار پانچ مہینے بعد اسے چند دن کے لئے گھر آنے کا موقع
تھا۔ ماں باپ کے ساتھ وقت گزار کر خوش خوش واپس چلا جاتا تھا۔ مگر جب نور بی بی اس کی زندگی میں آئی تو
کے لئے گھر سے دور رہنا عذاب ہو گیا تھا، وہ بے تابی سے گھر جانے کے دن گنا کرتا تھا اور چند دن نور بی بی
ساتھ گزار کر جب وہ واپس جانے لگتا تو اس کا جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ بارہا اس نے سوچا کہ استعفیٰ د
دے...... لیکن اس کا کوئی اور ذریعہ روزگار نہیں تھا اور ان کے پاس کاشت کاری کے لئے زمین نہیں تھی۔ ر
خان کے باپ کے پاس کچھ جانور تھے جن کا دودھ بیچ کر گزر اوقات کرتے تھے۔

جب نور بی بی بیاہ کر آئی تو یہ جانور اس کی ذمے داری بن گئے تھے اور وہ روز انہیں چرانے کے لئے
جاتی تھی۔ آس پاس سرسبز چراگاہوں کی کمی نہیں تھی۔ ایک روز نور بی بی جانور لے کر چرانے کے لئے نکلی
نزدیکی چراگاہ تک گئی۔ چند گھنٹے بعد اسے دو گھڑ سوار وہاں نظر آئے اس نے توجہ نہیں دی کیونکہ اس علاقے
گھڑ سواری عام تھی۔ دشوار راستوں پر کوئی مشینی سواری بے کار تھی۔ اس لئے نور بی بی چونکی نہیں تھی لیکن قریب
کر وہ گھوڑے سے اتر کر اس کی جانب لپکے تو اسے خطرے کا احساس ہو۔ وہ گاؤں کی طرف بھاگی۔ مرد زیاد
تھے انہوں نے چند قدم بعد ہی اسے جا لیا تھا اور اسے کھینچ کر گھوڑوں کی طرف لے جانے لگے تھے۔ نور بی بی
چیخیں ماریں۔ خوش قسمتی سے گاؤں کے چند مرد نزدیک ہی سے گزر رہے تھے وہ اس کی مدد کو آئے۔ انہوں
دونوں افراد کو پکڑ لیا اور لاٹھیوں سے مار مار کر ان کا بھرکس نکال لیا تھا۔ نور بی بی نے اس غیبی امداد پر خدا کا شکر
کیا تھا اور جب ان دونوں کو پولیس کے حوالے کرنے کے لئے لے جایا جا رہا تھا۔ پیر بادشاہ کے ہرکارے آ

اور انہیں اپنی تحویل میں لے لیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ان مجرموں کو پیر بادشاہ سزا دیں گے۔ گاؤں والے پیر بادشاہ کے عقیدت مند تھے اس واقعے کے بعد عقیدت مندی سے ادھ موئے ہو گئے تھے۔

پیر بادشاہ مرشد علی کا باپ ریاست علی تھا اور مرشد اس وقت نوجوان تھا۔ رحمت خان واپس آیا اور اسے پتا چلا تو اس کا خون کھول گیا تھا۔ گھر والوں اور نور بی بی سے مل کر وہ پیر بادشاہ کے پاس پہنچا تھا وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں کو کیا سزا ملی۔ مگر اسے درگاہ میں داخل نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ اس وسیع احاطے میں جا بجا پیر بادشاہ کے پالے مسٹنڈے مرید تھے جو آنے والوں پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے اور کوئی شخص ان سے بچ کر براہِ راست اندر نہیں جا سکتا تھا۔

''کیا بات ہے منہ اٹھائے کدھر جا رہا ہے۔'' ایک ملنگ نے اسے روک کر جھڑکا۔ ''جانتا نہیں اِدھر مرکز تجلیات ہے۔''

ملنگ کا اشارہ مرشد علی کے دیوانے دادا کی قبر کی طرف تھا جو حالت مجذوبیت میں مر گیا تھا اور اب اس کی اولاد اس کی قبر پر کاروبار چلا رہی تھی۔ ''مجھے پیر بادشاہ سے ملنا ہے۔''

''اوئے پیر بادشاہ...... اونچی ذات ہے...... اس سے ملنا ہر بندے کے بس کی بات نہیں ہے اپنا مسئلہ بتا۔''

رحمت خان کو پیروں فقیروں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی اور نہ ہی وہ عقیدت کا مارا تھا۔ اس نے ملنگ کو ان مجرموں کے بارے میں بتایا جنہوں نے اس کی بیوی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور جو اب پیر بادشاہ کی تحویل میں تھے۔ ملنگ اس کی بات سن کر معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا اور اسے ایک شخص کے حوالے کر دیا۔ ''اسے چھوٹے سرکار کے پاس لے جاؤ۔''

''لیکن مجھے تو پیر بادشاہ سے ملنا ہے۔'' رحمت خان نے احتجاج کیا۔

''پیر بادشاہ اس وقت چلے میں ہیں کسی سے نہیں مل سکتے۔'' ملنگ نے ٹکا سا جواب دیا۔

''وہ لوگ اسے تحویل میں لے کر درگاہ کے ایک طرف بنی چھوٹی سی عمارت میں لے گئے تھے۔ عمارت باہر سے سادہ تھی لیکن اندر اس کی آرائش دیکھ کر رحمت خان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ اس آسائش و عشرت کدے میں مرشد علی ایک کمرے میں تخت پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا اور ایک نوجوان عورت اس کا جسم دبا رہی تھی وہاں روحانیت کے بجائے نفس پرستی کا ماحول تھا۔ ملنگ نے جھک کر مرشد علی کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے مخمور آنکھیں اٹھا کر رحمت خان کی طرف دیکھا تھا۔ نزدیک ایک تپائی پر رکھی بوتل اور جام دیکھ کر شبے کی بات نہیں رہی تھی۔ مرشد علی شراب نوشی کر رہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اشارے سے عورت کو وہاں سے جانے کو کہا۔ عورت کے جانے کے بعد وہ چند لمحے بغور رحمت خان کو گھورتا رہا۔ ''تو نور کا شوہر ہے؟''

رحمت کو ایک بدمست شرابی کے منہ سے اپنی بیوی کا نام اچھا نہیں لگا تھا وہ کراہت دباتے ہوئے بولا۔

''نور بی بی میری عورت ہے۔''

''چھوٹے سرکار بول۔'' ملنگ نے اسے گھرکا۔

''چھوٹے سرکار نور بی بی میری عورت ہے۔'' رحمت خان نے خود پر جبر کر کے کہا۔

مرشد عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''پتا ہے تیری بیوی کو اغوا کرنے والے کون تھے؟ ان کا تعلق جنوں سے ہے۔'' مرشد علی انکشاف کرنے کے انداز میں بولا۔ ''بڑے سرکار نے انہیں قید کر دیا ہے۔ پر ان کے ساتھی بدلہ لینے کی فکر میں ہیں۔''

''پر ان کو تو گاؤں کے لوگوں نے مار مار......''

''ہم پر شبہ نہ کر۔'' مرشد علی غضب ناک انداز میں بولا۔ ''اگر پیر بادشاہ کا علاقہ نہ ہوتا تو وہ ایسے بھی نور بی بی کو لے جاتے...... مگر پیر بادشاہ کے علاقے میں جن بھی پَر مارنے کی مجال نہیں رکھتا۔ پر خطرہ اب بھی ہے۔''

''کیسا خطرہ...... چھوٹے سرکار؟''

''جن دوبارہ نور بی بی کو لے جانے کی فکر میں ہیں اور وہ صرف ایک وجہ سے بچ سکتی ہے......''

رحمت خان ان چیزوں کو نہیں مانتا تھا لیکن وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ ''وہ کیسے چھوٹے سرکار؟''

''اسے آنے والی چار جمعراتیں اس درگاہ کے احاطے میں گزارنا ہوں گی۔''

رحمت خان چپ رہا۔ ملنگ نے اسے ٹہوکا دیا۔ ''سوچتا کیا ہے...... چھوٹے سرکار کسی کسی پر اتنے مہربان ہوتے ہیں۔ اپنی بیوی کو جنوں سے بچانا چاہتا ہے تو آنے والی جمعرات سے پہلے اسے یہاں لے آ......''

رحمت خان نے ایک نظر مرشد علی کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ناچتی ہوس دیکھ کر وہ جان گیا تھا کہ نور بی بی کو اصل میں کس جن سے خطرہ تھا اور سارا معاملہ بھی اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ ایک لمحے کو اس کے دل میں آئی کہ نتائج کی پروا کئے بغیر چھوٹے سرکار کی گردن توڑ دے۔ وہ جوان اور مضبوط شخص تھا فوجی تربیت میں دست بہ دست لڑائی شامل ہوتی ہے۔ چھوٹے سرکار کی گردن توڑنا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن اس کے بعد وہ خود بھی یہاں سے زندہ سلامت نہیں جا سکتا تھا۔ وہ نور بی بی اور ماں باپ کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔

''بول کیا کہتا ہے؟'' مرشد علی نے کہا۔

''سرکار...... میں سوچ کر......''

''بکواس نہ کر......'' ملنگ غضب ناک انداز میں بولا۔ ''چھوٹے سرکار کی بات رَد کرتا ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں جہنم بن جائیں گی۔''

''جی چھوٹے سرکار...... میں گھر والی کو لے آؤں گا۔'' رحمت خان نے بے چارگی سے کہا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے نور بی بی کو لے کر اس جگہ سے کہیں اور جانا پڑا تو وہ چلا جائے گا۔ اسے امید تھی کہ ان دنوں وہ جس کرنل صاحب کا اردلی تھا، وہ بخوشی نور بی بی کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دیں گے۔ مگر مرشد علی اس کے اندازے سے زیادہ شاطر نکلا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں لانے میں زحمت ہو گی۔ ابھی جابر تمہارے ساتھ جائے گا۔'' اس نے ملنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہاری گھر والی کو لے کر آئے گا۔ وہ جتنی جلدی درگاہ کے احاطے میں آئے گی اتنا ہی اچھا ہو گا۔''

''زحمت کیسی جی...... میں لے آؤں گا۔'' رحمت نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''بدبخت! چھوٹے سرکار کا حکم جھٹلاتا ہے۔'' ملنگ نے اسے گھر کا ''گھر آئی رحمت کو ٹھکراتا ہے۔''

رحمت خان چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ رحمت کے نام پر اس کے گھر کیا سیاہ بختی آنے والی تھی مگر وہ پھنس

کر رہ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا انکار کر کے بھی وہ نور بی بی کو نہیں بچا سکتا تھا۔ یہ لوگ اسے قید کر لیتے اور نور بی بی کو کسی اور طریقے سے چھوٹے سرکار کے قدموں میں لا ڈالتے۔ نہ جانے اس کی منحوس نظر کب اور کیسے نور بی بی پر پڑی تھی۔ رحمت خان اسے نہیں بچا سکتا تھا لہٰذا اس نے ڈپلومیسی سے کام لیا۔

''میں بھلا سرکار کی بات رد کر سکتا ہوں......! دنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی۔''

مرشد علی فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا تھا۔ ''تو سمجھدار آدمی لگتا ہے......فکر نہ کر جب نور بی بی یہاں سے واپس جائے گی تو اس کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں گی۔''

رحمت خان کا دل چاہ رہا تھا کہ خدائی کے دعوے کرنے والے اس ذلیل شخص کو قتل کر دے۔ مگر وہ مجبور تھا اس کے بعد وہ بھی مرتا اور اس کا پورا خاندان ان فرعونوں کے انتقام کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ ملنگ اسے باہر لایا اور ڈھکے چھپے انداز میں دھمکی دی کہ اگر اس نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ اس نے رحمت خان سے کہا تھا۔ ''نور بی بی نے اِدھر آنا ہی آنا ہے۔''

کچھ دیر بعد ملنگ دو افراد کے ساتھ اسے لے کر ایک جیپ میں اس کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ رحمت خان کو انہوں نے درمیان میں مجرموں کی طرح بٹھا رکھا تھا۔ شام کے قریب وہ گاؤں کے نزدیک تھے کہ جیپ کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ ملنگ گالیاں دینے لگا کیونکہ ابھی انہوں نے واپس بھی جانا تھا اور رات کے وقت کچے پہاڑی راستوں پر ڈرائیونگ آسان کام نہیں تھا اس کے حکم پر دونوں افراد جیپ کا ٹائر بدلنے لگے۔ جیپ ذرا سی ترچھی کھڑی تھی اور اسے سلپ ہونے سے بچانے کے لئے ایک بڑا پتھر درکار تھا جسے نیچے رکھا جاتا۔ رحمت خان نے اس موقع پر جلدی سے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ ''میں تلاش کر کے لاتا ہوں۔''

باقی دو جیپ میں لگے تھے اس لئے ملنگ نے اسے پتھر تلاش کرنے کی اجازت دے دی۔ ''فرار مت ہو جانا!'' اس نے رحمت خان کو دھمکایا۔ ''میرے پاس رائفل ہے۔''

''نہیں جی......میں کیوں بھاگوں گا؟'' رحمت خان نے مسکین سے لہجے میں کہا تھا۔

رحمت خان دکھاوے کے لئے ایک چھوٹا پتھر لایا لیکن اسے مسترد کر دیا گیا۔ وہ بڑے پتھر کی تلاش میں درختوں کے درمیان گھسا اور پھر آہٹ کئے بغیر ہر ممکن تیزی سے گاؤں کی طرف بھاگا جو دو تین کلو میٹر دور تھا۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ عقب سے ان لوگوں کے چلانے اور اسے دھمکیاں دینے کا شور بلند ہوا۔ جابر اسے گولی مارنے کی دھمکی دے رہا تھا پھر اس نے فائر بھی کیا۔ گولی رحمت خان کے سر پر سے گزر گئی تھی۔ وہ رکا نہیں......اسے معلوم تھا کہ نیم تاریکی میں جھاڑیوں کے درمیان اس کا درست نشانہ لینا ممکن نہیں تھا ہاں اس کی قضا آ جائے اور گولی اس کی طرف کا رخ کرلے تو الگ بات تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے کبھی جھک جاتا تھا اور کبھی رخ بدل لیا کرتا تھا۔ یہ اس کا علاقہ تھا اور وہ اس کے چپے چپے سے واقف تھا اسے معلوم تھا کہ کہاں راستہ اچھا ہے اور کہاں گڑھے ہیں۔ وہ بلا جھجک دوڑے جا رہا تھا جب کہ اس کے پیچھے آنے والے راستوں سے ناآشنا ہونے کے سبب رک رک کر دوڑ رہے تھے۔ رحمت خان کی ساری طاقت ٹانگوں میں آ گئی تھی۔ اسے معلوم تھا آج وہ پکڑا گیا تو اپنی جان کے ساتھ آبرو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

پہاڑی علاقے کے دیگر دیہات کی طرح اس کا گاؤں بھی پھیلا ہوا تھا جس کو جہاں جگہ ملی اس نے مکان

بنالیا تھا۔ اس کا مکان ایک طرف دوسرے مکانوں سے ہٹ کر تھا۔ گاؤں میں داخل ہونے کے باوجود اس کی
رفتار میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی بلکہ مکان کے نزدیک پہنچ کر اس نے چلا چلا کر نور بی بی کو آواز دینا شروع کردی
تھی۔ وہ گھر میں تھی، شوہر کی آواز سن کر گھبرا کر گھر سے باہر نکل آئی۔ ''کیا ہوا رحمت خان؟''
''نور...... چل۔'' رحمت خان نے اس کا بازو پکڑا اور اسے پکڑ کر گاؤں سے باہر لے جانے لگا۔ وہ اس
بار مخالف سمت میں جارہا تھا۔
''ہوا کیا ہے...... کچھ تو بتا؟''
''میرے ساتھ بھاگ...... کتے پیچھے آرہے ہیں...... تجھے لے جانے کے لئے۔''
رحمت کے لہجے سے نور بی بی نے اندازہ لگایا کہ کوئی بہت سنگین بات ہے، وہ اس کے ساتھ حتی الامکان
تیزی سے دوڑنے لگی۔ چند منٹ کے اندر وہ گاؤں کے دوسری طرف واقع جنگل میں تھے۔ یہاں رک کر رحمت
خان نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ وہ کیوں اسے لے کر بھاگا تھا۔
''نور اس سے پہلے پیر بادشاہ کے کتے ہمیں تلاش کرلیں...... یہاں سے نکل جانا چاہئے...... ہمیں کرنل
صاحب کے پاس ہی پناہ مل سکتی ہے۔''
پیر بادشاہ کے سپوت کے عزائم جان کر نور بی بی کا خوف سے برا حال تھا۔ اگر اس وقت رحمت خان اسے
جہنم میں چلنے کو کہتا تو وہ بخوشی تیار ہو جاتی۔ دونوں میاں بیوی تاریکی چھاتے ہی پکی سڑک کی طرف روانہ ہوگئے
جہاں سے انہیں بس مل سکتی تھی۔ رحمت خان کھاریاں چھاؤنی میں تھا۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں پنڈی اڈے
تک جانے والی بس مل گئی تھی۔ جہاں سے انہوں نے صبح دم کھاریاں جانے والی ویگن پکڑی اور سورج نکلنے سے
پہلے وہ کھاریاں میں تھے۔ رحمت خان سے اس کی کہانی سن کر کرنل اور اس کی بیوی نے فوری طور پر نور بی بی کو پناہ
دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔
نور بی بی کو محفوظ کرنے کے بعد اب رحمت خان کو اپنے ماں باپ کی فکر تھی، وہ ان کے بارے میں جاننے
کے لئے خود نہیں جا سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا پیر بادشاہ کے پالتو اس کی تاک میں ہوں گے۔ وہ اپنے جنگل میں شیر
تھے اور کوئی ان کے منہ سے نوالہ چھین کر لے جائے ایسے شخص کی نسلیں مٹا کر بھی ان کے جذبہ انتقام کی تسلی ممکن
نہیں تھی۔ اس نے ایک جاننے والے کے توسط سے پتا چلایا۔ پیر بادشاہ کے گرگے اس کے ماں باپ کو پکڑ کر لے
گئے تھے لیکن پھر مار پیٹ کر رہا کر دیا تھا اور وہ اب اپنے گھر میں تھے ان کی خیریت معلوم کرکے رحمت خان نے
اطمینان محسوس کیا تھا۔ نور بی بی اس بہانے اب اس کے ساتھ تھی۔ کرنل صاحب کی بیگم اس پر اتنی مہربان تھی کہ
اس کی باقاعدہ تنخواہ لگا دی تھی۔ یوں رحمت خان اس قابل ہوا تھا کہ باقاعدگی سے ماں باپ کو خرچہ بھیج سکے۔ گاؤں
جانے کی ہمت اس نے پورے سال بعد کی تھی وہ رات کی تاریکی میں گاؤں میں داخل ہوا اور ماں باپ سے مل کر
صبح روشن ہونے سے پہلے واپس چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ہر دوسرے، تیسرے مہینے اسی طرح آ کر خاموشی سے
ماں باپ سے مل جاتا تھا۔ پانچ سال گزر گئے نور بی بی کی گود ہری نہ ہو سکی تھی۔ اگرچہ دو بار وہ امید سے ہوئی
تھی۔
ایک بار رحمت خان ماں، باپ سے ملنے روانہ ہوا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ یہ خفیہ آمدورفت گاؤں والوں

سے چھپی نہیں رہی تھی۔ جس رات رحمت خان کے گھر میں روشنی رہتی گاؤں والے سمجھ جاتے کہ رحمت خان ماں باپ سے ملنے آیا ہے۔ سب اس کے حامی اور دوست تھے تو کچھ ایسے بھی تھے جو اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے کسی نے پیر بادشاہ کو اس کی آمد کے بارے میں بتا دیا۔ اب تک ان کی آگ اس لئے دبی ہوئی تھی کہ وہ ایک کرنل کے گھر میں گھس کر کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ سرکار کے کتنے ہی مقرب سہی لیکن اس حد تک آتے ہوئے ان کے پر بھی جلا کرتے تھے اب انہیں پتا چلا تو یہ آگ ایک بار پھر پوری شدت سے بھڑک اٹھی تھی۔

رحمت خان حسب معمول تاریکی میں آیا لیکن مخبر تاک میں تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا اور درگاہ تک خبر پہنچا دی کہ تمہارا شکار آن پہنچا ہے۔ رحمت خان صبح کے قریب گھر سے نکلا اور سڑک کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں گھات لگائے افراد نے حملہ کر کے اسے قابو کرنے کی کوشش کی۔ ان کی بدقسمتی کہ رحمت خان ہوشیار ہو گیا۔ اوچھا وار بچا کر اس نے لاٹھی سے حملہ آور کو مار گرایا اور خود بھاگ نکلا۔ انہوں نے رحمت خان کو پکڑنے کی کوشش کی۔ شاید وہ اسے مرشد علی کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ اس سے خود انتقام لے سکے۔ ورنہ اسے مارنا بہت آسان تھا۔ رحمت خان کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ان گرگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے وہ جابر کا انجام نہیں بھولے تھے جسے مرشد علی نے نور بی بی کو لانے میں ناکامی کے بعد کتوں کے آگے ڈلوا دیا تھا۔ انہوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی اور ایک گولی رحمت خان کے ٹخنے سے گزر گئی۔ وہ جس جگہ گرا تھا اس کے پاس جھاڑیوں میں پوشیدہ ایک گڑھا تھا وہ رینگ کر اس میں چلا گیا تھا۔ گولی نے اس کی ہڈی توڑ دی تھی اور وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ خاموشی سے گڑھے میں پڑا رہا۔ باہر مرشد علی کے آدمی اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے کسی کا دھیان اس گڑھے کی طرف نہیں گیا تھا۔

کئی گھنٹے بعد وہ جھنجلاتے ہوئے، گالیاں دیتے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت رحمت خان کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ پر ستم ٹوٹنے والا تھا۔ مرشد علی کے گرگے وہاں پہنچے اور اس کے ماں باپ کو مکان کے اندر بند کر کے مکان کو آگ لگا دی۔ دوسری طرف رحمت خان کو جب یقین ہو گیا کہ وہ چلے گئے ہیں تو وہ رینگتا ہوا گڑھے سے نکلا اس نے زخم پر رومال باندھ لیا تھا۔ مگر ابھی اس کے لئے زمین پر پاؤں رکھنا ممکن نہیں تھا۔ دن نکل آیا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح ایک مضبوط لکڑی تلاش کر لی اور اس کے سہارے سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔ زخمی پاؤں کے ساتھ یہ کام بے حد مشکل تھا مگر وہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ دو کلومیٹر کا فاصلہ اس نے دو گھنٹے میں طے کیا تھا۔ سڑک تک پہنچتے پہنچتے اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ وہاں سے گزرنے والے کسی انسان دوست شخص نے اسے اسپتال تک پہنچایا۔ جہاں اس کی جیب سے نکلنے والے آرمی کارڈ کی مدد سے کرنل سے رابطہ ہوا۔ کرنل آ کر اسے فوری طور پر سی ایم ایچ لے گیا تھا، رحمت خان نے اسے خود پر گزرنے والی کہہ سنائی۔ کرنل کو غصہ آ گیا تھا۔

"میں ان لوگوں کے خلاف ایف آئی آر درج کراؤں گا۔"

"بے کار ہے کرنل صاحب...... یہ طاقتور لوگ ہیں۔ پولیس اور انتظامیہ ان کی مٹھی میں ہے۔"

رحمت خان نے دکھ سے کہا۔ "مجھے اپنے ماں باپ کی فکر ہے نہ جانے ان کا کیا حال ہوا ہو گا؟"

کرنل نے ایف آئی آر درج کروائی تھی لیکن پولیس نے نامعلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر درج کی

تھی۔ رحمت خان حملہ آوروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے ان کے چہرے تک نہیں دیکھے تھے اور پولیس بغیر کسی ثبوت کے ایف آئی آر میں پیر بادشاہ یا اس کے کسی آدمی کا نام شامل کرنے کے لئے تیار نہیں تھی اور وہیں کرنل کو پتا چلا تھا کہ رحمت خان کے ماں باپ مکان میں اتفاقاً آگ لگنے سے جل کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ رحمت خان کو پتا چلا تو وہ رونے لگا۔ ”کرنل صاحب ان ظالموں نے ہی میرے ماں باپ کو مارا ہے۔“

”تم فکر مت کرو...... ہم انہیں کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔“

لیکن جلد کرنل کو بھی اندازہ ہو گیا کہ پیر بادشاہ کتنی طاقت رکھتا تھا یہ پورا علاقہ اس کے حلقہ اثر میں تھا اور سیاست دان ووٹروں کے لئے اس کے محتاج تھے۔ اس کے خلاف کارروائی کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی، اس لئے رحمت خان پر حملے اور اس کے ماں باپ کے قتل کا معاملہ دب گیا۔ پولیس نے تفتیش سرے سے کی ہی نہیں تھی اور چند مہینے بعد دونوں کیسوں کی فائلیں بھی داخل دفتر کر دی گئی تھیں۔ رحمت خان چند دن بعد اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ کرنل اور اس کی بیوی نے رحمت خان اور اس کی بیوی کو اپنے پاس رکھا لیکن جب وہ مکمل صحت مند ہو گیا تو انکشاف ہوا کہ ٹخنے کی ہڈی میں کمزوری کے سبب وہ فوج میں مطلوبہ معیار کا حامل نہیں رہا تھا اور اسے میڈیکل پر ریٹائر کیا جا رہا تھا۔ یہ رحمت خان کے لئے ایک اور صدمہ تھا اس کی ملازمت کرتے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اس لیے اسے معمولی سی رقم ملی تھی۔ اسے کسی اور جگہ ملازمت کرنی پڑتی یا گاؤں جا کر کوئی کام کرنا پڑتا۔ کرنل نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ اسے شہر میں کسی جگہ ایڈجسٹ کرا دے گا مگر رحمت ان کی بدقسمتی کہ کرنل کا تبادلہ اچانک ہی ہوا تھا اور وہ جانے سے پہلے رحمت خان کی ملازمت کا بندوبست نہ کر سکا تھا۔

اب رحمت خان بے یار و مددگار تھا۔ گاؤں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہاں وہ درندے اب بھی دندناتے پھر رہے تھے جو اس کے ماں باپ کا لہو پی چکے تھے۔ مگر اس کے پاس گاؤں کے سوا اور کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ اس نے نور بی بی کو لیا اور گاؤں آ گیا۔ اس کا مکان جلا تھا لیکن زمین تو اس کی تھی۔ چند دن ایک رشتے دار کے ہاں رہ کر اس نے اپنا مکان مرمت کیا اور نور بی بی کے ساتھ وہاں آ ٹھہرا۔ چند جانور تھے، اپنے پاس موجود رقم سے اس نے مزید بکریاں لے لی تھیں۔ گاؤں والوں کے پاس کاشت کے لئے موزوں زمین کم تھی اور زیادہ تر لوگوں کا پیشہ جانور پالنا تھا۔

شروع میں رحمت خان اور نور بی بی بے حد خوف زدہ رہتے تھے۔ ہر لمحے یہ خدشہ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی پیر بادشاہ کے آدمی آئیں گے اور اس کے بعد ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مگر جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور کوئی نہیں آیا تو ان کے خدشات بھی کم ہونے لگے تھے۔ چند مہینے بعد وہ اس خوف سے خاصی حد تک آزاد ہو گئے۔ رحمت خان اور نور بی بی کی خواہش تھی کہ اللہ انہیں اولاد سے نوازے۔ دونوں صحت مند تھے...... کوئی خرابی یا کمی نہیں تھی، بس قدرت کی طرف سے دیر تھی۔ یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اولاد کس طرح ان کا نصیب ہو گی۔

اس روز بے پناہ سردی تھی۔ انہیں گاؤں آئے پانچواں مہینا تھا۔ رحمت خان اور نور بی بی سر شام گھر میں دبک گئے تھے۔ انگیٹھی اور رضائی سے خود کو گرم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک رحمت خان کے صحن میں آہٹ ہوئی۔ بکریاں بولنے لگی تھیں۔ وہ دیکھنے کے لئے باہر نکلا ہی تھا کہ کسی نے اس کے سر پر وار کیا اور وہ ہوش

حواس سے بیگانہ ہوگیا۔اس کی کراہ سن کر نور بی بی باہر آئی اور اسے دو افراد نے پکڑ لیا اسے چلانے کا موقع بھی
نہیں ملا اور چلاتی بھی تو کون سنتا! نزدیکی گھر بھی سو فٹ کے فاصلے پر تھا اور اس سردی میں سب دروازے
کھڑکیاں بند کر کے بیٹھے تھے۔اس پر کوئی سن بھی لیتا تو اس کی مدد کے لئے نہیں آ سکتا تھا۔رحمت خان بے ہوش
پڑا تھا، آنے والے ان دونوں کو اندر لے آئے۔انہیں دیکھتے ہی نور بی بی جان گئی تھی کہ وہ جس برے وقت سے
ڈر رہے تھے وہ وقت آ گیا تھا۔

انہوں نے نور بی بی کا منہ بند کیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے اندر چار پائی پر لا پھینکا اور رحمت
خان کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔اس کے بعد مرشد علی اندر آیا تھا۔نور بی بی اس کے عزائم جان گئی تھی
لیکن مزاحمت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے اس رات کو کئی بار مری اور کئی بار زندہ ہوئی۔ جب مرشد اسے روند کر
فاتحانہ چال سے واپس گیا تو اس کے کتوں نے یلغار کر دی۔نور بی بی ساری رات موت کی دعائیں مانگتی رہی
لیکن موت ابھی تقدیر میں نہیں تھی۔ رحمت خان کو ہوش آیا تو طوفان آ کر جا چکا تھا لیکن اس کی ساری زندگی اور
خوشیاں تہ و بالا کرنے کے بعد......لٹی پٹی نور بی بی اندر بے ہوش پڑی تھی اور اس کی حالت چیخ چیخ کر بتا رہی تھی
کہ اس پر کیا گزری ہے۔اپنے نصیبوں کو روتے ہوئے رحمت خان نے نور بی بی کو لباس پہنایا اور اسے ہوش میں
لانے کی کوشش کرنے لگا۔بکری کا دودھ گرم کر کے نور بی بی کے حلق میں ٹپکانے سے خاطر خواہ نتیجہ نکلا تھا اور وہ
ہوش میں آنے لگی۔

نور بی بی ہوش میں تو آئی لیکن حواس سے بیگانہ رہی تھی۔ ہوش میں آتے ہی وہ چلانے اور ہاتھ پاؤں
چلانے لگتی تھی۔ جیسے کسی نادیدہ وجود کے خلاف مزاحمت کر رہی ہو۔ دو دن اس کی یہی حالت رہی تھی۔ رحمت
خان اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بار بار بکھر جاتی تھی۔ بے آبروئی اور ذلت کے احساس نے اس کا
دماغ الٹ دیا تھا۔تیسرے دن رحمت خان کی کوششوں سے اس کی حالت سدھرنے لگی تھی۔ جب نور بی بی کو صحیح
معنوں میں ہوش آیا تو اس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ اس نے چھت کو سنبھالنے والی لکڑی کے ڈنڈے
(بلی) سے چادر باندھ کر خود کو پھانسی دینا چاہی تھی لیکن رحمت خان بروقت آ گیا تھا۔اس نے نور بی بی کو بچا لیا۔
اس کے بعد سے وہ اس کی کڑی نگرانی کرنے لگا۔ ایک ہفتے تک وہ گھر سے ہی نہیں نکلا، اپنے جانور اس نے
اپنے ایک چچازاد کے سپرد کر دیئے تھے، وہ چرا کر لے آتا تھا، بدلے میں رحمت خان اسے نصف دودھ دے دیا
کرتا تھا۔

رفتہ رفتہ نور بی بی کی حالت سدھرنے لگی۔ وہ زیادہ تر چپ پڑی رہا کرتی تھی لیکن کبھی اس سانحے کی
پرچھائیاں اسے تنگ کرتی تھیں تو اس کا دماغ الٹ جاتا تھا اور وہ چیخنے چلانے اور ہنگامہ کرنے لگ جاتی تھی۔
ت خان کا خیال تھا کہ ان پر گزرنے والے سانحے کی گاؤں میں کسی کو خبر نہیں ہے۔ ورنہ اب تک اس کا جینا
ام ہو چکا ہوتا۔ گاؤں والوں کو اس نے یہی بتایا تھا کہ نور بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس پر دورے پڑنے
ہیں۔ گاؤں کی عورتیں اسے دیکھنے آتی تھیں تب بھی روایت کے خلاف رحمت خان ان کے پاس موجود رہا
تا تھا اسے ڈر تھا کہ کبھی نور بی بی پر دورہ پڑ جائے اور وہ راز فاش کر دے۔ایک روز چند عورتیں آئی ہوئی تھیں
ور بی بی کی طبیعت خراب ہو گئی لیکن اسے دورہ نہیں پڑا تھا بلکہ چکر آنے لگے تھے اور متلی ہو رہی تھی۔ ایک

بوڑھی اور تجربے کار عورت نے رحمت خان سے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے تُو باپ بننے والا ہے...... جا کر دائی کو بلا لا۔''

سانحے کو گزرے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ رحمت خان کے اندر خدشات سرسرانے لگے۔ اگر نور بی بی ماں بننے والی تھی تو کیا یہ اس کا بچہ تھا یا اس وحشت کا نتیجہ جو نور بی بی نے سہی تھی۔ دائی نے بھی تصدیق کر دی کہ نور بی بی ماں بننے والی تھی۔ رحمت کے خدشات برقرار رہے تھے۔ یہ ایک اور اذیت ناک بات تھی۔ اس سانحے سے صرف دو دن پہلے انہوں نے ازدواجی فرض ادا کیا تھا۔ ابھی یہ ذہنی اذیت کم نہیں ہوئی تھی کہ رحمت خان نے محسوس کیا کہ وہ گاؤں سے گزرتا ہے تو لوگ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ایک روز اس نے اپنے بچپن کے دوست جمال کو پکڑ لیا۔ ''جمال! یہ گاؤں والے مجھے ایسے کیوں دیکھتے ہیں جیسے مجھ سے کوئی قصور ہوا ہو؟''

جمال نے بھی اسے انہی نظروں سے دیکھا تھا۔ ''تو کیا تُو نہیں جانتا کہ گاؤں میں تیرے اور تیری گھر والی کے بارے میں کیا خبریں پھیل رہی ہیں؟''

''نہیں۔'' رحمت خان لرز گیا تھا۔ ''کیسی خبریں؟''

جمال نے اسے افسوس سے دیکھا۔ ''سارا گاؤں جانتا ہے، تیرے گھر ڈاکو گھسے تھے اور تیری گھر والی کی......''

''جمال....'' رحمت نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''رحمت! تُو کس کس کا گریبان پکڑے گا۔'' جمال نے اپنا گریبان چھڑا لیا۔ ''پورا گاؤں یہی بات کہہ رہا ہے بلکہ لوگ تو اور بھی بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''چھوڑ رحمت خان...... تُو سچ سن نہیں سکتا۔'' جمال نے تلخی سے کہا۔ ''اس بار شاید تُو میرا گلا پکڑ لے گا۔''

رحمت خان کا سر جھک گیا۔ ''نہیں جمال تُو بول۔''

''گاؤں میں یہ بات پھیلی ہے کہ نور بی بی کا بچہ...... تیرا نہیں ہے۔''

''یہ بکواس ہے۔'' رحمت خان نے کربناک آواز میں کہا۔ ''نور پر بہتان ہے۔''

جمال نے کچھ نہیں کہا۔ رحمت خان کو ترحم آمیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد گاؤں کا ہر فرد اسے ایسے ہی دیکھنے لگا تھا۔ وہ اور نور بی بی اچھوت بن کر رہ گئے تھے۔ کوئی اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا، اس کے پاس آنے سے گریز کرتا تھا۔ گھر میں آنا جانا بند کر دیا تھا۔ نور بی بی باہر نہیں جاتی تھی۔ البتہ رحمت خان کی مجبوری تھی، وہ باہر جانے اور لوگوں کا سامان کرنے پر مجبور تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی نور بی بی کی طرح گھر بیٹھ جائے لیکن اس صورت میں وہ کیا کرتے اور کہاں سے کھاتے! جیسے جیسے ولادت کا وقت قریب آ رہا تھا، گاؤں میں رہنا ان کے لئے دشوار ہو رہا تھا۔ کئی افراد نے رحمت خان کو مشورہ دیا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ پھر ایک روز گاؤں کے سرپنچ وفد بنا کر آئے اور رحمت خان سے مطالبہ کیا۔ ''اس گاؤں سے چلے جاؤ۔''

''کیوں؟'' رحمت خان چلا اٹھا۔''میں کیوں جاؤں اپنے باپ دادا کی زمین سے۔''

''کیونکہ اب تم اور تمہاری بیوی یہاں رہنے کے قابل نہیں رہے ہو۔''انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔

رحمت خان نے ان کے پتھر چہروں کو دیکھا اور سمجھ گیا۔ وہ فیصلہ کر کے آئے تھے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔ ان سے التجا کرنے لگا کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دیں مگر پہاڑوں میں رہنے والوں کے دل بھی پتھر ہو گئے تھے۔ انہوں نے رحمت خان کو ایک ہفتے کی مہلت دی کہ اپنا سامان سمیٹ کر گاؤں سے نکل جائے ورنہ وہ اسے خود زبردستی نکال دیں گے۔ رحمت خان نے اس فیصلے کے خلاف شور کیا۔ منتیں کیں۔ پیروں تک میں پڑ گیا لیکن کسی نے رحم نہیں کیا۔ ایک ہفتے بعد وہ نور بی بی اور اپنا سامان لے کر گاؤں سے نکل گیا تھا پھر اس نے کسی بھی آبادی سے دور اس ویرانے میں اپنا آشیانہ بنایا تھا۔ بھاگ بھری وہیں پیدا ہوئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بھاگ بھری اس کی اولاد ہے یا نہیں اور نہ ہی اس نے کبھی اس بارے میں سوچا تھا۔ وہ بھاگ بھری سے اتنی ہی شدت سے محبت کرتا تھا جتنی شدت سے کوئی باپ اپنی بیٹی سے کر سکتا ہے۔ نور بی بی کا ذہنی توازن کسی قدر بہتر ہوا تھا لیکن کبھی کبھی وہ سنک جاتی تھی اور چیخنے چلانے لگتی تھی۔ گزشتہ ایک سال سے وہ کچھ زیادہ ہی بیمار رہنے لگی تھی۔

☆======☆======☆

میں نے غور سے رحمت خان کی طرف دیکھا۔ اس کی داستان دکھ بھری تھی۔ ایسی داستانیں عام ہیں۔ کب سے دیکھتا اور سنتا آ رہا ہوں لیکن رحمت خان کی اس داستان کا تعلق مجھ سے تھا۔ بے شک جو نور بی بی کے ساتھ ہوا، اس کا ذمے دار میں نہیں تھا لیکن جو کچھ بھاگ بھری کے ساتھ ہو چکا تھا یا ہونے والا تھا، اس کا کسی حد تک ذمے دار میں تھا۔ رحمت خان نے اپنے آنسو خشک کیے۔''ایسا لگتا ہے وقت خود کو دہرا رہا ہے۔ پہلے جو ظالم تھے وہ آج بھی ظالم ہیں اور جو ان کے ظلم کا شکار ہوئے تھے، وہ آج بھی ان کے ظلم کا شکار ہیں۔''

''رحمت خان اللہ سے بہتری کی امید رکھو...... وہی انسان کی بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''پتا نہیں...... وہ ہماری کیوں نہیں سنتا۔'' رحمت خان کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''ایسا مت کہو...... خدا سب کی سنتا ہے...... انسان یہ بات سمجھتا نہیں ہے۔''

رحمت خان نے سر ہلایا اور تھکے قدموں سے کوارٹرز کی طرف بڑھ گیا تھا، جہاں کوٹھی میں کام کرنے والے ملازمین رہا کرتے تھے۔ میں بھی اندر آ گیا کچھ دیر بعد حکیم مالش کرنے آ گیا۔ اس نے مالش اور تقریری کی اور مجھے گرم پانی کا پیالہ دے کر رخصت ہو گیا۔ اب گرم پانی کا پیالہ اس کا نائب مالش کے فوراً بعد لے آتا تھا تا کہ مالش ختم ہوتے ہی گرم پانی میں ڈال دوں۔ نہ جانے حکیم کون سا تیل استعمال کرتا تھا کہ جب وہ مالش ختم کرتا تھا تو میرا ہاتھ بالکل خشک ہوتا تھا ذرا بھی چکنائی باقی نہیں رہتی تھی۔ پندرہ منٹ تک پانی میں ہاتھ رکھ کر حرکت دینے کے بعد میں نے اسے ایک چھوٹے سے تولیے میں لپیٹ لیا تا کہ ہوا سے محفوظ رہے۔ میرے ہاتھ کی کارکردگی بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے مختلف وزنی اشیاء اس ہاتھ سے اٹھانے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی کہ جو وزن پہلے میں اس ہاتھ سے نہیں اٹھا پاتا تھا وہ وزن اب میں با آسانی اٹھا رہا تھا۔ آنے والے حالات ایسے تھے کہ میں ذہنی اور جسمانی طور پر مضبوط ہوتا، ان کا اتنا ہی بہتر طور پر سامنا کر سکتا تھا۔ میں اپنی جنگ خود لڑنا

چاہتا تھا۔

☆======☆======☆

جیپ جی ٹی روڈ پر پوٹھوہار کے علاقے سے نکل کر پنجاب کے میدانی علاقے کی طرف رواں تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک تقریباً چالیس برس کا مضبوط اور سخت جان نظر آنے والا شخص بیٹھا تھا۔ وہ میرے لئے اجنبی تھا اور میں نے اسے پہلی بار اس جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھا تھا۔ چند گھنٹے پہلے میں ایکسر سائز اور غسل سے فارغ ہو کر آرام کر رہا تھا، اچانک وسیم کمرے میں آیا۔ ”جناب ہمیں یہاں سے روانہ ہونا ہے...... آپ کو ایک اور جگہ منتقل کیا جا رہا ہے۔ میرے ساتھی جو سفیر صاحب اور مونا کو چھوڑنے گئے تھے۔ وہ واپس آ چکے ہیں اور امکان ہے کہ سفیر صاحب بھی یہاں آنے کی کوشش کریں گے۔“

”کوشش؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

”میرے ساتھیوں نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان کی روانگی کے چند گھنٹے بعد سفیر صاحب کو آپ کی جانب سے ایک رقعہ ملے گا جس میں انہیں حویلی میں رہنے اور شہر کی طرف نہ آنے کی ہدایت کی گئی ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ اب کیا کرنا ہے؟“

”ہم یہ کوٹھی خالی کر کے جا رہے ہیں، ممکن ہے سفیر صاحب یہاں آ جائیں۔“

”میرا غائب ہونا ضروری ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”گاڑی تیار ہے، حکیم اور اس کا نائب بھی آپ کے ساتھ جائے گا۔“

یہ پرانے ماڈل کی خاصی بڑی سی جیپ تھی جس کے عقبی حصے میں مقامی ساختہ فولاد سے بنا کیبن تھا، اس پر سرخ رنگ کیا گیا تھا۔ جیپ کے سامنے والے حصے میں خاصا بھاری بھرکم بونٹ تھا اور اس کے آگے فولادی گرل لگی تھی۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھا جو میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ ”ہمیں کہاں جانا ہے؟“

اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”اس کا مجھے بھی علم نہیں ہے...... یہ بندوبست راجا صاحب کا ہے۔ بس اتنا پتا ہے، آپ کو پنجاب کے میدانی علاقے میں کہیں جانا ہے۔“

”میں جانے سے پہلے راجا صاحب سے بات کرنا چاہوں گا۔“

درحقیقت میں اپنے ساتھ کئے جانے والے اس کھلونا سلوک سے بیزار ہو گیا تھا۔ یہ لوگ مجھے اپنی مرضی سے حرکت دے رہے تھے اور میری آزادی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وسیم نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے آئیں...... میں بات کراتا ہوں۔“

وسیم نے رابطے کے لئے سیلائٹ فون استعمال کیا تھا، اس کی کال ٹریس کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے وسیم نے سیلائٹ فون سے کال کی تھی۔ راجا صاحب کے پاس شاید ایسا ہی فون تھا۔ راجا صاحب سے بات کر کے وسیم نے فون میری طرف بڑھایا۔ ”ہیلو راجا صاحب...... میں اپنی منزل کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“ میں نے بلا تمہید کہا۔

”منزل کا تمہیں ڈرائیور بتا دے گا۔“

”راجا صاحب میں اس معاملے میں......“ میں نے تیز لہجے میں کہنا چاہا۔

''برخوردار صبر کرو...... اور حالات کے مطابق عمل کرو...... فی الحال شہر میں رہنا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔'' راجا نے میری بات کاٹ کر نرمی سے کہا۔

''راجا صاحب...... میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ میرے لئے یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں......''

''میری کہانی ابھی نامکمل ہے۔ جب یہ مکمل ہوگی تو تم سمجھ جاؤ گے اور جان جاؤ گے۔''

''یہ کہانی کب تک مکمل ہوگی؟''

راجا عمر دراز ہنسا۔ ''ہو جائے گی، ابھی حالات اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ ممکن ہے مجھے اپنے علاقے کی طرف واپس جانا پڑے۔''

راجا نے کال بند کر دی۔ میں نے فون وسیم کی طرف بڑھا دیا۔ ''مونا اور سفیر محفوظ ہیں۔ میں بھی کسی محفوظ مقام کی طرف جانے والا ہوں...... لیکن یہاں کے معاملات کا کیا ہوگا۔ خاص طور سے مجھے ندیم کی فکر رہے گی۔''

''ندیم صاحب کی آپ فکر نہ کریں۔ میرے چار آدمی مستقل ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔''

ان لوگوں نے مجھے کپڑے اور ذاتی استعمال کا دوسرا سامان مہیا کر دیا تھا۔ یہ سامان اب ایک سوٹ کیس میں میرے ساتھ تھا۔ روانگی سے کچھ پہلے حکیم قادس اور اس کا نائب اپنا سامان سنبھالے ہوئے آئے اور جیپ کے عقبی حصے میں سوار ہو گئے۔ میں نے احتیاطاً پی کیپ کے ساتھ ایک زیرو کی عینک لے لی تھی۔ ہم تاریکی پھیلنے کے بعد روانہ ہوئے تھے۔ جب ڈرائیور نے موٹر وے کے بجائے جی ٹی روڈ کا رخ کیا تو میں نے اندازہ لگایا کہ ہمیں وسطی پنجاب سے پہلے کہیں جانا ہے۔ راستے میں صادق نے بھی تصدیق کر دی تھی۔ ڈرائیور کا نام صادق تھا۔

''ہمیں جہلم کے پاس ایک جگہ جانا ہے۔'' اس نے کہا۔

عقبی نشست پر حکیم قادس اور اس کے نائب کے ساتھ ایک محافظ سب سے پچھلے حصے میں موجود تھا۔ صادق کے بارے میں وسیم نے بتایا تھا کہ وہ بھی تربیت یافتہ، لڑاکا اور مسلح ہے۔ ان لوگوں کے پاس اسلحہ تھا اور مجھے اطمینان تھا کہ ناگہانی طور پر کہیں دشمن سے سامنا ہو بھی گیا تو ہم اس کے مقابلے میں ہلکے نہیں پڑیں گے۔ روانگی سے پہلے صادق کہہ رہا تھا کہ راستے میں رکنے کا خطرہ کم سے کم مول لینا ہوگا، اس لئے ہم تمام ضروریات سے فارغ ہو کر چلیں۔ کھانے کے لئے وسیم کی اس کوٹھی کے باورچی نے پیکٹس بنا دیئے تھے۔ ان میں دوران سفر آسانی سے کھائی جانے والی اشیاء تھیں جیسے برگر، سینڈوچز، فرائز اور روسٹ وغیرہ۔ جب ہم کوٹھی سے نکلے تو صادق بڑی محتاط ڈرائیونگ کر رہا تھا، اسلام آباد کی حدود میں اس نے کوئی ایسا رسک نہیں لیا تھا کہ ٹریفک پولیس کو اسے روکنے کا موقع ملے۔ ساتھ ہی وہ بار بار عقبی آئینے پر نظر ڈال رہا تھا۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''کیا کوئی تمہارا تعاقب کر رہا ہے؟''

''نہیں...... پر خطرہ ہے جناب۔'' صادق نے اپنی مخصوص بھاری آواز میں کہا۔

''جی ٹی روڈ پر آنے کے کچھ دیر بعد مجھے ایک سیاہ لانسر کار کافی دیر تک جیپ کے عقب میں نظر آتی رہی۔''

''اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے صادق سے کہا۔

''ممکن ہے جناب۔'' وہ بولا۔

لیکن نصف گھنٹے بعد لانسر کار کہیں پیچھے رہ گئی اور باقی سفر میں ایسی کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تھی جس پر تعاقب کا شبہ کیا جا سکتا۔ دو گھنٹے بعد ہم نے دوران سفر کھانا کھایا۔ پینے کے لئے پانی کے ساتھ کولڈ ڈرنک اور چائے بھی تھی۔ جہلم کے پاس پہنچ کر صادق نے جی ٹی روڈ چھوڑ دی اور ہم ایک کچی سڑک پر آ گئے، اس کے ساتھ ہی سفر کا مشکل مرحلہ بھی شروع ہو گیا۔ اس سڑک پر کبھی اچھا اور صاف راستہ آ جاتا اور کبھی ایسے جھٹکے لگتے کہ ہڈیاں کڑکڑا اٹھتی تھیں۔

''یار اس بیگم پور تک جانے کے لئے کوئی آسان راستہ نہیں ہے۔'' میں نے صادق سے کہا۔

''وہ آہستہ سے ہنسا۔'' اگر ہوتا تو میں اُدھر سے نہ لے جاتا...... ویسے فکر نہ کریں...... یہ زیادہ طویل نہیں ہے کچھ دیر بعد ہم صاف سڑک پر ہوں گے۔''

اس کی بات درست نکلی۔ نصف گھنٹے بعد ہم ایک نسبتاً بہتر سڑک پر تھے اور ابھی تک پوٹھوہار کے علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ اگر چہ اس علاقے میں اب میدانی جھلک نمایاں تھی بہ نسبت ناہموار زمین کے۔ گندم کے پودے کھیتوں میں بالشت بھر اونچے ہو رہے تھے۔ چاندنی میں کھیت قالین کی طرح ہموار لگتے۔ اچانک جیپ لڑکھڑانے لگی۔ صادق نے تیز رفتاری کے باوجود پھرتی سے بریک لگا کر جیپ کو قابو کر لیا۔ اس نے جیپ ایک طرف کر کے روکی اور نیچے اتر کر دیکھا۔ ''ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔'' اس نے اطلاع دی اور عقبی حصے سے جیک اور اسٹپنی نکالنے لگا۔ میں بھی نیچے اتر آیا تھا۔ یہ جگہ کھیتوں کے درمیان میں تھی اور خاصے فاصلے پر ایک اونچی جگہ کوئی آبادی تھی اس کی روشنیاں یہاں سے نظر آ رہی تھیں۔ صادق ایک گارڈ کی مدد سے پنکچر ہونے والا ٹائر بدل رہا تھا۔ میں سڑک کنارے ٹہلنے لگا تھا۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔

حکیم قادس اتر کر ایک طرف استادہ چند درختوں کی طرف بڑھا۔ میں نے اسے روکا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

نائب نے کھڑکی سے سر نکال کر بتایا۔ ''حکیم صاحب حوائج ضروریہ کے لئے جا رہے ہیں۔''

میں نے راستہ چھوڑ دیا۔ ''ضرور جائیں...... لیکن زیادہ دیر نہ لگائیں ابھی ہم نے مزید سفر کرنا ہے۔''

حکیم قادس درختوں میں چلا گیا تھا۔ میں پلٹ کر صادق کی طرف آیا جو اتارے جانے والے ٹائر کی جگہ دوسرا لگا رہا تھا۔ ''اگر مزید کوئی ٹائر پنکچر ہو گیا تو......''

''ایک اور ہے...... اس کے بعد اللہ مالک ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

اسے ٹائر بدلنے میں دس منٹ لگے تھے۔ جیک اور ٹائر اندر رکھنے کے بعد اس نے سڑک کے کنارے کھیتوں میں بہنے والے پانی سے ہاتھ دھوئے۔ میں نے درختوں کی طرف دیکھا۔ ''یہ حکیم نہیں آیا اب تک۔''

صادق نے ایک گارڈ سے کہا۔ ''یار جا کر اسے بلا ابھی ایک گھنٹے کا سفر ہے۔''

گارڈ نے نزدیک جا کر حکیم قادس کو آواز دی۔ تین چار بار پکارنے کے بعد اس نے خود درختوں میں جھانکا اور بدحواسی میں چلایا۔ ''حکیم یہاں نہیں ہے۔''

میں اور صادق بیک وقت درختوں کی طرف لپکے تھے۔ یہ یوکلپٹس کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا دس بارہ تنوں کے درمیان روشنی کم تھی لیکن اتنی کم بھی نہیں کہ حکیم قادس نظر نہ آتا۔ وہ درختوں کے پیچھے نہیں تھا۔ میں نے

اسے آواز دی۔ صادق بھی چلایا۔ ہمارے پیچھے حکیم کا نائب بھی دوڑا آیا تھا۔ وہ بھی بدحواسی میں اسے پکارنے لگا۔ میں نے صادق کی طرف دیکھا۔ ''گارڈ کو ہوشیار کردو اور کوئی ٹارچ ہے تو وہ بھی لے آؤ۔''

صادق جیپ کی طرف بھاگا تھا۔ میں نے جھنڈ کا جائزہ لیا۔ یہ بات تو طے تھی کہ حکیم سامنے والی طرف سے نہیں نکلا تھا۔ ورنہ سب اسے دیکھ سکتے تھے۔ وہ جھنڈ کے عقبی حصے سے کہیں گیا تھا اور حکیم خود کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہمیں روانہ ہونا ہے۔ اس جھنڈ کے عقب میں کوئی پچاس گز تک ہموار کھیت تھا اس کے بعد جھاڑیاں تھیں جن کا سلسلہ دور واقع جنگل سے جا کر مل رہا تھا۔ صادق ٹارچ اور دونوں گارڈز بھی لے آیا۔ میں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''جیپ کے پاس کوئی رہے، اسے اکیلا مت چھوڑنا۔''

صادق نے ایک گارڈ اور حکیم کے نائب کو واپس جیپ کی طرف بھیج دیا۔ ہوشیار رہو اگر کوئی جیپ کی طرف آنے کی کوشش کرے تو ہوائی فائر کر کے ہمیں خبردار کر دینا۔''

اس دوران میں، مَیں ٹارچ کی تیز روشنی میں جھنڈ کے اندر زمین کا جائزہ لے رہا تھا۔ زمین سخت تھی اور اس پر پیروں کے نشانات نہیں تھے پھر روشنی میں کوئی شے چمکی تھی۔ میں نے آگے ہو کر دیکھا یہ سیاہ چمک دار پتھروں کی مالا تھی جو میں نے بارہا حکیم کے گلے میں دیکھی تھی۔ اس وقت یہ مالا بکھر گئی تھی۔ اب بالکل واضح تھا کہ حکیم قادس کو زبردستی کہیں لے جایا گیا تھا۔ مگر اسے کون لے جا سکتا تھا اور وہ بھی اتنی خاموشی کے ساتھ کہ بالکل نزدیک ہونے کے باوجود ہم بے خبر رہے۔ یہی بات صادق سوچ رہا تھا۔

''شہباز صاحب مجھے کسی گڑبڑ کی بو آ رہی ہے.....کوئی ہماری بے خبری میں ہمارا تعاقب کرتا رہا ہے۔''

''مگر کیسے.....اس پورے سفر کے دوران مجھے کوئی گاڑی اپنے پیچھے آتی نظر نہیں ہوئی اور جی ٹی روڈ سے اترنے کے بعد تو سرے سے کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔''

''جناب تعاقب اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن پہلے ہی ہماری منزل سے واقف ہو اور راستے میں گھات لگائے بیٹھا ہو۔''

صادق کی بات میں وزن تھا۔ ''کیا تم مطلوبہ مقام تک جانے کے لئے اس راستے سے جاتے یا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی ہے؟''

''اس کے علاوہ بھی کئی راستے ہیں لیکن سب سے موزوں راستہ یہی ہے۔''

میں فکرمند ہو گیا تھا۔ ''صادق اگر تمہاری بات درست ہے تو ہم پوری طرح دشمن کی نظروں میں ہیں۔ حکیم کو غائب کرنے والے اب ہماری فکر میں ہوں گے۔''

''ممکن ہے اسے غائب کر کے دشمن نے ہمارے لئے جال بنایا ہو۔ ہم حکیم کی تلاش میں نکلیں اور اس جال میں پھنس جائیں۔''

''اس کے باوجود ہمیں حکیم قادس کو تلاش کرنا ہے۔''

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''کیا تمہارے پاس کوئی فاصل ہتھیار ہے۔''

دونوں گارڈز خودکار رائفلوں سے مسلح تھے۔ جبکہ صادق کے پاس شاٹ گن تھی اس نے اپنے کرتے میں

ہاتھ ڈالا اور ایک اعشاریہ اڑتیس کا اسمتھ اینڈ ولسن پستول نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

''اس کے فاضل میگزین ہیں؟'' میں نے پستول چیک کر کے پوچھا۔

اس بار صادق نے ایک اضافی میگزین دیا۔ ''پہلے میں جاؤں گا۔ کسی حملے کی صورت میں تم مجھے کور دو گے۔'' میں نے صادق سے کہا۔ ''جب میں اشارہ کروں تو باری باری آنا۔''

میں ٹارچ اور پستول سنبھالتا کھیت سے ہوتا جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ بعض جگہوں سے گندم کی فصل دبی ہوئی تھی جیسے اس پر کچھ لوگ گزرے ہوں۔ نشانات تازہ تھے اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ حکیم قادس کو لے جانے والے کم سے کم دو افراد تھے۔ جھاڑیوں تک خیریت سے پہنچ کر میں نے صادق کو اشارہ کیا۔ پہلے وہ اور اس کے بعد گارڈ بھی میرے پاس پہنچ گئے تھے۔ ''ہمیں خاموشی سے پھیل کر آگے بڑھنا ہوگا۔'' میں نے سرگوشی کی۔ ''ٹارچ کو بجھا دو۔''

صادق نے بھی ٹارچ اٹھا رکھی تھی۔ اس نے ٹارچ بجھائی اور دائیں طرف سے جھاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ گارڈ میرے بائیں طرف تھا۔ ہم خاموشی سے جھاڑیوں میں آگے بڑھنے لگے۔ حکیم قادس کو اغوا کرنے والے ماہر اور پیشہ ور قسم کے لوگ لگ رہے تھے انہوں نے اتنی صفائی سے کام کیا تھا کہ ہمیں ذرا بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ہم حکیم کو واپس حاصل کر پائیں گے۔ اسے لے جانے والے اتنی دیر میں نہ جانے کہاں نکل گئے ہوں گے۔ بس ایک امید کے سہارے میں نے حکیم قادس کو تلاش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ مل جاتا۔

جھاڑیوں والی پٹی کوئی نصف کلومیٹر چوڑی تھی اور اس سے آگے ناہموار زمین تھی جو چھوٹے، بڑے اور بہت بڑے درختوں سے چھپی ہوئی تھی۔ اس جگہ جابجا برگد اور پیپل کے درخت موجود تھے اور ان کی وجہ سے جنگل کا تاثر بن رہا تھا۔ ورنہ دوسرے درخت جھاڑی نما تھے۔ اچانک مجھے بائیں طرف ہلکی سی آواز آئی۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ میں تمیز کرنے سے قاصر تھا کہ آواز کسی انسان کے منہ سے نکلی ہے یا اس کا مخرج کچھ اور تھا۔ اس طرف گارڈ تھا۔ میں سامنے جانے کے بجائے محتاط قدموں سے بائیں طرف بڑھا۔ سب سے پہلے مجھے گارڈ کے پاؤں نظر آئے۔ وہ زمین پر پڑا تھا۔ کم سے کم اس کے جوتوں کی پوزیشن سے یہی لگ رہا تھا۔ میں تیزی سے پلٹا اور گھوم کر دوسری طرف سے گارڈ کی طرف آیا۔ ایک سیاہ پوش چھلاوے کی طرح درختوں میں غائب ہو رہا تھا اور گارڈ زمین پر اس طرح پڑا تھا کہ اس کی پشت پر عین دل کے مقام پر ایک سادہ دستے والا خنجر پیوست تھا اور وہ مر چکا تھا۔ میں نے چھلاوے پر فائر کیا اور چلایا۔ ''صادق ہوشیار...... حملہ ہوا ہے۔''

صادق بھاگتا ہوا جھاڑیوں سے نمودار ہوا اور گارڈ کو دیکھ کر اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

''اسے کیا ہوا؟''

''کسی نے قتل کر دیا ہے۔ میں نے اسے درختوں میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔'' میں نے نائب سے کہا۔ اچانک مجھے احساس ہوا میں اور صادق کتنی غیر محفوظ جگہ پر کھڑے تھے۔ اس جگہ چاندنی تھی اور ہمیں دور سے بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ ''اس جگہ سے ہٹو...... ہم دشمن کے نشانے پر ہیں۔'' میں نے کہا اور جھاڑیوں کی آڑ میں ہو گیا اسی لمحے فائر ہوا اور میں نے صادق کو اپنا سینہ تھام کر اوندھے منہ گرتے دیکھا تھا۔ فائر کی آواز سنتے ہی

میں بھی زمین پر گر گیا تھا اور رینگتا ہوا جنگل کے تاریک گوشے کی طرف جانے لگا۔ خطرے کے احساس سے میرا دل میرے سینے میں دھمک رہا تھا۔

تاریک حصے میں آتے ہی میں تیزی سے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور سڑک کی جانب بھاگا۔ ہمیں پوری پلاننگ سے گھیرا گیا تھا۔ حکیم قادس کا اغوا صرف نمائشی قدم تھا اور ہم دشمن کے بچھائے جال میں پھنس گئے تھے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے ہم سب کو قابو میں کر لیا تھا۔ گارڈ اور صادق مارے جا چکے تھے اور اب مجھے جیپ پر موجود گارڈ اور حکیم کے نائب کی عافیت خطرے میں لگ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے پیچھے بھی قاتل تھے اور ان سے محفوظ رہنے کے لئے میرا ان کی نظروں سے اوجھل رہنا ضروری تھا۔ میں درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے سڑک کی طرف جا رہا تھا اور جس راستے سے ہم آئے تھے اس سے ذرا ہٹ کر جا رہا تھا۔ میں جیپ کے عین سامنے نکلتا۔ کھیتوں کے پاس پہنچ کر میں نے جھانک کر جیپ کی طرف دیکھا۔ گارڈ چوکس کھڑا تھا اور حکیم کا نائب جیپ کے اندر ساکت بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے عقب کا جائزہ لیا اور ایک دم ہی جیپ کی طرف بھاگا۔ میں تقریباً اڑتے ہوئے جیپ تک پہنچا تھا۔ گارڈ مجھے آتے دیکھ کر چوکس ہو گیا تھا۔

"جلدی کرو...... یہاں سے نکلو...... ورنہ ہم بھی مارے جائیں گے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ حکیم کا نائب بدستور ساکت بیٹھا تھا۔ میری بات پر اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اچانک اس کے عقب سے ایک چہرہ نمودار ہوا تھا جسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہ چہرہ ہمیشہ مجھے حیران کر دیا کرتا تھا۔ وہ فتح خان کا چہرہ تھا اور میں نے پہلی بار دیکھا کہ حکیم کے نائب کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بے نور تھیں۔ اگلے لمحے کوئی شے میری گدی سے ٹکرائی اور میں گرنے سے پہلے بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

مجھے ہوش آیا تو جسم جیسے پانی کی لہروں میں ڈول رہا تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اور ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ البتہ پاؤں آزاد تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا میں کسی گاڑی میں تھا اور وہ حرکت میں تھی اس وجہ سے مجھے اپنا جسم ڈولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا کہ منہ بھی بند تھا۔ اس پر ٹیپ لگا دیا تھا۔ نہ جانے میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ ضرب جتنی شدید تھی امکان یہی تھا کہ میں کئی گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ فتح خان کا منحوس چہرہ سو فی صد یقین دلانے کے لئے کافی تھا کہ میں مرشد علی یا ڈیوڈ شا کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

دشمنوں نے سارا کام اتنی صفائی اور مہارت سے کیا تھا کہ میرے ساتھیوں کا صفایا کر کے مجھ پر قابو پانے میں انہیں ذرا سی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں پاؤں ٹٹول کر اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں کس قسم کی گاڑی میں کہاں تھا۔ چند منٹ کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں کسی وین کے فرش پر پڑا تھا۔ فرش دھاتی اور ہموار تھا۔ اس پر کوئی نشست یا گدی نہیں لگی تھی اور اس جگہ سوائے میرے کوئی نہیں تھا۔

ضرب کی وجہ سے سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا مگر میں اب ایسی چوٹوں کا عادی ہو چکا تھا۔ اس لئے درد زیادہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے ایک دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے پاؤں سے دوسری جگہ دیوار پر لاتیں مارنا شروع کر دیں۔ میرے پیروں میں سخت سول والے جوتے تھے اور ان کی ضرب سے دیوار بج اٹھی تھی۔ اندر شور

زیادہ محسوس ہو رہا تھا مگر باہر بھی کچھ نہ کچھ شور محسوس ہوا تھا اور اس کا خطرہ خواہ ردِعمل بھی ہوا۔ گاڑی کے اگلے حصے سے کچھ کھلنے کی آواز آئی اور کسی نے درشت انداز میں کہا۔

''آرام سے بیٹھو ورنہ گولی ماردیں گے۔''

''مجھے کہاں لے جارہے ہو؟'' میں نے چلا کر پوچھا۔

''جہنم۔'' تمسخرانہ انداز جواب دیا گیا اور شاید اس کیبن اور ڈرائیونگ کمپارٹ کے درمیان کھلنے والی کھڑکی پُرشور طریقے سے بند کر دی گئی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں نے آنکھوں پر بندھی پٹی اتارنے کی کوشش کی لیکن پشت پر بندھے ہاتھوں کے ساتھ ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ تھک کر میں نے اپنی کوششیں ترک کردیں۔ گاڑی کے باہر یا تو ٹریفک نہیں تھا یا ڈبا ساؤنڈ پروف تھا۔ باہر کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی لیکن جلد کوئی گاڑی پاس سے گزری اور اس کی آواز آئی تھی یعنی یہ وین کسی سنسان راستے پر سفر کر رہی تھی اور جھٹکوں سے ظاہر تھا کہ سڑک ناہموار یا کچی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ابھی رات ہے یا دن نکل آیا ہے لیکن موسم معتدل تھا یعنی نہ تو مجھے سردی لگ رہی تھی اور نہ گرمی۔ دیوار پر لاتیں مارنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ شاید باہر سے کوئی متوجہ ہو جاتا لیکن اس سنسان راستے پر میں کسے متوجہ کرتا اس لئے آرام سے بیٹھ گیا بلکہ لیٹ گیا۔ ذرا سی کوشش سے میرے سر کے درد کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔

سفر میرے اندازے کے مطابق کوئی ایک گھنٹے جاری رہا تھا اور اس کے آخری حصے میں مجھے خاصے شدید قسم کے جھٹکے برداشت کرنے پڑے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وین ناہموار کچے راستے سے گزر رہی ہو۔ ٹائروں کے پانی سے گزرنے کے چھپاکے بھی سنائی دیتے تھے۔ میری قوت شامہ نے گوبر کی مخصوص بو محسوس کی تھی یعنی ہم انسانی آبادی کے قریب تھے۔ اس جگہ وین چند لمحے کے لئے رکی اور دوبارہ حرکت میں آئی لیکن اس بار بہت معمولی رفتار تھی جیسے وین کہیں پارک کرنے کے لئے لے جائی جارہی ہو۔

وین رکی اور ایک منٹ بعد اس کا عقبی دروازہ کھلا اور کسی نے بے رحمی سے مجھے بازو سے پکڑ کر اس طرح کھینچا کہ میں کچی زمین پر جاگرا۔ اس بات پر کچھ لوگوں نے قہقہے لگائے اور میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کم سے کم بھی چار پانچ تھے۔ پشت پر بندھے ہاتھوں کی وجہ سے مجھے کھڑے ہونے میں ذرا دشواری پیش آئی تھی۔ پھر کسی نے اتنی ہی بے رحمی سے میری آنکھوں پر بندھی پٹی نوچ لی میں نے دل ہی دل میں ایسا کرنے والے کو بے نقط سنائیں اور آنکھیں کھول کر اردگرد دیکھنے کی کوشش کی۔ سورج کی روشنی نمودار ہو چکی تھی اور میں ایک کچے احاطے میں کھڑا تھا جس کے تین طرف مخصوص دیہاتی طرز کے کمرے بنے ہوئے تھے اور ایک طرف کچی مٹی کی دیوار میں لکڑی کا بڑا سا دروازہ لگا تھا۔ ایک طرف چھپر تلے چارپائیاں بچھی تھیں اور ایک احاطے میں ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا پک اَپ کھڑی تھی۔ جس کے عقبی حصے میں بند دھاتی کیبن تھا۔

پٹی نوچنے والا ایک تنومند شخص تھا، اس نے دھوتی اور بنیان پہن رکھی تھی۔ گلے میں سیاہ ڈوری سے چاندی کا تعویذ بند لٹک رہا تھا۔ پاس ہی چار ہٹے کٹے نوجوان کھڑے تھے۔ مجھے گاڑی سے بھی اس تعویذ والے نے ہی اتارا تھا۔ پک اَپ کے اگلے حصے میں ایک ڈرائیور اور اس کے ساتھ ایک اور شخص بیٹھا تھا۔ ڈرائیور نے تعویذ والے سے کہا۔ ''پہلوان جی اپنی امانت سنبھالو......ہم چلتے ہیں۔''

''اوئے ایسے ہی چلتے ہیں۔'' پہلوان خلاف توقع تقریباً نسوانی آواز میں بولا۔ ''اللہ رکھا کے ڈیرے سے کوئی بغیر روٹی ٹکڑ کے چلا جائے...... یہ کیسے ممکن ہے۔''

''پہلوان واپس جا کر اور کام بھی کرنے ہیں...... تم جانتے ہو ہم کیسے بندے کے لئے کام کرتے ہیں۔ ذرا سی غلطی ہوئی تو کھال غائب سمجھو۔''

''اچھا یارو...... پھر رب راکھا۔'' اللہ رکھا نے بے پروائی سے کہا۔ ڈرائیور نے پک اَپ اسٹارٹ کی اور لکڑی کے گیٹ سے نکل گیا۔ گیٹ پر بھی ایک تنومند شخص موجود تھا۔ بظاہر یہ جگہ بدمعاشوں کا ڈیرا لگ رہی تھی۔ چار افراد میں سے دو کے شانوں پر شاٹ گنیں لٹک رہی تھیں۔

''دوستو، میرے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے خوش دلی سے کہا مگر وہ سب میری طرف تمسخرانہ انداز میں دیکھتے رہے تھے۔ جب وہ خاموش رہے تو میں سر ہلا کر کہا۔

''اچھا اچھا...... تم لوگ انسانوں کی زبان نہیں سمجھتے۔''

اس بات پر چاروں غرا کر میری طرف بڑھے تھے لیکن اللہ رکھا نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ ''نیا جناور ہے...... باڑے میں آ کر اچھلے گا لیکن کچھ دن میں ساری اچھل کود بھول جائے گا۔''

میں الٹے قدموں پر ایک چارپائی تک گیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ اللہ رکھا نے اپنے آدمیوں میں سے ایک کو حکم دیا۔ ''اسے روٹی پانی ڈال...... میں ابھی سونے جا رہا ہوں......'' اور اندر چلا گیا۔

''روٹی پانی بعد میں ڈالنا...... پہلے میرے ہاتھ کھولو اور مجھے ایسی جگہ دکھاؤ جہاں میں ضرورت سے فارغ ہو سکوں۔''

''دلشاد...... چل اس کا ہاتھ کھول۔'' ایک شاٹ گن والے نے سب سے کم عمر نوجوان کو حکم دیا۔ درحقیقت وہ چاروں ہی بیس پچیس برس تک کے نوجوان تھے لیکن اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے اپنی عمروں سے خاصے بڑے لگتے تھے۔ دلشاد نے آ کر میرے ہاتھ کھولے میرے دونوں ہاتھ اتنی دیر بندھے رہنے سے سن ہو گئے تھے۔ خاص طور سے بایاں ہاتھ تقریباً بے حس ہو رہا تھا، اس کا علاج ابھی جاری تھا اور بقول حکیم قادس یہ علاج بہت اہم تھا، اس کے ادھورے رہ جانے سے میرے ہاتھ میں کمزوری آ سکتی تھی اب قسمت کی نامہربانی کہ میں دشمنوں کے ہاتھ لگ گیا تھا اور فی الحال مجھے اپنی ہڈی پسلی کے بارے میں تشویش تھی۔ ہاتھ کو کیا دیکھتا! پھر بھی میں نے مالش کر کے اور مستقل حرکت دے کر اس کی حس اور حرکت بحال کی۔ حکیم قادس کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا۔ وہ نہ جانے کس حال میں تھا۔ اگر دشمنوں نے اسے بھی باقی افراد کی طرح اس دنیا سے روانہ کر دیا تھا تو میرے ہاتھ کے مزید علاج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''چلو۔'' شاٹ گن والے نے اشارہ کیا اور مجھے احاطے کے ایک طرف بنی چھوٹی سی کوٹھری تک لایا۔ اندر سے آنے والی بو حال بیان کر رہی تھی یہ ایک دیسی ساختہ لیٹرین تھا۔ دو اینٹوں پر پاؤں جما کر ضروریات سے فارغ ہوا جاتا تھا خیر یہ کرتب دکھانا مشکل نہیں تھا اصل مسئلہ وہاں کی بدبو برداشت کرنا تھا۔ دیوار میں ایک سوراخ سے غلاظت بہائی جاتی تھی لیکن یہ طریقہ کارگر نہیں تھا۔ غلاظت کا کچھ نہ کچھ حصہ اندر رہ جاتا تھا۔ دل پر جبر کر کے میں دس منٹ وہاں رہا اور یہ عزم کر کے باہر نکلا تھا کہ اگر اس جگہ رہا تو کم سے کم بارہ گھنٹے سے پہلے

اس جگہ کا رخ نہیں کروں گا۔ اس لیٹرین کی واحد صاف شے پانی سے بھری ٹنکی تھی۔

ایسی ہی ایک ٹنکی باہر بھی رکھی تھی میں منہ ہاتھ دھو کر چارپائی پر آ بیٹھا۔ سامنے والے حصے کے ایک کونے میں کچا باورچی خانہ اور تنور تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت وہاں پراٹھے تل رہی تھی۔ فضا میں دیسی گھی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوشبو نے احساس دلایا کہ مجھے شدت سے بھوک لگی تھی۔ ذرا دیر بعد عورت نے ایک اور لکڑی کے چولہے پر فرائنگ پین رکھ کر اس میں دیسی انڈے مکھن میں تلنا شروع کر دیئے۔ ڈاکٹروں سے پوچھا جائے تو وہ اس ناشتے کو زہر سے کم قرار نہیں دیں گے لیکن دیہاتوں اور گاؤں میں جہاں اس قسم کا ناشتا اور کھانا عام ہے، وہاں دل اور بلڈ پریشر کے امراض کا تناسب شہروں کے مقابلے میں کم ہے۔ شہروں میں، میں نے ایسے افراد بھی دیکھے تھے جو ساری عمر کھانے پینے میں احتیاط کرنے کے باوجود دل کے دورے سے جاں بحق ہوئے۔

سارا مسئلہ خوراک اور خرچ کا ہے۔ دیہات میں عام طور سے لوگ جس طرح کھاتے ہیں، اس طرح کام بھی کرتے ہیں لہٰذا سارا کھایا پیا ہضم ہو جاتا ہے۔ جبکہ شہروں میں کام کرنے کا رواج ختم ہو رہا ہے۔ آدمی صبح سے شام تک دماغ سوزی کرتا ہے اور جسم سے کام نہیں لیتا۔ نتیجے میں اعصابی اور دل کے امراض کا شکار ہو رہا ہے۔ عورت اپنے حلیے سے ملازمہ لگ رہی تھی، اس نے جہازی سائز کے چار عدد پراٹھے اور اتنے ہی تلے ہوئے انڈے لا کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ اس وقت وہاں صرف شاٹ گن والا تھا۔ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''لو باؤ......کم سے کم ایک پراٹھا ضرور کھانا۔''

اسے معلوم نہیں تھا کہ میرا تعلق بھی دیہات سے تھا۔ جہاں اتنی خوراک نارمل سمجھی جاتی ہے۔ خود میں نے بابا کو ماں جی کے ہاتھ کے بنے نصف درجن پراٹھے بغیر ڈکار لئے کھاتے دیکھا تھا۔ میں نے کھانا شروع کیا اور جب میں نے دوسرا پراٹھا ختم کر کے تیسرے سے انصاف شروع کیا تو شاٹ گن والے کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''اوئے بلے بلے......تُو کھانے کا شیر ہے بھئی۔''

میں مسکرا دیا تھا۔ ابھی تک یہ معما میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں اپنے معروف دشمنوں کی قید میں کیوں نہیں تھا اور یہ کون لوگ تھے؟ مجھے ان کے حوالے کیوں کیا گیا تھا، ویسے ان کے انداز سے لگ رہا تھا میں ان کا قیدی تھا۔ البتہ وہ مجھ سے دشمنوں والا سلوک نہیں کر رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا وہ میرے براہِ راست دشمن نہیں تھے۔ پھر بھی یہ الجھن باقی تھی کہ مجھے ان لوگوں کے حوالے کیوں کیا گیا تھا۔ سر کی چوٹ، رات بھر بے آرامی اور پھر تگڑے ناشتے نے میرے دماغ کو سن کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھوئے اور آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ نہ جانے یہ کون سا علاقہ تھا مگر صبح نو بجے کے قریب بھی ہوا خوشگوار حد تک خنک تھی، اس کے جھونکوں نے مجھے مدہوشی کی نیند سلا دیا تھا۔

اچانک کسی نے مجھے زلزلے کی طرح ہلایا تھا۔ یہ پہلوان اللہ رکھا تھا جو اپنی مخصوص باریک آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''اوئے کاکا اٹھ جا......شام کا ویلا ہو رہا ہے۔''

میں اٹھ بیٹھا۔ سورج مغرب کی طرف جھک چکا تھا اور فضا میں سرمئی سا غبار پھیلا ہوا تھا اور اب مجھے پھر سے بھوک لگ رہی تھی مگر ظاہر ہے میں کھانے کے لئے یہاں نہیں تھا۔ میں نے اٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے

مارے۔ ان لوگوں کے ہاں چائے کا رواج نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے پہلوان سے پوچھ لیا۔ ”یہاں چائے ملے گی۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”اوئے، پہلوان کے ڈیرے پر سب ملے گا۔ دوا بھی ملے گی اور زہر بھی ملے گا۔ زہرہ......ادھر آ۔“

صبح میں نے پہلوان اللہ رکھا کو جس کمرے میں جاتے دیکھا تھا اس میں سے ایک بنی سنوری دلکش اور جوان عورت برآمد ہوئی۔ شاید اس کا نام زہرہ تھا اور خوب تھا۔ اس نے سبز رنگ کا ریشمی سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جو اس کے پورے جسم پر کھال کی طرح فٹ تھا اور خوش بدنی کے تمام پیچ وخم نمایاں کر رہا تھا۔ پتلی سی کمر کے اطراف میں متعلقات ذرا بھاری تھے اور چہرے کے نقوش بھی نہایت جاذب نظر تھے۔ حلیئے کے برعکس اس کی آنکھوں میں مجھے معصومیت اور حیا نظر آئی تھی۔ یہ تضاد، حیران کن تھا۔ پتا نہیں اس نے ایسا لباس کیوں پہنا تھا جو اسے اس حد تک نمایاں کر رہا تھا۔ چھوٹا سا باریک دوپٹا اس کے سراپے کو چھپانے میں ناکام رہا تھا۔

”اس کے لئے چائے لے آؤ۔“ اللہ رکھا نے میری طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ زہرہ نے اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور واپس کمرے میں چلی گئی۔ اللہ رکھا نے کہا۔ ”یہ میری بیوی زہرہ ہے۔“

اللہ رکھا تقریباً چالیس برس کا صورت سے گاؤدی اور احمق نظر آنے والا شخص تھا اور بلاشبہ بیوی کے معاملے میں خوش قسمت تھا۔ اس کا اور زہرہ کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ پانچ منٹ بعد زہرہ چائے لے آئی تھی۔ دور سے اپنی اچھی جسامت کی بنا پر وہ کسی قدر بڑی عمر کی لگتی تھی لیکن جب چائے دینے کے لئے نزدیک آئی تو اس کی اصل عمر جھلکنے لگی تھی وہ بیس بائیس سال کی تھی یعنی عمر میں اللہ رکھا سے نصف تھی اور یہاں بھی ان دونوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ میں نے بڑے سائز کے مگ میں موجود گرم اور کسی قدر شیریں چائے کا گھونٹ لیا۔ چائے تقریباً شہری انداز کی تھی۔ میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ”شاید تمہیں چائے پسند نہیں ہے پہلوان؟“

وہ ہنسا۔ ”ہاں یہ اپنی زہرہ کے شوق ہیں......شہر کی ہے ناں۔“

تو میرا اندازہ درست تھا۔ بہر حال یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا جس پر میں زیادہ دیر غور کرتا۔ ”پہلوان میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا ہے اور میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ پھر میرے دشمنوں نے مجھے تمہارے حوالے کیوں کیا ہے؟“

”تم اپنے دشمنوں کو جانتے ہو؟“ اس نے الٹا سوال کیا۔

”ہاں...... مجھے فتح خان نے اغوا کیا ہے......میرے سارے ساتھیوں کو اس نے قتل کر دیا۔“

اللہ رکھا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں کسی فتح خان کو نہیں جانتا۔“

”مرشد علی......ڈیوڈ شا......“

”اوئے نہیں کاکا...... مجھے ان کا کچھ نہیں پتا۔“ اس نے بیزاری سے کہا۔ ”تجھے پہلوان کے ڈیرے پر رانا نعیم نے بھیجا ہے۔“

”رانا نعیم؟“ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”تحصیل شکر گڑھ کا بہت بڑا زمیندار ہے۔ مجھ سے کام لیتا ہے۔ پہلے بھی بندے شندے رکھواتا رہا

ہے۔"

"تب میرے دشمنوں نے مجھے اس کے حوالے کیا ہے۔"

"پولیس کا معاملہ ہے۔" پہلوان نے غور سے مجھے دیکھا۔

"لگتا ہے میرے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتایا۔"

"بس اتنا معلوم ہے کہ ایک خطرناک بندہ ہے۔ اپنے پاس خطرناک بندے آتے رہتے ہیں۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "رانا صاحب پرانے مہربان ہیں۔"

"اللہ رکھا مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا۔"

"کاکا...... ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا...... رانا صاحب کب بلاتے ہیں۔" وہ بولا اور کھڑا ہوگیا۔ "کاکا بس ادھر آرام سے رہنا بھاگنے کا مت سوچنا۔ میرے کتوں سے تیز نہیں بھاگ سکو گے۔"

"دو پیروں والے یا چار پیروں والے۔" میں مسکرایا۔ "اور میرا نام کاکا نہیں...... ملک شہباز احمد ہے۔"

پہلوان مسکرایا تھا۔ "دونوں۔" اس نے کہا۔

پہلوان لکڑی کے پھاٹک سے باہر چلا گیا۔ ایک طرف ایک نیا بندہ شاٹ گن کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ بظاہر اس جگہ حفاظتی انتظامات معمولی سے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اس جگہ سے فرار آسان نہیں تھا۔ چائے پی کر میں نے کچھ دیر چہل قدمی کی۔ سورج ڈوبنے والا تھا اور فضا میں تیزی سے تاریکی چھا رہی تھی اچانک ایک نامانوس سا شور بلند ہوگیا اور احاطہ تیز روشنیوں سے جگمگانے لگا۔ کونوں پر تیز روشنی والی راڈز لگی تھیں اور ان کے لئے بجلی جنریٹر سے مہیا کی جا رہی تھی۔ جنریٹر احاطے کے پاس تھا۔ ذرا دور ہونے کے باوجود اس شور سماعت کو انتہائی ناگوار محسوس ہو رہا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد یہ شور کم ہوگیا تھا شاید جنریٹر کی سیٹنگ کر دی گئی تھی سورج ڈوبتے ہی رات کے کھانے کی تیاری شروع ہوگئی تھی۔ اس بار بھی وہی ادھیڑ عمر عورت کھانا بنا رہی تھی سالن چڑھا کر وہ روٹیاں لگانے کی تیاری کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد زہرہ اپنے کمرے سے نکلی وہ مگ لینے آئی تھی۔ "چائے کا شکریہ...... تم نے بہت اچھی چائے بنائی تھی۔" میں نے کہا تو وہ خوف زدہ نظر آنے لگی۔ جلدی سے مگ لے کر کمرے میں چلی گئی تھی۔ شاید پہلوان سے خوف زدہ تھی اور اسے مردوں سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھیں مگر دوسری طرف پہلوان نے اسے چائے لانے کو کہا تھا اور اس نے جسم نمایاں کرنے والا لباس پہنا تھا۔ میں الجھن محسوس کر رہا تھا۔

پھر میں نے زہرہ کو ذہن سے جھٹک کر اپنے حالات پر توجہ دی۔ راجا عمر دراز کو علم ہوگیا ہوگا کہ میں اور حکیم قادس غائب ہیں، اس کے سارے آدمی مارے جا چکے تھے۔ بلاشبہ دشمن کہیں تیز تھا اور ہمیں آخر لمحے تک احساس نہیں ہوا تھا کہ دشمن پیچھے ہے، اس نے حیران کن طریقے سے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ یہ بات بھی یقینی تھی ہم اتفاقیہ ان کی نظروں میں نہیں آئے تھے بلکہ جب ہم وسیم کی کوٹھی سے نکلے تھے تب ہی سے دشمن پیچھے تھے سوچتے ہوئے اچانک ایک اور اندیشہ ستانے لگا تھا۔ مونا اور سفیر بھی اس کوٹھی سے نکل کر گئے تھے تو کیا دشمن کی سفیر کی حویلی میں موجودگی سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ ممکن ہے مرشد علی اینڈ کمپنی نے وہاں پر بھی وار کیا یا کرنے والا ہو۔ میں مارے اضطراب کے کھڑا ہوگیا تھا۔ شاٹ گن والا ایک دم چوکنا ہوگیا تھا۔

"کیا بات ہے...... بیٹھ جا......" اس نے للکار کر کہا۔

میں نے اجنبی نظروں سے اسے دیکھا۔ میرا دل چاہا کہ اسے خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس جگہ سے نکل جاؤں۔ میرے تاثرات نے اسے بھڑکا دیا تھا۔ اس نے شاٹ گن تان لی۔ "اوئے، میں نے کیا کہا ہے...... سنا نہیں بیٹھ جاؤ۔"

میں چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ وہ شاٹ گن ہلاتا میری طرف آیا تھا۔ "اوئے سنا نہیں......" اس کے ساتھ ہی اس نے ایک موٹی سی گالی دی۔

اس نے شاٹ گن کی نال میرے شانے پر مارنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اضطراری طور پر ایک ہاتھ سے شاٹ گن کی نال پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ اس نے تلملا کر مجھ سے شاٹ گن چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اگر میں نے شاٹ گن چھوڑ دی تو وہ مجھے گولی مارنے سے گریز نہیں کرے گا۔ "چھوڑ دے......" گالیوں میں غالباً اس نے پی ایچ ڈی کر رکھا تھا۔

دوسری بار گالی مکمل ہونے سے پہلے میں نے اسے کے منہ پر گھونسہ مارا تھا۔ میں نے الٹے ہاتھ سے شاٹ گن کی نال تھام رکھی تھی اور ابھی تک اس کی گرفت میں کمزوری نہیں آئی تھی۔ اچانک ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ شاٹ گن میرے ہاتھ سے نکل رہی ہے۔ یہ بات اس نے بھی محسوس کی تھی۔ اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور شاٹ گن میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ وہ شاٹ گن کی طرف متوجہ ہوا اور میں نے گھٹنا اس کے زیر ناف رسید کیا۔ اس نے پھر چلا کر گالی دی اور نیچے جھکا تھا کہ میں نے گھٹنا اس کے منہ پر مارا اور وہ اچھل کر زمین پر جا گرا تھا۔ دو گھونسوں کے بعد کسر اس ضرب نے پوری کر دی تھی۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ اس عالم میں بھی وہ مجھے قتل کرنے کی فکر میں تھا۔ لیکن میں نے اسے شاٹ گن سیدھی کرنے کا موقع دیئے بغیر لات گھمائی اور شاٹ گن اڑ کر دور جا گری تھی۔

"بس۔" اچانک پہلوان اللہ رکھا کی آواز آئی۔ وہ سامنے کھڑا تھا اور اتفاق سے شاٹ گن اس کے قدموں میں جا گری تھی، اس نے شاٹ گن اٹھا کر قہرناک نظروں سے مجھے گھورا۔ "اوئے...... یہ کیا ہو رہا تھا؟"

"اپنے آدمی سے پوچھو...... یہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

وہ تڑپ کر اٹھا تھا۔ "بکواس کرتا ہے یہ...... یہ خود مجھ سے لڑا تھا۔"

"میں صرف کھڑا ہوا تھا اس نے مجھے دھمکایا اور پھر مارنے کی کوشش کی...... میں نے صرف اپنا دفاع کیا تھا۔ تم چاہو تو اس عورت سے پوچھ لو۔" میں نے کھانا بنانے والی عورت کی طرف اشارہ کیا۔

"فضل جا کر اپنی مرہم پٹی کرا۔" خلاف توقع پہلوان نے عورت سے پوچھا نہیں۔

فضل مجھے خونی نظروں سے دیکھتا باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پہلوان نے شاٹ گن گیٹ کے چوکیدار کو پکڑا دی جس نے اس سارے معاملے میں اب تک کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ "تو بھی اپنا دماغ ٹھنڈا رکھ...... یہ پہلوان کا ڈیرا ہے۔" پہلوان نے مجھ سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اس نے اس سارے ہنگامے پر مجھے بس اتنا ہی کہا تھا ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میری شامت آنے والی ہے۔ کھانا بنانے والی عورت نے مجھ سے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ "لے آؤ۔" میں ہاتھ دھونے کے لئے ٹنکی کی طرف

بڑھ گیا تھا۔

جس دوران میں کھانا کھا رہا تھا۔ کھانے بنانے والی عورت پہلوان کے کمرے کی طرف کھانا لے جا رہی تھی۔ سالن کی پوری دیگچی کے ساتھ روٹیوں کا ایک پورا انبار تھا۔ کھانے کے بعد میں کچھ دیر صحن میں چہل قدمی کرتا رہا۔ دن میں کسی قدر گرمی رہی تھی لیکن سورج ڈوبتے ہی موسم خوشگوار ہو گیا تھا اور اب خاصی خنکی تھی۔ پہلوان کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ وہ انسانی حس سے عاری کوئی سکہ بند بدمعاش ہے لیکن اس کی حسین بیوی کو دیکھ کر مجھے اپنے خیال میں ترمیم کرنا پڑی تھی۔ پھر فضل سے لڑائی اور اسے لہولہان کرنے کے باوجود پہلوان کا رویہ میرے ساتھ غیر متوقع تھا۔ اس نے مجھے صرف دھمکی دی تھی اور اس وقت بھی میں جسمانی طور پر آزاد تھا۔ ورنہ مجھے کسی کوٹھری میں بھی بند کیا جا سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد پہلوان باہر نکل آیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس کا چوکیدار کھانا کھانے لگا۔ اس وقت احاطے میں بس یہی افراد تھے۔ میرا خیال تھا کہ اب سب سو جائیں گے۔ مگر اس کے بجائے لکڑی کا دروازہ بجا اور چوکیدار نے کھانے سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ایک شخص اندر آیا، پہلوان نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا تھا۔ اس دبلے پتلے سیاہ رو شخص نے قیمتی کپڑے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں جن میں نگ جڑے ہوئے تھے۔ وہ شخص پہلوان کے ساتھ آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے تھے۔ اس کے بعد اگلے ایک گھنٹے میں مزید پانچ افراد آئے اور چارپائیوں پر بیٹھ کر گپیں لڑانے لگے۔ اپنے حلیئے اور باتوں سے وہ سب کھاتے پیتے لگ رہے تھے اور میں سمجھنے سے قاصر تھا وہ کیوں آئے تھے۔ کچھ دیر بعد پہلوان نے اپنے کمرے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔

''زہرہ بوتل اور گڈی لے آؤ۔''

یہ سنتے ہی جیسے ان چند افراد کی نگاہیں دروازے پر گڑ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد زہرہ اندر سے نکلی، اس وقت بھی اس نے نہایت چست ریشمی لباس پہن رکھا تھا اور اس بار دوپٹے کا تکلف بھی نہیں تھا۔ اس کا ہوش ربا حسن دیکھ کر ان لوگوں کی رال ٹپکنے کی کسر باقی رہ گئی تھی ورنہ ان کے تاثرات ایسے تھے جیسے کتوں نے گوشت دیکھ لیا ہو۔ وہ ایک بڑی بوتل لائی تھی جس میں غالباً ولیی شراب تھی اور دوسرے ہاتھ میں تاش کی دو گڈیاں تھیں۔ اس نے دونوں چیزیں چارپائی کے پاس چھوٹی میز پر رکھیں۔ جب تک وہ اندر نہیں چلی گئی ان لوگوں کی گرسنہ نگاہیں اس پر مرکوز رہی تھیں۔ جبکہ پہلوان اپنی بیوی کے حلیئے اور ان لوگوں کے انداز سے قطعی بے پروا نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے چوکیدار سے کہا۔

''اوئے......راجے......گلاس لا۔''

راجا چھ عدد گلاس لے آیا۔ سب نے اپنے اپنے گلاسوں میں شراب ڈالی۔ پہلا دور ختم ہونے کے بعد انہوں نے اپنی جیبوں سے رقم نکال کر پہلوان کے سامنے رکھ دی۔ میں پہلون کو رقم گنتا دیکھ رہا تھا۔ یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ ہر شخص نے پہلوان کو بیس ہزار دیئے تھے اور کل رقم بنتی تھی ایک لاکھ بیس ہزار روپے...... گویا یہاں جوا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا۔ رقم پہلون نے میز پر چھ الگ الگ حصوں میں رکھ دی تھی۔ پہلوان نے اپنے لئے شراب نہیں نکالی تھی۔ وہ شاید پیتا نہیں تھا یا اس وقت پینے سے گریز کر رہا تھا۔

چھ افراد دو گروہوں میں بٹ گئے تھے اور تین تین افراد آپس میں کھیلنے لگے۔ نصف گھنٹے بعد دو افراد اپنی رقم ہار چکے تھے اور منہ لٹکائے ایک طرف بیٹھے تھے۔ اس بار چار افراد آپس میں کھیل رہے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ جو فاتح ہوتا وہی ساری رقم کا مالک بن جاتا۔ کچھ دیر بعد میں بیزار ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ یہ خاصے بڑے سائز کی چارپائیاں تھیں۔ ایک چارپائی پر تین افراد آرام سے لیٹ سکتے تھے۔ ایک گھنٹے بعد نئی بازی جاری تھی کیونکہ سابقہ بازی کا فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔ ہارنے والے دو افراد مزید ایک گلاس دیسی شراب حلق سے اتار کر رخصت ہو گئے تھے۔ چار افراد کا جوش و خروش اور بے تابی دیدنی تھی۔ اس سے پہلے مجھے کبھی جوا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا بس سنا ہی تھا کہ اس کے عادی افراد اس کے پیچھے اپنے تن کے کپڑوں سے بھی ہاتھ دھو لیا کرتے تھے۔

بارہ بجے کے قریب بازی اختتام کو پہنچی اور دبلے پتلے سیاہ شخص نے بازی جیت لی۔ وہ سب سے پہلے آیا تھا۔ باقی تین افراد پر ناکامی کا غبار چڑھ گیا تھا۔ انہوں نے مرے ہوئے انداز میں سیاہ رو شخص کو مبارک باد دی اور نامراد قدموں سے رخصت ہو گئے۔ سیاہ رو نے کامیابی کا جشن منانے کے لئے اپنے لئے گلاس بنایا تھا۔ میرا خیال تھا وہ گلاس پی کر اور جیت کی رقم لے کر رخصت ہو جائے گا لیکن اس کے بعد جو ہوا اس کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ دولت کے لئے انسان کس قدر پستی میں گر سکتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے کیا کر سکتا ہے یہ میں نے اس رات جانا۔

پہلوان نے ایک لاکھ بیس ہزار روپے پورے کے پورے سیاہ رو شخص کے سامنے رکھ دیئے تھے۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس نے رقم میں سے کچھ نہیں لیا تھا۔ سیاہ رو شراب کے بڑے بڑے گھونٹ لے رہا تھا وہ شاید عادی شرابی تھا۔ ورنہ تیز دیسی شراب اس طرح نہ پیتا۔ پہلوان معنی خیز انداز میں اسے دیکھ رہا تھا، اس نے زہرہ کو آواز دی۔ ''ادھر آ...... یہ بوتل لے جا۔''

زہرہ بجھے قدموں کے ساتھ آئی اور بوتل لے کر جانے لگی مگر پہلوان نے اسے روک لیا۔ ''اتنی جلدی کیا ہے؟'' وہ بولا پھر سیاہ رو شخص کی طرف دیکھا۔ ''کیا خیال ہے رانا صاحب؟''

رانا پوری بے باکی سے زہرہ کو آنکھوں سے ٹٹول رہا تھا۔ پھر اس نے ایک نظر گڈیوں پر ڈالی اور اثبات میں سر ہلایا۔ پہلوان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ''اب تو جا اور ذرا سج کر رہا کر۔'' اس نے بیوی سے کہا۔ زہرہ جلدی سے اندر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی پہلوان نے نوٹوں کی گڈیاں اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ میرا ذہن سنسنا اٹھا تھا میرے سامنے ایک شوہر اپنی بیوی کا سودا کر رہا تھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار کے عوض اس کی حرمت دوسرے شخص کے حوالے کر رہا تھا۔ پہلوان نے اپنے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔

''رانا صاحب آپ کے پاس تین گھنٹے ہیں اور خیال رکھنا اسے کوئی تکلیف نہ ہو...... میری بات سمجھ رہے ہو ناں آپ؟'' اس نے رانا کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

''فکر نہ کر پہلوان۔'' رانا نے قہقہہ لگایا تھا اور اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

میرا دماغ جیسے کھول رہا تھا۔ رانا کے جانے کے بعد میں خود پر ضبط نہ کر سکا۔ ''پہلوان میں نے تم جیسا بے غیرت انسان نہیں دیکھا۔''

''اوئے کاکے...... لگتا ہے تو نے ابھی دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں۔'' اس نے سکون سے جواب دیا۔ میری

گالی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ”میں نے صرف بیوی بیچی ہے ناں......لوگ ماں بیچ دیتے ہیں، ملک بیچ دیتے ہیں۔“

”اس سے تمہاری بے غیرتی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔“ میں نے بھڑکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم ایک عورت کو بیچ رہے ہو جو تمہاری بیوی ہے۔“

وہ ہنسا۔ ”صرف نام کی بیوی ہے میرے کسی کام کی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ میرے پاس وہ صلاحیت ہی نہیں ہے جو بیوی کے پاس جانے کے لئے چاہئے ہوتی ہے۔“

میرے خدا...... مجھے لگ رہا تھا یا تو یہ شخص پاگل تھا یا مجھے بنا رہا تھا۔ اس نے کتنے آرام سے میرے سامنے اپنی بیوی کا سودا دوسرے شخص سے کر کے اسے اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا اور اب کتنی سادگی سے اعتراف کر رہا تھا کہ وہ مردانہ صلاحیت سے محروم ہے۔ اس کے پہاڑ جیسے جسم کو دیکھتے ہوئے اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سر جھٹکا...... کیا میں خواب دیکھ رہا تھا یا سچ مچ یہ سب دیکھ اور سن رہا تھا۔ پہلوان اللہ رکھا کے چہرے پر معصومانہ غبی پن تھا اور اس کی سوئی سوئی سی آنکھوں میں سپاٹ پن کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”تم...... یہ بات مجھے بتا...... رہے ہو۔“ میں نے ناقابلِ یقین لہجے میں کہا۔

”یہ بات پورا علاقہ جانتا ہے۔ تجھ سے چھپا کر مجھے کیا کرنا ہے۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ پہلوان کس قسم کا شخص تھا یا تو وہ انتہائی عیار شخص تھا یا کوئی نفسیاتی مریض لگ رہا تھا۔ میں نے غور کیا اور مجھے پہلی والی بات درست لگی تھی۔ پہلوان بظاہر بے وقوف نظر آنے والا باطن انتہائی عیار شخص تھا۔ اس نے بیوی کی ایک رات کی اتنی زیادہ قیمت وصول کرنے کا نیا طریقہ سوچا تھا۔ چھ افراد مل کر جوا کھیلتے ہیں اور جو شخص ساری رقم جیت جاتا ہے اس کے سامنے پہلوان دو آپشن رکھ دیتا ہے یا تو ساری رقم لے جائے یا بدلے میں اس کی بیوی کے ساتھ رات گزار لے۔ سارے طریقۂ کار میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ ایک شخص کی جیب سے بیس ہزار جا رہے تھے اور زہرہ جیسی عورت کے حصول کے لئے یہ رقم معمولی سی تھی۔ جیتنے والا بھی بیس ہزار ہی گنواتا۔ ورنہ پہلوان کسی سے ایک لاکھ بیس ہزار مانگتا تو وہ کبھی نہ دیتا۔ شہروں میں دولت مند ایک کال گرل کی ایک رات کا معاوضہ اس سے بھی کہیں زیادہ دیتے تھے۔ ندیم بھٹی کے ایک مؤکل نے اسے ایک ایسی کال گرل سے ملوایا تھا جو ایک رات کا معاوضہ دس لاکھ روپے لیا کرتی تھی۔ مگر یہاں اس دیسی علاقے میں کوئی اتنا اچھا معاوضہ نہ دیتا۔ لہٰذا پہلوان نے یہ شاطرانہ طریقہ دریافت کیا تھا۔ اس طرح لوگ بیک وقت جوئے اور شراب کے ساتھ شباب سے بھی لطف حاصل کر سکتے تھے۔ زہرہ کا حسین وجود جوئے کی بازی کی سنسنی خیزی کو بڑھا دیتا تھا۔ پہلوان نے کیا ترکیب سوچی تھی، زہرہ سے کمانے کی اور اسے ذرا بھی شرمندگی نہیں ہو رہی تھی۔

”لوگ جانتے ہیں اس بات کو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں...... میں کوئی ڈھک چھپ کر کام نہیں کرتا۔“

”کوئی تمہیں کچھ کہتا نہیں ہے۔“

''اوئے کاکے...... کسی کی مجال ہے جو کچھ کہے......'' اس نے بدمعاشوں کے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''کوئی مائی کا لال ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔''

''تمہارے خیال میں تم جو کام کر رہے ہو وہ ٹھیک ہے؟''

''کبھی سوچا ہی نہیں۔'' اس نے بے پروائی سے تھوڑی کھجائی۔ ''مجھے صرف پیسے سے مطلب ہے۔''

''لیکن پیسا کمانے کے اور بھی......''

''اوئے کاکے......'' اس نے میری بات کاٹی۔

''میرا نام شہباز ہے...... براہ کرم اب مجھے کاکا کہہ کر مت پکارنا۔'' میں نے بھی اس کی بات کاٹی۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''اچھا بھائی شہباز صاحب...... بات یہ ہے...... ہر شخص کا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ مجھے کمانے کا یہ طریقہ اچھا لگتا ہے۔''

اس شخص نے بے غیرتی کی انتہا کر دی تھی۔ ہماری تاریخ میں آج سے نہیں تیس چالیس برس پہلے جس شخص کو پہلوان کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ عزت و احترام خود بخود مخصوص ہو جاتا تھا۔ جب کسی شخص کو پہلوان کا لقب ملتا تھا تو جاننے والے خود بخود جان جاتے تھے کہ وہ شخص علم و شرافت کا پیکر ہوگا۔ بوڑھوں کا ادب، بچوں سے پیار اور عورتوں کی عزت کرنے والا ہوگا۔ بے پناہ طاقت رکھنے کے باوجود اس کی ذات سے ناانصافی ممکن ہی نہیں ہوگی۔ پھر قدریں بدلیں اور پہلوان کا لقب بدمعاشوں کے معنوں میں استعمال ہونے لگا اور آج کل اس لقب کے حامل شخص سے کسی بھی برائی کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن جو کام یہ شخص کر رہا تھا، وہ کرتے ہوئے شاید شیطان بھی شرماتا۔ مجھے اس سے کراہت محسوس ہوئی تھی۔

''کاش کہ یہ بات مجھے یہاں آتے ہی معلوم ہو جاتی۔''

اس نے طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''تو کیا کرتے تم؟''

''اس جگہ سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ پیتا۔''

''تو اب نہ پینا۔''

''تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''اگر رانا صاحب نے تین چار دن نہ پوچھا تو تم فوت ہو جاؤ گے۔'' وہ ہنسا۔

''رانا صاحب۔'' میں نے غور کیا۔ ''یہ جو ابھی اندر گیا ہے...... یہ بھی تو رانا......''

''رانا صاحب کا رشتہ دار ہے۔'' وہ بولا۔

اچانک اندر سے ایک نسوانی چیخ سنائی دی تھی اور ظاہر ہے یہ چیخ زہرہ کی تھی پھر اس کے لگاتار چلانے کی آواز آئی۔ پہلوان فکرمند ہو کر اٹھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''رانا صاحب اپنی رقم وصول کر رہے ہیں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

زہرہ نے غالباً بھاگنے کی نیت سے دروازہ کھولا تھا کیونکہ اس کی ایک جھلک نظر آئی تھی اگلے ہی لمحے اسے واپس کھینچ لیا گیا اور دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔ یہ ایک جھلک بتانے کے لئے کافی تھی کہ رانا صاحب حیوانیت کی حدوں کو بھی پار کر چکے تھے اور زہرہ کے نازک جسم پر ان کی درندگی کے نشان واضح تھے۔

پہلوان دروازے کی طرف لپکا اور اسے بجا کر کسی کوئل کی طرح دھاڑا۔ ''رانا...... انسان کا بچہ بن جا......''

''دفع ہو جاؤ۔'' جثے کے مقابلے میں رانا کی آواز گرج دار تھی ایسا لگ رہا تھا کہ پہلوان اور رانا کے گ
بدل گئے تھے۔ ''پہلوان اس کتیا نے میری توہین کی ہے۔''

''رانا اسے ہاتھ مت لگانا۔'' پہلوان نے دروازہ بجانا جاری رکھا۔ ''میں نے کہا تھا اپنی حیوانیت قابو میں
رکھنا۔''

''خریدار من مانی کی قیمت ادا کرتا ہے۔'' میں نے پھر پہلوان کو چرکا لگایا۔

''بکواس نہ کر۔'' اس نے خوں خوار نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک بار پھر دروازہ بجایا۔ ''رانا دروازہ کھو
ورنہ میں توڑ دوں گا۔''

جواب میں رانا کی جانب سے جو کچھ کہا گیا وہ قطعی نا قابلِ بیان تھا اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ زہ
کو قابو کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ آخر میں اس نے چلا کر کہا تھا۔ ''پہلوان تو اندر آیا تو میں گولی مار دو
گا۔''

زہرہ کی اگلی چیخ لرزہ خیز تھی۔ پہلوان جواب تک تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا یک دم آگ بگولا ہو گیا۔ اس
نے شانے سے ایک ضرب لگائی اور دروازہ ٹوٹ گیا۔ پہلوان کسی ارنے بھینسے کی طرح اندر گیا تھا۔ فوراً ہی اند
سے دھماکے کی آواز آئی تھی اور پہلوان اپنے سینے پر ہاتھ رکھے صحن میں آ گرا تھا۔ زہرہ کی چیخیں اب ہذیانی ہو گ
تھیں۔ گیٹ کا چوکیدار اپنی شاٹ گن سنبھالے بھاگتا ہوا آ رہا تھا کہ اندر سے رانا نمودار ہوا اس نے چوکیدار
شاٹ گن سیدھی کرنے کا موقع دیئے بغیر اسے بھی گولی مار دی۔ اس کا نشانہ بہترین تھا۔ میں دیکھ رہا تھا پہلوان
عین دل کے مقام پر گولی لگی تھی اور چوکیدار کو بھی اس نے اسی جگہ گولی ماری تھی۔ دونوں مر چکے تھے یا مرنے ک
قریب تھے۔ چوکیدار کو مار کر رانا نے میری طرف دیکھا تو میں نے جلدی سے ہاتھ اوپر کر لئے۔

''میں قیدی ہوں...... ان لوگوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''تجھے بڑے رانا صاحب نے بھیجا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کس نے بھیجا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

رانا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور اس کے انداز میں ذرا بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ اس کے بجائے وہ کچھ سوچ ر
تھا۔ اچانک اس نے پستول کا رخ میری طرف کر دیا۔ ''اُدھر اُدھر کمرے میں آؤ۔''

حکم عدولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ شخص میرے سامنے دو افراد کو گولی مار چکا تھا اور اس کا تیسرا شکا
بننا مجھے قبول نہیں تھا۔ بادلِ نخواستہ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے پہلوان کے کمرے کے برابر وا
دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا میں اندر داخل ہوا۔ یہ کمرا شاید مہمانوں کے لئے تھا کیونکہ یہاں سوا
چار پائیوں اور ایک میز کے کچھ نہیں تھا۔ رانا نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ ایک منٹ بعد باہر سے زہرہ کے چیخ
اور بین کرنے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھلا اور رانا نے بے رحمی سے زہرہ کو اندر دھکیل دیا۔ اس کے جسم پر لباس
نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ہاں پورا جسم جگہ جگہ سے گل رنگ ہو رہا تھا۔ وہ فرش پر گری اور وہیں خود کو سمیٹ کر بلن
آواز سے رونے لگی۔ میں دروازے کی طرف لپکا لیکن اس سے پہلے رانا دروازہ بند کر چکا تھا۔ میں نے درواز

چھوڑ دیا۔

''ذلیل آدمی اس کے کپڑے دو...... یا کوئی چادر دو۔'' میں نے چلا کر کہا۔

اس نے باہر سے قہقہہ لگایا۔ ''مزے کرتو بھی......''

مارے طیش کے میں نے اسے بنا سنسر کے سنائیں لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میں ہواؤں سے باتیں کر رہا تھا رانا ہمیں یہاں بند کر کے جا چکا تھا۔ اگر مجھے کال کوٹھری میں بند کردیا جاتا اور صبح سورج نکلنے سے پہلے پھانسی دی جانے والی ہوتی تب بھی مجھے اتنی گھبراہٹ نہ ہوتی جتنی اس عورت کے ساتھ ہو رہی تھی جو شوہر کے ہاتھوں روز بکا کرتی تھی۔ میں نے منہ دوسری طرف کر کے اپنی قمیص اتار کر اس کی طرف پھینک دی۔

''یہ پہن لو۔''

مگر وہ بدستور رو رہی تھی۔ اس کا انداز سوگ منانے والا تھا اور وہ ہچکیوں کے درمیان دبی آواز میں اللہ رکھا کا نام لے رہی تھی۔ کمرے کا فرش بھی کچا تھا اور اس کے زخموں اور اس سے بہنے والے لہو پر مٹی جم گئی تھی۔ ابتدائی جذباتی ردِعمل کے بعد جب میرا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو مجھے رانا کی حرکت سے تشویش ہونے لگی آخر اس کی حرکت کا مقصد کیا تھا۔ اس نے مجھے اور زہرہ کو اس حال میں کمرے میں کیوں بند کیا تھا۔ کیا اس کا مقصد محض فرار تھا یا اس کے دماغ میں کوئی شاطرانہ منصوبہ آ گیا تھا۔ اس کا جواب آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا۔

کمرے میں ایک طرف صراحی اور پیتل کا بڑا گلاس موجود تھا۔ میں نے اٹھ کر صراحی کو چیک کیا اس میں پانی تھا۔ گلاس میں پانی نکال کر میں زہرہ کے پاس آیا۔ ''لو پانی پیو اور خود پر قابو پاؤ۔'' میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا تھا۔

اس کی ہچکیاں رک گئی تھیں ذرا دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور ذرا سا ہاتھ آگے کر کے گلاس لے لیا۔ میں نے دوسری طرف رخ کر کے کہا۔ ''پانی پی کر میری قمیص پہن لو۔''

اس نے پانی پی کر گلاس ایک طرف پھینک دیا اور بھرائے لہجے میں بولی۔ ''میرے پاس چھپانے کے لئے باقی ہی کیا رہا ہے؟''

''فضول باتیں کرنے کے بجائے قمیص پہنو۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ ہم دونوں ہی مصیبت میں ہیں، رانا ہمیں کسی مقصد سے یہاں بند کر کے گیا ہے۔''

اس نے اٹھ کر میری شرٹ پہن لی اور چارپائی پر اس طرح دوزانو ہو کر بیٹھ گئی کہ شرٹ نے اس کے پاؤں بھی کسی حد تک ڈھک لئے تھے۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''سب سے پہلے مجھے رانا کے بارے میں بتاؤ۔''

''اس کا نام حسن رانا ہے۔ یہ بڑے رانا کا چچازاد بھائی ہے۔''

''کیا پہلوان سے اس کا کوئی تنازع تھا۔ معمولی بات پر کوئی اس طرح قتل نہیں کرتا ہے۔''

اس نے سر ہلایا اور تلخ لہجے میں بولی۔ ''بہت بڑا تنازع تھا...... اور وجہ میں تھی...... وہ چاہتا تھا کہ میں پہلوان کو چھوڑ کر اس کی رکھیل بن جاؤں۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تو اس سے کیا فرق پڑتا!''

میری بات سمجھ کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پھر اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''میں پہلوان کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ میں نے اس سے محبت کی تھی۔''

میں دم بخود ہو گیا تھا، یہ کیسی محبت تھی! پہلوان نامرد تھا اور اس نے زہرہ کو کاروبار کا ذریعہ بنالیا تھا۔ اس کے باوجود اس سے محبت کر رہی تھی۔ ''کیا تمہیں شادی سے پہلے معلوم تھا کہ پہلوان ان صلاحیتوں سے محروم ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''اس نے خود بتایا تھا۔''

میں ایک بار پھر دنگ رہ گیا تھا۔ ''اس کے باوجود تم نے اس سے شادی کر لی۔''

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''تو پھر محبت کس بات کی ہوئی؟''

''اور یہ جو پہلوان تمہاری تجارت کر رہا تھا۔''

''میں نے خود کو اس کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ جیسا چاہتا کر سکتا تھا۔''

پہلوان کا ذکر کرتے ہوئے اس کا لہجہ پھر سے بھرا گیا تھا اور اس نے منہ چھپا کر رونا شروع کر دیا تھا۔ میں اس عجیب وغریب محبت پر غور کرنے لگا۔ پہلوان کسی طرح اس جیسی حسین اور میرے اندازے کے مطابق پڑھی لکھی عورت کے قابل نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ خوش قسمت تھا کہ اسے زہرہ ملی اور بدقسمت بھی کہ اس وقت اس کی لاش اپنے ہی گھر میں خاک وخون میں پڑی تھی اور اس کا قاتل ہمیں یہاں بند کر کے جا چکا تھا۔ مجھے اپنی فکر بھی تھی۔ میں نے اٹھ کر پہلے دروازے کا معائنہ کیا۔ یہ بے حد مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اسے باہر سے کوئی پہلوان جیسا آدمی ہی توڑ سکتا تھا۔ اندر سے اسے رستم زماں بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے لئے اسے پوری چوکھٹ اکھاڑنی پڑتی۔

''یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟''

''نہیں۔'' زہرہ نے سر اٹھا کر کہا۔ ''اس کمرے میں بس یہی دروازہ ہے۔''

کمرے کی کچی دیواریں بے حد موٹی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ کم سے کم بھی ڈیڑھ فٹ موٹی دیواریں تھیں۔ ''اس کی دوسری طرف کیا ہے؟'' میں نے عقبی دیوار کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''باڑہ ہے۔'' زہرہ نے جواب دیا۔ ''ہماری بھینسیں رکھی ہیں۔''

مجھے یاد آیا جب ہم آ رہے تھے تو گوبر کی تیز بو محسوس ہوئی تھی۔ اس وقت پک اپ یقیناً باڑے کے پاس سے گزر رہی تھی۔ ''کیا یہ ڈیرا آبادی میں ہے؟''

''نہیں...... گاؤں سے ذرا ہٹ کر ہے۔'' زہرہ نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کئے تھے۔

میں نے کمرے کے سامان کا جائزہ لیا۔ چارپائیوں اور میز کے علاوہ صرف صراحی اور گلاس تھا۔ جبکہ دیوار پر کپڑے ٹانگنے کے لئے ایک کھونٹی بھی لگی تھی۔ ان میں سے کوئی شے مٹی کھودنے میں کام نہیں آ سکتی تھی۔ میرے ذہن میں تھا کہ اگر کسی طرح دیوار میں سوراخ کر لیا جائے تو فرار ممکن تھا۔ اچانک میری نظر گلاس پر پڑی۔ یہ پیتل کا کوئی آٹھ انچ لمبا اور مضبوط گلاس تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر اس کے پیندے...... والے حصے کو

دیوار پر مارا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ مٹی کا خاصا بڑا ٹکڑا جھڑ کر گرا تھا۔

زہرہ چونکی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''دیکھتی رہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور ہاں ہو سکے تو دروازے کے باہر کا خیال رکھنا جیسے ہی کوئی آواز آئے مجھے خبردار کر دینا۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تم فرار ہونا چاہتے ہو؟''

''ظاہر ہے مجھے کسی چکر میں نہیں پڑنا ہے۔ رانا نے تمہارے لئے پہلوان کو مار دیا ہے اور اس سارے معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

دوسرے وار سے بھی خاصی مٹی جھڑی تھی۔ میں لگاتار ضربیں لگانے لگا۔ دیوار کچی تھی مگر سالوں سے جمی ملی پتھر کی طرح سخت ہو رہی تھی۔ اوپری پرت جھڑنے کے بعد کام خاصا دشوار ہو گیا تھا۔ سخت مٹی پر گلاس کا کنارہ اچٹ رہا تھا۔ اور معمولی سی مٹی نکل رہی تھی۔ میں مایوس ہونے لگا اس رفتار سے تو کام چار پانچ گھنٹوں میں جا کر مکمل ہو گا اور میرے پاس اتنی مہلت نہیں تھی۔

''یہ خشک مٹی ہے اتنی آسانی سے نہیں نکلے گی۔'' زہرہ نے کہا تھا۔

''تو پھر کیا کروں؟''

''اسے گیلا کر لو......'' اس نے مشورہ دیا۔

میں نے صراحی کی طرف دیکھا اس میں نصف سے زیادہ پانی بھرا ہوا تھا اور یہ خاصی بڑی صراحی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ پانی دو ڈھائی لیٹر ہو گا۔ میں نے کچھ پانی گلاس میں نکالا اور اسے احتیاط سے دیوار کے کھرچے جانے والے حصے پر گرانے لگا۔ میری کوشش تھی کہ پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو۔ سارے کا سارا دیوار میں جذب ہو جائے۔ جب دیوار نے گلاس کا پانی پی لیا تو میں نے پھر سے گلاس سے مٹی کھودنا شروع کی۔ مٹی نم ہو کر نرم پڑ گئی تھی اس لئے میرا کام نسبتاً آسان ہو گیا تھا مگر اب اس میں وقت بہت لگنے لگا تھا۔ پہلے میں دیوار کو پانی سے نم کرتا تھا اور پھر نرم ہونے والی مٹی کو کھودتا تھا۔ ایک گھنٹے کی کوشش سے میں نے کوئی فٹ بھر اندر تک اور دو فٹ قطر کا سوراخ کر لیا تھا۔ اتنا ہی کام باقی تھا۔

اسی لمحے باہر صحن سے چند افراد کے بولنے اور چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔ زہرہ نے سراسیمہ ہو کر میری طرف دیکھا۔ ''وہ آ گئے۔''

میں نے تیزی سے دوسری چار پائی...... اس سوراخ کے سامنے کھڑی کر دی تھی۔ زہرہ ایک بار پھر سمٹ کر بیٹھ گئی اس طرح وہ اپنی برہنگی چھپا رہی تھی۔ میں ایک طرف فرش پر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ، پاؤں اور جسم مٹی مٹی ہو رہا تھا۔ فرش پر بیٹھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا جواز پیدا ہو جائے۔ زہرہ خوف کے مارے لرزنے لگی تھی۔ ''یہ بہت ظالم لوگ ہیں۔''

''خود پر قابو رکھو۔'' میں نے دھیمے مگر سخت لہجے میں کہا۔ ''دیوار کے بارے میں اشارہ بھی مت کرنا ورنہ میرے ساتھ تم بھی ماری جاؤ گی۔''

اسی لمحے کسی نے باہر سے کنڈی کھولی۔ پہلے رانا اندر آیا اس نے پستول اٹھا رکھا تھا اس کے بعد ایک

چھوٹے قد کے...... مگر صورت اور حلئے سے جاگیردار نظر آنے والے شخص نے اندر قدم رکھا۔ میں کھڑا ہو گیا میر مقصد تھا کہ ان کی توجہ مجھ پر ہو جائے اور وہ کمرے کا جائزہ نہ لے سکیں۔ میں نے کہا۔

"رانا صاحب...... آپ سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے...... مجھے جانے دیں۔"

جاگیردار نظر آنے والا ہنسا۔ "رانا سے نہیں ہے...... پر ہم سے تو ہے ناں...... مجھے رانا نعیم کہتے ہیں۔"

میں سناٹے میں رہ گیا مگر پھر جلد سنبھل گیا۔ "دشمنی میری تم سے بھی نہیں ہے۔"

"ہاں لیکن ہمارے سجنوں سے تو ہے۔" اچانک اس کا لہجہ خطرناک ہو گیا تھا۔

ان کے تیور بتا رہے تھے کہ جانے کی اجازت تو ایک طرف رہی وہ مجھے کسی نئی مصیبت میں پھنسانا چاہ رہے تھے۔ رانا حسن کچھ دیر گرسنہ نظروں سے زہرہ کو دیکھتا رہا۔ جب کہ رانا نعیم فاتحانہ انداز میں مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ زہرہ ان کی نظروں سے بچنے کے لئے جھک گئی تھی۔ اچانک رانا نے اسے گالی دی۔

"حرامزادی...... کیا چھپا رہی ہے...... اس کی قمیص پہن کر کیا تُو سمجھتی ہے خود کو چھپا لے گی۔ بس چند دن رک جا...... تیرے یار جیسا حشر نہ کیا تو میرا نام حسن رانا نہیں۔"

اس کے لہجے میں جاگیرداروں والی مخصوص فرعونیت تھی۔ پہلوان کے ذکر پر زہرہ پھر رونے لگی تھی۔ اس نے چلا کر کہا۔ "مار دے...... مجھے بھی مار دے...... چند دن کیوں رکتا ہے...... ابھی مار دے۔"

"فکر نہ کر تیری یہ حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔" رانا زہرخند کے ساتھ بولا۔ "لیکن تُو کیا سمجھتی ہے اتنی آسانی سے مر جائے گی؟ نہیں، پہلے ہمارا ایک ایک کتا تجھے بھنبھوڑے گا تب جا کر تجھے موت ملے گی۔"

مجھے لگا جیسے رانا اس عورت کے خلاف دل میں شدید قسم کا عناد رکھتا تھا۔ نہ جانے وہ کن کتوں کا ذکر کر رہا تھا وہ دو پیر والے تھے یا چار پیروں والے۔ رانا نعیم نے اسے اشارہ کیا اور وہ دونوں کمرے سے چلے گئے تھے۔ دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔ میں لپک کر دروازے کے پاس پہنچا۔ رانا اپنے چچازاد سے کہہ رہا تھا۔ "دو گھنٹے بعد انسپکٹر اقبال آ کر انہیں لے جائے گا۔ قتل کا پرچہ اِس کے خلاف کٹے گا۔ زہرہ کو وہ اس معاملے سے نکال دے گا۔ بس اس نے ایک شرط رکھی ہے زہرہ دو دن اس کے پاس رہے گی۔"

"چار دن رکھے...... پر اس معاملے میں رانا خاندان کا نام نہ آئے۔"

"آپ فکر نہ کریں بھائی جی...... قسمت مہربان ہے...... قربانی کا بکرا بھی ادھر ہی مل گیا ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے دور چلے گئے اور ان کی آواز اتنی مدھم ہو گئی تھی کہ صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ان کی باتوں نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں تھا وہ جس قربانی کے بکرے کا ذکر رہے تھے وہ خاکسار ہی تھا۔ پہلوان کا قتل میرے سر ڈالے جانے کا پلان بن چکا تھا۔ میں نے زہرہ کی طرف دیکھا جسے ابھی رانا کو بچانے کی قیمت ادا کرنی تھی۔ انسپکٹر نے بدلے میں اسے مانگا تھا۔ انسپکٹر دو گھنٹے بعد آتا اور میرے پاس بھی اتنی ہی مہلت تھی۔ میں نے فیصلہ کیا اور دروازہ کی زنجیر اندر سے چڑھا کر پھر سے دیوار کھودنے لگ گیا۔ اس بار میں احتیاط کر رہا تھا کہ کھدائی کی آواز باہر نہ جائے۔ پانی چھڑک کر مٹی کھود رہا تھا۔ رفتہ رفتہ سوراخ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے فکر لاحق ہو گئی جب ڈیڑھ فٹ تک کھدائی مکمل ہونے کے باوجود سوراخ نہیں ہوا تھا۔ دیوار میرے اندازے سے زیادہ موٹی تھی یا باہر کی طرف سے مٹی کا ڈھیر تھا اور میں اس میں کھدائی

کر رہا تھا۔ ایک گھنٹا مزید گزر چکا تھا یا ہو سکتا تھا اس سے زیادہ وقت ہو گیا ہو۔

پولیس کسی بھی وقت بھی آ سکتی تھی اور ایک بار پولیس آ جاتی تو فرار بے حد مشکل ہو جاتا۔ یہ سوچ کر میرے ہاتھ ہر ممکن تیزی سے چلنے لگے۔ سیدھے ہاتھ سے ضرب لگا کر میں الٹے ہاتھ سے مٹی جھاڑ رہا تھا جب مٹی سخت ہو جاتی تو اس پر پانی ڈالا کرتا تھا۔ اچانک گلاس کی ضرب سے مٹی جھڑ کر باہر گری تھی۔ میرا دل اچھل پڑا تھا۔ دیوار میں سوراخ ہو گیا تھا۔ میں نے بے تابی سے تاریک اور چھوٹے سے خلا سے ہاتھ باہر نکالا۔ میرے ہاتھ نے بیک وقت خنکی اور آزادی کا لمس محسوس کیا تھا۔ میں نے ہاتھ اندر کیا اور جلدی جلدی گلاس سے ضرب لگا کر اس سوراخ کو بڑا کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ سوراخ وسیع ہو رہا تھا۔ اس لمحے مجھے کمرے سے باہر صحن میں کسی کے زور سے بولنے کی آواز آئی تھی۔ ''اوئے کدھر ہے...... وہ معشوق جوڑا؟''

میرا دل ایک لمحے کو رک گیا تھا۔ آزادی کا ٹھنڈا میٹھا چشمہ یک دم سراب بن گیا تھا۔

☆======☆======☆

پولیس آ گئی تھی، کچھ دیر بعد وہ کمرے میں ہوتی اور میری اتنی دیر کی محنت ضائع جاتی۔ ان آوازوں کو سن کر میں چند لمحے کے لئے سن رہ گیا تھا لیکن پھر بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا۔ میں نے پوری قوت سے گلاس دیوار پر مارنا شروع کیا اور زہرہ سے بولا۔ ''اِدھر آؤ یہ مٹی ہٹاؤ۔ پولیس آ گئی ہے۔''

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ ''پولیس رانا کو پکڑے گی۔''

''رانا کو نہیں مجھے پکڑے گی۔ پہلوان کے قتل کے الزام میں اور تمہیں انسپکٹر کو رشوت میں پیش کیا جائے گا۔ دو دن اس کے پاس رہو گی۔ اس کے بعد تمہیں رانا کے حوالے کر دیا جائے گا۔ رانا تمہارے ساتھ کیا کرے گا، وہ یہ بات تمہیں بتا چکا ہے۔ ان بھیڑیوں سے بچنا چاہتی ہو تو میرا ساتھ دو۔''

زہرہ آگے آئی اور زمین پر گر جانے والی مٹی ہٹانے لگی اس وقت تک سوراخ کوئی فٹ بھر چوڑا ہو گیا تھا میں اس کے کنارے پر ضربیں لگا رہا تھا۔ اسی لمحے کسی نے دروازہ بجایا۔ اندر سے زنجیر لگی تھی اور زنجیر خاصی مضبوط تھی۔ ''اوئے...... دروازہ کھولو۔'' کسی نے للکار کر کہا۔

''ہم نہیں کھولیں گے۔'' میں نے چلا کر جواب دیا۔ ''پہلوان کو میں نے نہیں رانا نے مارا ہے، اسے جا کر گرفتار کرو۔''

''اوئے کھول تیری...... تو...... توڑ دوں دروازے کو۔''

بولنے والا شاید انسپکٹر اقبال تھا اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ فوراً ہی ضربیں دروازے پر لگنے لگی تھیں۔

''روشنی بجھا دو۔'' میں نے زہرہ سے کہا اور اس نے کمرے میں روشن اکلوتا بلب بجھا دیا۔

روشنی گل کرنے کی دو وجوہات تھیں ایک تو میں نہیں چاہتا تھا کہ دروازہ توڑنے کی کوشش کرنے والوں کو سوراخ نظر آئے۔ دوسرے اس سوراخ سے روشنی جھلکتی اور باہر کوئی ہوتا تو وہ ہوشیار ہو جاتا۔ ویسے بھی میں نے کھودی جانے والی دیوار کے سامنے چارپائی کھڑی کر دی تھی باہر پولیس والے دروازے پر ٹھڈے اور رائفل کے بٹ آزما رہے تھے لیکن یہ دروازہ ٹوٹنے والا نہیں تھا۔ میں نے سوراخ اتنا بڑا کر لیا تھا کہ اس میں کسی کوشش کے بعد گزرا جا سکتا تھا۔ پہلے میں نے زہرہ کو جانے کو کہا۔ اس کا لوچ دار جسم بہ آسانی سوراخ سے نکل گیا تھا البتہ مجھے خاصی دشواری پیش آئی تھی، رگڑ لگی تھی اور جسم پر خراشیں آئی تھیں لیکن زندگی اور آزادی کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

یہ جگہ باڑے کے ساتھ تھی اور ہم نے براہ راست گوبر اور بھینسوں کے درمیان قدم رکھا تھا۔ زہرہ گوبر میں لت پت تھی اور میرا حال بھی اچھا نہیں تھا۔ بہرحال ان باتوں پر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ آج آسمان پر بادل تھے اور نیم تاریکی میں ایک طرف کوئی چار پانچ فٹ اونچی دیوار نظر آ رہی تھی۔ میں زہرہ کا ہاتھ تھام کر جھکے جھکے دیوار کی طرف بڑھا۔ یہاں کسی کی موجودگی عین ممکن تھی۔ ہمارے عقب میں کمرے کا دروازہ توڑنے کی کوششیں بھرپور طریقے سے کی جا رہی تھیں۔ ان کا اندازہ بلند ہونے والی آوازوں سے ہو رہا تھا۔ جیسے ہی ہم نے دیوار پھاندی عقب میں شور بلند ہوا تھا۔ ''اوئے...... وہ کہاں گئے...... بھاگ گئے...... پکڑو......''

''دوڑو...... ورنہ ابھی پکڑے جائیں گے۔'' میں نے زہرہ سے کہا۔ ''گاؤں سے باہر جانے والا راستہ کدھر ہے؟''

''ہمیں نہر کی طرف جانا ہوگا اس کے پار جنگل ہے...... ہم وہاں جا کر بچ سکتے ہیں۔''

زہرہ نے جس طرف اشارہ کیا تھا میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اس طرف کو دوڑ لگا دی۔ میرے پیروں میں جوتے تھے اور وہ ننگے پاؤں تھی۔ اس کے لئے ناہموار زمین اور اونچے نیچے راستے پر دوڑنا بے حد دشوار ہو رہا تھا۔ جب وہ لڑکھڑاتی تو میں اسے سہارا دیا کرتا تھا۔ عقب میں کچھ دیر شور سنائی دیتا رہا پھر وہ مدھم پڑ گیا۔ کوئی دس منٹ بعد اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''رُ کو...... خدا...... کے...... لئے...... اب...... مجھ...... سے نہیں...... بھاگا جا رہا...... رک جاؤ۔''

میں رک گیا۔ ''نہر کتنی دور ہے؟''

''وہ...... جو درخت نظر آ رہے ہیں ان کے...... پار۔''

میں نے اسے اٹھا کر شانے پر ڈالا اور اس کی تحیر انگیز آوازوں کو اَن سنی کرتے ہوئے درختوں کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔ معمولی مزاحمت کے بعد وہ ساکت ہو گئی تھی۔ پولیس والے شاید ہماری راہ پر لگ گئے تھے۔ میں دو منٹ میں درختوں کے سامنے تھا اسی لمحے عقب سے کسی گاڑی کی لہراتی روشنیاں مجھ پر پڑی تھیں۔ اگلے لمحے میں درختوں میں تھا لیکن یہ سوچنا حماقت تھی کہ عقب سے آنے والوں کی نظر مجھ پر نہیں پڑی ہو گی۔ سامنے ایک چوڑی سی نہر بہہ رہی تھی اور خزاں کے باوجود اس میں اچھا خاصا پانی تھا۔

''تمہیں تیرنا آتا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' زہرہ نے جواب دیا۔ ''لیکن زیادہ اچھا نہیں تیرتی۔''

''ہمیں نہر کے پار جانا ہے۔''

میں نے اسے نیچے اتار دیا تھا اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ذرا آگے پلیا ہے اس سے آ کر وہ ہمیں پکڑ لیں گے۔ نہر کے ساتھ ساتھ آگے چلو۔''

عقب میں لہراتی کسی گاڑی کی روشنی قریب آ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''نہر کے کنارے کیوں...... نہر کے اندر سفر کریں گے۔''

میں نہر میں کود گیا۔ ''آ جاؤ۔'' اسے پکارا تو وہ کسی قدر جھجک کے ساتھ نہر میں کود گئی۔ پانی ٹھنڈا تھا اور اس کا بہاؤ اندازے سے زیادہ تیز تھا۔ ہم اس کے سہارے تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ زہرہ میرے بازوؤں سے

چمٹی تھی مگر وہ ازخود بھی تیر رہی تھی۔ اس کا سارا بوجھ مجھ پر نہیں تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ رفتار سے تیرا جائے۔ کیونکہ نہر کے کنارے نہ پا کر وہ لازماً ہمیں بہاؤ کے ساتھ تلاش کرتے اور ان کے پاس جیپ یا اس قسم کی کوئی گاڑی تھی۔ وہ تیزی سے آگے آ کر ہمیں پکڑ سکتے تھے۔

نہر کے پانی نے ذرا سی دیر میں ہم پر جمی غلاظت اور مٹی صاف کر دی تھی۔ جہاں نہر درختوں کے نیچے سے گزر رہی تھی وہاں مکمل تاریکی چھا جاتی تھی اور جہاں کھلی جگہ ہوتی تھی کچھ کچھ نظر آتا تھا۔ سرد پانی نے رفتہ رفتہ ہمارے جسموں کو شل کرنا شروع کر دیا تھا اور مجھے لگ رہا تھا ہم کچھ دیر اور اس میں تیرے تو جسم پر اختیار کھو دیں گے۔ زہرہ کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی اب اس نے اپنا سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ کنارے کی طرف جانا شروع کر دیا۔ بہاؤ کی وجہ سے یہ کام بھی آسان نہیں تھا۔ آخر میں نے کنارے کی لمبی گھاس پکڑ لی۔

''اوپر...... چڑھنے...... کی...... کوشش کرو۔'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں چڑھ سکتی۔'' وہ منمنائی۔

میں نے کوشش کی کہ گھاس کو پکڑ کر خود کو اوپر کھینچ لوں لیکن اسی لمحے انکشاف ہوا کہ میرا بایاں ہاتھ اپنی قوت کھو چکا تھا۔ میں گھاس پکڑنے میں ناکام رہا اور محض دائیں ہاتھ کے بل بوتے پر خود کو اوپر کھینچنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں نے زہرہ کو ہلایا۔ ''اوپر چڑھو ورنہ ہم دونوں پانی میں بہہ جائیں گے۔''

بادل نخواستہ اس نے کوشش کی اور گھاس تھام کر خود کو اوپر کی طرف کھینچنے لگی۔ نیچے سے میں اسے سہارا دے رہا تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ وہ اوپر ہونے لگی اور پھر کسی نہ کسی طرح کنارے پر چڑھ گئی، وہ ناتواں سہی لیکن اس کا جسم مکمل طور کام کر رہا تھا جب کہ میرا بایاں ہاتھ اپنی گرفت کھو چکا تھا اور محض ایک ہاتھ کے سہارے اوپر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن میرے پیروں تلے صرف پانی آ رہا تھا۔ یہاں ڈھلان تقریباً عمودی تھی اگر گھاس نہ ہوتی تو اس پر چڑھنا قطعی ناممکن تھا۔ میں نے زہرہ کو آواز دی۔ ''مجھے اوپر آنے میں مدد دو۔ میں ازخود نہیں آ سکتا۔''

وہ کنارے پر لیٹ گئی اور اپنا ہاتھ آگے کیا۔ میں نے اپنا بایاں ہاتھ اسے تھما دیا۔ ''اسے مضبوطی سے پکڑنا۔ چھوڑنا مت۔''

زہرہ نے ہاتھ پکڑ لیا تو میں نے دوسرے ہاتھ سے کوشش کی اور اوپر پہنچ گیا۔ اس دوران ایک موقع پر میں نیچے گرتے گرتے بچا تھا بلکہ شاید زہرہ کو بھی لے جاتا مگر اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔ نہر کے کنارے گھاس پر گر کر ہم کتنی دیر تک سانس بحال کرتے رہے تھے۔ مشرق کی طرف سے سفیدی نمودار ہونے لگی تھی اور ہم بھی مشرقی کنارے پر تھے۔ آدھے یا پون گھنٹے میں ہم نہ جانے کتنی دور نکل آئے تھے لیکن یہ فاصلہ کم سے کم بھی میلوں میں تھا۔ زہرہ روشنی دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

''اب ہم کہاں جائیں گے اور میرے پاس تو......'' وہ جھجک کر چپ ہوگئی۔ اس کے جسم پر سوائے ایک شرٹ کے کچھ نہیں تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور اٹھ کر دو درخت کی آڑ سے اپنی پتلون بھی اتار کر اسے دے دی۔ نیچے میں نے کسی قدر بڑے سائز کی نیکر پہن رکھی تھی اس لئے میری ستر پوشی ہو رہی تھی۔ عورت ہونے کے ناتے

اسے مکمل لباس کی زیادہ ضرورت تھی۔ اس نے خاموشی سے گیلی پتلون پہن لی اور میں کھسیانے انداز میں درخت کے پیچھے سے نکل آیا۔ میری ہیئت کذائی دیکھ کر وہ ہنسی تو میں مزید کھسیا گیا تھا۔

"سوری...... لیکن مجبوری ہے۔"

"سوری تو مجھے کرنا چاہئے۔" وہ بولی۔ "تم نے میری جان بچائی اور میں نے تمہارے کپڑے اتروا لئے۔"

گیلی پتلون اتر جانے سے مجھے ذرا سا سکون محسوس ہوا تھا۔ میں اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ "اسے بھول جاؤ اب یہ بتاؤ کہ جانا کہاں ہے یہ علاقہ میرے لئے بالکل اجنبی ہے۔"

وہ سوچنے لگی اور اس کے چہرے پر مایوسی نظر آ رہی تھی۔ "ابھی ہم کہیں نہیں جا سکتے۔ رانا خاندان اس علاقے میں بہت مضبوط ہے اس کے بندے روشنی ہوتے ہی ہر طرف پھیل جائیں گے۔ ہم کسی بھی آبادی یا سڑک کے قریب گئے تو ان کو اطلاع مل جائے گی۔"

"تم پڑھی لکھی لگتی ہو۔" میں نے اس کے تجزیے پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے ہمیں آبادی اور سڑکوں سے دور رہنا چاہئے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں نے بی ایڈ کیا تھا اسکول ٹیچر تھی اور ایم ایڈ کی تیاری کر رہی تھی جب میں نے اللہ رکھا سے شادی کا فیصلہ کیا۔"

"مجھے اب بھی یقین نہیں ہے تم پہلوان جیسے شخص......"

"میں نے اس سے محبت کی تھی اور اب بھی کرتی ہوں۔" وہ تند لہجے میں بولی۔ "دنیا کے نزدیک وہ کیسا ہی تھا...... میرا محبوب ہے۔...... ہائے ربا...... کیسے زمین پر پڑا تھا!" اس نے اچانک دبی آواز میں رونا شروع کر دیا۔ "اسے مارنے والے...... رانا...... تیرے بچے روئیں...... تجھے موت آئے۔" وہ کوسنے دے رہی تھی۔ محبوب کا غم مناتے ہوئے اس کی بی ایڈ کی ڈگری ایک طرف رہ گئی تھی۔ میں نے اسے رونے دیا اور صورت حال پر غور کرنے لگا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو اتنا مسئلہ نہیں تھا مگر زہرہ کا ساتھ ہونے کی وجہ سے خطرہ کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ اگر میں اسے خدا حافظ کہہ کر اپنی راہ لیتا تو یہ خود غرضی نہ کہلاتی لیکن اخلاقی لحاظ سے یہ بات مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی کہ اس کی وجہ سے لاحق خطرات کم کرنے کے لئے میں اس کو چھوڑ دوں جبکہ رانا کے کتے مجھ سے زیادہ شد و مد سے اس کی تلاش میں تھے۔ پولیس والوں سے لے کر رانا کے...... بدمعاشوں تک کی رال اس پر بہہ رہی تھی۔

سورج طلوع ہونے والا تھا اور مشرقی افق پوری طرح سرخ ہو چکا تھا۔ اس طرف دور تک ریتلی زمین پر جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہمارے چھپنے کے لئے یہ بہترین جگہ تھی لیکن سوال یہ تھا ہم کب تک چھپ سکتے تھے! میں اور زہرہ درختوں کے درمیان سائے میں تھے اور دور سے ہمیں دیکھنا ناممکن [illegible] اچانک نہر کے مغربی کنارے پر ایک جیپ نمودار ہوئی۔ میں اور زہرہ بیک وقت گھاس میں لیٹ گئے تھے۔ جیپ آ کر دوسرے کنارے پر رکی۔ اس سے چار افراد کودے۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ چاروں مسلح تھے اور نہر کے پانی کو جھک جھک کر دیکھ رہے تھے۔ "پتا نہیں...... کہاں نکل گئے......؟" ایک شخص نے فحش گالی کے ساتھ کہا۔

"وہ بندہ بہت حرامی ہے۔" دوسرے نے کہا۔ "اس گشتی کے ساتھ عیش کر رہا ہوگا۔"

''سنا ہے کپڑے بھی نہیں ہیں اس کے پاس۔'' تیسرے نے لطف لینے والے انداز میں کہا۔
''ایک بار ہاتھ آ جائے تو لے جانے سے پہلے......'' پہلے والے نے پھر گل افشانی کی۔ اس سے آگے کی ساری گفتگو اس کے منہ سے ابلنے والی گندگی تھی۔ کچھ دیر وہ کھڑے اسی طرح کی بکواس کرتے رہے۔ پھر ایک کو وہیں چھوڑ کر باقی تین جیپوں پر نکل گئے۔
''یہ مصیبت تو چھوڑ گئے۔'' میں نے سرگوشی میں زہرہ سے کہا۔ وہ دبی دبی آواز میں رو رہی تھی۔ ظاہر ہے اس کا رونا ان لوگوں کی گفتگو پر تھا لیکن میں اس معاملے میں جذباتی نہیں ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کوئی پاک باز عورت نہیں تھی۔ پہلوان اسے جوئے کی بازی میں استعمال کرتا رہا تھا اور وہ اپنی خوشی سے استعمال ہوتی رہی تھی۔ ''خود پر قابو رکھو...... اس سے پہلے وہ اس کنارے پر آ جائیں ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''
اس نے اپنے آنسو صاف کئے اور جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ ''چھپنے کے لئے یہ بہترین جگہ ہے۔ ہمیں اس طرف جانا ہے۔''
لیکن مسئلہ نہر کے دوسرے کنارے پر موجود شخص تھا۔ یہاں گھاس میں تو ہم اس کی نگاہوں سے چھپے ہوئے تھے لیکن ہم جھاڑیوں کی طرف جاتے تو وہ ہمیں دیکھ لیتا۔ اس سے بچنا لازمی تھا۔ میں نے زہرہ سے کہا۔
''پہلے ہمیں گھاس کے ساتھ ساتھ آگے جانا ہوگا جب یہ نظروں سے دور ہو جائے گا تب ہم جھاڑیوں میں جائیں گے۔''
''آگے بھی کوئی نہ کوئی ہوگا۔'' اس نے خدشہ ظاہر کیا۔
''اس طرح تو پیچھے بھی کوئی نہ کوئی ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آگے جانا بہتر ہوگا، اسی طرح جھکے جھکے چلو۔''
ہم گھاس کے ساتھ ساتھ چاروں ہاتھوں، پیروں سے چلنے لگے۔ جہاں کہیں گھاس کی اونچائی کم ہو جاتی ہم پیٹ کے بل رینگنے لگتے تھے۔ کئی سو گز کا فاصلہ اسی طرح طے کرنے کے بعد میں نے سر اٹھا کر دوسرے کنارے کی طرف دیکھا۔ وہ شخص نظروں سے اوجھل تھا یہ اچھا موقع تھا کہ ہم جھاڑیوں میں گھس جاتے اتفاق سے اس جگہ جھاڑیاں بھی نزدیک تھیں۔ میں اور زہرہ جھکے جھکے دوڑے اور جھاڑیوں میں گھس گئے۔ نہر کے دوسرے کنارے پر موجود شخص کی نظر ہم پر نہیں پڑی تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ شہروں کے برعکس دیہی علاقوں میں صبح کی روشنی بے حد سرعت سے پھیلتی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ وہاں نہ آلودہ گیسیں ہوتی ہیں اور نہ ہی گاڑیوں اور فیکٹریوں سے نکلنے والا دھواں ہوتا ہے۔
زہرہ آگے بھاگی جا رہی تھی میں نے اسے روکا۔ ''ہمیں نہر سے نزدیک رہنا چاہئے۔ آگے جا کر ہم راستہ بھٹک سکتے ہیں۔ بھارتی سرحد یہاں سے کتنی دور ہے؟''
''کوئی بارہ تیرہ میل کے فاصلے پر۔''
''ہم بے خیالی میں وہاں تک چلے گئے تو مسئلہ بن جائے گا۔''
''یہاں وہ لوگ ہمیں تلاش کر لیں گے۔''
''ان جھاڑیوں میں تلاش اتنی آسان نہیں ہے۔''

یہ سخت گھنی اور کانٹے دار جھاڑیاں تھیں جن کے درمیان جگہ خاصی کم تھی۔ اگر کوئی شخص ان جھاڑیوں میں گھس جاتا تو کسی فوج کے لئے بھی اسے تلاش کرنا آسان نہ ہوتا۔ پھر بھی احتیاطاً ہم جھاڑیوں میں خاصے اندر چلے آئے تھے۔ شاید چند دن پہلے بارش ہوئی تھی کیونکہ جھاڑیاں ہری بھری ہو رہی تھیں اور زمین پر جہاں جگہ خالی تھی وہاں بھی گھاس اگ آئی تھی۔ میں ایسی ہی ایک ہری جگہ جھاڑی تلے بیٹھ گیا اور اپنے بائیں ہاتھ کا معائنہ کرنے لگا۔ پانی سے نکلنے کے بعد اس کی کارکردگی بہتر ہوئی تھی اور اب وہ گرفت کر رہا تھا اگرچہ یہ گرفت اب بھی کمزور تھی۔ زہرہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ''تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا؟''

''اسے حادثہ پیش آ گیا تھا۔'' میں نے تفصیلات بتانے سے گریز کیا۔ ''اس کے بعد سے کبھی کبھی اس کی گرفت ختم ہو جاتی ہے تبھی میں خود سے نہر کے اوپر نہیں چڑھ پا رہا تھا۔''

زہرہ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ''بظاہر تو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔''

''ہاں بعض خرابیاں اوپر سے نظر نہیں آتی ہیں۔''

اس نے میری بات سے نہ جانے کیا مطلب نکالا وہ افسردہ نظر آنے لگی۔ ''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ جیسے میری زندگی......ایک گندگی......''

میں نے بوکھلا کر کہا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

مگر اس نے میری وضاحت قبول نہیں کی تھی وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر اٹھ کر ایک طرف بڑھ گئی۔ ''کہاں جا رہی ہو؟''

''یہیں ہوں فکر مت کرو۔'' اس نے تلخی سے کہا تھا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کوئی ہمیں تلاش کرتا نہ آ گیا ہو۔''

میں نے اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ حالات میرے لئے کتنی تیزی سے بدل رہے تھے۔ پرسوں تک میں مطمئن تھا کہ دشمنوں کے وہم و گمان سے بھی دور ہوں لیکن اس وقت میں کسی چوہے کی طرح ان سے چھپتا پھر رہا تھا۔ نہ جانے فتح خان اور اس کے آقاؤں نے مجھے ان راناؤں کے حوالے کیوں کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ مجھے باآسانی اپنی قید میں رکھ سکتے تھے۔ رانا نعیم نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ میں مرشد علی کا دشمن ہوں لہٰذا اس کا بھی دشمن ہوں۔ دوسرے الفاظ میں، مَیں مرشد علی کی قید میں تھا لیکن یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ مرشد علی میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا اور اگر میں اس کے ہاتھ آ جاتا تو وہ پہلی فرصت میں میرا قیمہ بنانے کی کوشش کرتا نہ کہ مجھے ان راناؤں کے پاس بھجواتا۔

دوسرے مجھے جس انداز میں اغوا کیا گیا تھا۔ مرشد علی کے لوگوں میں اتنی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ مار دھاڑ کرنے والے اور طاقتور بدمعاش تھے۔ ان سے یہ توقع محال تھی کہ وہ کسی اعلیٰ درجے کے منصوبے پر اتنی صفائی اور سلیقے سے عمل کر سکیں۔ یہ انداز مجھے ڈیوڈ شا کا لگ رہا تھا اور فتح خان اس کے لئے یہ کام کر رہا تھا۔ اچانک میں چونکا۔ مجھے زہرہ کی دبی دبی چیخ سنائی دی۔ آواز کچھ ایسی تھی کہ کسی نے زہرہ کا گلا دبا لیا ہو۔ اس کے باوجود مجھے سمت کا اندازہ تھا میں اٹھ کر خاموشی اور احتیاط سے اس طرف بڑھا۔ راستے میں ایک بڑے سیب کے سائز کا گول پتھر نظر آیا تو میں نے اسے ہتھیار کے طور پر اسے اٹھا لیا۔ اس دوران میں کئی بار مجھے زہرہ کی گھٹی گھٹی آواز آئی

تھی۔ جس جھاڑی کے پیچھے سے یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے اس کے عقب میں جھانکا۔ دو افراد نے اس طرح زہرہ کو قابو کر رکھا تھا کہ ایک نے اس کی بغلوں سے ہاتھ گزار کر اسے جکڑ رکھا تھا اس کا منہ بھی اسی شخص نے دبا رکھا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا کہ میری شرٹ جو زہرہ نے پہن رکھی تھی تار تار ہو چکی تھی اور دوسرا پتلون سے نبرد آزما تھا۔ زہرہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

دونوں بدمعاش جوان عمر کے تھے اور حلیئے سے عام افراد نظر آ رہے تھے۔ ان کے پاس مجھے سوائے اس ڈانگ کے کوئی ہتھیار نظر نہیں آیا جو ایک طرف زمین پر پڑی تھی۔ یہ لوگ کسی کام سے آئے تھے اور زہرہ کو اکیلا سمجھ کر ان کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ میں گھوم کر دوسری طرف سے آیا اور اس کے سر پر پتھر سے تسلی بخش قسم کی ضرب لگائی جس نے زہرہ کا منہ اور جسم جکڑ رکھا تھا۔ پتھر کی ضرب پہ جب اس نے ہائے وے ربا پکارا تو اس کے ساتھی نے اس پر قطعی توجہ نہ دی جو پورے انہاک سے اپنا کام کرنے میں مصروف تھا۔ دوسری ضرب پر اس نے مزید کچھ پکارنے کے بجائے بے ہوش ہو جانا مناسب سمجھا۔ وہ لڑھکا تو زہرہ کا جسم بھی آزاد ہوا۔

"کتے دے پتر...... صبح سے پکڑا اپنی ماں کو۔"

مگر کتے دا پتر بے خبر زمین پر پڑا تھا۔ جب دوسرے کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے گھبرا کر زہرہ کو چھوڑ دیا اور چند لمحے ساکت رہنے کے بعد یک دم اپنی ڈانگ کی طرف لپکا۔ ظاہر ہے میں اسے ڈانگ اٹھانے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے پتھر پھینک کر اس کے سر پر مارا جو ٹھیک نشانے پر بیٹھا اس نے ڈانگ کے بجائے اپنا سر تھام لیا تھا۔ تقریباً اُڑ کر میں نے اس کی کمر پر لات رسید کی تو وہ سامنے والی خاردار جھاڑی میں جا گھسا اور دلدوز آواز میں اپنی ماں کو پکارا۔ میں نے اس کی کمر پر ایک لات اور رسید کی۔ "خبیث کیا سمجھ کر اس پر دست درازی کر رہا تھا؟"

مجھے پتا نہیں تھا کہ آزاد ہونے کے بعد زہرہ جوشِ انتقام میں سلطان راہی کا زنانہ ایڈیشن بن جائے گی۔ اس نے ڈانگ اٹھا کر جھاڑی میں پھنسے شخص کو مارنے کی کوشش کی۔ مجھے اس وقت پتا چلا جب ڈانگ کا فولاد چڑھا حصہ اس شخص کی گردن پر لگا اور اس کی چیخ پکار یک دم رک گئی۔ میں نے سوکھی شاخ چٹخنے جیسی آواز سنی تھی۔ اس پر وار کر کے زہرہ زخمی شیرنی کی طرح زمین پر بے ہوش پڑے شخص کی طرف لپکی اور جب تک میں اسے روکتا وہ جوش اور غضب سے بھرپور وار اس کے سر پر کر چکی تھی۔ اس کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹا تھا۔ میں نے زہرہ سے ڈانگ چھین لی۔

"پاگل ہو گئی ہو، یہ کیا، کیا تم نے؟"

"دو کتوں کو مار دیا۔" اس نے تمتماتے چہرے اور لہجے کے ساتھ کہا۔

میں نے جھاڑی والے کا معائنہ کیا اس کا جسم اب نزع کے عالم میں جھٹکے کھا رہا تھا۔ دوسرے کا بھی خون جتنی تیزی سے بہہ رہا تھا وہ مجھے کچھ دیر کا مہمان لگ رہا تھا۔ میں نے زمین پر پڑے شخص کے لباس کو خون سے بچانے کی کوشش کی۔ اس نے سیاہ رنگ کا کرتہ شلوار پہن رکھا تھا۔ جھاڑی والے کا لباس جھاڑی کی وجہ سے بے کار ہو چکا تھا اور وہ اتنی بری طرح کانٹوں سے الجھا ہوا تھا کہ اسے نکالنا بھی ناممکن تھا۔ پہلے جھاڑی والے نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کے بعد وہ صرف دس منٹ زندہ رہا تھا۔ زہرہ نے اس کے شانے پر

پڑا سرخ رنگ کا بڑے سائز کا رومال لے کر جسم کے اوپری حصے کی ستر پوشی کر لی تھی۔ پانچ منٹ بعد جھاڑی والے کا جسم بھی اینٹھا اور اس نے جان دے دی۔ میں افسوس سے انہیں دیکھتا رہا۔ میں ان کو بچانے کے لئے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر پہلے ایک عورت کو کمزور جان کر دست درازی کرنے والے ان دو ہٹے کٹے مردوں نے غرور مردانگی میں سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ان کی موت اس کمزور نظر آنے والی عورت کے ہاتھ سے لکھی ہے۔

''یہ کہاں سے آ گئے تھے؟''

''پتا نہیں.....'' اس نے سر ہلا دیا وہ ابھی تک کانپ رہی تھی۔ ''میں اس طرف آئی تو انہوں نے پکڑ لیا۔''

اگر چہ وہ اتنی بڑی سزا کے حق دار نہیں تھے لیکن ان کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ زہرہ نے انہیں قتل کرنے کے لئے وار نہیں کیا تھا یہ اور بات تھی کہ وہ مر گئے۔ میں نے دوسرے کی شلوار قمیص اتاری اور اسے جھاڑ کر پہن لیا۔ زہرہ دوسری طرف چلی گئی تھی اس کے بعد میں نے جھاڑیوں میں پھنسے شخص کی لاش کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے ایک بٹوا، سگریٹ اور لائٹر نکلا تھا۔ میں نے سگریٹ کا پیکٹ پھینک دیا اور احتیاطاً اسے پیروں سے مسل دیا تاکہ میری انگلیوں کے نشانات باقی نہ رہیں۔ پرس میں چند سو کی رقم اور اس کے کاغذات تھے میں نے رقم نکال کر پرس بھی صاف کر کے پھینک دیا۔

شلوار کرتہ مجھے ذرا چھوٹا تھا لیکن برا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کئی بار مرحوم سے معذرت کی کیونکہ اس نے نیچے انڈرویئر بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ زہرہ ایک طرف سر جھکائے بیٹھی تھی ابتدائی غیظ و غضب ختم ہونے کے بعد وہ اب پشیمان اور خوف زدہ نظر آ رہی تھی اس نے میری طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ ''پولیس مجھے گرفتار کر لے گی؟''

''پولیس کو کیا پتا کہ انہیں کس نے مارا ہے!'' میں نے کہا۔ ''پھر تم نے جان بوجھ کر تو انہیں قتل نہیں کیا ہے۔ اب یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ یہ مر گئے۔''

مجھے ایک خیال اور آیا ڈانگ ہمیں پھنسوا سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے اسے بھی صاف کر کے ایک گھنی جھاڑی کے وسط میں پھینک دیا کہ وہ نظر میں نہ آ سکے۔ ''اب ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہئے۔''

''کہاں؟'' اس نے پوچھا۔

''جہاں تقدیر لے جائے گی۔'' میں نے فلمی ڈائیلاگ بولا۔ ''یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے اگر پکڑے گئے تو یہ دونوں قتل سچ مچ ہمارے گلے پڑ جائیں گے۔''

زہرہ نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے کھڑی ہو گئی اور ہم مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ ہم گاؤں یا رانا کے علاقے سے جتنا دور جاتے، اتنا ہی محفوظ ہوتے۔ ان دونوں نے زہرہ کی شرٹ اس طرح پھاڑی تھی کہ وہ بے چاری خود کو نمایاں ہونے سے بچانے کی کوششوں میں نظر آ رہی تھی۔ کاش میں کسی طرح جھاڑی میں پھنسے شخص کا لباس اتار سکتا۔ اسے خفت سے بچانے کے لئے میں اس کے آگے چلنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ ہم گھنی اور اونچی جھاڑیوں کے درمیان سے گزریں تاکہ اگر دشمن آس پاس تلاش کر رہے ہوں تو ہمیں دیکھنے نہ پائیں۔

سورج سر پر آنے کے بعد گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ زہرہ کا تو نہیں پتا لیکن میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ یہ بھی یہ خشک سا علاقہ تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے پیاس لگی ہے۔''

''پیاس تو مجھے بھی لگی ہے لیکن اس وقت نہر کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں ہے ایک بار دشمن کی نظر پڑ گئی تو جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔''

''مجھے زور سے پیاس لگی ہے۔'' وہ اس بار رو دینے والے انداز میں بولی۔ ''میں اتنی پیاس برداشت نہیں کر سکتی۔''

بادل نخواستہ اسے لے کر میں مغرب کی طرف بڑھا جس طرف نہر ہونی چاہیے تھی لیکن خاصی دیر تک چلنے کے بعد بھی نہر نہیں آئی۔ بلکہ جھاڑیوں کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی کہیں ہم راستہ تو نہیں بھٹک گئے تھے۔ زہرہ اب چلتے ہوئے لڑکھڑا رہی تھی۔ ایک بار وہ چلتے ہوئے زمین پر گر گئی اور اس کا منہ ہانپنے سے کھلا ہوا تھا اور اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر ایک جھاڑی کے سائے میں کر دیا تھا۔

''تم یہاں بیٹھو میں پانی دیکھتا ہوں۔''

میں نے آگے جانے سے پہلے جھاڑیوں کی چند نشانیاں رکھیں اور ایک ڈنڈی توڑ کر اس سے ریت پر نشان بناتا آگے روانہ ہو گیا۔ یہ نشان واپسی میں میری رہنمائی کرتا۔ اگر ہم راستہ نہیں بھٹکے تو نہر کے اپنی جگہ نہ ہونے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ نہر نے اپنا راستہ بدل لیا تھا۔ میں نے اپنا رخ ذرا سا جنوب مغرب کی طرف کر لیا۔ سورج سے مجھے سمتوں کا تعین کرنے میں مدد مل رہی تھی۔ بالآخر ایک جگہ سے جھاڑیاں نسبتاً کم گھنی ہونے لگی تھیں اور مجھے ایک طرف درختوں کی قطار نظر آنے لگی۔ یہ نہر کی نشانی تھی۔ نہر کے کنارے کا بیشتر حصہ درختوں سے ڈھکا تھا۔ یہ درخت پانی کو ضائع ہونے سے بچاتے تھے اور ساتھ ہی نہر کے پشتے کو بھی مضبوط بناتے تھے۔ پیاس مجھے بھی شدت کی لگ رہی تھی اور جب کچھ دور بہتے پانی کی امید نظر آئی تو میں خود پر ضبط نہیں کر سکا تھا۔ تیز رفتاری سے کمر کے بل جھکے جھکے میں نے جھاڑیوں اور درختوں کا درمیانی فاصلہ طے کیا۔ درختوں کے اندر نیم تاریکی تھی۔ پہلے میں نے سن گن لی کہ وہاں دشمن کا کوئی آدمی تو موجود نہیں ہے۔ پھر میں بے تابی سے پانی کی طرف لپکا۔ گھاس پکڑ کر نہر کے بہتے پانی تک رسائی حاصل کی اور چلو سے پانی پینے لگا۔ پانی ٹھنڈا اور صاف تھا۔ اگر برسات کا موسم ہوتا تو نہر کا پانی گدلا اور مٹی زدہ ہوتا۔

جی بھر کر پانی پینے کے بعد میں جیسے ہی اوپر کی طرف آیا۔ دو عدد رائفلیں میرے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر آ کر رک گئیں۔ یہ دونوں افراد نہ جانے کب اور کس وقت اتنی خاموشی سے میرے سر پر آن پہنچے تھے اور مجھے ذرا بھی خبر نہیں ہوئی۔ حلیئے اور انداز سے وہ بلاشبہ رانا اینڈ پارٹی کے آدمی لگ رہے تھے۔ میں نے بے ساختہ ہاتھ اوپر کر لیئے۔ ان میں سے ایک نے ڈاکوؤں جیسی گھنی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے دریافت کیا۔ ''لڑکی کہاں ہے؟''

''کون لڑکی؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''بکواس مت کر......'' دوسرے نے اشتعال انگیز لہجے میں کہا۔ ''کہاں چھپایا ہے اپنی ماں کو۔''

''میری ماں اللہ کے حکم پر میرے باپ کے گھر ہے۔ اپنی ماں کے بارے میں جانتا......''

اس نے رائفل کی نال میرے سر پر مارنے کی کوشش کی تھی میں نے جھکائی دے کر اپنا سر بچایا۔ اس نے اتنی قوت سے وار کرنے کی کوشش کی تھی کہ ناکامی کے بعد وہ اپنے زور میں گھوما اور میرے اور اپنے ساتھی کے

درمیان میں آ گیا۔ میں موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتا؟ میں نے ایک ہاتھ سے عقب سے اس کی گردن جکڑی اور دوسرے ہاتھ سے اس سے رائفل چھین لی۔ دوسرے نے تڑپ کر اپنی رائفل سیدھی کر لی۔ "اوئے......اوئے چھوڑ اسے۔"

میری گرفت میں موجود شخص نے خود کو چھڑوانے کی کوشش کی لیکن میری گرفت سے نہ نکل سکا۔ اس کے بجائے میں نے اس کی کمر پر گھٹنا رسید کیا اور اس سے رائفل چھین لی لیکن میں رائفل ایک ہاتھ سے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے مجھے شبہ تھا کہ دوسرا رائفل بردار اپنے ساتھی کی پروا کرے گا۔ عین ممکن ہے وہ گولی چلا دے اور اتنے نزدیک سے رائفل کی گولی لازماً ہم دونوں کو مار جاتی۔ میں نے سوچا اور رائفل عقب میں نہر کے پانی میں اچھال دی اور جکڑے شخص کو اس کے ساتھی کی طرف دھکیل کر دونوں ہاتھ اوپر کر لئے۔ "ابتدا اس نے کی تھی میرا لڑائی کا ارادہ نہیں تھا۔"

"لڑائی دے......" پہلا والا ارنے بھینسے کی طرح میری طرف لپکا اور میں نے اس کا سر اپنے پیٹ پر روکا۔ کچھ دور وہ مجھے دھکیلتا چلا گیا پھر میں نے اچانک زمین پر گر کر اسے دونوں پیروں پر لیتے ہوئے عقب میں اچھال دیا۔ ایک چنگھاڑ کے ساتھ وہ نہر کے پانی میں جا گرا تھا۔

"ساکت ہو جا۔" رائفل بردار نے مجھے دھمکایا تو میں سچ مچ ساکت ہو گیا تھا۔ وہ نروس ہو رہا تھا اور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہتھیار زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ مضطربانہ انداز میں نہر کے پانی کو دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی کو آواز دے رہا تھا۔ "قدیرے......اوئے کدھر مر گیا ایں۔"

یہ سارا ہنگامہ نہر کے کنارے درختوں میں ہو رہا تھا۔ قدیرے کو غالباً تیرنا نہیں آتا تھا اور نہر میں گرنے کے بعد اسے ابھرنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ قدیرے کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے شرربار نظروں سے میری طرف دیکھا اور رائفل میری طرف سیدھی کر لی۔ "اوئے مرنے کے لئے تیار ہو جا۔"

"ایک منٹ۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے مار کر تم رانا کو کیا جواب دو گے اور زہرہ کا پتا بھی صرف میں ہی جانتا ہوں۔"

"رانا نے کہا ہے اگر تو مزاحمت کرے تو تجھے اڑا دیا جائے۔ میں تجھے گولی مار بھی دوں تو رانا مجھے کچھ نہیں کہے گا بلکہ شاباش دے گا۔ تو نے قدیرے کو بھی مارا ہے۔"

"میں نے اسے صرف دور پھینکا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ نہر میں جا گرے گا اور ڈوب کر مر جائے گا! کیا تم زہرہ کے بارے میں نہیں جاننا چاہتے۔"

میں اسے باتوں میں ایک خاص مقصد کے تحت الجھا رہا تھا۔ زہرہ کے نام پر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا غالباً اس کے ذہن میں فاسدانہ خیالات جنم لے رہے تھے۔ زہرہ کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا پھر اس نے سوچا کہ جب زہرہ اس کے ہاتھ آ جاتی تب بھی مجھے گولی ماری جا سکتی تھی۔ اس لئے فی الحال اس نے مجھے گولی مارنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ "ٹھیک ہے......اس کا پتا کہاں ہے؟"

"تمہارے پیچھے۔" زہرہ نے اس کے عقب سے کہا اور لکڑی کی موٹی شاخ گھما کر اس کے سر پر ماری۔ وار بہت قوت سے اور تمام تر نفرت کے ساتھ کیا تھا۔ رائفل بردار نے ایک آہ بھری اور آلو کی بوری کی طرح

زمین پر لڑھک گیا۔ وہ گرنے سے پہلے بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے تیزی سے اس کی رائفل اٹھائی اور پھر زہرہ کو سنبھالا۔ نہ جانے کتنے حوصلے اور ہمت سے وہ یہاں تک آئی تھی اور اس نے مجھے بچانے کے لئے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا۔ اب اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ گرنے لگی تو میں نے اسے سنبھال کر زمین پر لٹا دیا۔ پیاس سے اس کے ہونٹ خشک اور چہرہ ویران ہو رہا تھا۔ میں نے پہلے قدیرے مرحوم کے بے ہوش ساتھی کا معائنہ کیا۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔ پھر میں نے اس کے شانے پر پڑے بڑے سے رومال کو لیا اور نیچے نہر میں اتر کر اسے پانی سے تر کر کے زہرہ کے خشک ہونٹوں پر پانی ٹپکایا۔ دو مرتبہ اسی طرح کر کے اسے پانی پلایا تو اس کے حواس بحال ہوئے تھے اور اس میں اتنی ہمت آئی کہ خود نیچے جا کر پانی پی لے۔

اس نے جو سرخ رومال اپنی ستر پوشی کے لئے رکھا تھا وہ نہ جانے کہاں رہ گیا تھا۔ وہ پھر سے میری قمیص کے چیتھڑوں سے ستر پوشی کر رہی تھی۔ میں نے بے ہوش شخص کی قمیص اتار کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ''یہ پہن لو...... ان چیتھڑوں کو اتار پھینکو۔''

میں نے رخ دوسری طرف کیا اور وہ قمیص بدلنے لگی۔ مجھے خاصی بھوک لگ رہی تھی اور اس کا حال یقیناً مجھ سے زیادہ خراب تھا لیکن وہ صبر اور حوصلے سے برداشت کر رہی تھی۔ میں نے بے ہوش شخص کی تلاشی لی اس کی دھوتی کی ڈب سے ایک تھیلی کے سوا کچھ نہیں نکلا تھا میں نے تھیلی کھولی تو اس کے اندر سونے کی پتھر جڑی انگوٹھیاں نکلیں ان کی تعداد چھ تھی اور یہ سب زنانہ تھیں۔ زہرہ میرے پاس چلی آئی۔ ''یہ شاید چور ہے۔''

''ظاہر ہے رانا کے خاص آدمی اس قسم کے جرائم پیشہ ہی ہو سکتے ہیں۔'' میں نے انگوٹھیوں کا معائنہ کیا۔ ان میں سے تین میں شفاف ہیرے جڑے تھے دو میں زرد اور ایک میں سرخ رنگ کا پتھر تھا شاید یہ یاقوت تھا۔ مجھے جواہرات کی شناخت نہیں تھی لیکن اتنا ضرور معلوم تھا اگر ان انگوٹھیوں میں لگے جواہرات اصلی تھے تو ان انگوٹھیوں کی مالیت بہت زیادہ تھی۔ قمیص پہن کر زہرہ کسی قدر پُرسکون ہو گئی تھی اس نے مجھ سے کہا۔ ''اب یہاں سے چلو...... اس کے ساتھی نہ آ جائیں۔''

''نہیں فی الحال ہمیں اس جگہ رکنا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم یہاں تک کیسے آئیں؟''

''میں تھوڑی دیر تک تو وہیں رہی پھر پیاس سے مجبور ہو کر تمہارے پیچھے چل پڑی۔ تم ریت پر چھڑی سے نشان بنا آئے تھے، میں اس نشان کو دیکھتی ہوئی یہاں تک آ گئی۔ اس وقت تم دوسرے سے لڑ رہے تھے پھر تم نے اسے پانی میں پھینک دیا۔''

''اگر تم اس کے سر پر وار نہیں کرتیں تو یہ تو مجھے گولی مارنے والا تھا۔''

''اتنی آسانی سے نہ مارتا۔'' وہ زہرخند کے ساتھ بولی۔ ''ان کتوں کی رال تو مجھ پر ٹپک رہی ہے۔''

''رانا نے یہ بہت خطرناک چال چلی ہے۔ اب اس کے تمام آدمی بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہمیں تلاش کر رہے ہوں...... تم ذرا منہ دوسری طرف کرو۔''

''کیوں؟'' اس نے الجھی نظروں دیکھا۔

''کرو تو...... میں نے اصرار کیا تو اس نے بادل نخواستہ منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے بے ہوش شخص کی

دھوتی اتاری اور اس سے پٹیاں پھاڑ کر ان سے رسی بنائی اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ آخر میں اس کے رومال سے اسے اس کے منہ کو بھی بند کر دیا اس طرح وہ مکمل طور پر بے بس ہو گیا تھا۔ آخر میں بچ جانے والی دھوتی اس کی کمر کے گرد لپیٹ دی تھی تا کہ کسی حد تک اس کی ستر پوشی ہوتی رہے۔ اس دوران میں اسے بے ہوش ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ وقت کے ذکر پر یاد آیا اس کی کلائی میں ایک عدد قیمتی رولیکس بھی تھی جو میں نے اتار کر پہن لی تھی۔ اس طرح مجھے وقت کے سلسلے میں آسانی ہو گئی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ از خود وہ نہ جانے کب ہوش میں آ جائے۔ ایک بار پھر میں نہر تک گیا تھا اپنی شرٹ کے چیتھڑے پانی میں بھگو کر لایا کچھ پانی اس کے حلق میں ٹپکایا اور کچھ اس کے منہ پر...... میری کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ دس منٹ بعد وہ کراہنے لگا اور مزید پانچ منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر مسکرانے لگا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا وہ مسکراتا رہا۔

''ہمارے پیچھے رانا کے مزید کتنے گرگے لگے ہیں؟'' اس سوال پر بھی وہ مسکراتا رہا۔

''اسے پہچانتے ہو؟'' میں نے زہرہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مسکراتا رہا۔

میں نے گہری سانس لی۔ ''لگتا ہے تمہاری لگائی گئی ضرب نے اس کے دماغ کو متاثر کیا ہے۔''

''کیا یہ پاگل ہو گیا ہے؟'' زہرہ نے لاتعلقی سے کہا۔

''ممکن ہے...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیشہ کے لئے پاگل ہو گا ہو۔''

''لعنت بھیجو اس پر...... یہاں سے چلو۔''

''نہیں مجھے پاگلوں پر رحم آتا ہے۔ بے چارہ کس طرح ساری عمر پاگل پنے میں گزارے گا۔ اس سے بہتر ہے یہ مر جائے۔ میں اسے نہر میں لڑھکا دیتا ہوں۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں کچھ دیر میں ڈوب کر مر جائے گا۔'' میں نے کہا اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھانے لگا۔ اس بار اس نے مسکرانے سے گریز کیا اور مچلنے لگا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح خود کو چھڑا لے۔ زہرہ ہنسی۔

''میرا خیال ہے، اس کا دماغ درست ہو گیا ہے۔''

میں نے اسے نہر کے کنارے گرایا اور اس کی گردن دبا کر کہا۔ ''میں تمہارے منہ سے کپڑا ہٹا رہا ہوں کوئی بھی آواز نکلی یا میرے کسی سوال کا جواب نہ ملا تو میں تمہیں نہر میں دھکا دے دوں گا۔ آگے کچھ نہ کچھ عقل تمہارے پاس بھی ہے۔''

''خدا کے لئے۔'' اس نے کپڑا ہٹتے ہی کہا۔ ''مجھے تیرنا نہیں آتا۔ اس طرح میں ضرور ڈوب کر مر جاؤں گا۔''

''ایسا ہی ہو گا اگر میرے کسی سوال کو جواب نہ دیا۔ یہ بتاؤ کہ رانا کے کتنے بندے ہماری تلاش میں ہیں اور کہاں کہاں تلاش کیا جا رہا ہے؟''

''ادھر نہر کے آس پاس ہم تلاش کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''سڑک کی طرف پولیس لگی ہے۔''

''بندے کتنے ہیں اور گاڑیاں کتنی ہیں؟''

''ادھر تو تین گاڑیاں ہیں، ایک جیپ چھوڑ کر گئی ہے ہمیں۔'' وہ تمام سوالوں کے فرفر جواب دے رہا تھا اگرچہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا لیکن مجھے اس کے لہجے میں سچائی محسوس ہو رہی تھی۔

''نہر کے اس طرف کتنے بندے ہیں...... اسلحہ کون سا ہے ان کے پاس؟''

''سات یا آٹھ بندے ہیں۔ میرے اور قدیرے کے پاس رائفل تھی باقی کے پاس دو تین پستول ہیں اور اتنا ہی اسلحہ اور بندے دوسری طرف بھی ہیں۔''

''یعنی اب رائفل میرے پاس ہے۔''

''دیکھو تم رانا صاحب سے بچ کر نہیں جا سکتے اس لئے بہتر ہوگا خود کو ان کے حوالے کر دو۔''

میں نے اس کا مشورہ نظر انداز کر کے اگلا سوال کیا۔ ''سڑک پر پولیس ہے اگر اس جگہ سے نکلیں تو کس طرف جا سکتے ہیں۔''

''اسے چھوڑو میں بتاتی ہوں۔'' زہرہ نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے یہاں سے نکلنے کا راستہ۔''

''لیکن کیا ہم پیدل جا سکتے ہیں اور کتنی دور جائیں گے...... ان کے پاس گاڑیاں ہیں یہ ہمیں پکڑ سکتے ہیں۔''

''تب ہم کیا کریں؟''

''ہمیں گاڑی کا انتظار کرنا ہوگا۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور قیدی کے منہ پر پھر سے کپڑا باندھ دیا۔ اسے زہرہ کی نگرانی میں چھوڑ کر میں درختوں کے جھنڈ سے باہر آیا۔ دو پہر کے تین بج رہے تھے اور دور دور تک کوئی بندہ بشر یا گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں واپس جھنڈ میں آ گیا جہاں زہرہ اس کے پیٹ میں مسلسل ٹھوکریں مار رہی تھی اور وہ تڑپتے ہوئے بچنے کی کوششیں کر رہا تھا میں نے اسے پیچھے کھینچا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو...... ہوش میں ہو؟''

''چھوڑ دو مجھے...... میں ان کتوں کو مار ڈالوں گی۔'' وہ جوشِ غضب سے جامے سے باہر ہو رہی تھی۔ ''یہ اتنے ذلیل اور گھٹیا ہیں کہ اس حالت میں بھی ان کی آنکھوں میں سوائے گندگی کے اور کچھ نہیں ہے۔''

''احمق نہ بنو، اسے مار کر تمہیں کیا ملے گا اور سب سے اہم بات یہ زندگی تم نے خوشی سے قبول کی تھی جسے اپنانے کے بعد تم کسی مرد کی نگاہوں میں عزت اور احترام نہیں پا سکتی ہو۔''

یک دم اس کا جوش و خروش رک گیا تھا اس نے زخمی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم بھی ان مردوں میں سے ہو؟''

''میں اس فطرت کا آدمی نہیں ہوں۔ میری ماں نے مجھے ہر حال میں عورت کی عزت کرنا سکھایا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ لوگوں سے ان کی اوقات سے زیادہ توقع مت رکھو۔''

کرتہ اس کے جسم پر بہت ہی ڈھیلا تھا اور جوش میں اس کے شانے سے اتر گیا تھا اسے احساس ہی نہیں تھا لیکن جب وہ حواس میں آ گئی تو اس نے جلدی سے کرتہ درست کیا اور اس کے سارے ہی بٹن بند کر لئے تھے۔ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں ان دیہاتی مردوں کی فطرت سمجھ رہا تھا۔ زہرہ کے رحم و کرم پر ہونے کے باوجود وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھا اور اس نے منہ بند ہونے کے باوجود کوئی اشتعال انگیز حرکت کی ہو گی۔ جس پر زہرہ نے اسے ٹھوکروں سے مارا تھا۔ میں نے اس بار درختوں سے باہر جھانکا تو مجھے گاؤں والی سمت سے

ایک نقطہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ وہ جیپ یا کوئی اور گاڑی تھی جو ابھی خاصی دور تھی۔ میں تیزی سے اندر آیا۔ ''کوئی گاڑی آ رہی ہے ہوشیار ہو جاؤ۔''

''میں کیا کروں؟'' اس نے کہا۔

''تم اس کے پاس رہو اگر یہ ہنگامہ کرے یا کوئی متوجہ کرنے والی حرکت کرے تو بلا تکلف نہر میں دھکا دے دینا۔ مگر بلاوجہ دھکا مت دینا۔''

''مجھے سمجھ آ گئی ہے۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

میں رائفل لے کر درختوں کے پاس آ گیا۔ آنے والی گاڑی جیپ تھی اور اب کچھ فاصلے پر تھی۔ اس میں سامنے بیٹھے دو افراد بھی نظر آ رہے تھے۔ جیپ نزدیک آ کر رکی اور دونوں افراد کود کر جھنڈ کی طرف بڑھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ...... ارد گرد رانا کے کتنے آدمی تھے اور اس جگہ سے کتنے فاصلے پر تھے۔ اگر میں رائفل سے فائر کرتا تو ان تک آواز جاتی۔ ان کے خبردار ہونے سے میرے راستے میں رکاوٹ ہو سکتی تھی اس لئے میں نے فائر کرنے سے گریز کیا۔ ''خبردار۔'' ان کے قریب آنے پر میں نے چلا کر کہا اور درخت کے تنے کی آڑ سے رائفل نکالی۔ ''رک جاؤ ہاتھ اوپر کر لو۔''

وہ رک گئے انہوں نے رائفل کی نال دیکھی اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور ہاتھ اوپر کر لئے۔

''زمین پر اوندھے منہ لیٹ جاؤ...... اپنے ہاتھ آگے کی طرف پھیلا لو۔''

اس بار انہوں نے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ گھنی داڑھی اور مونچھوں والا تپے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تو کیا سمجھتا ہے اس طرح بچ جائے گا۔''

''یہ بعد کا مسئلہ ہے۔ تمہارے تین ساتھی میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے ہیں۔'' میں نے مصلحتاً غلط بیانی سے کام لیا۔ ''تم ان میں اپنا اضافہ نہیں کرنا چاہتے تو جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔''

میں رائفل بدست درختوں سے نکل آیا۔ ذرا ڈرانے دھمکانے پر وہ مان گئے انہوں نے زمین پر اوندھے منہ لیٹ کر ہاتھ سامنے پھیلا لئے تھے۔ میں نے زہرہ کو آواز دی۔ وہ بھاگی ہوئی آئی۔ ''ان کی تلاشی لو۔'' میں نے اس سے کہا۔ زہرہ نے ان کی تلاشی لی تھی ان کے پاس سے ایک پستول نکلا تھا۔ یہ گھنی داڑھی مونچھوں والے کے پاس سے نکلا تھا۔ رائفل زہرہ کو تھما کر اس بار میں نے ذرا مردانہ انداز میں ان کی تلاشی لی۔ مگر ان کے پاس مزید کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے باری باری ان کی پگڑیوں سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے اور انہیں درختوں میں ڈال دیا۔

اس دوران میں زہرہ نے جیپ کی تلاشی لے لی تھی اس کے عقبی حصے میں پانی کی ایک بوتل اور کپڑے میں لپٹی ہوئی مکئی اور گڑ سے بنی ہوئی ٹکیاں برآمد ہوئیں۔ جب زہرہ نے ان کی برآمدگی کی اطلاع دی تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کیونکہ مجھے لگ رہا تھا اگر چند گھنٹے اور مجھے کچھ کھانے کو نہ ملا تو میں بھوک سے فوت ہو جاؤں گا۔ کھا پی کر میں نے جیپ کسی نہ کسی طرح درختوں کے اندر چھپا دی اور اس کے بعد ان لوگوں سے معلومات حاصل کرتا رہا تھا۔ نجانے انہوں نے جان بوجھ کر مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی یا یہ سچ تھا۔ بقول ان کے نہ صرف پولیس اور رانا کے آدمی ہماری تلاش میں تھے بلکہ رانا کی طرف سے ہمیں پکڑنے والے کو دس ہزار کے انعام کے

اعلان کے بعد اردگرد کے دیہات کے لوگ بھی ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

صورت حال تشویش ناک تھی۔ لامحدود افرادی قوت سے بچنا محال تھا۔ ساڑھے چار بجتے ہی سورج تیزی سے روبہ زوال ہوا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ سورج ڈوبتے ہی ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ تاریکی میں ہم کسی قدر محفوظ تھے۔ میرے پاس رائفل اور اس کے دو درجن اضافی شاٹس اور ایک پستول مع ایک اضافی میگزین کے تھا یعنی اسلحے کے لحاظ سے پوزیشن تسلی بخش تھی۔ جیپ کی ٹنکی ڈیزل سے نصف بھری ہوئی تھی اور عقبی حصے میں دس گیلن کا کین بھرا تھا یعنی ایندھن کی بھی کمی نہیں تھی۔

''میرا خیال ہے ہمیں نہر کے ساتھ شمال کا رخ کرنا چاہئے۔'' میں نے ان تینوں کو سنانے کے لئے زہرہ سے کہا۔''اس طرف سے ہمیں لاہور جانے والی کوئی نہ کوئی سڑک مل جائے گی۔''

''سڑک ہے۔'' زہرہ میرا مقصد بھانپ کر بولی۔''لیکن گاؤں سے بچ کر جانا ہوگا اس کے لئے ہمیں اوپر سے چکر لگانا پڑے گا۔''

''یہ مسئلہ نہیں ہے۔ بس تیاری کرو۔ ہمیں نکلنا ہے۔''

میں نے ان کے منہ باندھنا مناسب نہیں سمجھا تھا اس طرح وہ چلا چلا کر مدد حاصل کر سکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ بندھے منہ کے ساتھ وہ یہیں بھوکے پیاسے بنا مدد کے مر جاتے۔ سورج ڈوبتے ہی تاریکی نے تیزی سے تسلط قائم کیا تھا۔ میں نے پانی کی بوتل نہر سے بھری کیونکہ آگے جا کر ہم نہر سے جدا ہو جاتے۔ کم سے کم زہرہ نے یہی بتایا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے جیپ کا رخ شمال کی طرف رکھا تھا لیکن کچھ آگے جا کر واپس مڑا اور جھاڑیوں سے ہوتے ہوئے جنوب کا رخ کیا۔ اس جگہ سے نہر جنوب مغرب کی جانب مڑ رہی تھی اور ہمیں جنوب کی طرف جانا تھا۔

''تمہیں راستہ اچھی طرح معلوم ہے ناں...... ایسا نہ ہو ہم صحرا میں بھٹک جائیں۔''

''صحرا آگے بہاولپور اور رحیم یار خان کی طرف ہے۔ تم فکر مت کرو...... پہلوان کے ساتھ میں نے اس علاقے میں سفر کیا ہے۔''

''پکی سڑک کتنی دور ہے اور ہم کس شہر کا رخ کر سکتے ہیں لیکن بڑا شہر کوئی نہیں ہے۔''

''لاہور جانے کے لئے کیا کرنا ہوگا؟''

''اس طرف سے سڑک مل جائے گی لیکن خطرہ ہے آگے چیکنگ ہوگی۔''

''کوئی اور راستہ۔''

''میرے علم میں نہیں ہے۔'' اس نے کہا پھر خاموش ہو کر کسی سوچ میں گم ہو گئی۔ خاصی دیر بعد اس نے کہا۔''ہاں ایک طریقہ ہو سکتا ہے مزید جنوب کی طرف جائیں تو ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔ اس طرف ہمیں سمہ سٹہ جانے والی ٹرین مل سکتی ہے۔ وہاں سے لاہور جا سکتے ہیں۔''

''تم نے اچھا طریقہ بتایا ہے۔'' میں نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔''ٹرین سے سفر کرنے میں ہم محفوظ رہیں گے۔ تمہیں اسٹیشن کا علم ہے۔''

''ہاں پہلوان کے ساتھ دو بار جا چکی ہوں جب اس نے بہاولپور یا ملتان کی طرف جانا ہوتا تھا تو ٹرین

سے سفر کرتا تھا۔''

''پہلوان تمہیں کہاں اور کیسے ملا؟''

''میں قصور کی رہنے والی ہوں۔ وہیں اسکول میں پڑھاتی تھی۔ میرا ابا بھی اسکول ماسٹر تھا۔ پہلوان ایک میلے میں ملا تھا۔ وہاں کچھ اوباش مجھے اور میری ساتھی ٹیچر کو چھیڑ رہے تھے۔ وہ علاقے کے بااثر افراد کی بگڑی ہوئی اولاد تھے۔ اس لئے کوئی انہیں روکنے کے لئے آگے نہیں بڑھا تھا۔ پہلوان بھی وہاں آیا تھا جب ان کی حرکتیں حد سے گزرنے لگیں تو پہلوان نے انہیں روکا اور جب وہ نہ مانے تو مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا۔''

''یعنی بالکل فلمی انداز تھا۔'' میں مسکرایا۔

''ہاں...... میں نے اسی لمحے دل ہار دیا تھا۔ جب عورت دل ہار جاتی ہے تو اس کے سامنے دنیا کی کوئی دیوار، دیوار نہیں ہوتی ہے۔ کوہ ہمالیہ بھی آئے تو وہ اسے پھلانگ جاتی ہے۔ اس وقت سب کے ساتھ مجھے پہلوان نے بھی سمجھایا تھا اور کوئی چارہ نہ پا کر اس نے یہ راز بھی کھول دیا کہ وہ شادی کے قابل ہی نہیں ہے۔ مگر میں اس کے عشق میں پاگل ہو چکی تھی۔ میں نے اسے دھمکی دی اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں خودکشی کرلوں گی۔''

''پہلوان مان گیا تھا؟''

''کیسے نہیں مانتا۔'' اس کے لہجے میں غرور تھا۔ ''پھر ایک رات ہم چپکے سے قصور سے نکل گئے۔ راستے میں میرا اور پہلوان کا نکاح ایک مولوی نے پڑھایا تھا۔''

''پہلوان کا ذریعہ معاش کیا تھا؟''

''بھینسیں پالی ہوئی تھیں، بہت بڑا باڑا تھا جواب بھی ہے۔''

''یعنی پہلوان ایک کھاتا پیتا شخص تھا پھر تم دونوں کو اس گندگی میں اترنے کی کیا ضرورت تھی؟ پہلوان کو تنی ہی ہوسِ زر تھی تو ڈاکا مارتا، اسمگلنگ کرتا۔''

''نہیں، اسے ہوس نہیں تھی میں نے مجبور کیا تھا۔''

مارے حیرت کے میں دم بخود رہ گیا تھا۔ کیا وہ مرحوم پہلوان کا الزام اپنے سر لے رہی تھی؟ ''تم نے...... کر کیوں......؟ کیا ہر رات اس طرح نیلامی کی بھینٹ چڑھنا تمہیں اچھا لگتا ہے۔''

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کون عورت طوائف بننا پسند کرتی ہے! ۔ ڈیڑھ سال تو ہم سکون سے رہ رہے تھے لیکن پھر لوگوں نے پہلوان کو طعنے اور مجھے آوارگی کے پیغامات دینا وع کر دیئے تھے۔ خاص طور سے رانا خاندان کے مردوں کی نیت شروع سے مجھ پر خراب تھی اور پہلوان طاقتور ، لیکن ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ طعنوں سے اس کا دل چھلنی کرتے رہتے تھے۔ میں نے پہلوان ، کہا کہ وہ اپنا علاج کیوں نہیں کراتا۔ اس نے بتایا کہ اس نے ہر ممکن جگہ اپنا علاج کرانے کی کوشش کی تھی لیکن ں کامیابی نہ ہو سکی۔ میں نے اخبار میں لاہور کے ایک ڈاکٹر کا اشتہار دیکھا تھا جو اس قسم کے معاملات میں ت رکھتا تھا۔ میں اصرار کر کے پہلوان کو لاہور لے گئی جہاں اس ڈاکٹر نے پہلوان کو چیک کیا اور پھر اس نے کہ پہلوان کا امریکا میں ایک آپریشن ہوگا جس کے بعد یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن علاج بہت مہنگا تھا۔

مجموعی طور پر اس پر تین کروڑ روپے لگتے۔"

"تین کروڑ روپے جمع کرنے کے لیے پہلوان نے یہ ترکیب سوچی؟"

"نہیں...... پہلوان نے نہیں...... میں نے یہ بات سوچی تھی اور جب میں نے اس سے کہا تو اس نے غصے میں مجھے مار ہی دیا تھا۔"

"پھر مانا کیسے؟"

"میں نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں اس کے پاس سے بھاگ کر کسی کوٹھے پر جا بیٹھوں گی۔" اس کا لہجہ دکھی ہو گیا" بظاہر دنیا والے پہلوان کو بے غیرت اور دلال تک کہتے تھے لیکن میں جانتی ہوں اندر سے وہ کتنا حساس تھا۔ میری خاطر اس نے ذلت کا یہ گھونٹ بھی پی لیا تھا۔"

میں دنگ رہ جانے میں حق بجانب تھا۔ بے شمار محبت و عشق کے افسانے تھے جن میں محبت کرنے والے ناقابلِ تصور آزمائشوں سے گزر گئے تھے۔ مگر ایسی آزمائش کا میں نے یا شاید کسی اور نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں ڈرائیونگ کرتا رہا اور اس بارے میں سوچتا رہا۔ جیپ جھاڑیوں اور کھیتوں کے درمیان کچے راستوں سے گزرتی رہی۔ اس علاقے میں بڑے درخت صرف وہیں تھے جہاں پانی وافر مقدار میں میسر تھا۔ جیسے نہروں کا کنارہ۔ باقی جگہوں پر چند فٹ اونچی جھاڑیاں یا گھاس پھونس تھی۔ جنوب کی طرف جاتے ہوئے کہیں کہیں ریت یا بجری کے خشک علاقے بھی آتے تھے۔ زہرہ کو بھی اس اسٹیشن کا درست محل وقوع معلوم نہیں تھا لیکن جنوب کی طرف سفر کر کے ہم ریلوے لائن تک جا سکتے تھے اس کے بعد ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔

دس بجے جیپ کا ایندھن ختم ہونے والا تھا۔ میں نے دس گیلن والا کین جیپ کی ٹنکی میں الٹ دیا۔ چار گھنٹے کی مسلسل ڈرائیونگ نے مجھے تھکا دیا تھا لیکن دشمن کی پہنچ سے دور نکلنے کے احساس نے تمام تھکن اتار دی تھی۔ آرام کے اس وقفے میں ہم نے بچی ہوئی میٹھی روٹی کھا کر پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا جو انسان کو ہر حال میں رزق دیتا ہے۔ گیارہ بجے ہم دوبارہ روانہ ہوئے۔ اب تک ہم نے ساٹھ ستر میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا اور ریلوے لائن اب تک نہیں آئی تھی۔ میرے ذہن میں راستہ بھٹک جانے کا خدشہ تھا مگر فی الحال میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ گیارہ بجے تک چاند خاصا بلند ہو چکا تھا اور اس کی مدد سے سمتوں کا پتا چل رہا تھا۔

"جیپ روکو۔" اچانک زہرہ نے کہا۔

میں نے جیپ روک دی۔ "کیا ہوا؟"

"وہ...... مجھے ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔" اس نے جھینپنے والے انداز میں کہا اور جیپ سے اتر کر ایک طرف جانے لگی۔

"دور مت جانا...... روشنی اتنی نہیں ہے۔" میں نے پکار کر کہا اور وہ سر ہلاتی ایک جھاڑی کے عقب میں چلی گئی تھی۔ میں انتظار کرنے لگا اور جیپ کا انجن بند کر دیا۔ اس کا شور رات کے سناٹے میں دور تک صاف سنائی دے رہا تھا۔ علاقہ سنسان لگ رہا تھا اس کے باوجود میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ زہرہ کو گئے ہوئے تقریباً دس منٹ ہو چکے تھے اور میں بے قرار ہو کر اسے آواز دینے والا تھا کہ اس کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ میں جیپ سے اتر کر بے ساختہ جھاڑی کی طرف بھاگا۔ جیسے ہی دوسری طرف پہنچا ایک سیاہ لمبی سی شے پھرتی

سے لہراتی ہوئی نزدیکی جھاڑی میں گھستی نظر آئی۔ زہرہ زمین پر بیٹھی تھی اور اس نے پنڈلی پکڑ رکھی۔

"سانپ۔" اس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔ "اس نے مجھے کاٹ لیا ہے۔"

"ہلنا مت...... ساکت رہو۔" میں نے کہا اور اسے گود میں اٹھا لیا۔ "سانس بھی آہستہ لو...... خوف مت محسوس کرو۔"

"میں درد سے مر رہی ہوں۔" اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے اسے لا کر جیپ کے عقبی حصے میں لٹا دیا۔ اس کی پنڈلی سے پتلون کا پائنچہ اوپر کیا۔ خوش قسمتی سے یہ میری پتلون تھی اور اس کا پائنچہ اسے ڈھیلا تھا اس لئے آسانی سے اوپر ہو گیا۔ چاند کی مدھم روشنی کے باوجود اس کی شفاف پنڈلی پر سانپ کے کاٹنے کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔ دو سوراخوں سے خون کی سیاہ بوندیں نکل کر جم رہی تھیں اور پنڈلی کا یہ حصہ نیلگوں ہو رہا تھا۔ سانپ کے کاٹنے کی احتیاطی تدبیر ہم دیہاتی لوگوں کو ازبر ہوتی ہیں۔ میں نے پائنچہ اس کے گھٹنے سے اوپر کرنے کی کوشش کی مگر یہاں آ کر پائنچہ تنگ پڑنے لگا تھا۔ وہ درد کے مارے سسکیاں لے رہی تھی۔ مجبوراً میں نے پائنچہ پھاڑ دیا اور اسے ران تک لے گیا۔ اس کے بعد میں نے جیپ کے عقبی حصے میں موجود کیبن کو باندھنے والی رسی کس کر زہرہ کی ران پر باندھ دی۔ سانپ نے گھٹنے سے ذرا نیچے ڈسا تھا۔ اب خون کا اوپر کی جانب سفر ذرا سست پڑ جاتا۔

دوسرے مرحلے میں اس کی پنڈلی سے منہ لگا کر زور سے خون چوسا اور تھوک دیا۔ زہرہ گھبرا گئی تھی اپنی تکلیف بھول کر مجھے منع کرنے لگی۔ "یہ کیا کر رہے ہو...... زہر تمہارے جسم میں چلا جائے گا۔"

"فکر مت کرو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "سانپ کا زہر منہ میں جانے سے نقصان نہیں کرتا یہ صرف خون میں شامل ہو کر نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔"

"پھر بھی میں اپنی زندگی کے بدلے تمہیں خطرے سے دوچار نہیں کرنا چاہتی۔" وہ ذرا اوپر ہو کر بولی۔ اس کے چہرے سے پسینا پھوٹ رہا تھا حالانکہ موسم خاصا خشک تھا۔ "میں ایسی عورت نہیں ہوں جس کے لئے کوئی اپنی زندگی خطرے میں ڈالے۔"

میں اس کی باتوں کو نظر انداز کر کے زہر چوستا رہا۔ کاش میرے پاس کوئی تیز دھار آلہ ہوتا تو میں اس کے زخم کو چیرا لگا دیتا تاکہ زیادہ سے زیادہ زہر نکل جاتا۔ جیپ میں ایسی کوئی شے تلاش کے باوجود مجھے نہیں ملی تھی۔

"وہ بڑا سا سیاہ رنگ کا سانپ تھا۔" میرے پوچھنے پر زہرہ نے بتایا۔ یہ تشویش ناک بات تھی کیونکہ سانپ جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے اندر اتنا ہی زہر پایا جاتا ہے۔ سانپ کے دونوں دانتوں کے درمیانی فاصلہ زیادہ تھا، یہ بھی اس کے بڑے ہونے کی نشانی تھی۔ میں نے زہرہ کو احتیاط سے اگلی نشست پر بٹھایا۔ "اپنے حواس قابو میں رکھو اور جاگنے کی کوشش کرتی رہو۔"

اس نے سست روی سے سر ہلایا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس پر سانپ کا زہر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اچانک میری نظر جیپ کے سائیڈ کے آئینے پر پڑی۔ میں نے پتھر اٹھا کر اس پر مارا اور اس کا ایک ٹکڑا لے کر زہرہ کی پنڈلی کے زخمی والی جگہ چبھو دیا۔ شیشے نے کٹ لگایا اور اس جگہ سے تیز رفتاری سے خون بہنے لگا تھا۔ خون کا رنگ بھی سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ زہرہ نے پاؤں جیپ سے باہر لٹکا دیا تھا کہ خون جیپ کے فرش کو گندا نہ کرے۔ پاؤں

نیچے کرنے سے خون کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد خون بہنے کی رفتار میں کمی آ گئی تھی اور اس کا رنگ بھی سرخی مائل ہو گیا تھا۔ یعنی پنڈلی میں موجود زہر کا بیشتر حصہ نکل گیا تھا۔ رفتہ رفتہ خون رک گیا۔ میں نے جھاڑی سے پتے توڑ کر اس کا پاؤں صاف کیا۔ اتنا خون بہہ جانے کے بعد وہ نڈھال نظر آنے لگی تھی۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی اور اس کے لئے ضروری تھا کہ ہم کسی آبادی تک جا پہنچیں۔ میں نے جیپ پوری رفتار سے چلانا شروع کر دی کچھ دیر بعد زہرہ نے سیٹ کی پشت سے سر لگا لیا تھا۔ اس پر غنودگی چھا رہی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسے جھنجھوڑا۔

''زہرہ اٹھو...... جاگنے کی کوشش کرو۔''

''مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اس نے غنودہ سی آواز میں کہا۔

''زہرہ سو گئیں تو پھر ہوش نہیں آئے گا، جاگتی رہو۔''

اس نے میری طرف دیکھا اور پھیکے سے انداز میں ہنسی۔ ''پہلوان کے بعد زندگی بے کار سی لگنے لگی ہے۔ خدا کرے اسی بہانے ہمیشہ کی نیند سو جاؤں۔''

''زندگی خدا کی امانت ہے جب اس کی مرضی ہوتی ہے تو لیتا ہے۔'' میں نے اسے باتوں میں الجھانا شروع کر دیا۔ ''ٹھیک ہے پہلوان تمہاری محبت اور تمہارا شوہر تھا لیکن اس کے مرنے سے دنیا ختم نہیں ہوئی ہے۔''

''میری تو ختم ہو گئی۔''

زہرہ ابھی تم نوجوان ہو...... خوب صورت ہو تمہیں زندگی کا دوسرا ساتھی مل سکتا ہے۔''

''کون کرے گا مجھ سے شادی۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''وہ جو مجھ سے واقف ہیں یا میں کسی کو دھوکا دوں جو کبھی نہ کبھی کھل جائے گا۔''

''دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے تم اس علاقے سے چلی جاؤ...... مجھے یقین ہے ایک نئی زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

''زندگی یا موت۔'' وہ ہنسی۔ ''اب تو مجھے نئی زندگی موت کی صورت میں نظر آ رہی ہے۔''

''یہ صرف مایوسی ہے ورنہ تمہارے مرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دیکھو، سانپ کا بیشتر زہر میں نے چوس لیا تھا اور باقی خون کے ساتھ نکل گیا جو معمولی سا رہ گیا ہے وہ نقصان دہ نہیں ہے اور تم جاگتی رہو تو زیادہ سے زیادہ ایک دو دن میں اس کے اثرات بھی ختم ہو جائیں گے۔''

باتیں کرنے سے وہ قائل ہوئی یا نہیں اس کی غنودگی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے پانی کی بوتل اسے دی۔ ''اس سے اپنے چہرے پر چھینٹے مارتی رہو۔''

اس نے خاموشی سے بوتل لے لی۔ میں نے جیپ کی روشنیاں گُل کر دی تھیں تا کہ ریلوے لائن دور سے نظر آ جائے لیکن ریلوے لائن اس وقت نظر آئی جب جیپ اس کے بالکل سامنے جا پہنچی تھی۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ ''زہرہ دیکھو ریلوے لائن مل گئی اب ہمیں کس طرف جانا ہے؟''

زہرہ کا سر آگے جھکا تھا اس نے بمشکل سر اٹھایا۔ ''دائیں طرف۔''

اسے پھر نیند آر، ہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لئے جھوٹ بولا تھا ورنہ میرے خیال میں سانپ کا زہر خاصی مقدار میں اب بھی اس کے جسم میں تھا اور اسے علاج کی ضرورت تھی۔ میں نے جیپ دائیں طرف موڑ دی۔ ''جاگتی رہو.....زہرہ..... پانی پیو..... جتنا پانی پی سکتی ہو۔''

اس نے بمشکل بوتل منہ سے لگا کر کچھ پانی پیا بیشتر اس پر گر گیا۔ میں نے اس سے بوتل لے کر رکھ دی اور بائیں ہاتھ سے اس کا گال زور سے تھپتھپایا۔ وہ چونکی۔ ''مجھے کیوں مار رہے ہو؟''

''میں مار نہیں رہا، جگا رہا ہوں۔''

''مجھے سونے دو۔'' اس نے غنودہ سی آواز میں کہا۔

''سوئیں تو ہمیشہ کے لئے سو جاؤ گی۔'' اس بار میں نے اس کے بال پکڑ کر جھنجھوڑے۔ تکلیف سے اس کے منہ سے کراہ نکل گئی تھی۔ میں نے پھر بال جھنجھوڑے۔

''ظالم۔'' وہ چیخی۔ مگر دھیمی آواز میں، اس میں بلند آواز سے بولنے کا حوصلہ بھی نہیں تھا۔

ایک موقع پر دشوار راستے کی وجہ سے میں جیپ کو ریلوے لائن سے ذرا دور لے گیا۔ میری کوشش تھی کہ ریلوے لائن سے دور نہ نکلوں۔ جیسے ہی لائن کے ساتھ ناہموار حصہ ختم ہوا میں پھر ریلوے لائن کے ساتھ آ گیا۔ میں مشکل سے چند منٹ کے لئے زہرہ سے بے خبر رہا تھا اور جب میں نے اسے دیکھا تو وہ سو چکی تھی۔ میں نے اس کے بال جھنجھوڑے، اسے تھپڑ مارے لیکن اس کی نیند نہیں ٹوٹی۔ بس وہ بے ہوشی کے عالم میں کراہ کر رہ گئی۔

اس بار میں نے اسے جگانے کی مزید کوشش کرنے کے بجائے جیپ کو ہر ممکن تیزی سے آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ میں جلد از جلد ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں ریلوے اسٹیشن تھا وہاں کوئی نہ کوئی ڈاکٹر یا دیسی معالج مل جاتا۔ ایک بج چکا تھا۔ رات کی تاریکی میں ناہموار راستے پر میں پچاس پچپن کی رفتار سے جیپ چلا رہا تھا۔ جب کوئی جھٹکا لگتا تو مجھے زہرہ کو بھی سنبھالنا پڑتا تھا۔ وہ ہوش و حواس سے قطعی بیگانہ ہو چکی تھی۔ ایک بار چند لمحے کے لئے جیپ روک کر میں نے اس کی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کی جو خاصی غیر متوازن تھی۔ نبض رفتار سست ہو رہی تھی۔

سانپ کا زہر دو طرح سے انسان پر اثر کرتا ہے۔ ایک قسم کا زہر خون کے سرخ اور سفید ذرات کو متاثر کر دیتا ہے۔ نتیجے میں خون جمنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے اور جریان خون شروع ہو جاتا ہے۔ یہ زہر خطرناک ہوتا ہے لیکن آدمی کے مرنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ دوسری قسم کے زہر کے اثر سے دماغ کا وہ حصہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے جو تنفس یعنی سانس کے نظام اور دل کی دھڑکن کو قابو کرتا ہے۔ نتیجے میں آدمی کا سانس رک جاتا ہے۔ دل بند ہو جاتا ہے اور شکار چپکے سے موت کی وادی میں اتر جاتا ہے۔ اس زہر کے شکار کو نیند آنے لگتی ہے اور اگر وہ سو جائے تو بچنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ زہرہ کو اسی قسم کے زہر کے حامل سانپ نے کاٹا تھا۔ وقفے وقفے سے میں اسے جھنجھوڑتا رہا تھا۔ اس کی بے ہوشی نما نیند میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ دو دفعہ میں نے رک کر اس کے دل کی دھڑکن اور نبض کی حالت دیکھی اور دونوں کو ہر بار زیادہ خراب پایا تھا۔ اس کا سانس بھی رک رک کر آنے لگا تھا۔

میں ہر ممکن تیزی سے جیپ ڈرائیو کر رہا تھا وقت اور زہرہ کی زندگی رفتہ رفتہ میرے ہاتھوں سے پھسل رہی تھی۔ اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا سوائے انسانیت کے۔ ہاں وہ میری محسن تھی اس نے میری جان بچائی تھی

ورنہ رانا کے کرگے مجھے مار چکے ہوتے۔ میں اسے یوں مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ریلوے لائن کے دونوں جانب دور تک تاریکی اور ویرانہ تھا میں نے اب تک کسی آبادی کے آثار نہیں دیکھے تھے۔ مگر ایک بار جب میں ایک نالے کو عبور کرنے کے لئے ریلوے لائن سے ذرا دور آیا تو مجھے نالے سے ذرا فاصلے پر ایک بلند جگہ روشنی نظر آئی تھی۔ میں نے جیپ کا رخ اس روشنی کی طرف کر دیا۔ بے شک وہاں چور ڈاکو ہوتے لیکن میں ان سے کسی آبادی کا پتا تو پوچھ سکتا تھا۔ جیپ ٹیلے کے نیچے رکی۔ میں نے زور سے آواز دی۔ ''کوئی ہے...... مدد چاہئے۔''

ٹیلے کے اوپر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ''کون ہے...... کون ہے کیا بات ہے؟'' کسی نے بھاری لہجہ اور مقامی زبان میں کہا تھا۔

''مجھے مدد چاہئے...... میری بیوی کو سانپ نے ڈس لیا ہے...... وہ بے ہوش ہے۔''

''اوہ۔'' اوپر سے کسی نے کہا تھا۔ ''اسے جلدی سے اوپر لے آؤ۔''

مجھے جلدی تھی لیکن اوپر جانے سے پہلے میں نے رائفل اور پستول ساتھ لئے تھے پھر زہرہ کو گود میں لے کر چاند کی ہلکی سی روشنی میں اوپر پہنچ گیا۔ یہ خاصا دشوار کام تھا جو میں نے کسی نہ کسی طرح کر لیا تھا۔ اوپر پہنچتے ہی ایک دھوتی پوش ہیولے سے میرا سامنا ہوا۔ اس کا بالائی جسم ننگا تھا اور اس نے گلے میں بے شمار مالائیں ڈال رکھی تھیں۔ روشنی الاؤ سے ہو رہی تھی اس نے میری رہنمائی کی۔ ''اِدھر...... اِدھر لے آ...... یہاں چٹائی پر لٹا دے۔''

''تم کون ہو؟'' میں نے زہرہ کو چٹائی پر لٹانے کے بعد پوچھا۔

''ہم ملنگ لوگ ہیں۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''تیری بیوی کو سانپ نے کہاں کاٹا ہے؟''

''تم کیا کر سکتے ہو...... ! ڈاکٹر کہاں سے ملے گا؟''

''ادھر بارہ میل جنوب میں ریلوے اسٹیشن ہے...... ڈاکٹر بھی اُدھر ملے گا پر یہ اُدھر جاتے جاتے مر جائے گی۔ اس کی حالت دیکھو۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا زہرہ کی سانس اکھڑ رہی تھی اور وہ کچھ دم کی مہمان لگ رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اس سے کہا۔ ''تم کچھ کرو...... ورنہ یہ مر جائے گی۔''

الاؤ کی روشنی میں اس کی بدہیئت صورت نمایاں تھی۔ سرخ آنکھیں اور چہرے کا بیشتر حصہ بالوں سے پوشیدہ تھا۔ البتہ جسمانی طور پر وہ مضبوط لگ رہا تھا۔ اس نے حلیہ بھی ملنگوں جیسا بنا رکھا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس سے کراہت آئی تھی اس کے باوجود میں اس سے مدد مانگنے پر مجبور تھا۔ اس نے غور سے زہرہ کو دیکھا اور پھر مجھ سے بولا۔ ''ملنگ علاج کر سکتا ہے پر شرط ہے جیسا بولوں ویسا کرنا پڑے گا۔ انکار کیا تو علاج نہیں ہوگا۔''

''مثلاً کیا بولو گے؟''

''دیکھ تُو اس کا شوہر ہے پر میں علاج کرنے والا ہوں...... اس لئے کہہ رہا ہوں...... ڈاکٹر بھی کچھ نہیں چھپاتے۔''

''تم شرطیں منوانے کے بجائے اس کا علاج شروع کرو۔'' میں نے بے زاری سے کہا۔ ''علاج کے لئے تمہیں کسی کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، پہلے اس کے تمام کپڑے اتار دے۔''

بے ساختہ میں نے پستول نکال لیا۔ ''خبیث حرامزادے۔''

''بابا...... ملنگ علاج کے لئے کہہ رہا ہے۔'' اس نے جلدی سے ہاتھ بلند کر دیئے۔ ''اگر نہیں...... تو تمہاری مرضی۔''

میں بہر حال زہرہ کو بچانا چاہتا تھا۔ ''سن، اگر میں نے محسوس کیا کہ تُو نے کوئی شرارت کی تو پوری بارہ گولیاں جسم میں اتار دوں گا۔''

''میں ملنگ ہوں...... ایسی حرکت نہیں کرتا...... پر اب دیر نہ کر۔''

واقعی وقت نہیں تھا۔ میں نے بادل نخواستہ زہرہ کا لباس اتار دیا۔ اس دوران ملنگ اپنے جھونپڑے میں جا چکا تھا۔ یہ کام کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کر لیا تھا اگر ملنگ نے بدمعاشی کی یا زہرہ کو بچانے میں ناکام رہا تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ وہ کچھ دیر بعد اندر سے آیا۔ میں نے قمیص زہرہ کے اوپر ڈال دی تھی لیکن اس نے اسے بھی ہٹا دیا اور پھر ایک مرتبان سے کوئی چیز نکال کر اس کے جسم پر لیپ کرنے لگا۔ میں یہ سب دیکھنے پر مجبور تھا لیکن اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے میں سمجھ سکتا کہ وہ اپنے سفلی جذبات کی تسکین کر رہا تھا ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے گردن سے پاؤں تک اس کے جسم پر لیپ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک اور مرتبان اس کے پاس رکھ دیا اور مجھ سے کہا۔ ''صاحب اس کے منہ پر کس کے یہ کپڑا باندھ دو۔'' اس نے ایک تھیلی نما کپڑا میرے حوالے کیا تھا۔ ''اتنا کسنا کہ کوئی مکھی بھی اندر نہ جا سکے۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''کم سے کم دس قدم دور چلا جا۔''

اس بار بھی میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے دوسرے مرتبان کا ڈھکن ایک چھڑی سے ہٹایا اور خود بھی پھرتی سے میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ مرتبان خاصا بڑا تھا۔ کوئی دو فٹ اونچا اور ایک فٹ قطر کا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''ابھی دیکھ...... چپ رہنا۔''

کوئی شے مرتبان کے سرے پر حرکت کر رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیاہ رنگ کی خاصے بڑے سائز کی چھپکلی نما شے مرتبان سے نکلی اس نے سر اٹھا کر گویا فضا میں سونگھا اور ایک عجیب سی آواز نکالتی زہرہ کی طرف لپکی میں نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا لیکن ملنگ نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی میں بولا۔

''حرکت نہ کر...... چپ چاپ دیکھتا رہ۔''

دیکھتے ہی دیکھتے چھپکلی زہرہ کے جسم پر چڑھ گئی کچھ دیر وہ اسے جیسے سونگھتی رہی پھر اچانک اس نے منہ کھول کر زہرہ کے جسم سے لگا دیا۔ میں اسے دیکھنے میں اتنا مگن تھا کہ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ مرتبان سے ایسی چار پانچ اور چھپکلیاں نکل کر زہرہ کی طرف آ ئیں اور انہوں نے بھی اس کے جسم کے مختلف حصوں سے منہ لگا دیئے ہے۔

''یہ کیا بلائیں ہیں؟'' میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

''چپ...... یہ اس کے جسم سے زہریلا خون چوس رہی ہیں۔ اس کے اثر سے یہ جاگ جائے گی۔''

''یہ چھپکلیاں ہیں؟''

''ہاں......لیکن خاص نسل کی۔ جونک جیسی ہوتی ہیں۔ جسم سے چمٹ جائیں تو رستم زماں بھی الگ نہیں کر سکتا، خود ہی خون پی کر الگ ہوتی ہیں۔''

میں نے محسوس کیا کہ چھپکلیوں کا حجم بڑھ رہا تھا۔ یہ سچ مچ جونک جیسی خصوصیات رکھتی تھیں۔

''یہ بس چھ سات ہی ہیں؟''

''ہاں......اتنی بھی بڑی مشکل سے ملی ہیں......انہیں پکڑنا آسان نہیں ہے۔''

''تمہیں یقین ہے میری بیوی بچ جائے گی۔''

''یہ تو اوپر والے کی مرضی ہے۔'' اس نے بے نیازی سے کہا تو میں نے پستول اس کے سر سے لگا دیا۔

''ملنگ بابا ایسا مت کہو...... میں نے بڑی کڑی شرط مانی ہے تمہاری...... اب ادھر دیکھنا بند کرو اور خدا سے دعا کرو کہ میری بیوی بچ جائے۔ ورنہ اس کے ساتھ تمہیں بھی مرنا ہوگا۔''

میرے لہجے میں ایسی سرد مہری تھی کہ وہ لرزنے لگا۔ اس نے اپنا رخ جلدی سے دوسری طرف کر لیا اور گڑگڑانے لگا۔ ''میں تو صرف کوشش کر سکتا ہوں۔''

''کوشش کے بچے...... مجھے کیا پتا...... میری بیوی کے علاج کے بہانے تم اس مکروہ مخلوق کو اس کا خون پلا رہے ہو۔''

''نہیں......اوپر والے کی قسم...... یہ صرف زہریلا خون چوسیں گی اور پھر زہر کے اثر سے بے ہوش ہو کر خود اس سے الگ ہو جائیں گی۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا؟''

''اوپر والے کی مرضی ہوئی تو تیری بیوی بچ جائے گی۔''

''اور نہ بچی تو اس کے ساتھ ہی اپنی قبر بھی تجھے کھودنا پڑے گی میں صرف مٹی ڈالنے کی زحمت کروں گا۔'' میں نے پستول لہرا کر کہا تھا۔

میرے لہجے میں موجود عزم نے اسے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ میں نے تو اپنی طرف سے پُن کیا تھا......اسے میرا پاپ کیوں بنا رہے ہو۔''

''میں پاپ اور پُن کے الفاظ پر چونکا۔ ''تم ہندو ہو...... خبیث...... خود کو مسلمان ظاہر کر کے دھوکا دے دیتے ہو۔''

''نہیں...... میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ اپنا نام بھی نہیں بتایا۔''

واقعی غلطی میری تھی میں نے اس سے اس کے بارے میں پوچھا ہی نہیں تھا۔ ''بہرحال، تم جو بھی ہو میری بیوی نہ بچی تو تم بھی نہ بچو گے۔''

میں نے پلٹ کر زہرہ کی طرف دیکھا اس کے جسم سے لپٹی چھپکلیاں اپنے اصل سائز سے دگنا ہو گئی تھیں میں نے تشویش سے دیکھا۔ کیا ان جونکوں نے زہرہ کا سارا ہی خون چوس لیا تھا۔ کہیں وہ خون کی کمی سے نہ مر جائے۔ میں نے اس جعلی ملنگ کو گردن سے پکڑ لیا۔ ''یہ جونکیں اس کا سارا خون پی جائیں گی...... انہیں الگ کرو۔''

"میں...... کیا کوئی بھی نہیں الگ کر سکتا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ خود ہی الگ ہوں گی اس سے۔"

"اور اس دوران میں یہ اس کا سارا خون پی جائیں گی۔" میں چلایا۔

"نہیں...... انسان کے شریر میں بہت خون ہوتا ہے۔"

اچانک ایک جونک زہرہ کے جسم سے الگ ہو کر زمین پر گر پڑی۔ وہ بے حس پڑی تھی۔ اس کے چند لمحے بعد دوسری جونک نما چھپکلیاں زہرہ کے جسم سے الگ ہو کر بے حس و حرکت پڑی تھیں دو تو اس کے جسم پر ہی ساکت تھیں مگر زہرہ بھی ساکت تھی۔ اس کے سینے کا خفیف سا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ ملنگ بدستور دوسری طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ میرے خوف سے وہ زہرہ کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اس کی جونکیں زہرہ کے جسم سے الگ ہو چکی ہیں۔ میں نے قریب جا کر ایک جونک کو رائفل کی نال سے ہلایا مگر وہ بدستور بے سدھ پڑی رہی تھی۔ اچانک زہرہ کے کراہنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ہوش میں آ رہی تھی۔ میں نے تیزی سے اس کے اوپر سے چھپکلی نما جونکیں بھی اس سے دور پھینک دیں۔ میں نے قمیص اس پر ڈال دی اور ملنگ سے کہا۔

"اس چیز کو یہاں سے ہٹاؤ۔"

ملنگ تیزی سے آیا۔ اس نے مسرت سے کہا۔ "میں نے کہا تھا...... ابھی دیوی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"خدا کے لئے ان چھپکلیوں کو ہٹاؤ ورنہ دیوی نے انہیں دیکھ لیا تو اس کا ویسے ہی انتقال ہو جائے گا۔"

اس نے جلدی جلدی سے جونکیں اٹھا کر مرتبان میں ڈالیں اور اس کا ڈھکن بند کر کے جھونپڑی میں لے گیا۔ میں نے جلدی سے زہرہ کو لباس پہنایا۔ اگرچہ یہ خاصا مشکل مرحلہ ثابت ہوا مگر میں کسی نہ کسی طرح اس مرحلے سے گزر گیا تھا۔ زہرہ سر ہلا رہی تھی اور کبھی کبھی کراہتی بھی تھی۔ میں نے ملنگ سے کہا۔ "تمہارے پاس پانی ہے تو لے آؤ۔"

"نہیں پانی نہیں...... اسے کچھ اور دینا ہے...... میں لے کر آتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد وہ ایک کٹورے میں دودھیا مائل سبز محلول لے کر آیا۔ "دیوی کو یہ پلانا ہے۔" اس نے کٹورا میری طرف بڑھا دیا۔

"ہوش میں آنے کے بعد؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ابھی چمچے سے ٹپکانا شروع کر دو۔"

کٹورے میں المونیم کا میلا سا چمچہ تھا۔ میں نے زہرہ کا منہ ہاتھ سے کھولا اور محلول چمچے سے اس کے منہ میں ٹپکانا شروع کر دیا۔ جونکوں کے خون چوسنے کے بعد حیرت انگیز طور پر زہرہ کی حالت خاصی سدھر گئی تھی۔ سانس ہمواری سے آ رہی تھی۔ دل کی دھڑکن کسی قدر سست تھی لیکن اس میں روانی آ گئی تھی۔ جیسے جیسے محلول اس کے منہ میں جا کر جسم میں اتر تا رہا اس کے چہرے کی نیلگوں رنگت بھی بحال ہوتی چلی گئی تھی۔ اس میں سرخی جھلکنے لگی تھی۔ نصف کے قریب محلول پی کر اسے ہوش آ گیا تھا۔

"میں کہاں ہوں؟" اس نے نقاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"فکر مت کرو اب تم ٹھیک ہو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "یہ محلول پیو۔"

''یہ کیا ہے؟'' اس نے ذرا سا اٹھ کر پیالے کو دیکھا۔
''ایک دوا ہے۔ اس کے اثر سے تمہیں ہوش آیا ہے۔''
میں نے سوچا کہ فی الحال اسے جونکوں کے بارے میں نہ بتایا جائے۔ ''اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟''
''تکلیف نہیں ہے...... بس ہلکی سی نیند محسوس ہو رہی ہے۔''
''یہ محلول پی لو تو نیند بھی غائب ہو جائے گی۔''
اس نے اٹھ کر کٹورے سے محلول پیا اور اس کا ذائقہ یقیناً بہتر تھا ورنہ زہرہ اسے ایک سانس میں نہیں پی جاتی۔ پھر اس نے اپنا معائنہ کیا۔ غالباً اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے لباس کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ ہوئی ہے۔ ''وہ میرے کپڑے......؟''
''میں تمہیں گود میں اس جگہ اٹھا کر لایا ہوں اس وجہ سے کپڑے بے ترتیب ہو گئے اور تم جانتی ہو میں نے اب تک تمہیں غلط نظر سے نہیں دیکھا ہے۔''
''نہیں...... نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''تم پر مجھے خود سے زیادہ اعتبار ہے۔''
''بہر حال اس شخص کے سامنے خود کو میری بیوی ظاہر کرنا۔'' میں نے جھونپڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
''میں نے اسے یہی بتایا ہے۔''
''کون ہے یہ؟'' زہرہ نے جھونپڑی کے دروازے پر کسی بھوت کی طرح کھڑے ملنگ کی طرف دیکھا۔
''خدا جانے...... ہندو ہے...... اس نے تمہارا علاج کیا ہے۔''
''یہ کیسی دوا ہے جس سے سانپ کے زہر کا اثر ختم ہو گیا۔''
''یہ بھی مجھے نہیں معلوم...... لیکن جب تمہیں یہاں لایا تو تمہاری حالت اچھی نہیں تھی لیکن اس نے کمال کر دیا۔''
''میرے جسم میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے شکایت کرتے ہوئے جسم کے ان حصوں کو دبایا جہاں چھپکلی نما جونکوں نے دانت گاڑے تھے۔
''شاید یہ زہر کا اثر ہے۔'' میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے کہا۔
زہرہ اٹھ بیٹھی تھی اس نے چاروں طرف دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''یہاں سے چلو...... مجھے اس جگہ ڈر لگ رہا ہے۔''
خود میرا بھی یہی حال تھا۔ زہرہ کی حالت حیرت انگیز طور پر بہتر ہوئی تھی اور وہ سفر کر سکتی تھی۔ میں نے رانا کے گرگوں سے مال غنیمت میں حاصل کئے روپوں میں سے ایک ہزار روپے نکالے اور ملنگ کو آواز دی وہ دوڑا ہوا آیا تھا۔ ''حکم سرکار۔''
''یہ رکھ لو...... فی الحال اتنے ہی ہیں۔ ورنہ زیادہ دیتا۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''
اس نے بے حد سفید دانت نکالے اور نوٹ لے لئے۔ ''سرکار کی عنایت ہے۔''
''اب ہمیں جانا ہے، یہ بتاؤ ریلوے اسٹیشن کتنی دور ہے؟''
''اس طرف لائن کے ساتھ چلے جاؤ۔ بارہ میل بعد اسٹیشن ہے۔'' اس نے ریلوے لائن کی طرف اشارہ

کیا۔

''اب میری بیوی کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے سرکار......بس ایک دو دن کمزوری رہے گی۔''

وہ ہمیں ٹیلے کے نیچے تک چھوڑنے آیا تھا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی لیکن میرا دل نہ چاہا کہ اس غلیظ شخص سے کھانے کو مانگوں۔ ریلوے اسٹیشن پہنچ جاتے تو کھانے کو کچھ نہ کچھ مل جاتا۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور احتیاط سے ریلوے لائن کے نزدیک جانے لگا۔ یہ سارا علاقہ ندی نالوں سے پٹا پڑا تھا اس کی وجہ سے مجھے بار بار جیپ لائن سے دور لے جانی پڑتی تھی اور بعض مقامات پر نالا عبور کرنے کے لئے خاصا سفر کرنا پڑتا تھا۔ صبح چار بجے بھی ہم مشکل سے سات آٹھ میل آگے جا سکے تھے اور ڈیزل ختم ہونے کے قریب تھا۔ میں نے ایک ندی عبور کی جس میں فی الحال پانی نہیں تھا اور جیپ رک گئی۔ زہرہ جیپ میں نڈھال لیٹی تھی۔

''اب پیدل چلنا ہوگا۔''

''مجھ میں تو ہمت نہیں ہے۔''

''میں سہارا دوں گا۔''

''تم میرے لئے اتنا کیوں کر رہے ہو......؟ مجھے اس جگہ چھوڑ جاؤ۔''

''میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔''

''شہباز تم اپنے راستے پر جاؤ......میرے مقدر میں جو ہوگا وہ بھگت لوں گی۔ ویسے بھی ساری عمر تو مجھے ساتھ نہیں رکھو گے۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔ ''ہمارا یہ ساتھ عارضی ہے۔''

''ہاں......لیکن میں تمہیں اس ویرانے میں بے بس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ جب تک میں تمہیں محفوظ مقام تک نہ پہنچا دوں۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ آؤ جیپ سے اترو۔''

وہ سُست روی سے نیچے آئی۔ میرا سہارا لے کر چند قدم چلی۔ پھر اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے نہیں چلا جا رہا۔ میں بہت کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔''

''بس ریلوے لائن تک ہمت کر لو۔ اس کے بعد میں تمہیں اٹھا لوں گا۔ میرے خیال میں دو تین میل کا فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔''

میں اسے سہارا دے کر ریلوے لائن تک لایا۔ اس کا بیشتر بوجھ مجھ پر تھا اس کے باوجود اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ ''شہ......باز......اب مجھ سے نہیں......چلا جا رہا ہے۔''

''بس تم فکر مت کرو۔'' میں نے بیٹھ کر اسے پیٹھ پر سوار کر لیا۔ اس کے وزنی جسم کو آسانی سے اور دیر تک لے جانے کا یہی طریقہ تھا۔ قد اس کا ساڑھے پانچ فٹ کے قریب تھا اور جسم خاصا بھرا بھرا تھا۔ خاص طور سے ان مقامات سے، جہاں عام طور سے خواتین کے جسم بھاری ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ تھا اس کا وزن پینسٹھ......کلوگرام سے کم نہیں تھا۔ اگرچہ اپنی پتلی کمر کی وجہ سے وہ ہلکی پھلکی لگتی تھی۔ خدا گواہ ہے اس پورے سفر کے دوران میرے ذہن میں اس کے بارے میں ایک بھی غلط خیال نہیں آیا تھا۔ حالانکہ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں، مَیں نے اسے ہر حال میں دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی معصوم بچے کو اٹھائے ہوئے ہوں جو میری پشت سے چپکی ہوئی تھی۔ مگر

مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ وہ ایک دلکش عورت ہے۔ اس نے اپنی بانہیں عقب میں میرے گلے میں ڈال رکھی تھیں اور سر میرے کندھے سے ٹکا رکھا تھا۔

شکر ہے اس ریلوے لائن پر انگریزوں کے زمانے کے لکڑی کے چوڑے تختے لگے ہوئے تھے۔ ان پر پاؤں رکھ کر سفر کرنا آسان تھا آج کل سیمنٹ اور لوہے سے تیار کردہ راڈز لگی ہوتی ہیں جن پر پاؤں رکھ کر سفر کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ دیودار کے فٹ بھر چوڑے تختے برسوں گزر جانے اور موسموں کے سرد و گرم جھیلنے کے باوجود روز اول کی طرح مضبوط تھے۔ جبکہ ہزاروں ٹن وزنی ٹرینیں ان سے گزر چکی تھیں۔ میں لائنوں پر لگے تختوں نے ان سے بھی زیادہ وزن برداشت کیا ہے۔

میں اس کو پشت پر لادے دونوں ہاتھوں سے اس کے پیر تھامے احتیاط سے تختوں پر قدم جماتا چل رہا تھا۔ سامنے صرف اس وقت دیکھتا جب سانس درست کرنے کے لئے رکتا تھا۔ پانچ بج رہے تھے اور چاند غروب ہو جانے سے ماحول بھی تاریک ہو رہا تھا۔ بس کچھ ستاروں کی روشنی تھی۔ ایک بار میں نے ستانے کے لئے سامنے دیکھا تو دم بخود رہ گیا۔ ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم مجھ سے بمشکل سو فٹ کے فاصلے پر تھا اور اس کے وسط میں آفس کے سامنے لگے ہوئے کیروسین لیمپ کی روشنی صاف نظر آ رہی تھی۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ کب ہم ریلوے اسٹیشن تک آ پہنچے تھے۔ میں نے زہرہ کے پاؤں ہلائے۔

''اٹھ جاؤ ہم ریلوے اسٹیشن تک آ گئے ہیں۔''

''وہ چونکی۔'' آں...... ہاں...... سچ۔''

''سامنے دیکھو۔'' میں نے سر سے اشارہ کیا۔ ''اب اتر جاؤ بہت سواری کر لی ہے۔''

''میں تو نہیں اتر رہی۔'' اس نے ضد آمیز شرارت میں کہا۔ ''مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ تمہاری پیٹھ پر اتنا مزہ آئے گا، میں تو سو گئی تھی۔''

''مزے کا مجھ سے پوچھو۔'' میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''تمہارا پکا سوا دو من کا وزن اٹھا کر تین میل سے آ رہا ہوں۔''

''وہ میری پشت سے اتر آئی۔'' اتنی وزنی نہیں ہوں میں۔''

ریلوے اسٹیشن دیکھ کر اس کے اندر بھی توانائی آ گئی تھی۔ ہم پلیٹ فارم پر واقع عمارت کے پاس آ گئے۔ یہ خاصی پرانی عمارت تھی۔ سامنے کی طرف تین دروازے سے تھے ایک طرف چھوٹا سا لیٹرین اور اس کے ساتھ منہ ہاتھ دھونے کے لئے ہینڈ پمپ لگا تھا۔ اس کے پاس پکی مٹی کے گھڑے اور گلاس رکھے تھے۔ میں نے اور زہرہ نے پہلے پانی پیا۔ گھڑے کا پانی صاف اور ٹھنڈا تھا۔ اس کے بعد ہینڈ پمپ چلا کر دل بھر کر منہ ہاتھ دھویا۔ یہ پانی ہلکا سا گرم تھا جو سردی کی آمد کی نشانی تھی۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' زہرہ نے منمنا کر کہا۔

''فی الحال تو یہاں کوئی بندہ نظر نہیں آ رہا۔'' میں نے چاروں طرف دیکھا۔ اکلوتے پلیٹ فارم اور اس پر دفتر کی عمارت سنسان پڑی تھی۔ حد یہ کہ چوکیدار بھی نہیں تھا وہ شاید کہیں دبکا سو رہا تھا۔ صبح کے آثار نمایاں تھے اور اس وقت پونے چھ بج رہے تھے۔ ایک طرف بینچ تھی زہرہ جا کر اس پر لیٹ گئی۔ میرا بھی تھکن اور نیند سے برا

حال تھا مگر فی الحال میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ میرے پاس رائفل تھی اور اسے دیکھ کر کوئی بھی شخص بہ آسانی مشکوک ہوسکتا تھا لہٰذا میں نے رائفل سے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کیا۔ یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں نے رائفل عمارت کے سامنے والے شیڈ کے اوپر پھینک دی۔ وہاں وہ کسی کی نظر سے محفوظ رہتی جب تک کوئی خاص طور سے اوپر چڑھ کر نہ دیکھتا۔

''یہ کیا کر رہے ہو...... رائفل کیوں پھینک دی؟'' زہرہ اٹھ کر میرے پاس چلی آئی۔

''میں نے رائفل کی گولیاں بھی پھینک دیں۔'' یہ چیز خطرناک ہے یا تو جاگیرداروں کے پاس ہوتی ہے یا ڈاکوؤں کے پاس...... ویسے پستول ہے میرے پاس۔''

جیسے ہی میں نے گولیاں پھینکیں، پلیٹ فارم سے ایک شخص اس طرف آتا نظر آیا۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا وہ چالیس سال کا طویل قامت اور مضبوط جسم رکھنے والا شخص تھا۔ کسی قدر سرخی مائل گندمی رنگت، نفاست سے ترشی مونچھیں اور سلیقے سے بنے بالوں کے ساتھ وہ وجیہہ اور بارعب شخص نظر آ رہا تھا۔ اس نے تیز نظروں سے ہمیں دیکھا اور مجھ سے بولا۔ ''بندے کو سید غلام حسین کہتے ہیں...... آپ کی تعریف۔''

''ملک شہباز احمد......'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اس نے کسی قدر گرم جوشی سے تھام لیا۔

''شہباز صاحب! میں اسٹیشن ماسٹر ہوں اور آپ کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

اس کے لہجے میں خفیف سا طنز دیکھ کر میں محتاط ہو گیا تھا۔ ''خادم حسین صاحب...... میں اور میری بیوی رحیم یار خان کی طرف جا رہے تھے کہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔''

اس نے کسی قدر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''رحیم یار خان...... کہاں سے جا رہے تھے؟''

''قصور سے...... شکر گڑھ میں ایک شادی کی تقریب میں شرکت کر کے رحیم یار خان جا رہے تھے۔''

اس نے غور کیا۔ ''اس علاقے سے رحیم یار خان کوئی سڑک نہیں جاتی۔''

''ہم ریل سے جانا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ کے اسٹیشن کی طرف آ رہے تھے درمیان میں ڈاکوؤں سے ٹکراؤ ہو گیا انہوں نے نہ صرف ہمیں لوٹا بلکہ ہماری گاڑی بھی چھین کر لے گئے۔''

''گاڑی۔'' وہ چوکنا ہو گیا تھا۔ ''اگر گاڑی تھی تو سڑک کے راستے کیوں نہیں چلے گئے۔''

''گاڑی ہماری نہیں میزبان کی تھی۔ ڈاکوؤں نے ہمیں مارا بھی تھا۔'' میں نے شرمندہ نظر آنے کی کوشش کی۔ ''ان کی مار پیٹ کی وجہ سے میری بیوی کے کپڑے پھٹ گئے تھے اس لئے راستے میں ایک دیہاتی سے اس کے کپڑے لئے۔''

''اوہ۔'' اس بار اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ ''آپ تو مصیبت کے مارے ہیں۔ ایسا کریں میرے کوارٹر چلیں۔ پہلے کچھ کھا، پی کر آرام کر لیں اس کے بعد سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔''

اس کی پیش کش قطعی غیر متوقع تھی مگر میں نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ''آپ کو زحمت ہوگی۔''

''نہیں جناب یہ تو میرا فرض ہے۔'' وہ بولا۔ ''آ جائیں...... اپنی بیگم صاحبہ کو بھی لے آئیں۔''

سیّد خادم حسین ہمیں ریلوے اسٹیشن سے متصل ایک کوارٹر تک لایا۔ یہ اچھا خاصا مکان تھا جو پختہ سرخ اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ وسیع صحن میں نیم کے دو تناور درخت تھے جنہوں نے مکان کو گھیر رکھا تھا۔ بیرونی دیوار اور

صحن میں جا بجا پھولوں اور سبزیوں کے پودے لگے تھے۔ مکان کے ایک طرف ترچھے برآمدے پر انگور کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ گیٹ کے دروازے تک سرخ اینٹوں کا فرش تھا۔ اگر یہ سرکاری کوارٹر تھا تو حیرت انگیز طور پر خوب صورت اور صاف ستھرا تھا۔

''غریب خانہ۔'' اس نے چابی سے گیٹ پر لگا تالا کھولا۔

''آپ اکیلے رہتے ہیں۔''

''جی جناب۔'' اس نے مختصراً کہا اور اندر والے مکان کا دروازہ بھی کھولا۔ اندر سادہ سی لیکن صاف سی نشست گاہ تھی وہ اس کے برابر والے کمرے میں ہمیں لایا۔ ''اس کمرے میں غسل خانہ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ نہانا چاہیں تو نہا سکتے ہیں۔'' پھر اس نے میرا جائزہ لیا۔ ''آپ کو میرے کپڑے ذرا ڈھیلے ہوں گے لیکن گزارہ ہو جائے گا۔ بیگم صاحبہ کے لئے میں اپنی بیوی کا جوڑا لے آتا ہوں۔''

وہ چلا گیا تو زہرہ نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ تو کچھ زیادہ ہی مہربان ہو رہا ہے۔''

''سمجھ لو اس کی صورت میں خدا مہربان ہے۔''

''لیکن کوئی اور چکر نہ ہو۔''

''اس پر شک نہ کرو۔ کوئی اور چکر ہوا تو دیکھ لیں گے۔'' میں نے کرتے تلے پستول پر ہاتھ مارا۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''آ جائیں جناب۔''

وہ اندر آیا۔ اس نے دو سوٹ اٹھا رکھے تھے۔ ایک مردانہ کرتہ پاجامہ تھا اور ایک زنانہ ریشمی پھولدار سوٹ تھا۔ ''معذرت خواہ ہوں لیکن اس وقت یہی میسر ہے۔ سات بجے تک ناشتا تیار ہو جائے گا۔'' وہ چلا گیا تو زہرہ پہلے غسل خانے میں گئی۔ مجھے فکر لاحق ہوگئی اب وہ نہ صرف اپنے جسم پر جونکوں کے کاٹنے کے نشانات دیکھ لے گی بلکہ شاید ملنگ نے اس کے جسم پر جس لیپ کو لگایا تھا شاید اس کے نشانات بھی باقی تھے۔ حسبِ توقع نصف گھنٹے بعد وہ آگ بگولا اندر سے نکلی۔

''یہ میرے جسم پر نشانات کیسے ہیں...... اس خبیث ملنگ نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔''

''اس نے کچھ نہیں کیا ہے۔'' میں نے اسے ٹھنڈا کرتے ہوئے بتایا کہ وہ علاج کے کن مراحل سے گزری تھی۔ کنگ سائز چھپکلی نما جونکوں کا سن کر اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ ''میرے خدا۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''اگر میں ذرا بھی ہوش میں ہوتی تو بے شک مر جاتی لیکن ان کو اپنے پاس نہ آنے دیتی۔''

''ان چھپکلیوں نے زہریلا خون چوس کر تمہاری جان بچائی ہے لیکن مجھے اندازہ تھا اس لئے اب تک یہ بات تم سے چھپائی تھی۔''

سید خادم حسین کی بیوی نسبتاً مختصر قامت رکھتی تھی اس لئے اس کے کپڑے زہرہ کو تنگ تھے۔ اس نے ذرا جھینپتے ہوئے انداز میں کہا۔ ''خادم حسین سے کہو...... کوئی چادر...... دے دے...... ان کپڑوں میں تو میں بہت بے ہودہ لگ رہی ہوں۔''

میں نے کمرے سے باہر جھانکا لیکن خادم حسین نظر نہیں آ رہا تھا اور یہ مناسب نہیں تھا کہ اسے تلاش کرنے کے لئے میں پورے گھر میں ڈھونڈتا پھروں۔ میں نے دروازہ بند کر لیا۔ ''ابھی خادم حسین کہیں اور ہے۔

تم آرام کرو...... میں نہانے جارہا ہوں۔"

یہ خاصا معقول قسم کا غسل خانہ تھا۔ ایک بڑی سی ٹنکی تھی جس میں سے پانی، بالٹی میں منتقل کر کے مگّے سے نہایا جاسکتا تھا۔ خوشبودار صابن اور صاف ستھرا تولیا بھی تھا۔ میں جی بھر کے نہایا اور باہر آیا تو زہرہ بے خبر سو رہی تھی۔ کرتہ پاجامہ ہونے کی وجہ سے لباس بے تکا نہیں لگ رہا تھا ورنہ سید خادم حسین کا قد مجھ سے دو انچ زیادہ تھا اگر شلوار قمیص ہوتا تو زیادہ بے تکا لگتا۔ میں نے بال خشک کئے اور آئینے میں دیکھ کر کنگھی کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں باہر نکل آیا۔ خادم حسین نہ جانے کہاں سے پُرتکلف قسم کا ناشتا بنوا کر لایا تھا۔ اس میں پراٹھے تھے، سوجی کا حلوا، تلے ہوئے ڈبل زردی کے انڈے تھے اور ساتھ میں لسی تھی۔ "بیگم صاحبہ تو اتنی تھکی ہوئی تھیں کہ سو گئی ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔

"کوئی بات نہیں وہ بعد میں ناشتا کر لیں گی۔" اس نے کہا۔ "آیئے آپ میرا ساتھ دیں۔"

خادم حسین مہذب آدمی تھا۔ کھانے کے دوران اس نے گفتگو یا کسی قسم کے سوالات سے گریز کیا تھا۔ میں نے گزشتہ چھتیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا سوائے میٹھی روٹیوں کے۔ اس لئے میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور سب کچھ صاف کر دیا پھر مجھے خیال آیا کہ زہرہ کے لئے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں تھا۔ میں نے معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا وہ مسکرایا۔ "فکر مت کریں...... میں ابھی ناشتا بنوا لیتا ہوں۔ بہتر ہے ان کو بھی اٹھا لیجئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھوکی ہوں گی۔"

لسی کے ایک بڑے گلاس نے تمام ناشتے کو جیسے خواب آور دوا میں تبدیل کر دیا تھا۔ میں بری طرح خمار محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے ناشتے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔ "مزید ایک گھنٹا لگے گا اصل میں، مَیں اکیلا رہتا ہوں...... تینوں وقت کا کھانا لائن مین کے گھر سے آتا ہے۔ اگر مہمان آئے ہوں تو اسے بتانا پڑتا ہے۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی جا کر کہہ دیتا ہوں۔"

"جناب ایک مہربانی اور کریں...... اگر ایک چادر مل جائے۔"

"میں لاتا ہوں۔"

مجھے چادر دے کر وہ چلا گیا تھا۔ میں کمرے میں آیا۔ چادر چارپائی پر سوتی ہوئی زہرہ پر ڈال دی اور خود دوسری چارپائی پر لیٹ کر سو گیا۔ تھکن اور پیٹ بھر کر کھانے کا خمار ایسا تھا کہ مجھے دنیا سے غافل ہونے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا۔ میں بے خبر سوتا رہا اور کافی دیر تک سوتا رہا۔ میری آنکھ کھلی تو کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ کھڑکی کے پردے سے باہر ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی پھر زہرہ کی چارپائی خالی دیکھ کر میں چونک کر رہ گیا۔ وہ کمرے سے کہاں چلی گئی تھی کیونکہ غسل خانے کی کنڈی بھی باہر سے لگی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ شام کی تاریکی چھائی تھی۔ پانچ بج رہے تھے اور آسمان پر بادل بھی تھے۔ گویا میں کوئی نو گھنٹے سوتا رہا تھا۔ ساری تھکن اتر گئی تھی۔ میں نے باہر جھانکا۔ نشست گاہ میں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں صحن میں آیا۔ زہرہ اور خادم حسین وہاں تھے۔ خادم حسین نے صحن میں ایک طرف بید کی کرسیاں رکھی تھیں۔ یہیں وہ دونوں چائے پی رہے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ مجھے زہرہ کے چہرے پر ایک خوشی اور چمک نظر آ رہی تھی۔ خادم حسین کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔

''لیں اپنے شہباز صاحب بھی آ گئے۔''

''اُف..... کتنا عرصہ ہو گیا ہے چائے کی خوشبو سونگھے۔'' میں نے گہری سانس سینے میں بھری۔

''آپ سو رہے تھے۔ بیگم صاحبہ جاگ گئی تھیں میں نے سوچا چائے پیش کر دوں۔'' خادم حسین کا انداز صفائی پیش کرنے والا تھا۔

''مجھے بیگم صاحبہ مت کہیں۔'' زہرہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''شہباز میں انہیں سب بتا چکی ہوں کہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

میری نیند کے دوران کوئی انقلاب آ گیا تھا۔ میں نے پہلی بار غور سے دیکھا۔ زہرہ اور خادم خاصے فاصلے پر تھے لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ وہ دونوں ایک ہیں یا ذہنی طور پر ایک ہو چکے ہیں ان کے درمیان کچھ طے پا گیا تھا۔ میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے تم ان کو سب کچھ بتا چکی ہو۔''

زہرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''خادم اپنے آدمی ہیں انہوں نے وعدہ کیا ہے یہ میری ہر ممکن مدد کریں گے۔''

''تمہاری؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ زہرہ کے انداز سے واضح تھا کہ اس نے مجھے الگ کر دیا تھا۔ ''میرا خیال ہے مدد کی ضرورت ہمیں ہے۔''

''بنیادی طور پر تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''ان لوگوں سے براہِ راست تمہاری دشمنی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے میرا معاملہ نہ ہوتا تو وہ کبھی ہمارے پیچھے نہ آتے۔''

''میں ہنسا۔ ''تمہیں اپنے بارے میں زیادہ ہی خوش فہمی ہے۔ بہرحال تم نے اپنا راستہ الگ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم نے اس وقت درست کہا تھا کہ جلد یا بدیر ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے۔''

''شکر ہے تم نے سمجھداری سے کام لیا۔'' وہ بولی۔ ''اب میری ذمے داری خادم پر ہے۔''

میں نے خادم حسین کی طرف دیکھا۔ ''آپ کی ہمدردی لائق تحسین ہے۔''

وہ کھسیا گیا تھا۔ ''بس جناب شروع سے ایسی طبیعت پائی ہے۔ اس وجہ سے میں نے کئی لوگوں سے دشمنیاں مول لی ہیں۔''

''تو یہ طے ہے زہرہ اب آپ کے حوالے ہے۔ یہ بتائیں کہ مجھے یہاں سے جانے کے لئے کون سی ٹرین مل سکتی ہے۔''

''ٹرین تو اب صبح دس بجے گزرے گی۔'' اس نے کہا۔ ''آپ اس میں سمہ سٹہ تک جا سکتے ہیں وہاں آپ کو ملک کے کسی بھی حصے کے لئے ٹرین مل جائے گی۔''

''شکریہ سیّد صاحب..... کیا میرے لئے چند ملبوسات اور ایک بیگ کا بندوبست ہو سکتا ہے۔''

''بیگ تو مشکل نہیں۔'' اس نے سوچ کر کہا۔ ''ہاں کپڑوں میں مسئلہ ہو سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ہے۔ درزی اور اَن سلے کپڑے مل جائیں گے لیکن ریڈی میڈ سوٹ مشکل ہیں۔''

''کوشش کریں درزی ایک دو جوڑے بنا کر دے دے اور ایک سینڈل مل جائے۔ میں ان سب چیزوں

کی ادائیگی کروں گا۔''

اس نے شاکی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''جناب آپ میرے مہمان ہیں میری یوں بے عزتی نہ کریں۔ میں جو ممکن ہوا کروں گا۔''

خادم حسین اٹھ کر باہر نکل گیا اس کے جانے کے بعد زہرہ شرمندہ نظر آنے لگی تھی۔ اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ ''وہ میں نے سوچا...... تم نے ٹھیک کہا تھا...... مرنے والے کے ساتھ......''

''وضاحت کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر نرمی سے کہا۔ ''تم اپنے اور اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے پوری طرح آزاد ہو۔''

''پھر بھی تم نے میری جان بچائی۔ ایک بار نہیں دو بار اور مجھے کتنی کوشش کر کے یہاں تک لائے۔''

''وہ میرا فرض تھا۔ انسان ہونے کے ناتے...... میں تم سے اس کا صلہ طلب نہیں کر رہا تھا بلکہ مجھے خوشی ہو رہی ہے اگر خادم حسین تمہارا رفیق بن جائے تو۔''

''تم سوچ رہے ہو گے میں نے اتنی عجلت کیوں کی؟ اور تم سے مشورہ لئے بغیر ہی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔''

''نہیں...... میں زیادہ سوچنے کا عادی نہیں ہوں۔'' میں نے بے زاری سے کہا۔ سچی بات ہے مجھے اب اس موضوع سے کوفت ہو رہی تھی۔ ''کیا مجھے چائے نہیں ملے گی؟''

''میں ابھی لاتی ہوں......'' وہ جلدی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

میں سیلاب پر بہنے والے تنکوں کی سی بے بسی سے حالات کے دھارے پر بہتا جا رہا تھا۔ ہر نئے دن میرے لئے نئے حالات ہوتے تھے۔ نئے واقعات...... نئے کردار اور نیا ماحول...... بلکہ احساسات تک بدل جاتے تھے۔ زہرہ اس کی ایک مثال تھی۔ بہر حال اس سے اب مجھے کوئی شکوہ تھا بھی تو وہ معمولی سا تھا چند منٹ سے زیادہ میرے دل میں نہ ٹک سکا۔ زہرہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اس نے چادر کے بجائے باریک سا دوپٹا لے رکھا تھا اور یوں بے تکلفی سے مکان میں گھوم پھر رہی تھی جیسے وہ اس جگہ کی مالکن ہو۔ میں نے چائے لے لی۔

''خادم حسین کے سامنے میں نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ تم دونوں کے انداز سے لگ رہا ہے کہ تم اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکے ہو؟''

''ہاں...... یہ درست ہے۔''

''کیا تم اس کی باتوں پر یقین کر سکتی ہو؟''

''ہاں۔'' اس بار وہ ذرا ہچکچائی تھی۔ ''اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ سچا ہے۔''

''گڈ! اگر تم مطمئن ہو تو میں بھی یہاں سے مطمئن جاؤں گا۔'' میں نے چائے کا کپ اسے دے دیا۔ ''نیک خواہشات کے ساتھ۔''

خادم حسین دو گھنٹے بعد آیا تھا اس کے ساتھ قصبے کا درزی تھا اس نے میرا ناپ لیا اور یقین دلایا کہ صبح تک سوٹ مجھے تیار ملیں گے۔ خادم حسین دو جوڑے جوتے اور ایک پشاوری چپل لایا تھا۔ جوتوں میں سے ایک مجھے آ گیا۔ پشاوری چپل بھی ناپ کی تھی۔ اس نے میرے لئے اپنے پاس سے ایک سفری بیگ بھی نکال لیا تھا۔

وہ واضح طور پر مجھے جلد از جلد یہاں سے روانہ کرنے کے موڈ میں تھا تاکہ زہرہ پر اس کا قبضہ ہو سکے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے عزائم کیا تھے۔ زہرہ باورچی خانے کی طرف تھی اس لئے میں نے اس سے بات کر لینا مناسب سمجھا۔

''خادم حسین صاحب...... میں کھل کر بات کروں گا۔ زہرہ کے لئے آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

''شادی کا۔'' اس نے بلا جھجک کہا۔ ''میں نے مسجد کے مولانا سے بات کر لی ہے۔ آج عشاء کے بعد ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا۔''

میں سن کر کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ کیا زہرہ نے اسے اپنے بارے میں یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے بیوہ ہوئے محض اڑتالیس گھنٹے گزرے تھے اور وہ عدت پوری کئے بغیر کسی سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ میری ہچکچانے کی وجہ یہ تھی کہ اگر زہرہ نے غلط بیانی کی تھی تو میری طرف سے سچائی کے اظہار کو ان دونوں کی جانب سے نہ جانے کس نظر سے دیکھا جاتا۔ میں نے سوچ کر کہا۔

''سیّد صاحب فرض کریں مستقبل میں آپ کو پتا چلتا ہے زہرہ نے آپ سے کسی معاملے میں غلط بیان کی ہے تو آپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟''

خادم حسین سوچ میں پڑ گیا تھا۔ پھر اس نے ایک طویل سانس لی۔ ''شہباز صاحب! میں آپ سے چھپاؤں گا نہیں...... میں زہرہ کو پسند کرنے لگا ہوں اور جب وہ مجھے اپنے بارے میں بتا رہی تھی تو مجھے شک تھا اس نے بہت ساری باتیں غلط بتائی ہیں یا مجھ سے چھپائی ہیں۔''

''اپنی شادی کے بارے میں اس نے کیا بتایا؟''

''یہی کہ اس کا شوہر مر چکا ہے۔''

''درست۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''لیکن اسے مرے صرف دو دن ہوئے ہیں...... تو سیّد صاحب آپ سمجھ سکتے ہیں۔ چار مہینے دس دن سے پہلے زہرہ کی آپ سے شادی اس ملک کے قانون اور مذہب کی رو سے ممکن نہیں ہے۔''

خادم حسین کا چہرہ تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے مکان کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''زہرہ نے مجھے یہ بات نہیں بتائی ہے۔''

''سیّد صاحب...... زہرہ اچھی عورت ہے۔ اس نے زمانے کے بہت دکھ سہے ہیں اور میں گواہی دے سکتا ہوں کہ یہ بنیادی طور پر اچھی عورت ہے۔''

''ملک صاحب میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ ایک اسٹیشن ماسٹر کو جتنے کردار اور آدمی دیکھنے کا موقع ملتا ہے شاید ہی کسی شخص کو ملتا ہو۔''

خادم حسین نے بڑک ماری تھی ورنہ زہرہ کے ہوش رُبا حسن نے اسے اپنا اسیر کر لیا تھا۔ مگر میں نے اپنے طور پر درست فیصلہ کیا تھا۔ انہیں معاشرتی اور مذہبی حدود توڑنے سے بچا لیا تھا۔ زہرہ کے مقدر میں جو ہوگا وہ اسے مل کر رہے گا۔ خادم حسین اندر چلا گیا۔ اس علاقے میں بجلی نہیں تھی۔ خادم حسین نے کیروسین لیمپ لگا رکھے تھے۔ ان کی تیز روشنی سے صحن جگ مگا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اندر سے زہرہ کے تیز لہجے میں بولنے کی آواز آئی تھی۔

''تم نے ابھی سے اپنی بات بدل دی۔''

خادم حسین نے دبی زبان میں کچھ کہا۔ زہرہ پھر چلانے لگی تھی۔ ''تمہیں اس پر اعتبار ہے...... مجھ پر نہیں...... بکواس کرتا ہے وہ۔''

ظاہر ہے روئے سخن میری طرف تھا۔ زہرہ آتش فشاں بنی باہر آئی تھی۔ ''کمینے...... ذلیل...... شخص...... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم نے......''

''بکواس بند کرو۔'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''کیا تم نے مجھے بتا کر ان سے جھوٹ بولا تھا اور جھوٹ بھی اس معاملے میں...... جس میں دوسرے کو سراسر دھوکا دیا جا رہا ہو۔ میرے سامنے کوئی غلط کام کرے تو میرا فرض ہے کہ اسے ٹوکوں...... اگر میں اصول پسند نہ ہوتا تو تم راناؤں کے قبضے میں ہوتیں یا تمہاری لاش ویرانے میں پڑی ہوتی۔''

خادم حسین باہر آیا۔ ''زہرہ تم بلاوجہ غصہ کر رہی ہو...... میں تم سے ناراض نہیں ہوں لیکن شکوہ ہے تم نے مجھے شروع سے کیوں نہیں بتایا۔'' اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''سن لیا تم نے۔'' میں نے کہا۔ ''زہرہ تم بلاوجہ ایک اچھے شخص سے سچ چھپا رہی ہو۔''

زہرہ کچھ دیر کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی پھر یک دم روتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں نے خادم حسین کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ اس کے پاس جائے اور اسے منائے۔ خادم حسین اندر گیا تو میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ باہر موسم خنک ہو چکا تھا۔ نو بجے خادم حسین کھانا لے آیا تھا۔ زہرہ نہیں آئی تھی گویا خادم حسین نے ابھی سے اسے اپنی حرم سمجھ لیا تھا۔ کھانے میں پُرتکلف مرغ مسلم اور بکرے کے گوشت کا سالن تھا۔ دیسی خمیری روٹیاں تھیں۔ صبح کا ناشتا ہضم ہو چکا تھا اس لئے میں نے ڈٹ کر کھایا۔ حکیم قادس کے علاج کے بعد میری بھوک کھل گئی تھی۔ کھانے کے بعد زہرہ چائے لے کر آئی تو اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔

''میں شرمندہ ہوں۔ تمہیں غلط الفاظ سے پکارا۔''

''میں نے تمہیں پہلے ہی معاف کر دیا ہے ورنہ میں اس وقت یہاں نہ ہوتا۔''

''میں لائن مین کے گھر جا رہی ہوں۔ اب جب تک میری عدت کا وقت نہیں گزر جاتا میں وہیں رہوں گی۔''

''یہ اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے خادم حسین عقل مند شخص ہے۔''

''شہباز! میں تمہاری شکر گزار ہوں اس بار تم نے مجھے دائمی گناہ سے بچا لیا۔ میری کمزوری آڑے آ رہی تھی۔'' اس نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

رات خنک تھی اس لئے میں نے پاؤں کی طرف رکھی چادر اوڑھ لی۔ دن بھر سونے کے بعد مجھے خاصی دیر تک نیند نہیں آئی تھی۔ شاید میں دو یا تین بجے سویا تھا اور اس دوران میں اپنے پیاروں اور دوستوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ نہ جانے وہ کیسے ہوں گے۔ میرے غائب ہونے پر وہ کیا سوچتے ہوں گے۔ میرے لئے کتنے پریشان ہوں گے۔ دشمنوں سے نمٹنے کے لئے تدبیریں سوچتے ہوں گے۔ مجھے ان کی قید سے چھڑانے کے منصوبے بناتے ہوں گے۔ شاید دشمن کے خلاف کوئی کارروائی کر گزرے ہوں۔ مجھے دوسرے افراد کے حوالے

کرنے کا قدم ظاہر کرتا ہے کہ دشمن میرے بارے میں کسی قدر دباؤ کا شکار تھے۔
صبح ساڑھے آٹھ بجے مجھے خادم حسین نے بیدار کیا تھا۔ ''اٹھ جائیں ملک صاحب...... ٹرین جانے میں ڈیڑھ گھنٹا رہ گیا ہے۔ آپ کے سوٹ آ گئے ہیں انہیں دیکھ لیں۔ ناشتا کرنے سے پہلے غسل کرنا چاہیں تو پانی بھی ہے۔''
میں نے اٹھ کر غسل کیا۔ خادم حسین کا لایا ایک شلوار سوٹ پہن لیا۔ میرے بال اور شیو بڑھی ہوئی تھی لیکن انہیں درست کرانے کا وقت نہیں تھا اپنے دوسرے کپڑے اور سینڈلز میں نے بیگ میں رکھے۔ خادم حسین ناشتا لے آیا۔ ہم دونوں نے ناشتا کیا۔ اس کے بعد میں نے خادم حسین کو کپڑوں اور جوتوں کی قیمت دینے کی کوشش کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ ''اس سے بہتر ہے ملک صاحب آپ مجھے براہ راست ذلیل کر دیں۔''
''لاحول ولاقوۃ...... ایسی احسان فراموشی کی امید آپ مجھ سے رکھتے ہیں۔'' میں نے ہڑبڑا کر کہا۔
''تب ایسی بات نہ کریں۔''
''جیسے آپ کی خوشی۔'' میں نے تھک ہار کر اس کی بات مان لی تھی۔
ساڑھے نو بجے زہرہ آئی تھی۔ وہ مجھ سے الوداعی ملاقات کرنے آئی تھی۔ جب میں بیگ اٹھا کر جا رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ میرے ساتھ اسٹیشن تک جانا چاہتی تھی لیکن میں نے منع کر دیا۔ ''زہرہ، تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔ یہ جگہ پہلوان کے گاؤں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں کا کوئی فرد اس طرف آیا اور تم پر نظر پڑ گئی تو تم سوچ سکتی ہو کہ کیا ہو سکتا ہے۔''
زہرہ کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ ''مم...... میں باہر نہیں جاؤں گی۔''
''اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ باہر جاؤ بھی تو خود کو چھپا کر۔ میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''
پلیٹ فارم پر چند افراد تھے جو ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ خادم حسین اپنے دفتر میں مجھے لے آیا اس نے ٹکٹ بھی بنوا دیا تھا۔ ''چار گھنٹے بعد آپ سمہ سٹہ میں ہوں گے۔ وہاں آپ کو کوئی اَپ ٹرین مل جائے گی۔ تقریباً ساری ہی ٹرینیں وہاں رکتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے میں آپ راولپنڈی میں ہوں گے۔''
''میں آپ کا شکر گزار ہوں سید صاحب۔''
وہ مسکرایا۔ ''شکر گزار تو مجھے ہونا چاہئے۔''
''اس کا ایک طریقہ ہے آپ زہرہ کا خیال رکھیں اور ایک مشورہ ہے اگر آپ مانیں...... جلد از جلد اس جگہ سے چلے جائیں۔''
''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ تبادلے کی درخواست میں نے پہلے ہی دے دی تھی۔ ویسے بھی زہرہ کو میں شادی ہوتے ہی ڈیرہ غازی خان لے جاؤں گا...... میرا آبائی شہر ہے۔''
ڈیرہ غازی خان شکر گڑھ سے خاصے فاصلے پر واقع ہے۔ زہرہ وہاں زیادہ محفوظ رہتی...... ٹرین بیس منٹ کی تاخیر سے آئی تھی۔ اس کا اسٹاپ دو منٹ کا تھا۔ ٹرین پر چڑھنے سے پہلے خادم حسین کے گلے لگا۔ ''بہت محتاط رہئے گا...... وہ بہت سفاک لوگ ہیں۔''
''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب...... بازو میرے بھی کمزور نہیں ہیں۔'' اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا تھا۔

"وہ باز دوسں ؟ انہیں بارود کی زبان میں بات کرنے والے لوگ ہیں اور جو لوگ ان کے پیچھے ہیں وہ اور بھی خطرناک ہیں۔" میں نے خادم حسین کو خطرے کا احساس دلانے کی کوشش کی لیکن بعد میں جو ہوا اس سے ثابت ہو گیا تھا میں اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

چار گھنٹے بعد اس سست رفتار پسنجر ٹرین نے مجھے سمہ سٹہ کے اسٹیشن پر اتارا تھا۔ یہاں مجھے شام کے وقت لاہور جانے والی ٹرین ملی تھی۔ میں نے دوپہر کا کھانا ایک نزدیکی ہوٹل میں کھا لیا تھا۔ میں نے موسم کی مناسبت سے ایک اضافی ٹوپی اور سیاہ فریم کی رنگین زیرو شیشوں والی عینک لے لی اس سے میرا حلیہ ساٹھ فیصد بدل گیا۔ باقی کسر میں نے ایک باربر سے بالوں اور شیو کو حجامت بنوا کر مکمل کر لی۔ فرنچ کٹ اور آرمی کٹ بالوں کے ساتھ میں خاصا مختلف نظر آنے لگا تھا۔ ایک حمام میں غسل کر کے میں نے دوسرا لباس پہن لیا۔ آخر میں بازار سے ایک پینٹ شرٹ اور ایک ریڈی میڈ شلوار سوٹ لیا۔ جب میں اسٹیشن آیا تو گاڑی میں کچھ وقت تھا۔ ٹکٹ مجھے محکمہ ریل کے بااختیار نمائندوں یعنی قلیوں نے دلوایا تھا۔ برتھ بھی انہوں نے دلوائی۔ یہ اے سی پارلر کی برتھ تھی۔ میں نے ٹھاٹھ سے لاہور تک کا سفر کیا تھا۔ رات لاہور کے اسٹیشن روم میں گزار کر صبح میرا ارادہ راولپنڈی کے لئے ریل کار پکڑنے کا تھا۔ خادم حسین کے پاس سے روانگی کے بعد اب تک جاگتا رہا تھا اس لئے ویٹنگ روم کی ایک بینچ پر بیگ رکھ کر سویا تو پھر صبح نو بجے آنکھ کھلی تھی۔ ریل کار جا چکی تھی۔ بہرحال مجھے افسوس نہیں تھا۔ موٹروے کے راستے میں زیادہ جلدی پنڈی پہنچ سکتا تھا میں نے سب سے پہلے ایک پی سی او سے ندیم کا نمبر ملایا۔ فون شازیہ نے اٹھایا تھا مجھے شرارت سوجھی میں نے کوشش کرتے ہوئے ایک نسوانی آواز برآمد کی۔

"پلیز، ندیم سے بات کرا دیں۔"

"آپ کون ہیں؟" شازیہ کا لہجہ مشکوک تھا۔

"کسٹمر۔" میں نے لہجے کو بدل کر کہا۔ "ندیم نے رات آنے کو کہا تھا لیکن آئے نہیں۔"

"کہاں آنے کو......"

"آف کورس...... میرے گھر...... وہ میرا کیس گھر پر ہی دیکھتے ہیں۔"

"اچھا مجھے تو پتا نہیں تھا۔" ندیم کی بیوی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ عقب سے ندیم کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ فون کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ "لیں خود بات کر لیں اپنی کسٹمر سے۔"

"میری کسٹمر۔" ندیم نے حیرت سے کہا اور فون لے کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"تمہارا باپ۔"

"شہباز۔" ندیم چلایا۔ "کہاں ہے تو؟"

"فی الحال نہ پوچھ...... بس جہاں ہوں، محفوظ ہوں۔ وہاں کے حالات بتا۔"

"مونا اور سفیر خیریت سے ہیں...... میرا وسیم سے رابطہ ہے...... راجا صاحب واپس جا چکے ہیں۔ مرشد علی دو بار مجھ سے صلح کی درخواست کر چکا ہے۔"

"حیرت ہے اسے اب صلح کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ضرورت ہے، الیکشن قریب ہیں۔ مخالف پارٹی مضبوط ہے اور تیرے کیس کو سپورٹ کر رہی ہے۔ تیری

گمشدگی کا الزام مرشد علی پر آ رہا ہے۔ میں نے مرشد علی اور اکرم چشتی کے خلاف عدالت کی مدد سے ایف آئی آر درج کرادی ہے۔ اکرم چشتی معطل ہے۔"

"اس سے ہوشیار رہنا...... زخمی سانپ کی طرح خطرناک ہے۔"

"اس کی فکر مت کر...... ایک دن میرے گھر آ گیا۔ باقاعدہ پاؤں پڑ گیا تھا۔ خیر میں نے تیرے کیسوں کو ختم کرنے کی شرط رکھ دی ہے۔ اس کے بعد ہی میں ان کی مدد کر سکتا ہوں۔ امید ہے ایک دو ہفتے میں کوئی اچھا نتیجہ نکلے گا۔"

"میں ان کی گرفت میں سے نکل گیا ہوں۔ اس وجہ سے بھی زیادہ بوکھلائے ہوئے ہیں۔ تُو ایسا کر ان کے خلاف میری بازیابی کا کیس داخل کر دے۔"

"آہستہ میرے شیر آہستہ...... یہ قانونی کام فٹافٹ نہیں ہو جاتے۔ میں سب کر لوں گا۔ بس تُو اپنی حفاظت کر...... ان سے دور رہ۔"

"میں گھر آنا چاہتا ہوں۔"

"میں اس کا مشورہ بالکل نہیں دوں گا۔ یہاں تُو محفوظ نہیں ہے۔ بہتر ہے جہاں ہے وہیں رہ۔"

"مانا دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟" میں نے محاورے کی صورت میں اپنا حال بتایا۔

"ایسا کر مجھے ایک موبائل پر کال کر۔"

ندیم کی بات سے لگ رہا تھا جیسے اسے شبہ ہو اس کا فون آبزرویشن پر تھا اور یہ عین ممکن تھا۔ میں نے پی سی او سے کاغذ قلم لے کر ندیم کا بتایا ہوا موبائل نمبر نوٹ کیا اور پھر اس نمبر پر کال ملوائی۔ "ہاں اب بتا...... کیا ہو سکتا ہے؟"

"مجھے شبہ ہے میرے گھر کا فون چیک پر ہے۔ تُو لاہور میں ہے۔"

"ہاں...... یہ بتا مجھے یہاں رقم اور کوئی جائے پناہ مل سکتی ہے؟"

"ہاں، میں نے یہی بتانے کے لئے تجھے یہ نمبر دیا۔ وہاں میری بیوی شازیہ کا ماموں ہے ڈاکٹر حماد۔ سنکی آدمی ہے لیکن قابل اعتماد شخص ہے۔"

ندیم نے مجھے اس کا پتا اور فون نمبر دیا۔ "ریٹائرڈ آدمی ہے...... صبح اور شام اپنی کوٹھی میں فری کلینک چلاتا ہے۔"

"یار سفیر اور مونا کہاں ہیں؟"

"سفیر کی حویلی میں...... سفیر بھاگ آیا تھا بڑی مشکل سے راجا نے اسے واپس بھجوایا تھا۔ ورنہ وہ مُصر تھا تیرے پاس جانے کے لئے۔"

"اچھا ہوا وہ نہیں تھا...... لیکن یار مجھے دشمن کی مستعدی پر حیرت ہے۔ انہوں نے شروع سے ہمیں نظر میں رکھا تھا۔ میرے علاوہ سب مارے گئے البتہ حکیم قادس کا یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"ان چکروں کو چھوڑ...... فی الحال اپنی فکر کر...... رابطہ کرنا ہو تو باہر سے کرنا...... سمجھ رہا ہے ناں...... تیرے دشمنوں کے ہاتھ لمبے ہیں۔"

''کیا تُو وسیم کو میرے بارے میں بتائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... ممکن ہے دشمنوں نے ان پر بھی نظر رکھی ہو اور ان کے پیچھے پیچھے پہنچ جائیں۔ پچھلی بار بھی ایسا ہوا ہے۔''

''یار مجھے خود سے زیادہ تیری اور ان دونوں کی فکر ہے۔''

''ہم جانتے ہیں یار...... اب زیادہ باتیں نہ کر...... کوئی بھی ضروری بات ہو تو ایک نمبر اور لکھو اس پر کال کرنا...... اس پر مت کرنا۔''

ندیم بلاشبہ ذہین آدمی تھا۔ اس نمبر کو ٹریس کیے جانے کا امکان فی الحال نہیں تھا البتہ اگر دشمن اس کے گھر کا نمبر چیک کر رہا تھا تو اسے یہ نمبر مل گیا تھا البتہ ندیم نے اب جو نمبر بتایا تھا وہ یقینی طور پر اس کی رسائی سے دور تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''تُو بھی کوئی موبائل لے لے۔''

''فی الحال میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

''تم ماموں تک جا سکتے ہو ناں؟''

''ہاں اتنا تو ہے۔''

''تو بس اس کے پاس پہنچ جاؤ...... یہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔''

میں پی سی او کے مالک کو رقم دے کر نکلا اور سامنے سے گزرنے والی ٹیکسی روک لی۔ اسے ڈاکٹر حماد کا پتا بتایا۔ پتا ماڈل ٹاؤن کا تھا اس لئے ٹیکسی ڈرائیور نے فوراً ماڈل ٹاؤن والا کرایہ طلب کر لیا۔ میں نے سر ہلا دیا کیونکہ کون سا میری جیب سے جا رہا تھا۔ مالِ حرام تھا جسے میں بے دردی سے لٹا رہا تھا۔ ٹیکسی والے نے اپنی اور میری جان ہتھیلی پر رکھ کر لاہور کی تنگ اور ٹریفک سے بھرپور سڑکوں پر اپنی ڈرائیونگ کے جوہر دکھانے شروع کیے۔ یہ جوہر بعض اوقات اتنے تاب ناک ہوتے تھے کہ میں نے اس یقین کے ساتھ آنکھیں بند کر لی تھیں کہ اب یہ آنکھیں اگلے جہاں میں ہی کھلیں گی لیکن جب پون گھنٹے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے ماڈل ٹاؤن کی مطلوبہ کوٹھی کے سامنے اتار دیا تو اس بات پر میرا ایمان پختہ ہو گیا تھا۔ انسان چاہے کتنی ہی کوشش کر لے اس کی اور دوسروں کی موت کا وقت مقرر ہے۔ کرائے کے ساتھ میں نے زندہ سلامت پہنچانے پر معقول ٹپ بھی ٹیکسی ڈرائیور کی خدمت میں پیش کی تو مارے خوشی کے اس نے زوردار سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔ ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی میں نے کال بیل پر انگلی رکھی اور اچھل پڑا۔ اس میں کرنٹ آ رہا تھا۔ شکر ہے جھٹکا زوردار نہیں تھا۔

بڑا سا گیٹ بند تھا اور اندر دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے گیٹ کو ہاتھ لگایا کہ اس میں کرنٹ نہ آ رہا ہو۔ پھر اسے زور سے بجایا۔ چند لمحے بعد گھنٹی کے بٹن تلے لگی جالی سے کسی نے دریافت کیا۔

''کون ہے؟''

''جی میں شہباز احمد ہوں۔ ڈاکٹر حماد کی بھانجی شازیہ کے شوہر ندیم کا دوست۔''

''اتنا لمبا تعارف کرانے کی کیا ضرورت ہے؟'' اندر سے کہا گیا۔ ''بیل بجاؤ دروازہ کیوں بجایا؟''

''جناب بیل سے آدمی خود بج سکتا ہے اس میں کرنٹ آ رہا ہے۔''

''اچھا...... اچھا بارش کے بعد ایسا ہو جاتا ہے۔ نامراد کہاں ہے؟''

''میں کسی نامراد سے واقف نہیں ہوں۔ ویسے یہ ہے کون اور آپ کی تعریف؟''

''میں ڈاکٹر حماد ہوں۔ ابھی آتا ہوں...... نامراد حسبِ معمول سورہا ہوگا۔''

چند منٹ بعد اندر سے ایک عمر رسیدہ دبلا اور لمبا شخص گاؤن کی ڈوریاں کستا ہوا برآمد ہوا۔ اس نے آکر دروازہ کھولا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''شہباز احمد!''

اس نے اپنے ہاتھ گاؤن سے نکالنے کی زحمت کئے بغیر جواب دیا۔ ''ڈاکٹر حماد۔ ایم بی بی ایس فرام لندن۔''

پھر اس نے دھاڑ کر نامراد کو آواز دی۔ ایک منٹ بعد ایک چار فٹ قامت کا نمونہ بھاگتا ہوا آیا اور اٹینشن کھڑا ہوگیا۔ نمونہ میں نے اسے یوں کہا کہ اس نے خٹک ڈانس کرنے والوں کا سا گھیر دار لباس پہن رکھا تھا اور زلفیں بھی ان کی طرح لمبی تھیں۔ بس ایک تلوار کی کمی تھی، ڈاکٹر نے اس سے پوچھا۔ ''کہاں مر گیا تھا؟''

''ام پے خانے گیا تھا۔'' نامراد نے اطمینان سے کہا۔

''اچھا...... پیٹ خراب ہے تمہارا...... ایک گھنٹے بعد کلینک پر آجانا۔''

ڈاکٹر صاحب کا فرمان سن کر نامراد کے چہرے پر بارہ بج گئے تھے۔ یقیناً اس کی حرام خوری کا ڈاکٹر صاحب نے کوئی شافی علاج تیار کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے اندر لے آئے۔ ایک چھوٹی نشست گاہ میں لاکر انہوں نے پہلے ناشتے کا پوچھا اور میرے انکار کرنے پر انٹرکام پر کسی کو کافی لانے کا حکم دیا۔ ''تو تم ہو شہباز ملک۔'' انہوں نے جیب سے ایک بجھا سگار نکال کر سلگایا۔ ''کچھ دیر پہلے ندیم کا فون آگیا تھا۔''

''جی ندیم میرا بہت اچھا دوست ہے۔''

''بتانے کی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے سر ہلایا۔ ''میری طرف سے تم کو ہر ممکن تعاون ملے گا۔ کافی پی لو۔ اتنی دیر میں، مَیں ملازمہ سے تمہارے لئے گیسٹ ہاؤس میں کمرا سیٹ کرا دیتا ہوں۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' انہوں نے گہرا کش لے کر گاڑھا دھواں چھوڑا۔ ''مجھے افسوس ہے میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔ صبح نو سے شام سات بجے تک میرا وقت مریضوں اور مطالعے کے لئے مخصوص ہے۔ ناشتے اور رات کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔ ہاں میں دوپہر کا کھانا نہیں کھاتا...... اس لئے ملازمہ سے اپنے لئے کہہ دینا۔''

''شکریہ جناب...... اتنی عنایات کافی ہیں۔''

ملازمہ گرم مہکتی اور بھاپ اڑاتی کافی لے کر آئی تھی۔ جو بلاشبہ میری زندگی کی چند بہترین کافیوں میں سے ایک تھی۔ ملازمہ تقریباً چالیس برس کی قبول صورت اور متناسب جسم والی عورت تھی۔ اس نے خاصا اچھا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے لباس میں ملازماؤں والی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا۔ ''ان کے لئے ایک کمرا گیسٹ ہاؤس میں سیٹ کر دو۔''

''جی سر......!'' اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''کوثر میری زندگی میں آنے والے چند بہترین انسانوں میں سے ایک ہے۔ میں خوش قسمت ہوں مجھے

اس عمر میں ایسی مہذب اور وفادار خادمہ ملی ہے۔"

"درست فرمایا۔ اچھے ملازمین قسمت سے ہی ملتے ہیں۔" میں نے تائید کی۔ مجھے سیدگل یاد آ گیا۔ کہنے کو تو وہ چوکیدار تھا لیکن اس نے میرے بیشتر کام اپنے ذمے لے رکھے تھے حد یہ کہ دفتر میں صبح کا ناشتہ وہی بناتا تھا۔ صفائی ستھرائی اور آنے جانے والوں کا خیال رکھنا کی ذمے داری بھی اس نے از خود لے لی تھی۔ کاش میں اس کے قاتلوں کو بتا سکتا کہ وہ میرے لئے کیا تھا۔

"جناب آپ کا کمرا تیار ہے۔" کوثر نے آ کر کہا تو میں چونک گیا تھا۔

"برخوردار اب تم جا کر آرام کرو، میرا بھی مریضوں کو دیکھنے کا وقت ہو رہا ہے۔ کوئی ضرورت ہو تو کوثر سے کہہ دینا۔"

"جی شکریہ۔" میں نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور میں کوثر کے ساتھ کوٹھی سے متصل انیکسی میں آیا۔ وہیں آنے والے مہمانوں کے لئے رہائش کمرے تھے۔ مجھے دیا جانے والا کمرا تمام سہولیات سے آراستہ تھا۔ بیش قیمت فرنیچر اور گل رنگ قالین۔ بستر کے سامنے ٹرالی میں ٹی وی، سی ڈی پلیئر اور ایک طرف ریک میں کتابیں اور رسائل رکھے تھے۔ کھڑکیوں پر آسمانی رنگ کے پردے تھے۔ جو دیواروں سے ہم رنگ ہو رہے تھے۔ کوثر نے مجھے کمرا دکھایا اور ادب سے بولی۔

"جناب...... لنچ کب لینا پسند کریں گے۔ کوئی خاص ڈش پسند ہو تو حکم فرمائیں۔"

"نہیں...... کچھ بھی بنا لینا...... کھانا میں دو بجے کھاؤں گا۔"

"مزید کسی چیز کی ضرورت ہو تو؟"

"ہاں مجھے ایک کال کرنی ہے۔" میں نے کہا۔

کوثر مجھے مہمان خانے کے اس حصے میں لائی جہاں فون موجود تھا۔ میں نے ندیم کے دیئے ہوئے موبائل نمبر پر کال کی۔ کال اس نے ریسیو کی۔ شاید اس نے صرف میرے لئے یہ سسٹم بنایا تھا۔ "کیا حال ہیں شہزادے؟" میری آواز سن کر وہ بولا۔ "نمبر بتا رہا ہے تو ماموں کے پاس پہنچ گیا ہے۔"

"ہاں...... لیکن ماموں نے مال پانی کی بات نہیں کی ہے ابھی تک...... مجھے موبائل بھی لینا ہے۔"

"بھول گئے ہوں گے، میں ابھی یاد دلا دیتا ہوں۔"

"یار مجھے وسیم اور راجا صاحب کے نمبر بھی چاہئیں۔"

"اوہ...... بھائی تجھے پھر سے ان معاملات میں گھسنے کا شوق چرا رہا ہے۔"

"ان لوگوں کی مدد کے بغیر میرا بعض مسائل حل کرنا، ناممکن ہے۔ تُو فکر مت کر میں انہیں اپنا پتا نہیں دوں گا۔"

"اوکے...... میں نمبر ایس ایم ایس کر دوں گا۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ایک گھنٹے بعد کوثر نے ایک لفافہ لا کر میرے حوالے کیا۔ میں نے اس کے جانے کے بعد لفافہ کھولا۔ اس کے اندر پانچ سو اور ہزار کے خاصے نوٹ تھے۔ ان کی مالیت بیس ہزار تھی۔ میں نے رقم نکال کر جیب میں رکھ لی۔ دو بجے کوثر نے کھانے کا کہا۔ "آپ کے کمرے میں لا دوں یا ڈائننگ ٹیبل پر لگاؤں؟" میں نے ڈائننگ ٹیبل کو

ترجیح دی تھی۔

کھانے کے بعد میں نے کوثر کو بتایا۔ ''میں ذرا باہر جا رہا ہوں اگر ڈاکٹر صاحب میرے بارے میں پوچھیں تو کہنا شام تک آ جاؤں گا۔''

''جی جناب۔''

نامراد گیٹ پر تھا اور میں نے اس سے ٹیکسی یا رکشے کی دستیابی کے بارے میں پوچھا۔ ''جناب آپ ادر سے سیدھا جائے گا...... دائیں طرف مڑے گا...... سامنے کوئی نہ کوئی ٹیکسی یا رکشا مل جائے گا۔'' اس نے سمجھایا اور جب میں اس کے بتائے ہوئے راستے پر دائیں طرف مڑا تو سامنے ہی دو عدد رکشے نظر آئے میں نے پہلے والے کو ترجیح دی لیکن وہ مال روڈ جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے مجھے پیش کش کی کہ وہ مجھے مزنگ لے جا سکتا ہے۔

''تم مزنگ شوق سے جاؤ...... مجھے مال روڈ جانا ہے۔''

دوسرا رکشے والا مان گیا بشرطیکہ میں میٹر سے پچاس روپے اوپر دیتا۔ ماننا میری مجبوری تھی۔ اس سے پہلے بھی میں کئی بار لاہور آ چکا تھا لیکن چند دنوں میں، مَیں شہر کی گلی کوچوں سے واقف نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا چالاک رکشے والا مجھے گھماتا رہا اور پورے ایک گھنٹے بعد اس نے مجھے مال روڈ کے ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے اتار دیا تھا۔ یہ دیکھ کر میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا کہ میٹر نے تین سو روپے بنا دیئے تھے۔ میں نے منہ بنا کر کہا۔

''تمہارے رکشے میں کیا بجلی کا نیا والا میٹر لگا ہے۔ اتنی رقم کیسے بن گئی؟''

''آپ دیکھ سکتے ہو۔'' اس نے بے نیازی سے میٹر کی طرف اشارہ کیا اور اسٹائل سے بیڑی پینے لگا۔

''چلو پچاس چھوڑو دو صرف کرایہ دے دو۔''

''تین سو روپے میں تو ٹھاٹ سے کسی ٹیکسی میں آ سکتا تھا۔ اس چھکڑے میں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ جو شاید انسان کو ذلیل کرنے کے لئے ایجاد کیا گیا ہے۔''

''تو ٹیکسی لے لیتے۔''

''میں ڈیڑھ سو دوں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''دو سو۔'' اس نے جواب دیا اور پھر دو سو لے کر عجلت میں روانہ ہوا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ البتہ ٹریفک کانسٹیبل کو دیکھ کر حیرت رفع ہو گئی۔ جو شکار ہاتھ سے نکل جانے پر کفِ افسوس ملتا واپس اپنی جگہ جا رہا تھا۔ رکشے والے نے نو پارکنگ کے بورڈ کے عین سامنے رکشا روک رکھا تھا۔ میں نے شاپنگ سینٹر کا رخ کیا۔ ان دنوں موبائل فون عام ہو چکا تھا لیکن ابھی ہمارا قومی جنون نہیں بنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاپنگ سینٹروں میں ہر دوسری دکان موبائل شاپ نہیں بنی تھی۔ شاپنگ سینٹر کے اوپری فلور پر موبائل کی چند دکانیں تھیں۔ میں ایک دکان کی طرف جا رہا تھا کہ ایک شخص نے روک لیا۔

''موبائل چاہئے...... نوکیا، سونی ایرکسن، موٹرولا، سام سنگ...... سب آدھی قیمت پر ملے گا۔ بالکل نیا جیسا۔''

وہ یقیناً چوری کے موبائل بیچتا تھا اور کسی دکان دار سے اس کا کمیشن طے تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے تم سے موبائل نہیں لینا ہے۔"

"قیمت آپ کی پسند کی ہوگی۔"

"مجھے چوری کا مال نہیں لینا۔" اس بار میں نے صاف انکار کر دیا۔

اس نے نہایت غلط نظروں سے مجھے دیکھا اور چلا گیا۔ میں نے ایک دکان سے ذرا نارمل قیمت والے موبائل سیٹ دکھانے کو کہا۔ اس نے مجھے کئی سیٹ دکھائے...... ایک سیٹ مجھے پسند آ گیا۔ یہ بلیک اینڈ وائٹ اسکرین کا لیکن دیرپا بیٹری والا مختصر سا سیٹ تھا۔ اب تو اس کی قیمت خاصی گر گئی ہے لیکن اس وقت دکان دار نے اس سیٹ کی قیمت چھ ہزار بتائی تھی۔ پھر اس نے ساڑھے پانچ میں سیٹ دے دیا۔ اس کا چارجر بھی تھا۔ میں نے سم کی بات کی اس نے ایک مقبول موبائل سروس کمپنی کی سم بھی ولوادی۔

"سر اس کی ایک سال کی مکمل وارنٹی ہے کوئی بھی مسئلہ ہو آپ میرے پاس لے آئیں۔ اسی وقت آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" دکان دار نے وارنٹی کارڈ بنا کر میرے سپرد کیا میں نے ادائیگی کی اور موبائل لے لیا۔ اس نے مجھے بیلٹ لگانے والا کلپ گفٹ میں دیا۔

"مگر بہتر ہوگا...... موبائل جیب میں رکھیں۔ آج کل موبائل چھیننے کی وارداتیں زیادہ ہونے لگی ہیں۔"

اس نے مشورہ دیا تو مجھے چوری کے موبائل بیچنے والے شخص کا خیال آیا۔ میں نے دکان دار لڑکے کو اس بارے میں بتایا۔ "بس جناب چند کالی بھیڑیں اس کاروبار کو بدنام کر رہی ہیں۔" لڑکے کی بات پر یقین کرنا مشکل تھا کیونکہ کسی قسم کی اخلاقیات کو ہم کاروباری حضرات نے بہت پہلے اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا۔ اب کوئی صنعت کار، کوئی تاجر یا کوئی دکان دار دیانت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس پر ذرا مشکل سے ہی یقین آتا ہے۔ میں شاپنگ سینٹر سے باہر نکل آیا تھا۔ میرا ارادہ مزید کچھ خریداری کرنے کا تھا۔ اپنے حلیے کی بنا پر مجھے یقین تھا کہ میں دشمن کی نظروں سے محفوظ ہوں۔ میں فٹ پاتھ پر آگے چل پڑا۔ ایک دکان سے میں نے دو پینٹ شرٹس لیں۔ کیونکہ عام طور پر مجھے اسی لباس کی عادت تھی۔ شلوار قمیص شاذ ہی پہنتا تھا۔ دکان میں جاتے ہوئے میری نظر ایک چادر پوش پر پڑی تھی۔ خاصی دیر بعد جب میں دکان سے نکلا تب بھی وہ باہر موجود تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور اس وقت تو میں ٹھٹک گیا جب میں نے ایک جوس کارنر پر بھی اسے خود سے چند قدم کے فاصلے پر پایا۔ کیلے کا ملک شیک پینے کے دوران میں نے عینک کے رنگین شیشوں کے عقب سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ شاید اکیلا تھا اور مجھ سے بے نیاز نظر آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ کیا دشمن میری بو پا گئے تھے؟ لیکن اگر اس کا تعلق مرشد علی کی پارٹی سے تھا تو اس کے دوسرے ساتھیوں کی اردگرد موجودگی یقینی تھی اور اس صورت میں اس شخص کی چادر تلے کسی ہتھیار کی موجودگی بھی لازمی تھی۔

میں جوس کارنر سے آگے بڑھا تو وہ ٹہلتے ہوئے میرے نزدیک آنے لگا۔ اگر میں فرار ہونے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے فوری طور پر گولی مار سکتا تھا۔ شاید وہ مجھے پکڑ کر لے جانے کی فکر میں تھا۔ ابھی میں فرار کے کسی موزوں طریقے پر غور کر رہا تھا کہ وہ میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ اس کی چادر کا ایک حصہ مجھے چھو رہا تھا۔ پھر چادر کے نیچے سے کوئی شے مجھے پہلو میں چبھنے لگی۔

"یہ پستول ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" میرا لہجہ پُرسکون تھا۔

"اپنا موبائل میرے حوالے کر دو۔"

میں نے گہری سانس لی، وہ میرے دشمنوں میں سے نہیں تھا۔ بلکہ موبائل چھیننے والا ڈاکو تھا۔ "دوست! موبائل میری جیب میں ہے تم نکال لو۔"

"زیادہ چالاکی مت دکھاؤ...... چند ہزار کے موبائل کے لئے جان مت دو...... شرافت سے موبائل میرے حوالے کر دو۔" اس نے دانت پیسے۔

"مجھے بھی اس کے پیچھے مرنے کا شوق نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم موبائل لے جاؤ۔"

"خاموشی سے نکال کر دے دو۔"

"میں نے موبائل نکال کر اسے دے دیا۔ "ہلنا مت...... میرا ایک ساتھی آس پاس ہے اگر شور مچایا تو وہ گولی مار دے گا۔"

اسی لمحے ایک بچہ بھاگتا ہوا آیا اور چادر پوش سے ٹکرا گیا۔ یہ افغانی بچہ تھا۔ اپنے ساتھی سے لڑ کر بھاگ رہا تھا۔ اس جنگ زدہ قوم کی نفسیات میں لڑائی، مار کٹائی اس طرح بیٹھ گئی ہے کہ اس کے بچوں کا پسندیدہ کھیل آپس میں لڑنا بھڑنا ہے۔ چادر پوش اس ٹکر کے لئے تیار نہیں تھا وہ ہڑبڑا گیا۔ سنبھلنے کی کوشش میں اس کی چادر پاؤں تلے آئی اور وہ سڑک پر جا گرا۔ مزید بدقسمتی سے ایک بائیک اس طرف آ رہی تھی اور بچاتے بچاتے بھی اس کے پاؤں پر چڑھ گئی۔ اس نے ذبح کئے جانے والے بکرے کی سی آواز نکالی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ قابو میں کیا لیکن وہ اپنے ہوش میں کہاں تھا۔ میں نے بہ آسانی اس سے پستول چھین لیا۔

"لاؤ موبائل دو اِدھر۔"

اس نے جلدی سے موبائل مجھے واپس کر دیا اور میں نے پستول سے میگزین نکال کر اسے ایک کار کے نیچے پھینک دیا۔ چادر پوش دبی زبان میں گالیاں دے رہا تھا۔ اچانک وہ دھاڑا "پکڑ لو اس...... کو۔"

فٹ پاتھ پر دو طرف سے چادر پوش میری طرف لپک رہے تھے۔ ان کا مسلح ہونا یقینی تھا۔ ان چوروں کی دیدہ دلیری لائق تحسین تھی کہ بھاگنے کے بجائے وہ مجھے گھیرنے کی فکر میں تھے۔ میں نے فوری فیصلہ کیا اور ٹریفک کے دریا میں کود پڑا۔ دو گاڑیوں سے بچتے بچتے تیسری گاڑی نے پہلو میرے کولہوں پر مارا۔ اس کے بعد میں خیریت سے دوسری طرف پہنچ گیا۔ ٹریفک کے بے پناہ شور کے باوجود مجھے موبائل چھیننے والے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو میرا تعاقب کرنے اور مجھے جہنم رسید کرنے کا حکم دے رہا تھا۔

میں بے تحاشا بھاگا تھا۔ وہ دونوں بندروں کی طرح گاڑیوں سے بچتے اس طرف آ رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر لوگوں کا ہجوم تھا اس لئے وہ دور سے گولی چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھے لیکن اگر میں ان کے ہاتھ آ جاتا تو شاید وہ مجھے گولی مار دیتے۔ بدقسمتی سے اس فٹ پاتھ پر جانے والوں سے زیادہ آنے والوں کا ریلا تھا۔ وہ اس فٹ پاتھ پر آ چکے تھے اور لوگوں کو بلاتکلف دھکے دیتے میرے پیچھے دوڑے آ رہے تھے۔

اچانک میری نظری سامنے سے آتی بس پر پڑی۔ بس رفتار سے جا رہی تھی۔ میں نے سوچا اور اچانک سڑک پر اتر کر چلتی بس کا ڈنڈا پکڑ کر جھول گیا۔ میرے پاؤں سڑک پر رگڑ کھا رہے تھے اور میں پائیدان پر چڑھنے

کی کوشش کر رہا تھا۔ بس ان دو چادر پوشوں کے پاس سے گزری تو ان کے منہ کھل گئے تھے پھر ان میں نے ایک کو چادر سے پستول برآمد کرتے دیکھا تو دیوانہ وار کوشش کی اور پائیدان پر چڑھ گیا۔ اگلے لمحے میں بس کے اندر تھا۔ فائر کی آواز سنائی دی تھی لیکن گولی نہ جانے کہاں گئی۔ میں دوسری طرف کی نشستوں میں گھستا چلا گیا تھا۔ اسی لمحے میں نے کھڑکی کے غائب شیشے سے دوسری طرف کا منظر دیکھا۔ موبائل چھیننے والا زمین پر گرا تھا اس کے سامنے دو افراد تھے۔ ایک نے چھوٹی سی رائفل اٹھا رکھی تھی۔ چادر پوش نے ہاتھ اوپر کیا جیسے انہیں روکنا چاہ رہا ہو اور رائفل بردار نے اس کے سر میں گولی ماری تھی۔ خون اور مغز فوارے کی طرح اچھلا تھا۔ محض ایک سیکنڈ میں، مَیں نے یہ سب دیکھ لیا اور بس اس جگہ سے آگے بڑھ گئی۔ فائر کی آواز نے لوگوں کو ہراساں کر دیا تھا۔ وہ جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

''اوہ، میاں...... یہ کیا چکر ہے؟'' ایک نستعلیق قسم کے بزرگ نے پوچھا۔

''میرا چکر ہے جناب! مجھ سے موبائل چھیننا چاہتے تھے میں بھاگا تو مجھے مارنے کی کوشش کی تھی۔ بس میں لٹک کر جان نہ بچاتا تو مارا جاتا۔'' میں نے مصنوعی سانسوں کے درمیان کہا۔

میں نے عقبی شیشے سے دیکھا۔ سائیڈ سے ایک سیاہ جیپ نکل کر بڑے غلط انداز میں ٹریفک کے دھارے میں شامل ہوئی تھی۔ جیپ تیزی سے بس کے پیچھے آنے لگی تو میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اب تک میں اس معاملے کو موبائل چھیننے کی ایک واردات سمجھ رہا تھا لیکن مجھے محسوس ہوا معاملہ کچھ اور تھا میں تیزی سے بس کے اگلے حصہ کی طرف لپکا۔ اس سے پہلے کہ جیپ والے بس تک رسائی حاصل کرتے میرا بس سے اتر جانا ضروری تھا۔ ڈرائیور اب بس کو ریس دے رہا تھا اور چلتی بس سے کودنا خودکشی کرنے کے برابر ہوتا۔ میں نے اگلے دروازے سے لٹک کر باہر جھانکا۔ سیاہ جیپ تیزی سے ٹریفک میں راستہ بناتی ہوئی آ رہی تھی۔ اگر وہ بس تک رسائی حاصل کر لیتے تو مجھے پکڑ لینا یا گولی مار دینا ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ابھی انہوں نے کچھ دیر پہلے سرِ عام ایک شخص کو ہلاک کیا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے بس روکنے کو کہا۔

''اے...... روکو۔''

''جاؤ...... جاؤ......'' اس نے جواب میں کہا۔ ''بس اسٹاپ پر رکے گا۔''

''اسٹاپ کے بچے! بس میں بم لگا ہے...... بس روکو...... بم پھٹ گیا تو سب مارے جائیں گے۔'' میں نے چلا کر کہا تھا تاکہ سب سن لیں۔ اس اعلان کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا تھا۔ لوگوں نے چلانا شروع کر دیا۔ خود ڈرائیور نے بدحواس ہو کر اس طرح بریک لگائے کہ عقب میں آنے والی تین گاڑیاں پہلے بس سے اور پھر آپس میں ٹکرائیں۔ بس رکتے ہی میں نے چھلانگ لگائی اور ایک کار کے بونٹ سے ہوتا فٹ پاتھ پر جا گرا۔ جیپ کوئی سو گز کے فاصلے پر پیچھے ٹریفک میں پھنس گئی تھی میں آگے کی طرف بھاگا۔ موت کے ہرکارے میرے پیچھے تھے اور میں جلد از جلد ان کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ ایک عورت اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ رہی تھی اور شاپنگ کے سامان سے بھرے تھیلے اس نے برابر میں رکھ لئے تھے۔ میں نے فوری فیصلہ کیا اور جھپٹ کر کار کی عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ ''میرے ہاتھ میں پستول ہے۔'' میں نے دہشت زدہ خاتون سے کہا۔ ''دشمن میرے پیچھے ہیں۔ جلدی نکلو، دیر کی تو میرے ساتھ تم بھی ماری جاؤ گی۔''

"پلیز...... پلیز...... گولی مت چلانا۔" وہ لرزتے لہجے میں بولی اور اتنے ہی لرزتے ہاتھوں سے کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ جیپ سے اترنے والے تین افراد گاڑیوں کو پھلانگتے اسی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔ پتا نہیں انہوں نے مجھے اس خاتون کی کار میں بیٹھتے دیکھا تھا یا نہیں لیکن اگر وہ یہاں تک آ جاتے تو مجھے تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

"جلدی کرو...... وہ آ رہے...... ہیں۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "سفاک لوگ ہیں میرے سامنے اپنے ایک ساتھی کو مار چکے ہیں۔ وہ مجھے فرار سے روکنے میں ناکام رہا تھا۔"

خاتون نے بالآخر کار اسٹارٹ کر لی اور بے ڈھنگے پن سے ریورس کرنے کے بجائے سامنے فٹ پاتھ پر چڑھا دی۔ "مروا دیا......" میں کراہا۔ "ادھر...... برابر والی سیٹ پر جاؤ۔"

اس کار خیر میں مجھے خاتون کی مدد کرنا پڑی تھی۔ اسے برابر والی نشست پر دھکیل کر میں نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار ریورس کر کے دوڑا دی۔ عقب میں فائر ہونے کی آواز آئی اور ایک گولی بیک وقت آگے پیچھے کے شیلڈز میں سوراخ کرتی گزر گئی۔ میں نے خاتون کا سر نیچے کی طرف جھکا دیا۔ "نیچے رہو وہ لوگ فائرنگ کر رہے ہیں۔"

میں نے کار صاف ہو جانے والی سڑک پر دوڑا دی کیونکہ عقب میں بس اور اس کے عقب میں ساری ٹریفک جام تھی۔ پہلی سائیڈ روڈ آتے ہی میں نے کار اس پر گھما دی۔ "یہ...... تت...... تم کہاں جا رہے ہو؟" خاتون نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ عمر تیس بتیس تھی لیکن بہت دلکش اور نسوانیت سے بھرپور خاتون تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی اور گہرے نیلے رنگ کے بلاؤز میں اس کا حسن نکھر رہا تھا۔ خوف اور تشویش بھی اس کے چہرے کی خوبصورتی کو دبانے میں ناکام رہے تھے۔

"دشمنوں سے دور......" میں نے کار ایک گلی میں گھماتے ہوئے کہا۔ "وہاں بڑی سڑک پر وہ بہ آسانی ہمارے پیچھے آ سکتے تھے۔"

"تب...... مجھے اتار دو...... تم بے شک کار لے جاؤ۔"

اس کی تجویز معقول تھی۔ "ہاں...... لیکن آپ مجھے اپنا کوئی نمبر دے دیں...... میں آپ کو کال کر کے بتا دوں گا کہ میں نے آپ کی گاڑی کہاں چھوڑی ہے، آپ منگوا لیجئے گا۔"

اس نے جلدی سے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "اس پر میرے تمام نمبر ہیں۔"

میں نے کارڈ دیکھا۔ اس پر بیگم شاہینہ خان کے ساتھ ایک این جی او آسمان کا نام بھی تھا۔ "آپ سماجی کارکن ہیں؟"

"ہاں، میری این جی او بے سہارا ہو جانے والی لڑکیوں کو شادی اور باعزت زندگی گزارنے کے لئے مدد دیتی ہے۔ ہمارا ایک شیلٹر ہوم بھی ہے۔" میرے مہذبانہ رویے نے اسے کسی قدر بے خوف کر دیا تھا۔

"شکریہ! اگر کبھی حالات نے موقع دیا تو میں آپ کا شکریہ ادا کرنے ضرور آؤں گا۔" میں نے کار روک

دی۔

وہ اتر گئی۔ میں نے شاپنگ کے تھیلے بھی اس کی طرف بڑھا دیئے۔ "آپ کے پاس ایکسٹرا چابی ہوگی۔ میں کار لاک کر کے جاؤں گا۔"

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا اور شاپرز لے کر پیچھے ہو گئی۔ میں نے کار آگے بڑھا دی۔ سائیڈ روڈ پر آنے کے بعد مجھے عقب میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اطمینان نہیں تھا۔ ان لوگوں کے پیچھے پڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ مرشد علی کی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بے شک مرشد علی کا تعلق راولپنڈی سے تھا لیکن اس کی سیاست پنجاب میں تھی اور لاہور پنجاب کی سیاست کا مرکز تھا۔ مرشد علی حکومتی جماعت کا ایک حصہ تھا۔ یہاں اس کا اثر اور قوت ہونا تعجب کی بات نہیں تھی۔ میں کار مختلف سڑکوں سے گزارتا رہا۔ پھر ایک جگہ مجھے ٹیکسیاں کھڑی نظر آئیں اور میں نے کار ایک گلی میں روک دی۔ چابیاں میں نے فٹ میٹ پر اس طرح ڈال دی تھیں کہ باہر سے نہ نظر آئیں۔

میں نے جو کپڑے لئے تھے ان کا شاپر بھاگ دوڑ میں گر گیا تھا۔ بہرحال موبائل بچ گیا تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی والے سے بات کی۔ وہ شریف آدمی فوراً چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کی ٹیکسی کا میٹر بھی مناسب رفتار سے چل رہا تھا۔ اس نے آدھے گھنٹے میں مجھے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے سامنے اتار دیا اور کرائے کے علاوہ پچاس روپے لے کر خوشی خوشی رخصت ہو گیا۔ نامراد جس کا اصل نام مراد خان تھا گیٹ پر موجود تھا۔ میں نے بیل بجانے سے گریز کیا اور دروازہ بجایا۔ "بھاگ جاؤ۔" مراد خان نے کرسی سے جواب دیا۔

"بھاگ جاؤ کے بچے......! میں ہوں تمہارے صاحب کا مہمان۔"

"تم ہے صاحب!" اس نے بوکھلا کر جلدی سے دروازہ کھولا۔

مہمان خانے میں اپنے کمرے میں آ کر میں نے کافی طلب کی۔ ذرا دیر کی بھاگ دوڑ نے میرا جسم ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کافی آنے تک میں نے ایک مختصر سا غسل کیا۔ میرے پاس ابھی کوئی صاف جوڑا نہیں تھا۔ مجبوراً وہی کپڑے پہن لئے۔ کوثر کافی لے کر آئی تو میں نے اس سے کپڑے دھلوانے کے بارے میں پوچھا۔ "یہاں پاس لانڈری ہے؟ مجھے اپنے کپڑے دھلوانے ہیں۔"

"میں دھو دیتی ہوں۔" اس نے پیشکش کی۔ "ایک گھنٹے بعد آپ کو کپڑے مل جائیں گے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ میرے پاس اور کوئی صاف سوٹ نہیں ہے اب۔"

"اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "میں آپ کو ایک سوٹ اور لا دیتی ہوں۔ یہ بھی دے دیں۔"

جب تک میں نے کافی پی اس نے مجھے ایک سوتی ٹراؤزر اور ایک سفید ٹی شرٹ لا دی۔ میں نے لباس تبدیل کر کے تمام گندے کپڑے اس کے حوالے کر دیئے۔ یقیناً کوٹھی میں کوئی کوئیک واش اینڈ ڈرائی واشنگ مشین تھی۔ سچ مچ ایک گھنٹے کے اندر اس نے مجھے تمام کپڑے دھلے اور استری کئے ہوئے لا دیئے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں پوچھا۔ "اس وقت وہ کلینک میں ہیں۔ ان سے ڈنر کی میز پر ملاقات ہوگی۔" کوثر نے بتایا۔ "ڈنر ٹھیک آٹھ بجے ہوتا ہے۔ دس بجے ڈاکٹر صاحب سونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔"

سات بج رہے تھے۔ندیم یقیناً دفتر سے گھر آ چکا تھا۔میں نے اس کا موبائل نمبر ملایا۔"کیا حال ہیں اس طرف سب خیریت ہے ناں؟"

ندیم میرے لہجے سے بھانپ گیا۔"ادھر سب خیریت ہے،تم بتاؤ وہاں سب ٹھیک ہے؟"

"ویسے تو ٹھیک ہے لیکن ایک چکر ہوا تھا۔" میں نے کہا اور پھر اسے مختصر الفاظ میں پیش آنے والا واقعہ سنایا۔"بس سمجھ لے اللہ نے بچا لیا۔"

"بیٹے!وہ تو میں پچھلے کئی مہینے سے دیکھ رہا ہوں۔"

"یار!انہوں نے مجھے اتنی جلدی تلاش کیسے کر لیا؟"

"سوال یہ ہے کہ اب بھی تُو ان کی نظروں سے دور ہے یا نہیں؟"

میرے جسم میں سنسنی سے دوڑ گئی۔"تیرا مطلب ہے انہوں نے میرا تعاقب کیا ہوگا۔"

"عین ممکن ہے۔دراصل یہ سارا واقعہ خاصا بھونڈا لگ رہا ہے اگر انہوں نے تجھے اغوا یا قتل کرنا تھا تو یہ کام براہِ راست بھی کر سکتے تھے۔ان گھٹیا قسم کے ڈاکوؤں کو سامنے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ندیم کے سوال نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔واقعی انہوں نے قطعی احمقانہ طریقہ اختیار کیا اور میں اسی وجہ سے نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔میں نے بھی تعاقب کا امکان ذہن میں رکھا تھا اور ٹیکسی میں بھی عقب سے دیکھتا رہا تھا مجھے ایک بار بھی تعاقب کا شبہ نہیں ہوا تھا۔بعض اوقات خاصی دیر تک ہمارے پیچھے کوئی گاڑی ہی نہیں ہوتی تھی۔

"نہیں یار...... مجھے ننانوے فی صد یقین ہے کہ میرا تعاقب نہیں ہوا ہے۔دشمن میری پناہ گاہ سے بے خبر ہے۔"

"چل تُو مطمئن ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" ندیم بولا۔"سفیر تجھ سے بات کرنے کے لئے مرا جا رہا ہے۔اسے بھی کال کر لے اس کے موبائل پر...... ویسے اس کی آبائی حویلی میں فون بھی ہے اس پر کال کر لے۔"

ندیم نے مجھے نمبر بتایا جو میں نے نوٹ کر لیا۔"کیس کی کیا پروگریس ہے؟"

"آج میں نے تیری بازیابی کے لئے اکرم چشتی اور مرشد علی کو فریق بنا کر کیس فائل کر دیا ہے۔شاید کل عدالت سمن جاری کر دے۔میری کوشش ہے میڈیا کیس کو زیادہ سے زیادہ کوریج دے۔"

"لیکن ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا۔" میں نے مشورہ دیا۔"وسیم کے آدمی تیرے ساتھ ہیں؟"

"ہاں بیویوں کی طرح چوبیس گھنٹے چمٹے رہتے ہیں۔ان کا بس چلے تو باتھ روم اور بیڈ روم میں ساتھ جائیں۔"

"اس معاملے میں اتنی ہی حفاظت کی ضرورت ہے۔میں نے تجھ سے راجا کا نمبر مانگا تھا۔"

"اس کی کوٹھی کال کر لے۔اس کا لال بیگ سیکرٹری یہیں ہے،وہ بتا دے گا۔تجھے راجا کے حوالے سے تازہ ترین صورتِ حال سے بھی آگاہ کر دے گا۔"

میں نے اگلا نمبر راجا عمر دراز کی کوٹھی کا ملایا۔ایک منٹ بعد بیگ لائن پر تھا۔"راجا صاحب جا چکے ہیں؟"

اس نے محتاط لہجے میں بتایا۔ ''ہاں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''حکیم قادس کی کوئی خبر ملی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔ باقی افراد کی لاشیں مل گئی تھیں۔ سوائے صادق کے۔'' بیگ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''شاید اسے بھی حکیم قادس کے ساتھ لے جایا گیا ہے۔'' میں نے غور کیا۔

''شاید۔ اب اس نمبر پر کال مت کرنا۔'' بیگ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں صورت حال پر غور کر رہا تھا۔ اب دشمن میرے پیچھے تھا۔ ظاہر ہے مرشد علی بہر صورت مجھے اپنے قبضے میں کرنا یا قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی جاگیردارانہ ذہنیت اور خدائی کے تکبر تک پہنچی انا کا تقاضا یہی تھا۔ اس کے لئے وہ ہر ممکن وسائل استعمال کر رہا تھا لیکن قادس کا اس نے کیا کرنا تھا۔ اگر وہ راجا سے بھی انتقام لینا چاہتا تھا اور حکیم قادس کا تعلق راجا سے تھا، تب بھی اسے اغوا کرنے کا تک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر آج جس بھونڈے پن سے مجھے پکڑنے کی کوشش کی گئی اس سے ظاہر تھا کہ پس پردہ کوئی نہ کوئی ایسا معاملہ جاری تھا جو فی الحال میری سمجھ سے باہر تھا۔ مرشد علی سے نمٹنا ندیم کا کام تھا کیونکہ طاقت میں، مَیں کسی طرح اس کا ہم پلا نہیں تھا۔ اسے صرف سیاست اور قانون کے میدان میں مجبور کیا جا سکتا تھا کہ وہ سمجھوتا کرے۔ اگرچہ مرشد علی جیسے لوگ زبان یا تحریری معاہدوں کی پروا نہیں کرتے ہیں۔ جب ان کا داؤ لگتا ہے یہ اپنی کر گزرتے ہیں۔

میں نے سفیر کی حویلی کا نمبر ملایا۔ کئی مراحل سے گزرنے کے بعد کال مردانے میں سفیر کو ملی۔ عقب میں جاری شور بتا رہا تھا کہ نوجوانوں کی ٹولی ہلا گلا کر رہی ہے۔ میں نے اونچی آواز میں سفیر سے بات کرانے کو کہا۔ فون اٹھانے والا چلایا۔ ''اوئے سفیر تیرا فون ہے۔''

''ہیلو۔'' کچھ دیر بعد سفیر کی آواز آئی۔

''کیا تیری شادی کی تاریخ رکھی جا رہی ہے۔''

''کون...... شوبی۔'' سفیر چلایا۔ ''کہاں ہے تُو......؟''

''ایک شہر میں...... تُو بتا...... کیسا ہے...... مونا کیسی ہے۔''

''تجھے یاد کرتا ہوں۔'' سفیر خفگی سے، بولا۔ ''مونا تو روتی ہے۔''

''یار مجھے بھی تم دونوں بہت یاد آتے ہو۔ مگر کیا کروں...... تقدیر کے ہاتھ میں کھلونا بنا ہوا ہوں۔''

''تیرے غائب ہونے کی اطلاع ملی تھی۔ پھر پرسوں ندیم سے بات ہوئی تو اس نے تیرے بارے میں بتایا تھا۔''

''یار دشمن کتے کی طرح پیچھے ہے۔'' میں نے اسے مختصراً خود پر بیتنے والی سنائی۔

''شوبی میں تیرے پاس آنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اضطرابی لہجے میں کہا۔

''فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔ میں خود چھپتا پھر رہا ہوں اور جب دشمن تاک میں ہو تو سب کا ایک جگہ ہونا حماقت کہلاتا ہے۔''

''تُو نے وسیم سے رابطہ کیا۔ وہ تیرے لئے بہت فکر مند ہے۔''

"نہیں ابھی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ابھی میں کسی قسم کا رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ مرشد علی کے گرگے میری توقع سے بڑھ کر چالاک ثابت ہو رہے ہیں۔"

"ڈیوڈ شا اور فتح خان کے مل جانے سے یہ لوگ بہت طاقتور ہو گئے ہیں۔"

"ڈیوڈ شا اپنا مقصد حاصل کر کے جا چکا ہے۔ فتح خان بھی اس کے ساتھ تھا لیکن مجھے اغوا کرنے والوں میں وہ شامل تھا۔ اس کا مطلب ہے کم سے کم فتح خان مرشد علی کے لئے کام کر رہا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں لیکن مرشد علی سے اسے کیا مفاد ہو سکتا ہے؟"

"پیسا...... اور دوسرے اسے راجا کے خلاف ایک مضبوط سہارا مل گیا ہے۔" میں نے سوچ کر کہا۔

"بہر حال فتح خان ایک چالاک آدمی ہے۔ میں اب تک حیران ہوں اس نے نہ جانے کیسے ہمارا تعاقب کیا تھا؟"

کچھ دیر تک سفیر سے باتیں کر کے اور اسے مونا کو تسلی دینے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ مونا زنان خانے میں تھی اور وہاں اس سے بات کرنے میں ذرا دشواری تھی اس لئے میں اس سے بات نہ کر سکا تھا۔ کچھ دیر بعد کوثر نے رات کے کھانے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر صاحب میرے منتظر تھے۔ کھانے کے دوران انہوں نے مجھ سے کچھ رسمی قسم کے سوالات کئے تھے یعنی مجھے یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے اور میں ٹھیک سے رہ رہا ہوں۔

"برخوردار اسے اپنا گھر سمجھو۔" انہوں نے کہا۔ "کسی قسم کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ضرور جناب۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

کھانا پُر تکلف تھا اور میرا پسندیدہ بھی۔ کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب مجھے لاؤنج میں لے آئے۔ کوثر کو انہوں نے کافی کا کہہ دیا۔ پندرہ بیس منٹ تک ہم گفتگو کرتے رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے قصے سنا رہے تھے۔ شادی شدہ اور بچوں والے تھے۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور بچے سارے ہی بیرون ملک تھے اس لئے اکیلے تھے۔ مریضوں اور مطالعے سے دل بہلایا کرتے۔ بچے ہفتے میں ایک بار فون پر خیریت پوچھ کر فرض سے سبکدوش ہو جاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب بچوں سے دوری اور تنہائی محسوس کرتے تھے۔

بس میاں...... انسان بچوں میں لگ کر ساری دنیا فراموش کر دیتا ہے لیکن جیسے ہی بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہیں، ماں، باپ کو بھول کر اپنی دنیا میں مگن ہو جاتے ہیں۔"

"دنیا اسی کا نام ہے جناب۔" میں نے کہا۔ "ماں باپ اپنے بچوں کے پیچھے جن لوگوں کو چھوڑتے ہیں ان میں ان کے اپنے ماں، باپ بھی شامل ہوتے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کا منہ کھل گیا تھا وہ ہکا بکا رہ گئے تھے۔ "برخوردار! تم نے بالکل درست کہا ہے واقعی میں بھی گاؤں میں اپنے ماں، باپ کو چھوڑ کر شہر کی زندگی میں آ کر بیوی، بچوں میں لگ گیا تھا۔ ماں باپ کو بھول گیا تھا۔"

"یہی وجہ ہے ہم پریشان ہیں اور اکیلے ہیں۔" میں نے گہری سانس لی۔

"نوجوان تمہاری سوچ اچھی ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے سراہنے کے انداز میں کہا۔

اس کے باوجود میں پریشان ہوں...... آوارہ و سرگرداں۔ میں نے تلخی سے سوچا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر

صاحب اٹھ گئے اور میں نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لئے میں نے ٹی وی آن کرلیا۔ مختلف چینلز گھماتے ہوئے ایک ماحول پر کام کرنے والے ٹی وی چینل پر آیا تو ایمن کا نام اور جانا پہچانا چہرہ دیکھ رک گیا۔ لگ رہا تھا کہ وہ اس چینل کی اہم فرد تھی۔ تبھی اس کے خاصے پروگرام آتے تھے۔ وہ کسی افریقی ملک میں تھی اور وہاں کے فطری ماحول کے بارے میں پروگرام پیش کر رہی تھی۔ نیچے سلائڈ پر اس کا نام اور ای میل ایڈریس آ رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اس سے انٹرنیٹ پر رابطہ کر سکتا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے اور اس پوش علاقے میں انٹرنیٹ کیفے ہونا چاہئے تھا۔

میں نے لباس تبدیل کیا اور مہمان خانے کے باہر جانے والے راستے سے نکل آیا۔ مراد خان گیٹ کے پاس چارپائی پر لیٹا ریڈیو پر گانے سن رہا تھا۔ ''مراد خان میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔ ''کچھ دیر میں آ ؤں گا۔''

''کدر جاتا اے صیب؟'' اس نے پوچھا۔

''یار یہاں کوئی نیٹ کیفے ہے۔''

''نیٹ کیفے۔'' اس نے سر کھجایا۔

''جہاں کمپیوٹر ہوتے ہیں۔'' میں نے آسان زبان میں اسے سمجھایا۔

''اچھا...... اچھا...... وہ والا کیفے...... ادر سے الٹے ہاتھ پر جاؤ...... بڑا روڈ پر پٹھان کا ن اے...... ادر ملے گا۔''

یہ خاصا شاندار قسم کا ائیر کنڈیشنڈ اور جدید ترین کمپیوٹرز والا انٹرنیٹ کیفے تھا۔ خاصے لوگ تھے اس کے باوجود مجھے ایک کیبن مل گیا۔ پلائی سے پارٹیشن بنائے گئے تھے۔ جن کے نیچے خلا تھا۔ میں نے اپنا ای میل اکاؤنٹ کھولا۔ خاصے عرصے سے بند رہنے کی وجہ سے اکاؤنٹ ان ایکٹویٹ تھا۔ میں نے اسے ایکٹو کیا اور ایمن کو ای میل کرنے لگا۔

''مس شا...... اگر تمہیں شہباز ملک یاد ہو...... تو اس میل کا جواب دینا۔ میں نے تمہیں ٹی وی پر دیکھا ہے۔ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوگئی ہو...... تمہیں یاد ہے...... تمہارا باپ جس تصویر کے لئے آیا تھا، اس نے کئی آدمیوں کی جان لی تھی...... اس بار تمہارا چچا ڈیوڈ شا آیا اور تصویر کے حصول کے لئے اس نے درجنوں آدمی قربان کر دیئے۔ اس نے مجھے بھی اغوا کرایا تھا۔ تصویر ڈیوڈ شا کے قبضے میں جا چکی ہے۔ تمہارے باپ کا مبینہ قاتل فتح خان ڈیوڈ شا کے لئے کام کر رہا ہے۔ جن دنوں تصویر کے حصول کے لئے خونریزی کی جا رہی تھی، اس سے چند دن پہلے تم پاکستان میں تھیں۔ کیا تمہیں ان سب حالات کا علم ہے؟''

شہباز احمد۔''

اسے ای میل کر کے مجھے خیال آیا۔ اس کا ای میل ہاٹ میل کا تھا۔ میں نے ایم ایس این کھولا اور اس پر اپنا اکاؤنٹ بنایا۔ جب میسنجر کھل گیا تو ایمن کا ای میل ایڈریس دوستوں والے خانے میں درج کر دیا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ آن لائن ہو اور یہ دیکھ کر میں خوش ہوگیا کہ وہ آن لائن تھی۔ میں نے اسے پیغام بھیجا۔ ''میں شہباز احمد ہوں۔'' مگر اس نے رد کر دیا۔ میں نے پھر میسج کیا اور بار بار کرتا رہا۔ مجھے امید تھی کہ وہ

تنگ آ کر ایک بار تو پڑھے گی۔ میری توقعات پوری ہوئیں۔ کوئی دس منٹ بعد اس کا پیغام آیا۔

''میرے خدا......! شہباز یہ تم ہو۔ ابھی مجھے تمہاری ای میل ملی ہے لیکن وہ دوسرے ای میل ایڈریس سے تھی۔ شکر ہے مجھے خیال آ گیا کہ پیغام دینے والے بھی تم نہ ہو۔''

''میں تمہیں یاد تھا۔'' میں نے لکھا۔

''شہباز تم بھولنے والی شے نہیں ہو۔'' اس کا جواب آیا۔ ''پاکستان میں جو وقت میں نے تمہارے ساتھ گزارا تھا اور تم نے مجھے بچانے کے لئے جس طرح اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔''

''میں بھی تمہیں نہیں بھولا تھا۔ ابھی ٹی وی پر تمہارا پروگرام دیکھ رہا تھا۔''

''ہاں...... یوگنڈا میں تھی...... لیکن ابھی تو میں لندن میں ہوں...... تم کہاں ہو؟''

''پاکستان میں۔''

''تمہاری میل نے مجھے حیران اور پریشان کر دیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان خوبصورت وادیوں میں یہ خونی کھیل کھیلا جا رہا ہوگا۔''

''ایمن...... یہ کھیل اب شہروں اور میدانوں تک آ پہنچا ہے۔ میرے لئے لکھ کر بتانا ممکن نہیں ہے ورنہ میں تمہیں اپنی رُوداد سناتا۔''

''وائس پر آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''ایک منٹ رکنا۔'' میں نے اس سے کہا اور کیفے کے مالک یا منتظم کے پاس آیا۔ اس سے وائس چیٹ کے لئے مائیک اور ہیڈ فون لیا۔ اسے پی سی سے منسلک کر کے میں نے ایمن کو وائس چیٹ کا پیغام بھیجا۔ فوراً ہی ہیڈ فون پر اس کی کھنکتی آواز آئی۔

''شہباز کیسے ہو؟ اتنے عرصے بعد تم سے بات ہو گی مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''لیکن آج کل میں جن انہونیوں سے گزر رہا ہوں...... مجھے یقین ہے۔ میں ہر بات اور واقعے کے لئے تیار رہتا ہوں۔''

''لگتا ہے ان دنوں تم کچھ پریشان ہو۔''

''ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے۔ ''مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں...... میری بات چھوڑو...... اپنی سناؤ...... ڈیوڈ شا اس تصویر کے لئے پاگل ہو رہا تھا۔''

''نام نہ لو اس شخص کا...... مجھے نفرت ہے اس سے...... اس نے میرے باپ کی جاگیر پر قبضہ کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ اسے مردہ بھی قرار دلوا دیا۔''

''اس کے بغیر وہ برٹ شا کی جائیداد پر قبضہ کیسے کر سکتے تھے۔ میں نے سنا ہے پاکستانی حکومت نے بھی برٹ شا کی فائل بند کر دی ہے۔''

''ہاں یہ سب ڈیوڈ شا کا چکر ہے۔ اس نے میری بے خبری میں یہ کام کیا۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے اس کے اقدام کو عدالت میں چیلنج کروں گی۔''

''کہاں...... برطانیہ یا پاکستان میں؟''

''پہلے پاکستان میں اور اس کے بعد یہاں...... اس سلسلے میں اگلے ہفتے پاکستان آ رہی ہوں۔''

''یہ تو اچھی خبر ہے۔''

''تم سے کہاں ملاقات ہوگی؟''

''فی الحال یہ مشکل ہے۔'' میں نے کہا۔

میں نے ایمن کو اپنے اور اپنے پیاروں پر گزرنے والی رُوداد اختصار کے ساتھ سنائی تھی اس کے باوجود بات ایک گھنٹے میں جا کر ختم ہوئی تھی۔ ایمن دم بخود سی سنتی رہی تھی۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''شہباز مجھے لگتا ہے تمہاری قسمت کی لکیر میں سکون سے رہنا نہیں لکھا ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ وہ چند دن تھے جب میں ایک نارمل زندگی سے دور رہا تھا۔ اس کے بعد میں سکون سے ایک عام آدمی کی طرح جی رہا تھا کہ یہ افتاد آن پڑی۔''

اس نے گویا جھرجھری لی۔ ''پہلے وزٹ کے بعد بھی میں کئی بار پاکستان آئی میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں بااثر لوگ قانون کو اس حد تک کھلونا بنا کر رکھتے ہیں!''

''اس سے بھی زیادہ...... میں تو پھر ان کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ یقین کرو کوئی غریب بے سہارا ہوتا تو اس کا نام ونشان مٹ چکا ہوتا۔''

''شہباز اب تم کیا کرو گے؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''مقابلہ! اس کے سوا اپنوں نے میرے لئے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میرا وکیل کوشش کر رہا ہے کہ مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے لیکن مجھے ایک فی صد بھی امید نہیں ہے کہ ایسا ہوگا۔''

''سنو...... تم ملک سے نکل جاؤ...... برطانیہ آ جاؤ...... میں ویزا دلوانے میں ہر ممکن مدد کروں گی۔''

''قانونی طریقے سے میرا نکلنا مشکل ہے کیونکہ میں کئی مقدمات میں پولیس کو مطلوب ہوں اور غیر قانونی طریقے سے نکلنا مجھے قبول نہیں ہے۔ ویسے تم فکر نہ کرو۔ خدا کی ذات کے بعد میرے مہربانوں کی کمی نہیں ہے۔''

''راجا اچھا آدمی ہے۔ وہ مجھے اس وقت بھی اچھا لگا تھا۔''

''یقین کرو۔ راجا جیسے لوگ جھوٹے اور چور نہیں ہو سکتے ہیں اس نے مجھے اس مہم کا تھوڑا سا احوال سنایا جس میں وہ تمہارے دادا کے ساتھ ہمالیہ کی طرف گیا تھا۔''

ایمن بے چین ہو۔ ''اس نے یہ نہیں بتایا کہ کیوں گیا تھا۔''

''نہیں۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ افسانوی شہر کا ذکر کرنا مجھے مناسب نہیں لگا تھا آخر اس کے باپ نے بھی اسے یہ بات نہیں بتائی تھی۔

''پاکستان آ کر میں تم سے کیسے رابطہ کروں گی؟''

''میرا موبائل نمبر لے لو...... اگر تمہارے آنے تک یہ میرے پاس رہا تو اس پر رابطہ کرنا ورنہ اللہ مالک ہے۔'' میں نے نمبر لکھ بھیجا۔

''او کے۔ میں کوشش کروں گی۔ اگر تمہارا نمبر نہ ملا تو مجھے اسلام آباد کے میریٹ میں کال کرنا میں وہیں ٹھہروں گی۔''

''ضرور بشرطیکہ حالات کال کرنے کی اجازت دیں۔'' میں ہنسا۔

''شہباز اپنا خیال رکھنا۔'' ایمن کی آواز اچانک جذباتی ہو گئی۔ ''تم نہیں جانتے میں تمہارے لئے دل میں کتنا خلوص رکھتی ہوں!''

''شکریہ ایمن......اب مجھے جانا ہوگا۔ میں زیادہ دیر باہر نہیں رہ سکتا ہوں۔''

''میں سمجھ رہی ہوں۔ گڈ بائے۔''

''بائے۔'' میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ اس کیفے کے مالک نے اپنے کسٹمرز کو اچھی سہولیات دے رکھی تھیں۔ سب سے بڑھ کر نیٹ بہت تیز تھا۔ اس پر کام کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔ بل ادا کر کے میں وہاں سے نکل آیا۔ بارہ بج رہے تھے اور پوش علاقہ ہونے کی وجہ سے گلیاں سنسان تھیں۔ صرف شرٹ میں مجھے ہلکی سردی لگ رہی تھی۔ میں تیز قدموں سے ڈاکٹر کی کوٹھی کے پاس پہنچا۔ اس کے مین گیٹ کے سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ میں رک گیا جب میں گیا تھا تو یہ کار نہیں تھی اور اس علاقے میں گھروں کے اندر اور باہر گاڑیاں کھڑی کرنے کی اتنی گنجائش تھی کہ کوئی بھی مجبوری میں کار کسی کے مین گیٹ کے سامنے پارک کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میری چھٹی حس نے چونکا دیا تھا اور میں نزدیک جانے کے بجائے ایک درخت تلے رک گیا۔ یہاں تاریکی تھی اور دور سے مجھے دیکھ لیا جانا ناممکن تھا۔ کار کے اندر بھی تاریکی تھی اور یہ جاننا ممکن نہیں تھا کہ اندر کوئی ہے یا نہیں۔ اچانک کار کے اندر ایک سرخ نقطہ نظر آیا۔ کوئی سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے ٹٹول کر زمین سے ایک بڑا پتھر اٹھایا اور سڑک کے کنارے لگے درختوں کی آڑ لیتا ہوا، جھکے جھکے کار کے نزدیک پہنچا اور کار کی ڈگی کے ساتھ دبک گیا۔ اچانک اندر سے کسی کی گھٹی گھٹی آواز آئی اور پھر کوئی غرایا۔

''وہ کہاں ہے......تیری ماں کا یار۔''

''کون......؟ ام کو نہیں پتا۔'' مراد خان نے فریاد کی۔

''یہ نہیں مانے گا اسے سلا دو......اندر دیکھو۔'' کسی دوسرے نے کہا۔ اس کے فوراً بعد ہلکی سی ٹھک کی آواز آئی اور میں نے مراد کی ہلکی سی چیخ سنی تھی۔

☆======☆======☆

اندر کم سے کم دو افراد تھے اور ایک شاید گاڑی میں تھا، ممکن ہے گاڑی میں ایک سے زیادہ افراد ہوں۔ مجھے صرف سگریٹ نوش نظر آیا تھا۔ اندر سے آنے والی آوازوں سے ظاہر تھا کہ مراد خان سے پوچھ گچھ کے بعد اسے بے ہوش کر دیا گیا تھا یا ممکن ہے وہ مارا جا چکا ہو۔ وہ لازماً مسلح تھے اور ان کے سامنے آنا خود کشی کرنے کے مترادف تھا۔ میں خاموشی سے پیچھے ہٹا اور مناسب فاصلے پر جا کر موبائل سے ڈاکٹر صاحب کے گھر کا نمبر ملایا۔ تیسری بیل پر ڈاکٹر صاحب نے کال خود ریسیو کی تھی۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں شہباز احمد بول رہا ہوں، آپ کی کوٹھی کے باہر سے۔''

''باہر سے کیوں؟ اندر کیوں نہیں آئے......اچھا سمجھا، وہ نامراد پڑا سو رہا ہوگا۔''

''نامراد کے بارے میں مجھے شبہ ہے، وہ ہمیشہ کی نیند سو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کی کوٹھی میں چند ڈاکو گھسے ہیں، پولیس کو کال کریں۔''

''میرے خدا ایک منٹ رکنا۔'' ڈاکٹر صاحب بوکھلا کر بولے۔ غالباً انہوں نے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔ کچھ دیر بعد بولے۔ ''شیر خان...... میں ہوں ڈاکٹر...... ہاں، میری کوٹھی میں کچھ ڈاکو گھس آئے ہیں۔ فوراً پولیس بھیجو۔ ہاں...... ہاں، پستول ہے میرے پاس...... تم اپنے آدمی بھیجو۔''

پھر وہ لائن پر آئے۔ ''میں نے ایک جاننے والے ڈی ایس پی کو کال کر دی ہے۔ وہ پولیس پارٹی بھیج رہا ہے، تم کہاں ہو؟''

''ڈاکٹر صاحب، آپ جانتے ہیں، میرا پولیس کے سامنے آنا مناسب نہیں ہے۔ فی الحال آپ کوٹھی کی کھڑکیاں، دروازے اندر سے بند کر لیں تاکہ وہ اندر نہ آنے پائیں۔ ان کا ایک یا ایک سے زیادہ ساتھی باہر ایک کار میں موجود ہیں۔''

''اوہ...... میں دیکھتا ہوں۔'' ڈاکٹر صاحب نے فون بند کر دیا۔''

میں نے ڈاکوؤں کا ذکر کر کے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ یہ لوگ سوفی صد میرے لئے آئے تھے۔ اچانک کار سے ایک سایہ اترا اور درختوں کی طرف آیا تھا۔ میں جس درخت کے عقب میں تھا، اس کے تنے سے چمٹ گیا۔ کیا اسے یہاں میری موجودگی کا شبہ ہوا تھا۔ مگر میرا شبہ غلط نکلا، جب وہ درخت کے تنے سے ذرا فاصلے پر دیوار کی طرف منہ کر کے ایک خاص پوز میں بیٹھا...... تو میں سمجھ گیا کہ یہ فطرت کی پکار تھی جو اسے یہاں تک لائی تھی۔ میں اس کی آمد سے فائدہ نہ اٹھاتا تو بلاشبہ احمق کہلاتا تھا۔ میں نے آرام سے اس کی گدی پر ہاتھ رکھا اور اس کا سر اس دیوار سے دے مارا، جس کی جڑ کو وہ آلودہ کر رہا تھا۔ سر اور دیوار کے تصادم سے خاصی آواز بلند ہوئی تھی۔ البتہ اس کے منہ سے نکلنے والی آواز میرے ہاتھ تلے دب کر رہ گئی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ سر دیوار پر مارا، دوسری بار سر دیوار سے لگا تو وہ سکون سے زمین پر دراز ہو گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اسے پتا چل گیا تھا کہ یہ فطرت کی نہیں اصل میں شامت کی پکار تھی۔ میں نے پھرتی سے اس کی تلاشی لی اور اس کے کرتے کی جیب سے برآمد ہونے والا پستول اور بٹوا قبضے میں کر لیا۔ اس کی طرف سے مجھے اطمینان تھا۔ اگر کوئی مداخلت نہ کرتا تو وہ خاصی دیر تک خواب خرگوش کے مزے لے سکتا تھا۔

میں محتاط قدموں سے کار کی طرف بڑھا۔ درختوں کے نیچے مکمل تاریکی تھی اس لئے اگر کوئی کار کی سمت سے اس طرف دیکھ بھی رہا تھا تب بھی میں اسے نظر نہ آتا۔ نزدیک جا کر میں نے ایک چھوٹا سا کنکر کار کے بونٹ کی طرف اچھال دیا۔ خاموشی میں اس کی آواز بھی گونجی تھی۔ کار کے اندر سے کسی نے بے اختیار باہر جھانکا۔ وہ شخص ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اردگرد دیکھنے کے لئے اس نے چند لمحے کے لئے کار کے اندر کی روشنی جلائی۔ میں نے دیکھ لیا، ڈرائیور اکیلا تھا اور اس نے پستول اٹھا رکھا تھا۔ جیسے ہی اس نے روشنی بجھائی، میں پھرتی سے اس کے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے پستول کا دستہ عقب سے اس کی کنپٹی پر مارا اور وہ آہ بھر کر ساتھ برابر والی سیٹ پر لڑھک گیا۔ ضرب بالکل درست جگہ اور قوت سے لگی تھی۔ وہ یقیناً بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے پھرتی سے اس کی تلاشی لی۔ اس کا پستول سامنے تھا۔ مزید کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اسے برابر والی نشست پر دھکیل دیا اور پھر جا کر

دوسرے شخص کو بھی لاکر عقبی سیٹ پر ڈال دیا۔
میں یہ سب ایک منصوبے کے تحت کر رہا تھا۔اس کے بعد میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔اندر موجود افراد کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ باہران کے ساتھیوں کے ساتھ کیا کارروائی ہوچکی ہے۔کار کا ٹھکانا میں نے پہلے ہی سوچ لیا۔نیٹ کیفے سے آتے ہوئے میں نے ایک ویران کوٹھی دیکھی تھی جو کھنڈر ہوچکی تھی اوراس کی ایک دیوار شاید گزشتہ بارش میں گرگئی تھی۔میں نے بلا تکلف کار اینٹوں کے ملبے پر چڑھا دی۔ممکن تھا اندر کوئی چوکیدار ہوتا اور مجھے اسے بھی لمبا لٹانا پڑتا لیکن نامعلوم چوکیدار اپنی خوش قسمتی سے غائب تھا۔میں نے کار کو اندر لے جاکر کھڑا کیا۔باہر سے نظر آنے کا امکان نہیں تھا،لہٰذا میں نے روشنی جلا کر اطمینان سے کام کیا۔توقع کے عین مطابق ڈکی سے مجھے رسی کا ایک گچھا مل گیا جس سے میں نے ان دونوں کو باندھا اور آخر میں ان کی قمیص پھاڑ کر ان کے منہ بھی بند کردیئے تھے۔اس کام سے فارغ ہوکر میں نے ڈیش بورڈ کی تلاشی لی۔اندر ایک عدد ماؤزر اوراس کے فاضل میگزین رکھے تھے۔میں نے وہ بھی نکال لئے۔ماؤزر تلے ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی تھی، یہ بھی مال غنیمت تھا جو میری جیب میں گیا۔گڈی میں کم سے کم دوسو نوٹ تھے یعنی یہ دولاکھ روپے تھے۔ان دونوں کے پاس سے موبائل فونز بھی نکلے تھے اور یہ زیادہ قیمتی چیز تھی۔
اب مجھے اندر جانے والوں کی فکر تھی، میں واپس ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے سامنے آیا۔وہاں بدستور سناٹا اور تاریکی تھی لیکن میں نے مین گیٹ کے قریب جانے کی حماقت نہیں کی تھی۔پولیس کسی وقت بھی وہاں آسکتی تھی۔ممکن ہے آنے والے بھاگ جاتے اور میں پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا۔اس لئے میں نے کوٹھی سے ذرا فاصلے پر ایک اور کوٹھی کے سامنے لگی کراٹا کی باڑھ کے پیچھے جگہ سنبھال لی۔کیونکہ فی الحال پولیس کی آمد کے آثار نہیں تھے اس لئے میں نے ندیم کو کال کی۔چوتھی بیل پر اس نے چراغ پا انداز میں کال ریسیو کی اور پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔''اس وقت کیا مسئلہ ہے؟''
''معاف کرنا...... شاید میں نے غلط موقع پر کال کی ہے۔'' میں ہنسا۔''مجھے وسیم کے موبائل کا نمبر چاہئے۔''
ندیم نے ایک خاصی وزنی گالی دی تھی اور رابطہ منقطع کردیا۔میں ٹھنڈی سانس لے کر پھر اس کا نمبر ملانے جارہا تھا کہ اس کی طرف سے ایس ایم ایس آگیا۔اس نے وسیم کا موبائل نمبر بھیج دیا تھا بلکہ یہ دونمبرز تھے۔میں نے ایک نمبر ملایا۔وسیم نے فوری کال ریسیو کی تھی۔''یس...... ہواز؟''
''میں ہوں۔''میں نے نام لئے بغیر کہا۔''میں لاہور میں ہوں۔''
''آپ...... مجھے معلوم ہے،کوئی خاص بات؟''
''شکاری کتے یہاں بھی میرے پیچھے ہیں۔مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔میں نے دو کتے پکڑ لئے ہیں۔''
''میں سمجھ گیا۔آپ کہاں ہیں؟''
میں نے اسے ڈاکٹر کی کوٹھی کا پتا بتایا۔''میں اس کے باہر ہوں۔اندر مزید شکاری کتے ہیں۔میں نے باہر والوں کو قابو کیا ہے۔''

''میں سمجھ گیا...... ابھی چند منٹ کے بعد میرا آدمی آپ سے رابطہ کرے گا۔ آپ کا نمبر میرے پاس آ گیا ہے۔''

وسیم نے فون بند کر دیا۔ پانچ منٹ بعد جیسے ہی موبائل تھرتھرایا، میں نے کال ریسیو کر لی۔ میں نے اس کی بیل بند کر دی تھی۔ ''یس!'' میں نے کہا۔

''میں عادل بات کر رہا ہوں...... وسیم صاحب کے توسط سے۔ آپ کہاں ہیں اس وقت؟''

میں نے اسے بھی پتا سمجھایا۔

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں آپ سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ میں اور میرے آدمی بیس منٹ کے اندر ایک سیاہ وین میں وہاں آ رہے ہیں۔''

''میں انتظار کر رہا ہوں...... لیکن خیال سے...... یہاں پولیس بھی آنے والی ہے۔''

''میں سمجھ گیا، آپ بے فکر رہیں۔''

میں نے باڑھ سے ذرا اوپر ہو کر دیکھا۔ اسی لمحے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی سے تین افراد باہر آئے تھے۔ میں نے ایک کی آواز سنی۔ ''اوئے، یہ کہاں مر گئے؟''

بولنے والا لہجے سے بدمعاش طبقے کا لگ رہا تھا۔ دوسرے نے بھی کچھ کہا، آواز تو آئی لیکن الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ وہ کار اور اپنے ساتھیوں کے غائب ہونے سے پریشان تھے۔ پولیس اپنی مخصوص رفتار سے آ رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو کال کیے پون گھنٹا گزر چکا تھا اور ابھی تک ان کی آمد کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

ایک آدمی اس طرف آیا جہاں میں باڑھ کے پیچھے چھپا تھا۔ دوسرا فرد گلی کے دوسرے سرے پر گیا تھا۔ وہ کار اور اپنے ساتھی کو تلاش کر رہے تھے۔ اچانک میری والی طرف سے ایک پولیس موبائل سائرن آن کرتی گلی میں داخل ہوئی تھی۔ اس طرف آنے والا اچھل کر بھاگا اور درمیان میں کھڑے شخص نے پولیس موبائل پر فائر کیے تھے۔ موبائل رک گئی اور پھر اس سے کسی نے برسٹ مارا...... بھاگنے والا شخص لڑکھڑایا، چند قدم بھاگا اور پھر منہ کے بل سڑک پر گر گیا۔ فائر کرنے والا پہلے ہی بھاگ رہا تھا۔ موبائل دوبارہ حرکت میں آئی اور اس کے تعاقب میں آگے بڑھی۔ موبائل سے دو پولیس اہلکار برسٹ کا شکار ہونے والے کے پاس کودے تھے۔ ایک نے گرنے والے کو ہلا جلا کر دیکھا جبکہ دوسرے نے بھاگنے والے پر فائر کیے۔ وہ تقریباً گلی کے کونے کے پاس جا پہنچا۔ سپاہی کی فائرنگ سے وہ بچ گیا تھا لیکن قریب آنے والی موبائل سے اس پر فائر ہوئے تو میں نے اسے بھی گرتے دیکھا۔ گلی کے دوسرے سرے کی طرف جانے والا موبائل دیکھتے ہی بھاگ کر گلی سے نکل گیا تھا، اب موبائل اس کے پیچھے تھی۔

اترنے والے دونوں سپاہی آگے بڑھ رہے تھے، وہ شاید ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے اندر جانا چاہتے تھے۔ دو دفعہ فائر ہوئے تھے اور خاصا شور بھی ہوا تھا لیکن اردگرد کی کوٹھیوں میں سناٹا طاری تھا۔ کسی کوٹھی سے روشنی یا آواز کا اشارہ نہیں ملا تھا۔ سب دم سادھے بیٹھے تھے۔ ورنہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اتنی فائرنگ کسی نے سنی نہ ہو۔ میں باڑھ کے پیچھے رہتے ہوئے گلی کے کونے کی طرف جانے لگا۔ عادل شاید آنے والا تھا۔ باڑھ ختم ہونے کے بعد میں نے درختوں کی آڑ لی، اس دوران میں دو بار اور فائرنگ کی آواز گونجی تھی۔ پولیس غالباً ان تینوں کو ڈاکو

قرار دے کر مقابلے میں پار کررہی تھی۔ ایک تو لازماً مارا جا چکا تھا۔ دوسرا بھی زخمی تھا اور تیسرے کا بھی کچھ نہ کچھ ہو چکا تھا۔ اگر پولیس کو معلوم ہوتا کہ یہ ڈاکو نہیں، بلکہ ایک حکومتی بندے مرشد علی کے آدمی ہیں تو شاید گولیوں کے بجائے وہ انہیں سلیوٹ مارتی۔ میں گلی کے سرے تک پہنچا کہ عادل کی کال آئی۔ ''ہم کھنڈر کوٹھی کے سامنے ہیں۔''

''میں بھی آ رہا ہوں۔'' میں نے موبائل بند کیا اور گلی سے نکل کر تیزی سے اس کوٹھی کی طرف بھاگا۔ پولیس موجود تھی اور مزید پولیس کی آمد بھی متوقع تھی۔ میں کسی نئے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ کھنڈر نما کوٹھی کے سامنے ایک سیاہ وین کھڑی تھی۔ میں نے وین کے عقبی حصے پر ہاتھ مارا۔ عقبی دروازہ کھلا اور میں اندر گھس گیا۔ وین کے عقبی حصے میں تین افراد تھے۔ میں نے تعارف کرایا۔ ''شہباز ملک!''

''عادل شیخ!'' ایک نوجوان نے تعارف کرایا۔

''وہ دونوں اندر کھڑی کار میں بندھے پڑے ہیں۔'' میں نے کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ ''جو کرنا ہے جلدی کرو، کچھ دیر میں پولیس یہاں بھی آ سکتی ہے۔''

''آپ آئیں۔'' عادل نے کہا اور اپنے ساتھیوں سمیت نیچے اتر گیا تھا۔ پانچ منٹ میں ہم نے دونوں بے ہوش افراد کو وین میں منتقل کیا۔ ڈرائیور نے وین گھما کر اس طرح ٹوٹی دیوار کے ساتھ لگا دی تھی کہ ہمیں دشواری پیش نہیں آئی۔ ہمارے بیٹھتے ہی وین روانہ ہوگئی تھی۔ عادل نے کار کے کاغذات بھی نکال لئے تھے۔ نمبر پلیٹ جعلی بھی ہو سکتی تھی۔ بے ہوش افراد کے بارے میں میرا اندازہ غلط نکلا تھا، ان میں سے ایک ہوش میں تھا۔ عادل آگے ڈرائیور کے پاس چلا گیا تھا اور باقی دو افراد سے میں واقف نہیں تھا، ویسے بھی وہ مؤدبانہ انداز میں خاموش بیٹھے تھے جیسے مجھ سے مرعوب ہوں۔ وین تیزی سے اس علاقے سے نکلی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو کال کی۔ خاصی دیر بعد کوثر نے فون ریسیو کیا۔ ''کوثر، ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ...... باہر پولیس والوں کے ساتھ ہیں۔'' اس نے میری آواز پہچان کر کہا۔ ''کیا بلاؤں؟''

''نہیں، بس ان کی خیریت معلوم کرنی تھی۔ میں...... فی الحال کہیں اور جا رہا ہوں بعد میں رابطہ کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب کو میرے بارے میں بتا دینا۔ وہ پریشان نہ ہوں، خدا حافظ!''

دونوں قیدی وین کے فرش پر ساکت اور سہمے ہوئے پڑے تھے۔ وین کوئی نصف گھنٹے بعد رک گئی۔ عقبی دروازہ کھول کر عادل کے دونوں ساتھ اتر گئے۔ میں بھی نیچے آیا۔ یہ خاصا وسیع سا احاطہ تھا جس کے چاروں طرف لال اینٹوں کی اونچی چاردیواری تھی۔ دیوار پر خاردار تاریں اور ہر دس فٹ کے بعد ایک طاقتور بلب لگا تھا جس کی وجہ سے پورا احاطہ جگمگا رہا تھا۔ مین گیٹ سے ایک شیڈ تک ساری زمین سرخ اینٹوں سے پختہ کی گئی تھی اور باقی زمین کچی تھی جس پر جا بجا پھولدار تختوں کی کیاریاں بنی تھیں۔ وسط میں ایک چھوٹا سا مکان تھا جسے چاروں طرف سے سفیدے کے اونچے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔

''آیئے جناب!'' عادل نے مجھ سے کہا تھا۔

''یہ لوگ '' میں نے وین میں موجود قیدیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے ان سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''میرے ساتھی ابھی انہیں تیار کر دیں گے۔'' عادل نے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ ''یہ اتنے شریف نہیں

ہیں کہ آسانی سے کچھ بتادیں۔"

عادل مجھے عمارت کے اندر لایا یہ ریڈ کراس کے نشان جیسی کوئی عمارت تھی۔ وسط میں ایک بڑا سا ہال نما کمرا تھا جس کے چاروں طرف دو دو کمرے قطار میں تھے۔ ہال ایک طرح سے نشست گاہ تھی۔ عادل نے ایک ملازم کو کافی لانے کا حکم دیا پھر مجھ سے پوچھا۔ "آپ کو بھوک لگی ہو تو کھانے کا انتظام بھی ہے۔"

"نہیں شکریہ!" میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وسیم کو اطلاع دے دی؟"

"جی جناب...... میری بات ہوگئی تھی ان سے راستے میں۔"

پندرہ منٹ بعد کافی آ گئی، میں بے تابی سے ان دونوں افراد سے پوچھ گچھ کا منتظر تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی تک کیسے آئے جبکہ مجھے سو فی صد یقین تھا کہ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔ تعاقب پر مجھے یاد آیا، میں نے اب تک اس نیک خاتون کو اس کی کار کے بارے میں نہیں بتایا تھا، میں نے جیب سے اس کا دیا ہوا کارڈ نکالا اور مطلوبہ نمبر ملایا۔ اس عورت کی آواز آئی۔ "ہیلو...... کون بات کر رہا ہے؟"

"آپ کا شرمسار۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "ابھی تک آپ کو آپ کی کار کے بارے میں نہیں بتا سکا تھا۔"

"اوہ...... تم خیریت سے تو ہوناں...... مجھے تمہاری فکر تھی۔"

"میں خیریت سے ہوں، بہت شکریہ!" میں نے کہا اور اسے جگہ بتائی جہاں میں نے اس کی کار چھوڑی تھی۔ "اپنی گاڑی وہاں سے منگوالیں۔"

"وہ میں منگوالوں گی مگر تم اپنا بہت خیال رکھنا۔ تمہارے دشمن خطرناک لوگ ہیں۔ کل شام ان کی فائرنگ سے دو افراد مارے گئے تھے۔"

"وہ ان کے ساتھی تھے کیونکہ وہ مجھے روکنے میں ناکام رہے تھے، اس لئے طیش میں آ کر انہوں نے اپنے ہی ساتھیوں کو مار دیا۔ ایک بار پھر بہت شکریہ۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے تمہارے کام آ کر خوشی ہوئی۔"

میں کافی ختم کر چکا تھا۔ عادل نے آ کر بتایا۔ "وہ دونوں تیار ہیں، آیئے میرے ساتھ۔"

ایک کمرے کے فرش سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ ان سے اتر کر ہم ایک تہ خانے میں آئے۔ اس کے ایک کونے میں وہ دونوں الٹے لٹکے تھے اور ان کے سروں کے نیچے بجلی کا ہیٹر لگا تھا۔ ان کے پاس دو افراد موجود تھے جو صورت سے ہی سفاک اور جلاد طبیعت کے نظر آتے تھے۔ عادل نے ان کی طرف دیکھا۔ "کچھ کہا انہوں نے؟"

ایک مسکرا کر بولا۔ "کہیں گے سرکار! کیوں نہیں کہیں گے، آپ سوال کر کے دیکھو۔"

ان دونوں کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا لیکن فی الحال وہ بہادری دکھا رہے تھے۔ میں ایک کے قریب گیا۔ "مجھے پہچانتے ہو؟"

"نہیں جی! ہم آپ کو نہیں جانتے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"پھر ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر کیوں گئے تھے؟"

"ہم جی ڈاکو ہیں۔ ڈاکا مارنے گئے تھے۔ ہمیں پولیس کے حوالے کردو۔" دوسرے نے کہا۔

"ماچس ہوگی کسی کے پاس؟" میں نے پوچھا۔ عادل نے ماچس منگوا کر میرے حوالے کی۔ میں نے اس کی ایک تیلی جلائی اور بجھا کر ایک دم پہلے والے کی ناک سے لگادی۔ اس نے تڑپ کر چیخ ماری تھی۔

"بس...... اتنی سی قوت برداشت ہے؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ ہیٹر جب جلیں گے اور تمہارے سروں میں موجود مغز اس کی گرمی سے فرائی ہوں گے تب کیسے برداشت کرو گے؟"

"ہمیں.... ہمیں کچھ نہیں معلوم.... ہمیں معاف کردو۔"

میں نے اس کی فریاد نظر انداز کی۔ "جب گرمی ناقابلِ برداشت ہو جائے گی تو کاسۂ سر میں تمہارے مغز پگھل کر...... ناک اور کان کے راستے باہر آ جائیں گے۔"

دونوں ڈر چکے تھے مگر ابھی زبان کھولنے پر آمادہ نہیں تھے۔ عادل کے اشارے پر ایک شخص نے ہیٹر آن کر دیا۔ یہ خاصے بڑے سائز کا ہیٹر تھا جو ان کے سروں سے صرف دو فٹ نیچے تھا۔ ہیٹر تیزی سے گرم ہوا اور جب اس کی آنچ ان کے سروں تک پہنچی تو انہوں نے کلبلانا اور سر اونچا کر کے حرارت سے بچنے کی کوشش شروع کر دی لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ مستقل سر اٹھائے رکھنا ممکن نہیں تھا اور جیسے ہی وہ سر نیچے کرتے، حرارت ان کے سروں کو جلانے لگتی تھی۔ ذرا دیر میں ایک کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے چلانا شروع کر دیا۔

"خدا کے لئے...... میں بتاتا ہوں۔" دوسرے نے چلا کر کہا۔

"چپ کر...... سؤر کے بچے...... !بلا تیرے میرے خاندان کو کھا جائے گا۔" پہلے والا غرایا۔

"میں برداشت نہیں کر سکتا۔" دوسرے نے باقاعدہ تڑپنا شروع کر دیا تھا۔ "اوئے میرا سر پگھل جائے گا، بند کرواسے۔"

میں نے اشارہ کیا تو ہیٹر بند کر دیا گیا۔ اگرچہ اس کی تپش فوری طور پر کم نہیں ہوئی تھی لیکن انہوں نے نفسیاتی سکون محسوس کیا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ پسینے پسینے ہو گئے تھے۔ ان کے سروں سے پسینے کے قطرے ہیٹر پر گر رہے تھے۔ گرم ہیٹر سے چھن چھن کی آواز آ رہی تھی، میں نے اشارہ کیا۔ "اگر تم چند سیکنڈ اور نہ مانتے تو پسینے کی جگہ تمہارا مغز ہیٹر پر گر رہا ہوتا۔"

"خدا کے لئے...... مجھے اتارو...... پانی دو۔" دوسرے نے ہانپتے ہوئے کہا۔

عادل نے میری طرف دیکھا تو میں نے سر کے اشارے سے اسے اتارنے کو کہا۔ جب اسے اتارا جا رہا تھا تو اس کے ساتھی نے ایک بار پھر اسے دھمکانا شروع کر دیا۔ "اوئے...... زبان کھولی ناں تو......"

عادل نے اچانک اس کے منہ پر ٹھوکر ماری تھی۔ اس نے کرب ناک سی آواز نکالی اور تڑپنا شروع کر دیا اس کے سامنے کے دو دانت غائب ہو گئے تھے اور خون فوارے کی طرح اچھلا تھا۔

"اب یہ کتا بھونکے تو اس کے سر کے نیچے ہیٹر آن کر دینا۔" عادل نے کہا اور دوسرے کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے لے آؤ۔"

ذرا دیر بعد وہ ہمارے سامنے تھا اس کی حالت پانی پی کر خاصی سنبھل گئی تھی۔ میں نے پہلا سوال بلا کے بارے میں کیا۔ "یہ بلا کون ہے؟"

"جی، آپ بلا چوہدری کو نہیں جانتے؟" اس نے بے حد تعجب سے کہا۔

"بدقسمتی سے ہمیں بالکل نہیں پتا چلا کہ چوہدری صاحب منسٹر بن گئے ہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اوہ...... نہیں جی، بلا چوہدری لاہور کا بہت بڑا بدمعاش ہے۔"

"اچھا...... سات فٹ اونچا اور پانچ من وزنی ہے۔"

"اوہ نہیں جی!" وہ میرے غیر سنجیدہ رویے پر جھنجلا گیا۔ "بہت سفاک بندہ ہے جی!"

"ہم سے بھی زیادہ؟"

"ہاں...... نہیں جی!" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"شاہد جی...... سب شادا کہتے ہیں۔"

"تو شادا صاحب...... تم لوگ میرے پیچھے کیوں پڑے ہو؟"

"یہ تو جی بلا چوہدری جانتا ہے، اس نے ہمیں آپ کی تصویر اور اس کوٹھی کا پتا بتا کر بھیجا تھا۔"

"اسے کیسے پتا چلا کہ میں اس کوٹھی میں ہوں؟"

"پتا نہیں جی!" اس نے سر کھجایا۔ "پر جب ہم جا رہے تھے تو ایک آدمی بلا چوہدری کے پاس تھا۔ اس نے جی ایک بڑی سی مشین اٹھا رکھی تھی۔ وہ بلا چوہدری سے کہہ رہا تھا، شہباز نے آخری کال اس جگہ سے کی ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیسی کال؟"

"پتا نہیں جی...... شاید موبائل کال کی بات کر رہے تھے۔ اس شخص نے عجیب سی بات کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مشین نے کال پکڑی تھی۔"

"میرے خدا!" میں نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا اور اس میں سے سم نکال دی۔

عادل غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور آہستہ سے بولا۔ "یہ عین ممکن ہے جناب، کمانڈر نے بھی باہر سے ایک ایسی مشین منگوائی ہے، اس کی مدد سے نہ صرف کسی موبائل کا محل وقوع معلوم کیا جا سکتا ہے بلکہ اس موبائل سے کی جانے والی کال بھی سنی جا سکتی ہے۔"

"میں اس شخص کے پاس آیا۔ "مشین والے شخص کا نام کیا ہے؟"

"پتا نہیں جی۔ پر وہ شخص بڑا تیز تھا جی! بلا چوہدری کسی سے نہیں ڈرتا ہے...... لیکن وہ بھی اس سے دبا دبا سا رہا تھا۔ چہرے سے بھی وہ خطرناک نظر آتا تھا۔"

"اس کا حلیہ...... میرا مطلب ہے، نقوش کس طرح کے تھے؟"

"کچھ چینیوں جیسے۔"

"اس کے ماتھے پر زخم کا نشان تھا؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔ "دائیں طرف کسی پرانی چوٹ کا نشان ہے۔"

"فتح خان!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "وہ فتح خان ہے۔"

میں عادل کو ایک طرف لے گیا۔ ''معاملہ بہت خطرناک ہو گیا ہے۔ میں نے اس موبائل سے وسیم سے رابطہ کیا تھا، اسے فوری طور پر مطلع کرو اور موبائل فون کے بجائے کوئی اور ذریعہ استعمال کرنا۔ میرا خیال ہے، نہ صرف وسیم کا ٹھکانا بلکہ یہ جگہ بھی دشمن کے علم میں آ چکی ہے۔ فی الحال کوئی موبائل کا استعمال نہ کرے۔''

صورتِ حال یک دم ہی سنسنی خیز ہو گئی تھی۔ گزشتہ ایک ہفتے سے میں شدید الجھن میں تھا کہ مرشد علی یا ڈیوڈ شا کے آدمیوں نے ہمارا سراغ کیسے لگایا۔ ان کے ٹریپ سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ہماری نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر تھے۔ میں شادا کے پاس واپس آیا۔ ''میرے بارے میں کیسے علم ہوا کہ میں لاہور میں ہوں؟''

''میں نہیں جانتا لیکن ہو سکتا ہے، مزمل جانتا ہو۔''

''تمہارا ساتھی جو تہ خانے میں ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ بلا چوہدری کے قریب ہے۔'' وہ کہتے کہتے یک دم خوف زدہ نظر آنے لگا۔ ''جناب! بلا بہت ظالم ہے، اسے پتا چلا تو وہ میرے سارے گھر والوں کو زندہ جلا دے گا، وہ پہلے بھی ایسا کر چکا ہے۔''

''فکر مت کرو۔ یہ بات اس تک نہیں پہنچے گی۔''

عادل نے اسے تہ خانے میں بھجوا دیا۔ میں اور عادل اوپر آئے تو وہاں زبردست چہل پہل تھی۔ شیڈ تلے موجود گاڑیاں تیار کی جا رہی تھیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے عادل کی طرف دیکھا۔

''ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ان لوگوں کا نظم و ضبط میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ مختصر سے نوٹس پر کسی بھی صورتِ حال میں حرکت میں آ جاتے تھے۔ میں حیران تھا، ہمارے ہاں اتنے منظم اور سائنٹفک انداز میں کام کرنے والے جرائم پیشہ گروہ بھی پائے جاتے ہیں۔ میں نے جرائم پیشہ اس وجہ سے کہا تھا کیونکہ وہ جو کام کرتے تھے، تکنیکی لحاظ سے جرائم ہی کے زمرے میں آتا تھا۔ اندر سے سامان لا کر گاڑیوں پر لادا جا رہا تھا۔ کُل تین گاڑیاں تھیں، ایک وین اور دو پجیرو۔ احاطے میں سات آٹھ افراد نظر آ رہے تھے۔ دس منٹ بعد دونوں قیدیوں کو بھی لا کر وین میں ڈال دیا گیا۔ ان کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور منہ پر ٹیپ لگا تھا۔ عادل میری طرف آیا۔ ''جناب! آپ بھی وین میں آ جائیں، یہ محفوظ ہے۔''

''بہتر ہو گا، مجھے اپنے ساتھ کھلی گاڑی میں رکھو اور اگر کوئی خطرہ ہو تو مجھے بھی کوئی ہتھیار دے دو۔'' میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''تب بہتر ہو گا آپ پجیرو میں آ جائیں۔''

مزید دس منٹ بعد احاطے اور عمارت کی تمام روشنیاں گُل کر دی گئی تھیں۔ اس کے بعد گیٹ کھلا اور ایک ایک کر کے تینوں گاڑیاں باہر آ گئیں۔ میں ایک پجیرو کے عقبی حصے میں تھا۔ پہلی بار میں نے دیکھا، یہ شاید کوئی نواحی علاقہ تھا۔ دور دور تک خالی پلاٹ اور کہیں کہیں مکانات تھے۔ چھوٹی چھوٹی دیواروں کی مدد سے پلاٹوں کی حد بندی کی گئی تھی۔ گاڑیاں ایک نیم پختہ سڑک پر آگے بڑھنے لگی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ عادل اور اس کے ساتھی چوکس تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھال رکھے تھے۔ فی الحال دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ عادل نے دھیمی آواز میں ڈرائیور سے کہا۔ ''رفتار بڑھاؤ...... جلدی نکلو یہاں سے......''

ابھی عادل کا جملہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ سامنے سے ایک روشنی نمودار ہوئی اور میرے کانوں نے بیک وقت کسی خودکار رائفل کا برسٹ چلنے اور شیشہ بکھرنے کی آواز سنی۔ جیپ ایک دھچکے سے رکی تھی۔ ہم دونوں نے بروقت سر نیچے کئے تھے۔ ڈرائیور اور اس کے ساتھی شاید گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ اس پہلے برسٹ کے ساتھ ہی ہم پر تین طرف سے فائرنگ ہونے لگی تھی۔ سامنے سے اور دائیں بائیں سے...... دشمنوں نے جال بچھایا تھا اور ہم نہایت آسانی سے ان کے جال میں پھنس گئے تھے۔ تین اطراف سے نشانہ لے کر ہم پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔ شیشے ٹوٹ رہے تھے۔ گاڑی...... کی باڈی گولیاں سہ کر ہمیں بچا رہی تھی لیکن کب تک...... کسی وقت بھی گولیاں اس کے پار ہو کر ہمیں چھلنی کر سکتی تھیں۔

عادل نیچے جو کچھ کر رہا تھا، میں اندھیرے میں دیکھنے سے قاصر تھا۔ اچانک اس نے سیدھے ہو کر کوئی شے دائیں طرف اچھال دی اور پھر جھک گیا اسی لمحے اس کے پاس سے تیز سیٹی کی آوازیں گونجی تھیں۔ ساتھ ہی اس نے مجھ سے کہا۔ ''شہباز صاحب، آنکھیں بند کر لیں، باہر ہرگز مت دیکھیں۔''

میں نے جھجکتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی لمحے باہر روشنی کا ایسا شدید جھماکا ہوا کہ جھکے ہونے اور بند آنکھوں کے باوجود میں نے محسوس کیا جیسے باہر بیک وقت کئی سورج طلوع ہو گئے ہوں۔ عادل نے زور سے کہا۔ ''ابھی آنکھیں مت کھولیے گا۔''

میں نے محسوس کیا وہ جھکے جھکے پھر سرگرم ہو گیا تھا اور پھر اس نے سیدھے ہو کر ایسی ہی کوئی اور شے باہر اچھال دی۔ میں نے سیٹی کی آواز سنی۔ سیٹی کا مطلب شاید ایک اشارہ تھا کہ آنکھیں بند کر لی جائیں۔ اس بار ہونے والے روشنی کے جھماکے ایسے تھے کہ روشنی کسی تند بگولے کی طرح ہم سے ٹکرائی تھی اور مجھے بے اختیار آنکھوں پر ہاتھ رکھنے پڑے تھے۔ اس کے باوجود روشنی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی، چبھ رہی تھی۔ نہ جانے باہر جنہوں نے کھلی آنکھوں سے اس روشنی کا سامنا کیا تھا، ان کا کیا حشر ہوا تھا لیکن اس ''چیز'' کے پھینکتے ہی فائرنگ رک گئی تھی اور کچھ افراد کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے ہی یہ خیرہ کن روشنی ختم ہوئی، عادل نے ایک اور سیٹی بجائی اور اپنے ہتھیار سنبھالتا گاڑی سے اتر گیا۔ میں بھی بائیں طرف اتر گیا تھا۔ اس طرف دوسری گاڑی ذرا فاصلے پر تھی۔ عادل اور اس کے ساتھی ان کے آڑ لے کر جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔ اندھیرے میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ان کا ٹارگٹ کہاں تھا؟

لیکن میرا اندازہ غلط تھا۔ ان لوگوں کے پاس رات کو دیکھنے والی عینکیں تھیں اور وہ دشمن کی طرف تاک کر فائرنگ کر رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے دشمنوں کا تقریباً صفایا کر دیا تھا۔ ان کو روشنی کے بے پناہ جھماکوں نے اندھا کر دیا تھا اور عادل اور اس کے ساتھی نائٹ وژن عینکوں سے صاف دیکھ رہے تھے۔ پانچ منٹ تک بھرپور کارروائی کرنے کے بعد عادل اور اس کے ساتھی واپس گاڑیوں میں گھسے۔ اس کے دو ساتھی مارے گئے تھے اور دو زخمی تھے۔ ان کو وین میں منتقل کر دیا گیا اور فوراً ہی تینوں گاڑیاں وہاں سے روانہ ہو گئیں۔ تاریکی نے ٹوٹے شیشوں اور گاڑیوں پر لگنے والی گولیوں کے نشان چھپا لئے تھے جس گاڑی میں، مَیں تھا اسے عادل خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ملتان روڈ پر ایک ٹھکانے کی طرف۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا وہ جگہ ہمارے دشمنوں کی نظر سے محفوظ ہے؟''

''امکان تو یہی ہے۔'' اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ جیسے اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا ہو۔ اس لئے میں بھی چپ ہو گیا۔ خوش قسمتی سے راستے میں مزید کسی نے مزاحمت نہیں کی۔ ایک جگہ پہنچ کر اچانک تینوں گاڑیاں الگ ہو گئیں۔ جیپ ایک تاریک راستے پر جارہی تھی۔ ساتھ ہی عادل نے گاڑی میں موجود دونوں افراد کو ہوشیار رہنے کو کہا۔ کچھ دیر بعد مجھے اندازہ ہوا، وہ تعاقب کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس کا ایک ساتھی نائٹ وژن دوربین کی مدد سے عقب میں دیکھ رہا تھا، اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''سر، پیچھے دور تک کوئی نہیں ہے۔''

عادل شاید اب تک ایسے ہی گاڑی گھما رہا تھا۔ جب اس کے ساتھی نے تعاقب کا امکان مسترد کیا تو اس نے ایک راستہ پکڑ لیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی ایک نئی قائم ہونے والی آبادی کی ایک کوٹھی میں داخل ہوئی۔ کوٹھی کے ڈرائیو وے میں سرگرمی تھی۔ شاید وہاں موجود لوگوں کو ہماری آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ پورچ میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ گاڑی دیکھتے ہی وہ بے تابی سے لپکی تھی۔ ''عادل، تم ٹھیک ہو ناں؟''

عادل نیچے اترا اور اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہاں...... لیکن دو آدمی مارے گئے ہیں۔''

میں نیچے آیا تو عادل نے تعارف کرایا۔ ''شہباز صاحب! شی از مائی وائف سونیا...... اور سونیا، یہ شہباز صاحب ہیں۔''

''میں ان کے بارے میں سنتی رہی ہوں۔'' اس نے اشتیاق سے کہا۔ ''آپ اندر آئیں۔''

''تم شہباز صاحب کو لے جاؤ، ابھی مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں۔''

شاید اسے ابھی گاڑیاں ٹھکانے لگانی تھیں اور اپنے مارے جانے اور زخمی ہونے والے ساتھیوں کا کچھ کرنا تھا۔ ہمارے پیچھے باقی دو گاڑیاں بھی آ گئی تھیں۔ میں رات بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد تھک گیا تھا اور آرام کرنا چاہتا تھا۔ سونیا نے راستے میں مجھے بتایا کہ وسیم نے اسے میرے بارے میں بتایا تھا۔ ''میرے بھائی ہیں...... وسیم اور میں ان کے گروپ میں شامل ہوں۔''

مجھے حیرت ہوئی تھی۔ وسیم نے اپنی بہن اور عادل نے اپنی بیوی کو اس خطرناک دھندے میں شامل کر رکھا تھا جس میں قدم قدم پر موت کا سامنا تھا۔ مگر فی الحال میرے پاس ان باتوں پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ اس نے مجھے تلاش کرنے کے لئے اس مشین کا سہارا لیا جو نہ صرف موبائل فریکوئنسی پکڑ لیتی تھی، بلکہ جس جگہ سے موبائل کا استعمال ہو رہا ہوتا تھا اس کی نشاندہی بھی کر دیا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے لاہور آتے ہی تلاش کر لیا گیا تھا۔ پہلی بار شاید کسی پہچاننے والے نے مجھے دیکھا تھا۔ شاید وہی چادر پوش جس نے موبائل شاپ سے میرا پیچھا کیا تھا اور مجھے روکنے میں ناکامی کی پاداش میں سر عام مارا گیا تھا، اس نے بلا چوہدری کے آدمیوں کو اس شاپ کی نشاندہی کر دی تھی۔ اس سے میرا کنکشن نمبر حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اسلام آباد سے روانگی کے بعد سے میرے ساتھ اب تک جو ہوا تھا اس میں ایک بات قابل غور تھی۔ مرشد علی نے مجھے زندہ کیوں رہنے دیا جبکہ میں اس کے قابو میں آ چکا تھا۔ اس کی وضاحت کسی حد تک ندیم نے کر دی تھی کہ الیکشن قریب تھے اور مرشد علی کے طاقتور حریف میرا کیس اس کے خلاف اچھال رہے

تھے اور اس مرحلے پر میرا مارا جانا شاید مرشد علی کی سیاسی ساکھ کے لئے نقصان دہ ہوتا۔ اخبارات اور میڈیا بھی اس کیس میں دلچسپی لے رہا تھا لہٰذا مجھے قابو میں کر کے مرشد علی نے راناؤں کے حوالے کر دیا تاکہ بعد میں مجھ پر دباؤ ڈال کر مجھ سے اپنے حق میں بیانات حاصل کئے جائیں لیکن اس کی نوبت آنے سے پہلے میں پہلوان کے ڈیرے سے مع اس کی بیوی زہرہ کے فرار ہو گیا تھا۔

مرشد علی کی نسبت معاملہ کسی حد تک واضح تھا لیکن ڈیوڈ شا مجھ سے کیا چاہتا تھا اور میری تلاش میں اس طرح کیوں سرگرم تھا یہ فی الحال میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ تصویر وہ حاصل کر چکا تھا اور اب اسے مجھ سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے تھی۔ ایک وجہ میرے ذہن میں رہ رہ کر آ رہی تھی کہ مارگلہ کے پہاڑوں میں جب مرشد علی کے آدمیوں نے مجھے گھیر لیا تھا تو میں نے تصویر جلانے کی دھمکی دے کر ڈیوڈ شا کو بلوا لیا تھا اور پھر اسے یرغمال بنا لیا تھا شاید ڈیوڈ شا اس کا انتقام لینا چاہتا تھا لیکن ہر بار میرے دل نے اس بات کو رد کر دیا۔ ڈیوڈ شا جیسے لوگ ان چھوٹے موٹے معاملات میں اپنی توانائی اور وقت ضائع نہیں کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ بڑے مقاصد ہوتے ہیں۔ سونیا نے مجھے ایک کمرا دکھا دیا۔ اگرچہ مجھے بھوک لگ رہی تھی مگر نیند سے برا حال تھا۔ اس لئے میں نے چار گھنٹے بعد ناشتے کے ساتھ جگائے جانے کی درخواست کی اور سو گیا۔ چار گھنٹے بعد مجھے خود سونیا نے جگایا تھا، میں اسے دیکھ کر ذرا بوکھلا گیا تھا۔ ”آپ......! کسی ملازم کو بھیج دیا ہوتا۔“

وہ مسکرائی۔ ”ہمیں یہاں آئے ہوئے صرف دو دن ہوئے ہیں اور فی الحال کوئی ملازم نہیں ہے۔ دوسرے کھانا میں خود بناتی ہوں۔ عادل ابھی سو رہا ہے، اس لئے صرف آپ ناشتا کر لیں۔“

وہ ناشتے کی ٹرالی ساتھ لائی تھی۔ جس پر خالص لاہوری اسٹائل کا ناشتا تھا۔ پائے، پراٹھے اور لسی کے ساتھ خاصا کچھ تھا۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ سونیا ناشتا لگا کر چلی گئی تھی۔ جب تک میں نے اطمینان سے ناشتا مکمل کیا وہ چائے لے آئی۔ ”آپ نے تکلف کیا مسز عادل!“

وہ ہنسی۔ ”تکلف آپ کر رہے ہیں، آپ میرے لئے وسیم بھائی کی طرح ہیں اور مجھے نام لے کر مخاطب کر سکتے ہیں۔“

”اوکے...... سسٹر، یہ بتاؤ...... کہ رات مزید کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوا؟“

”نہیں۔ البتہ عادل کے ساتھی ایک صحافی کو مشکوک سمجھ کر پکڑ لائے ہیں۔ وہ یہاں کسی اسٹوری پر کام کر رہا ہے۔ بہرحال عادل اٹھ کر اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔“

”یعنی تم لوگوں نے اسے قید کر رکھا ہے؟“

”مجبوری ہے...... کیونکہ بغیر چھان بین کے اسے نہیں چھوڑ سکتے...... دشمن صحافی کے بھیس میں بھی آ سکتا ہے۔“

”یہ بات تو درست ہے...... اسے کہاں رکھا ہے؟“

”عقبی حصے میں نوکروں کے لئے کوارٹر ہیں، وہاں ہے۔“

”میں اسے دیکھتا ہوں۔“ میں نے چائے کا کپ رکھ کر کہا۔ ”مجھے دکھانا...... کہاں ہے کوارٹر؟“

سونیا مطلوبہ کوارٹر کی نشاندہی کر کے واپس چلی گئی تھی اور جب میں کوارٹر میں داخل ہوا تو وہاں خاصی

دلچسپ صورت حالت تھی۔ ایک دبلا پتلا نسبتاً طویل قامت اور خوش رو نوجوان عادل کے دو ساتھیوں سے جھگڑ رہا تھا۔ ''یہ میانوالی جیل ہے۔ غضب خدا کا! صبح کے دس بج رہے ہیں اور اب تک ناشتے کا نام ونشان نہیں ہے۔''

عادل کے ساتھی مجھے دیکھ کر اٹینشن ہو گئے تھے۔ ایک نے شکایت کی۔ ''اس نے رات سے ہمیں تنگ کر رکھا ہے۔ اگر عادل صاحب کا خیال نہ ہوتا تو میں اسے......''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔ ''جا کر اس کے لئے ناشتا لاؤ۔''

اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے عادل کا نام لے کر غلطی کی ہے۔ وہ اور اس کا ساتھی خاموشی سے باہر چلے گئے تھے۔ صحافی بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے انگلیوں کے درمیان سگریٹ دبا رکھا تھا۔ اس نے بڑے اسٹائل سے مٹھی دبا کر کش لیا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''نام کیا ہے تمہارا؟''

''راجا ناصر!'' اس نے کش لے کر کہا۔ ''جرنلسٹ ہوں۔'' اس نے کارڈ نکال کر پیش کیا۔

میں نے ملاحظہ کیا۔ ''کیا ثبوت ہے کہ یہ اصلی ہے؟''

''معلوم کروالو، شہباز ملک صاحب!''

میں اچھل پڑا تھا۔ ''تم میرا نام جانتے ہو...... تم یقیناً مرشد علی یا بلا چوہدری کے ساتھی ہو۔''

''ان دونوں خبیثوں سے واقف ہوں...... لیکن تمہیں جاننے کی وجہ کچھ اور ہے۔ اسلام آباد میں میرا ایک دوست تمہارے لئے مہم چلا رہا ہے۔ تمہارے وکیل ندیم بھٹی کا دوست ہے۔''

''اچھا!'' میں نے غور کیا۔ ''تمہارے استدلال نے مجھے متاثر کیا...... لیکن بائی داوے...... تم یہاں کیا کر رہے تھے؟''

''میں تو سامنے والی کوٹھی کی نگرانی کر رہا تھا۔ مجھے اطلاع ملی تھی، یہاں ہائی کلاس قحبہ خانہ ہے جسے بعض بااثر سرکاری شخصیات کی پشت پناہی حاصل ہے۔''

''اس قسم کے عوامی خدمت گاروں کو سرکار کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے اور یہ کوئی اتنی خاص اسٹوری بھی نہیں ہے۔''

''ہاں، اس لحاظ سے تو خاص نہیں ہے۔ البتہ ایک نیا چکر ہے۔ اس قحبہ خانے کو لاہور شہر کے گرلز ہاسٹل سے لڑکیاں سپلائی کی جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں رات کی تاریکی میں آتی ہیں اور صبح سویرے رخصت ہو جاتی ہیں۔ بے چارے والدین اپنی لڑکیوں کو دور دراز کے قصبوں سے یہاں پڑھنے کے لئے بھیجتے ہیں اور ان کو خبر ہی نہیں ہے کہ ان کی بچیاں کس غلاظت میں اتر چکی ہیں؟''

''واقعی، یہ اس معاشرے کا اہم مسئلہ ہے۔'' میں نے تسلیم کیا۔

''کل رات بھی میں دو ایسی ہی لڑکیوں کا تعاقب کرتا یہاں تک آیا تھا۔ کوٹھی کی نگرانی کر رہا تھا کہ تمہارے آدمیوں نے مجھے چھاپ لیا۔''

''اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو ان سے غلطی ہوئی۔''

''بائی داوے...... تم لوگ کون ہو؟''

''سامنے والوں کے حریف یا حلیف؟'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"برخوردار! مجھے تمہاری نوجوانی پر رحم آ رہا ہے ورنہ اس سوال کا جواب میں کسی اور طرح دیتا۔"

اس نے ہاتھ اٹھائے۔"اوکے...... بندہ صرف قلم یا زیادہ سے زیادہ زبان چلا سکتا ہے باقی معاملات میں کورا ہے۔"

"راجا جی، بہتر ہو گا دونوں کے چلانے میں ذرا احتیاط سے کام لیا کرو۔"

اس نے آخری کش لے کر سگریٹ کو تقریباً فلٹر تک ختم کر کے ایک طرف اچھال دیا۔"احتیاط ہی تو نہیں آتی ورنہ یہاں کیوں بیٹھا ہوتا...... وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ صاحب نے 'بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق......' تو بس کچھ ایسی ہی طبیعت پائی ہے۔"

اتنے میں عادل کا ساتھی ناشتا لے آیا۔ راجا ناصر نے لپک کر ناشتے کی ٹرے لی تھی۔"جزاک اللہ، بس ساری بات یہ تھی، آج کا ناشتا تمہارے ہاں مقدر تھا۔"

"ناشتا!" عادل کے ساتھی نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔"وہ جو رات سے تم نے فرمائشیں کر کر کے اُدھم مچا رکھا تھا۔"

"پکڑا تم لوگوں نے ہے...... فرمائشیں میں کس سے کرتا۔" اس نے سخت ڈھٹائی سے کہا۔"اور ہاں، کافی لے کر آنا۔ میں ناشتے کے بعد کافی لیتا ہوں...... بلیک اور نان شوگر۔"

عادل کا ساتھی اسے گھورتا ہوا جانے لگا، میں نے اسے کہا۔"میرے لئے بھی کافی لانا۔"

وہ بادل ناخواستہ روانہ ہوا تو میں نے ناشتے میں بے خطر کود پڑنے والے صحافی سے کہا۔

"تم اس طرح ہر ایک سے پنگا لینے کے عادی ہو...... تعجب ہے اب تک فوت نہیں ہوئے۔"

"بندہ، صورت سے جتنا احمق نظر آتا ہے۔ حقیقت میں اس سے ذرا کم احمق ہے۔" اس نے کھانے کی رفتار میں کمی لائے بغیر کہا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے یہ اس کا آخری ناشتا ہے۔ جب تک اس نے ناشتا ختم کیا، اندر سے کافی بھی آ گئی تھی۔

"تو شہباز صاحب! بات یہ ہے آپ نے مگرمچھ کی دم تلے پناہ لے رکھی ہے۔" اس نے کافی کا مگ سنبھالا۔"اور آپ اس کے سامنے نہیں آ سکتے۔"

"تم نے مرشد علی کو درست طور پر مگرمچھ قرار دیا ہے میں جب بھی اس کے سامنے آیا، وہ مجھے دبوچنے سے گریز نہیں کرے گا۔" میں نے اعتراف کیا۔"ویسے تم اس سارے معاملے کو کس نظر سے دیکھ رہے ہو...... اور ہائی داوے...... تم نے مجھے شناخت کیسے کیا؟"

راجا ناصر مسکرایا۔"جناب کے پوسٹر لاہور کے ہر معمولی سے بدمعاش کے پاس بھی موجود ہیں۔ مجھے حیرت ہے تم اس طرح منہ اٹھا کر گھوم رہے ہو اور کسی نے تمہیں شناخت نہیں کیا۔ تمہارے لئے ایک لاکھ کا انعام رکھا گیا ہے۔"

"سخت قدر ناشناس ہے مرشد علی صرف ایک لاکھ روپے۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"ایک لاکھ کا انعام صرف شناخت کرنے اور پکڑوانے والے کے لئے ہے۔" راجا ناصر نے گویا مجھے تسلی دی۔"ورنہ درجہ بہ درجہ مرشد علی تک یہ انعام یقیناً پانچ، دس لاکھ تک پہنچ جائے گا۔"

''دس لاکھ ہاں یہ کچھ معقول رقم ہے۔''
ناصر نے کافی کا بڑا سا گھونٹ لے کر بات جاری رکھی۔ ''مرشد علی فی الحال الیکشن کی وجہ سے مجبور ہے ورنہ تمہارے لئے زمین آسمان ایک کر دیتا۔''
''زمین آسمان وہ اب بھی ایک کئے ہوئے ہے۔''
ناصر نے مگ خالی کر کے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگائی۔ ''نہیں......فی الحال وہ خود کرنے کے بجائے دوسروں سے کام لے رہا ہے۔ اپنے آدمیوں کو اس نے پیچھے ہٹا لیا ہے۔''
میں نے غور کیا شاید اس وجہ سے اس نے مجھے شکر گڑھ کے راناؤں کے حوالے کیا تھا۔ ناصر کے انداز میں ایک نامحسوس سچائی تھی لیکن جب تک عادل اسے کلیئر قرار نہیں دیتا اس پر اعتماد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ''تمہارا مطلب ہے زمین آسمان ایک کرنے والا کام وہ الیکشن کے بعد کرے گا؟''
راجا ناصر نے سر ہلایا۔ ''یقیناً......نتیجہ کچھ بھی ہو، اسے یقینی سمجھو......ویسے بھی وہ ہمیشہ سرکاری پارٹی میں رہا ہے۔ پولیس اور صوبے کی انتظامیہ اس کے ساتھ ہے۔ وفاقی حکومت میں بھی اس کا اثر رسوخ ہے۔''
''مرشد کے بھائی نادر کے بارے میں کوئی خبر ہے؟''
''ہاں......دبئی میں اس کا آپریشن ناکام رہا ہے اور اب اسے علاج کے لئے امریکا بھیجا جا رہا ہے۔ ایک بات طے ہے، مرشد علی بھائی کی اس حالت کا ذمے دار تمہیں سمجھتا ہے اور کسی صورت تمہیں معاف نہیں کرے گا، صرف ایک طریقہ ہے......تم اس سے بھی زیادہ طاقتور شخص کی پناہ میں آ جاؤ، جس سے مرشد علی بھی ڈرتا ہو۔''
''اور اس کے علاوہ کوئی طریقہ؟'' میں نے ملائمت سے پوچھا۔
''ہے، اس دریا سے دور رہو......جس میں مگرمچھ مرشد علی ہے۔''
میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ''مجھے نہ کسی طاقتور شخص کی پناہ چاہئے اور نہ ہی میں دریا سے دور رہوں گا اور تم بھی براہِ کرم اس کمرے تک رہنا......اس سے باہر جانے کی کوشش تمہاری صحت کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔''
''فکر نہیں کرو......کون پاگل کا بچہ اتنے ٹھاٹ چھوڑ کر جانا پسند کرے گا۔ بھاڑ میں گیا اخبار اور اس کا مالک۔ ہاں، دوپہر کے کھانے میں......''
میں نے باہر نکل کر عادل کے ساتھی سے کہا۔ ''اس کا خیال رکھو......جو چیز مانگے دے دو......لیکن پوری طرح نظر بھی رکھنا۔''
''میں سمجھ گیا جناب! لیکن یہ بہت تنگ کرتا ہے۔'' اس نے شکایت کی۔
''پھر بھی کوئی بدتمیزی مت کرنا۔ ممکن ہے ہمارا ہمدرد نکلے۔''
عادل جاگ گیا تھا اور میرے کمرے میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ ''کیسا رہا جناب! کیا یہ واقعی صحافی ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔ اس نے ندیم کا حوالہ دیا ہے۔ اسلام آباد کے کسی صحافی کا دوست ہے۔ اس کی تصدیق کرالو۔ ویسے مجھے ٹھیک لگ رہا ہے۔''

عادل نے سر ہلایا۔ ''آج ذرا مشکل ہے مرنے والے افراد کی میتیں ان کے گھر پہنچانی ہیں۔ زخمیوں کا آج آپریشن ہے۔ اسے کل دیکھیں گے۔''

''جیسا تم مناسب سمجھتے ہو......لیکن خیال رہے، اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔'' میں نے شانے اچکائے۔

''کیا وسیم کو صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''جی جناب! وہ آج کسی وقت یہاں آئیں گے۔''

میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ مجھے اس شخص سے الجھن ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس نے اب تک میرے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی اس شخص کے مزاج سے مجھے لگ رہا تھا کہ میری اس سے نہیں بنے گی۔ اس نے راجا ناصر کے معاملے کو کل تک مؤخر کر دیا تھا حالانکہ یہ کام اس وقت کیا جا سکتا تھا۔ وہ صحافی تھا اور اس کا زیادہ دیر غائب رہنا کسی مسئلے کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کسی کے علم میں ہو کہ وہ کہاں ہے۔ عادل کچھ دیر بعد معذرت کر کے چلا گیا تھا۔ میں ایک بار پھر سونے کے لئے لیٹ گیا کیونکہ چار گھنٹے کی نیند کافی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اس بار میری آنکھ کھلی تو شام کے چار بج رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر غسل کیا۔ نیم گرم پانی نے ساری کسلمندی دور کر دی تھی۔ باہر آیا تو کمرے میں وسیم کو موجود پا کر خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ میں اس کے سینے سے لگا۔ ''تم کب آئے؟''

''ابھی......آپ کیسے ہیں؟''

''ابھی تک بہتر ہوں۔''

''اور ہاتھ کا کیا حال ہے؟''

''یار، حکیم قادس کے بعد میرے ہاتھ کا علاج رک گیا ہے۔ بعض اوقات ہاتھ سُن اور بے جان ہو جاتا ہے۔''

وسیم کچھ دیر چپ رہا۔ ''مجھے افسوس ہے شہباز صاحب! لیکن حکیم قادس کا پتا نہیں چل رہا ہے۔ اس کی لاش بھی نہیں ملی تھی۔''

''ممکن ہے وہ زندہ ہو اور دشمن کی قید میں ہو۔''

''عین ممکن ہے، وہ حیرت انگیز آدمی ہے اور اسے زندہ رکھ کر اس سے بہت کام لئے جا سکتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ پر کیا گزری؟''

ایک طویل نشست میں، مَیں نے تفصیل سے وسیم کو جہلم میں غائب ہونے سے لے کر خود پر اب تک گزرنے والے واقعات سنائے۔ وسیم بغور سن رہا تھا۔ آخر میں، مَیں نے ڈیوڈ شا کے بارے میں اپنا شک ظاہر کیا۔ ''وہ کسی وجہ سے میرے پیچھے پڑا ہے......فتح خان کی لاہور میں موجودگی اس کا ثبوت ہے۔''

''ممکن ہے وہ مرشد علی کے لئے کام کر رہا ہو۔''

''نہیں، وہ ڈیوڈ شا کا ملازم ہے اور مجھے یقین ہے ابھی اس سرزمین سے اس کا انٹرسٹ ختم نہیں ہوا ہے۔''

ڈیوڈ شا ایک ہفتے پہلے پاکستان سے واپس لندن جا چکا ہے۔''

''ممکن ہے لیکن ابھی اس کا کام ختم نہیں ہوا ہے۔ اس تصویر کا حصول، مقصد نہیں تھا بلکہ صرف مقصد کا ایک حصہ تھا۔''

''شہباز، آپ اس تصویر کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔'' وسیم کے لہجے میں دلچسپی تھی۔ ''آخر اس میں ایسی کیا بات ہے؟''

''سچی بات ہے مکمل طور پر تو میں بھی نہیں جانتا...... لیکن اس تصویر کا تعلق ہمالیہ میں کہیں پائی جانے والی ایک پُراسرار سرزمین سے ہے۔''

اس بار وسیم کے لہجے میں بچگانہ اشتیاق تھا۔ ''لگتا ہے کسی خزانے کا چکر ہے؟''

میں مسکرا دیا۔ ''شاید ہو...... اور شاید نہ ہو۔''

''نہیں...... ضرور خزانے کا معاملہ ہے ورنہ ڈیوڈ شا جیسے لوگوں کو تصویر سے اور کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

وسیم اپنے انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں نے تردید کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ''اسلام آباد کے حالات کیا ہیں؟''

وہ میرا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ ''حیرت انگیز طور پر مرشد علی بالکل خاموش ہے۔ البتہ اس کے وکیل ندیم بھٹی سے بات کر کے صلح کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''صلح کی کوشش!'' میں تلخی سے ہنسا۔ ''اور یہاں اس کے کتے میرا تعاقب کرتے رہے۔''

''آپ کا اس کے ہاتھ آنا اس کی ایک بڑی کامیابی ہوگی۔'' وسیم نے سر ہلایا۔ ''لیکن فی الحال وہ زیادہ سرگرم نہیں ہے ورنہ ایسے لوگ جس کے دشمن ہو جائیں، اس پر پوری طاقت سے حملہ کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ ٹھنڈا ہی ہے۔''

''ان حالات میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہئے؟'' میں نے غور سے اسے دیکھا۔

''سچی بات ہے...... میں نہیں سمجھتا کہ مرشد علی سے کسی قسم کی مصالحانہ ڈیل مستقبل میں [illegible] کار آمد ہوگا۔ وہ جب بھی مشکل سے نکلے گا، آپ کا رخ کرے گا۔''

''یہی سوچ میری بھی ہے۔''

''آپ کو بہت زیادہ سکیورٹی میں رہنا ہوگا۔ دوسرے آپ کو نارمل طرزِ زندگی ترک کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ واحد حل یہ ہے کہ آپ ملک چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ چلے جائیں۔''

''پہلا راستہ میرے لئے ممکن نہیں ہے اور دوسرا مجھے قبول نہیں ہے۔''

''پھر کون سا راستہ باقی رہ جاتا ہے؟''

''ایک راستہ ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''وسیم!...... میں مقابلہ کروں گا...... مرشد علی سے اس کے میدان میں مقابلہ کروں گا۔''

وسیم کا منہ کھل گیا۔ ''مقابلہ؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں...... مقابلہ...... یہی واحد راستہ بچا ہے میرے لئے۔''

وسیم نے تعجب سے مجھے دیکھا۔ ''شہباز صاحب، شاید آپ ان کی طاقت کا درست اندازہ نہیں کر رہے

ہیں۔''

''مجھے اندازہ ہے۔'' میں نے سکون سے کہا۔ ''میں ہاتھی اور چیونٹی کی مثال نہیں دوں گا۔ کیونکہ مرشد علی اور میں دونوں انسان ہیں۔ جو وہ کر سکتا ہے وہ میں بھی کر سکتا ہوں۔''

وسیم نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ''آپ اس کی طرح ظالم اور گھٹیا نہیں ہو سکتے۔''

''میں نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ''چند مہینے پہلے تک میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن اب تک کئی افراد میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔''

''وہ آپ نے اپنے دفاع میں مارے تھے۔''

''کسی دن شاید میں مرشد علی یا اس کے گرگوں کو جان بوجھ کر بھی مار دوں گا۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''خیر چھوڑو...... یہ لمبی بحث ہے...... تم ایسا کرو، بلا چوہدری نامی شخص کے بارے میں معلوم کرو۔ اس کے دو آدمی تمہارے آدمیوں کی تحویل میں ہیں۔''

''جنہیں آپ نے پکڑا تھا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''خاص طور سے بلا چوہدری کے پاس فتح خان کی موجودگی کی تصدیق کرتی ہے۔''

''وسیم نے غور کیا۔ ''ٹھیک ہے میں اپنے آدمی لگا دیتا ہوں۔''

''بہتر ہو گا پہلے ان دو افراد سے تفصیلی بات کر لو...... اور ہاں، کل رات عادل کے آدمیوں نے کوٹھی کے باہر سے ایک شخص کو پکڑا جس کا دعویٰ ہے وہ صحافی ہے، اس نے ایک اخبار کا پریس کارڈ بھی دکھایا ہے۔''

''میں اسے بھی چیک کرتا ہوں۔''

میں اور وسیم باہر نکل آئے تھے۔ وسیم نے عادل کو بلا کر ہدایات دیں۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا لیکن اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے یہ احکامات ناگوار گزر رہے تھے۔ آخر میں وہ سر ہلا کر چلا گیا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ''یہ تمہارا بہنوئی مجھے تمہارے دوسرے آدمیوں سے مختلف لگتا ہے۔''

''ہاں، مزاج کا ذرا مختلف ہے لیکن بے حد ذمے دار آدمی ہے۔''

''مجھے حیرت ہے تم نے اپنی بہن کو بھی......''

وسیم نے گہری سانس لی۔ ''سونیا...... شروع سے ہمارے ساتھ ہے۔ آپ کو سن کر حیرت ہو گی، جب ہم نے کام شروع کیا تو میرے ساتھ سونیا اور شکیل تھے۔ ہم تین افراد نے اس آرگنائزیشن کی بنیاد رکھی تھی۔ آج اس میں تین سو سے زیادہ افراد ہیں۔''

میں نے ذرا محتاط انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ تمہارے بعض ساتھیوں کو ناگوار گزرتا ہو، جس طرح تم میرا ساتھ دے رہے ہو؟''

وہ چونکا اور پھر جلدی سے بولا۔ ''ایسی بات نہیں ہے جناب!''

''دیکھو وسیم! میرا تم پر قرض نہیں ہے، جو تمہیں لازماً ادا کرنا ہوا۔ اگر تم اس معاملے سے پیچھے ہٹنا چاہو تو تم مکمل طور پر آزاد ہو۔''

''پلیز شہباز صاحب! شرمندہ نہ کریں۔ میں تو اپنی ذمے داری بھی پوری نہیں کر سکا ہوں۔ راجا صاحب نے مجھے آپ کے لئے بہت بڑی رقم دی ہے۔ آپ کسی طرح سے بھی ذمے داری نہیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... سب سے پہلے اس صحافی کا معاملہ کلیئر کرو۔''

سونیا چائے لے آئی تھی۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ نازک سی کالج گرل لگتی تھی۔ شربتی آنکھیں اور اخروٹی رنگ کے بال اس کی گلابی رنگت سے میل کھاتے تھے۔ نسبتاً دبلی اور دراز قامت ہونے کے باوجود مجھے لگتا تھا وہ بہت مضبوط لڑکی ہے۔ ''شہباز بھائی! چائے......'' اس نے ٹرے لان کی میز پر رکھی۔ ''عادل کام سے نکلے ہوئے ہیں۔ اس لئے آپ...... فی الحال میری ذمے داری ہیں۔''

میں نے چائے کا سِپ لیا۔ ''اگر چائے تم نے بنائی ہے تو خوب بنائی ہے۔''

''شکریہ!'' وہ خوش ہوگئی۔ ''میں کھانا بھی اچھا بناتی ہوں۔ رات کو اپنے ہاتھ سے بنی بریانی کھلاؤں گی۔''

''آہ...... بریانی...... میں تو اب بریانی اور قورمے کا ذائقہ بھی بھولتا جا رہا ہوں۔''

''قورمہ بھی ہوگا اور گاجر کا حلوا بھی۔''

''خوش رہو!'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''اب مجھے ذرا آج کے اخبارات بھجوا دو...... اگر موجود ہیں۔''

''میں ابھی بھجواتی ہوں۔'' سونیا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد ایک آدمی ڈھیر سارے اخبارات رکھ گیا۔ اردو کے چار اور انگریزی کے دو اخبارات تھے۔ میں نے اردو کے دو اخبار نکالے جو صوبائی خبریں زیادہ دیتے تھے۔ دوسرے اخبار کے اندر ایک خبر نے میری توجہ حاصل کر لی تھی۔ میں نے شام کے بھی اخبارات منگوائے تھے۔ اس خبر نے مجھے چونکا دیا تھا۔ جنوب مشرقی پنجاب کے ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر کا بہیمانہ قتل۔ میرے اندر سرخی نے ہلچل مچا دی تھی اور جب خبر دیکھی تو ایک لمحے کو دل رک گیا تھا۔ مارے جانے والے اسٹیشن ماسٹر کا نام سیّد خادم حسین تھا۔ پولیس نے نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ قائم کر لیا تھا۔ خبر میں زہرہ کا کوئی ذکر نہیں تھا لیکن یہ بات یقینی تھی اگر قاتل اسے ساتھ نہیں لے گئے تھے تب بھی وہ پولیس کے ہاتھ لگ چکی تھی اور اسے واپس شکر گڑھ پہنچایا جا چکا ہوگا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ شاید خادم حسین معاملے کی سنگینی کو نہیں سمجھ سکا تھا، جب اس نے زہرہ کی ذمے داری قبول کی تھی تو اسے وہیں ٹکے رہنے کے بجائے پہلی فرصت میں وہاں سے چلے جانا چاہئے تھا۔ قاتل اس سے زیادہ دور نہیں تھے۔ افسوس کہ اس نے میری بات پر دھیان نہیں دیا تھا ورنہ شاید آج بھی زندہ ہوتا۔

درحقیقت مجھے خادم حسین کے مارے جانے کا بے حد افسوس تھا۔ وہ اچھا آدمی تھا۔ اگرچہ اتنی جلدی زہرہ کے چکر میں آنے سے ظاہر تھا کہ وہ حسن پرست شخص ہے، اس کے باوجود اتنی بڑی سزا کا مستحق نہیں تھا۔ نہ جانے زہرہ پر کیا بیتی تھی؟ اگر وہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی تو لازمی بات ہے، اچھے حالات میں نہیں ہوگی۔ پولیس اور راناؤں سے لے کر ان کے عام ملازم تک اس پر دانت لگائے بیٹھے تھے۔ میں نے پوری خبر دیکھی۔ اخبار کے دوسرے حصے بھی کھنگالے۔ دوسرے اخبار میں لاہور میں اچانک ہونے والی فائرنگ اور ڈکیتی کی وارداتوں کو جلی حروف میں شائع کیا گیا تھا۔ ایک رپورٹر نے مال روڈ پر فائرنگ اور ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے باہر مارے جانے

والے تینوں ڈاکوؤں کا آپس میں رشتہ جوڑا تھا۔ کیونکہ مال روڈ پر مارے جانے والے دو افراد میں سے ایک ڈاکوؤں میں سے ایک کا بھائی تھا۔ دونوں بھائیوں کا سوائے ایک بوڑھی ماں کے اور کوئی نہیں تھا اور وہ اب بے سہارا ہو چکی تھی۔

انگریزی اخبارات میں ایک مضمون اسلام آباد اور اس کے گرد و نواح میں واقع سیاسی برادریوں کے بارے میں تھا۔ ان میں مرشد علی کے خاندان کا ذکر بھی تھا۔ کچھ اشارے حالیہ واقعات کی طرف بھی تھے اور کہا گیا تھا کہ ان کی وجہ سے مرشد علی مشکلات میں ہے، اس بار اس کے حریف بڑی تیاری کے ساتھ میدان میں اترے تھے۔ خاص طور سے انہوں نے کالج کی طالبہ کے اغوا اور اس کی مرشد ہاؤس سے برآمدگی کو اس خاندان کی سیاسی ساکھ تباہ کرنے کے لئے اچھالا۔ ایک بزنس مین کا ذکر بھی تھا جس سے مرشد کے بھائی نادر کی دشمنی تھی۔ اس کے دفتر پر حملہ کر کے اسے تباہ اور دفتر کے گارڈ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ بزنس مین غائب تھا اور اس کے وکیل نے پولیس اور مرشد کے خلاف اغوا کا کیس درج کرا دیا تھا۔ کورٹ میں ابھی معاملہ چل رہا ہے۔

ابھی میں رپورٹ پڑھ رہا تھا کہ شام کا اخبار بھی آ گیا۔ حسب توقع گزشتہ رات ہونے والی وارداتوں کو ان میں ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔ خاص طور سے عادل کے ٹھکانے سے باہر ہونے والے حملے کا ذکر تھا جس میں شدید فائرنگ کے ساتھ روشنی کے عجیب و غریب جھماکے بھی تھے جو میلوں دور سے دیکھے گئے تھے۔ جب پولیس جائے وقوعہ پر پہنچی تو وہاں بے شمار گولیوں کے خول، گاڑیوں کے ٹوٹے شیشے اور جا بجا خون پڑا ہوا نظر آیا تھا لیکن کوئی زندہ یا مردہ شخص ملا اور نہ ہی کوئی گاڑی ملی۔ گویا دوسری پارٹی والے بھی اپنے زخمی اور مردے اٹھا کر لے گئے تھے۔ یہی خیال پولیس نے بھی ظاہر کیا تھا کہ جائے وقوعہ پر پائی جانے والی لاشیں اور زخمی، متحارب حریفوں نے غائب کر دیئے تھے۔ اخبارات دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ وہ کیا شے تھی جس نے روشنی کے اتنے شدید جھماکے پیدا کئے تھے۔ اتنے میں وسیم آ گیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے جو کام کہے تھے ان پر آدمی لگا دیئے ہیں۔ ناصر کو میں نے خود چیک کیا ہے، سچ مچ صحافی ہے۔''

''وہ مجھے جانتا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ کہ گزشتہ رات جب دشمن نے ہمیں روکا تھا تو عادل نے کوئی چیز ان کی طرف پھینکی تھی جس سے روشنی کے......''

''یہ روشنی کے خاص بم تھے۔ ہائی انرجی لائٹ بم کہلاتے ہیں۔ اتفاق سے کچھ بم ہمیں ملے اور یہ ہم بہت خاص مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے رات کو...... دشمن کے لئے یہ بہت غیر متوقع حربہ ہوتا ہے۔''

''اگر کوئی براہِ راست اس کی روشنی دیکھ لے تو......؟''

''نوے فی صد امکان یہی ہے کہ اس کی آنکھیں ضائع ہو جائیں گی۔''

''میرے خدا!'' میرے منہ سے نکلا۔ ''اتنی خوف ناک ایجاد ہے۔''

''روسیوں نے بنائی تھی۔ افغان جنگ کے آخری دنوں میں اسے استعمال بھی کیا گیا تھا۔ اتفاق سے ہم جس افغانی سے اسلحے کی ڈیل کرتے ہیں، اس کے پاس تھے، اسے خود بھی ان کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا، اس نے ہمیں دے دیئے۔''

''مجھے دکھاؤ۔'' میں نے فرمائش کی تو وسیم مجھے کوٹھی کے اندر لایا۔ ایک کمرے سے خفیہ راستہ تہ خانے میں جاتا تھا۔ تہ خانہ ظاہر ہے خفیہ مقاصد کے لئے تھا، وہاں ایک کمرے میں جدید ترین اسلحے کا ڈھیر تھا۔ ایک طرف ایک ریک پر سلیقے سے نارنجی رنگ کے بال پوائنٹ پین قطار میں رکھے تھے۔ وسیم نے ایک پین اٹھایا اور اس کا اوپری حصہ ذرا سا گھما کر دکھایا۔ پھر مجھے بتایا۔

''اس حصے کو دو بار کلاک وائز گھما کر پھینک دیں۔ دس سیکنڈ بعد یہ بلاسٹ ہو جائے گا اور کم سے کم بیس سے پچیس سیکنڈ اس کی روشنی برقرار رہے گی۔ اس دوران میں اس کی طرف دیکھنے والا لازماً عارضی طور پر اپنی بینائی کھودے گا۔''

ریک پر ایسے کوئی تین درجن پین رکھے تھے۔ ''ان سے صرف روشنی نکلتی ہے؟''

''صرف روشنی...... یہ پورے کا پورا پین ایسے مادے سے بنا ہے جو روشنی میں تبدیل ہو جاتا ہے نہ اس کے ٹکڑے باقی رہتے ہیں اور نہ آگ نکلتی ہے۔''

''واقعی، منفرد حربہ ہے۔'' میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ''کیا میں ایک دو لے سکتا ہوں؟''

''آپ یہاں سے جو چاہیں لے جا سکتے ہیں لیکن ان کا کیا کریں گے؟''

''وقت ضرورت کہیں کام آئیں گے۔''

''بے شک آپ لے لیں...... بلکہ اور بھی کوئی ہتھیار آپ کو درکار ہو تو بلا تکلف لے سکتے ہیں۔ آپ کو کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔''

''شکریہ دوست!'' میں نے اسلحے خانے کا جائزہ لیا اور ایک سیاہ دستے اور نیلگوں نالی والا اسمتھ اینڈ ولسن منتخب کر لیا۔ اس چھوٹے سے پستول میں بارہ گولیوں والا کلپ لگتا تھا اور اس کی مار اور درستی اپنے حجم کے بڑے پستول سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ وسیم نے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ''میرا بھی پسندیدہ ہتھیار ہے۔ چینی نقل ہے لیکن اصل سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس کے بعد مجھے روسی ساختہ ٹی ٹی پسٹل اچھا لگتا ہے۔''

''مجھے اسلحے کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے لیکن اسے پہلے بھی استعمال کر چکا ہوں۔'' میں نے پستول بیلٹ میں اڑس لیا۔ ریک سے اس کے تین اضافی کلپ بھی اٹھا لئے تھے۔ وسیم مسکرایا۔

''خیریت تو ہے شہباز صاحب! کسی مہم کا ارادہ ہے؟''

''بلا چوہدری اور فتح خان کے بارے میں کب تک معلوم ہو جائے گا؟''

''آج رات کسی وقت...... میں نے اس معاملے میں اپنے سب سے تیز آدمی استعمال کئے ہیں۔ اندر کی خبر نکال لاتے ہیں۔''

''گڈ...... اب اس صحافی کا کیا کرنا ہے؟''

''میرا خیال ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔ آج رات تک۔''

''جتنی جلدی ہو اس سے معاملے کو ختم کرو۔ اسے رہا کرنے میں تاخیر سے مسائل ہو سکتے ہیں۔ وسیم! جیسے ہی فتح خان کے بارے میں کوئی اطلاع ملے، اسے اٹھانے کی پلاننگ کرنی ہے۔''

وسیم نے سوال کیا۔ ''وجہ جناب!''

''وجہ مت پوچھو...... ویسے یہ راجا صاحب کا ہی کام ہے۔''

''راجا صاحب کا...... وہ کیسے؟''

''راجا صاحب کی تصویر بازیاب نہیں ہوئی ہے۔ تصویر ڈیوڈ شا کے پاس ہے اور فتح خان اس کا خاص گرگا ہے، اس ملک میں ڈیوڈ شا کا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ وہ پھر آئے گا۔ فتح خان سے اس کے عزائم کا پتا چل سکتا ہے۔ ممکن ہے تصویر کے بارے میں بھی معلوم ہو اور سب سے بڑھ کر اس سے حکیم قادس کے زندہ یا مردہ ہونے کے بارے میں پتا چلے گا۔''

وسیم نے گہری سانس لی۔ ''لگتا ہے شہباز صاحب آپ ان دنوں سوچتے رہے ہیں۔''

''ہاں...... میں نے کہا ناں...... میں نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب میں ان کے پیچھے رہوں گا، بھاگتے بھاگتے اور حالات کا کھلونا بنتے بنتے تھک گیا ہوں۔''

ہم اوپر آئے، میں کوارٹرز کی طرف آیا جہاں راجا ناصر قید تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بستر پر سیدھا بیٹھ گیا۔ ''اور سنائیں، ملک صاحب! کیا حال ہے؟''

''تم سناؤ۔''

''راوی چین لکھ رہا ہے۔ آج بھی مزے کیے۔''

''ممکن ہے آج رات تمہارے یہ مزے ختم ہو جائیں۔''

''صرف مزے...... یا میں بھی؟'' اس نے کمال سادگی سے پوچھا۔

''فی الحال مزے...... لیکن تم نے آئندہ ہمارے معاملات میں دخل درنا معقولات کیا تو دوسری صورت بھی پیش آ سکتی ہے۔''

''میں نے کہا تھا ناں...... بندہ صرف قلم یا زبان چلا سکتا ہے۔''

''میرا اشارہ بھی اس طرف ہے۔ انہیں قابو میں رکھنا۔'' میں نے کہا اور اٹھنے لگا۔

''ایک منٹ شہباز، میری بات سنو۔''

اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا اور واپس بیٹھ گیا۔ ''ہاں کہو۔''

''تم کن لوگوں کے ساتھ ہو؟''

میں چونکا۔ ''تم نے یہ سوال کیوں کیا...... تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''مجھ پر اعتماد کرو...... میں تمہارا ہمدرد ہوں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''صرف اتنا کہ تم جن کے ساتھ ہو، ان سے ہوشیار رہو۔''

''راجا جی...... تم اپنے لئے مشکلات مت پیدا کرو...... میں نے کہا ناں...... اپنی زبان قابو میں رکھو کیونکہ میں جن لوگوں کے ساتھ ہوں۔ ان پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں...... جتنا اپنی ذات پر۔''

''تمہاری مرضی!'' اس نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''بعد میں نہ کہنا کہ میں نے خبردار نہیں کیا تھا۔ ویسے اگر کوئی مسئلہ ہو تو بعد میں تم اخبار کے دفتر کے ذریعے مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔''

میں کوارٹر سے نکل آیا۔ کوٹھی کے اندر آیا تو سونیا نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ ''کہاں تھے آپ سب...... کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''بس بی بی......ادھر ہی تھے۔'' میں نے بے تابی سے کہا۔ ''کھانا کہاں لگا ہے؟''

سونیا مجھے کھانے والے کمرے میں لائی۔ کچھ دیر بعد عادل اور وسیم بھی آ گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں سنجیدہ تھے اور شاید کوئی کشیدگی والی بات ہوئی تھی، میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ''ایوری تھنگ از اوکے؟''

''جی!'' اس نے نظریں چرائیں۔ ''بھئی، سونیا کھانا لاؤ......بھوک لگی ہے۔''

عادل قطعی طور پر چپ تھا اور اس کے چہرے سے کشیدگی صاف جھلک رہی تھی۔ کوئی نہ کوئی بات تھی لیکن فی الحال بریانی اور قورمے کی خوشبو نے مجھے سب بھول جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ سونیا نے بریانی اور قورمہ دونوں ہی بہترین بنائے تھے، میرے مقابلے میں وسیم اور عادل بھی چکھتے رہے تھے۔ سونیا نے ان سے کہا۔ کھائیے ناں...... آپ دونوں نے کچھ لیا ہی نہیں ہے۔''

''بس...... مجھے بھوک نہیں ہے۔'' عادل نے اچانک کہا اور ٹشو سے منہ صاف کرتا ہوا اٹھ گیا۔ ''ایکسکیوز می، آپ کھانا کھائیں۔''

میں نے سونیا کے سامنے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وسیم فکرمند نظر آنے لگا تھا اور سونیا شرمندہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں سر جھکائے کھاتا رہا۔ کھانے کے بعد موسم کی مناسبت سے وسیم نے کافی کا کہا۔ اب راتیں خاصی خنک ہونے لگی تھیں۔ رات کے وقت باہر نکلو تو سردی لگتی تھی۔ وسیم اور میں نشست گاہ میں آ گئے تھے۔ میں نے موقع ملتے ہی اس سے عادل کے رویے کی وجہ دریافت کی۔ ''کچھ نہیں شہباز صاحب! عادل کسی نجی وجہ سے پریشان ہے۔''

''مجھے بچہ مت سمجھو۔ نجی پریشانی لوگ اس طرح سب کے سامنے ظاہر نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی وجہ سے کسی سے سرد رویہ رکھتے ہیں۔ کیا میری ذات وجہ تنازع ہے؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' وسیم نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''وسیم، میری طرف دیکھ کر بات کرو۔''

اس نے سر نہیں اٹھایا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''میں شرمندہ ہوں شہباز صاحب! اصل میں عادل محتاط آدمی ہے۔''

''یعنی وہ مرشد علی جیسی طاقت سے نہیں ٹکرانا چاہتا؟'' میں نے تلخی سے کہا۔

''اس کا کہنا ہے ہم ٹاسک نمٹانے والے ہیں کسی سے باقاعدہ دشمنی کا روگ نہیں پال سکتے۔''

''اگر عادل اتنا ہی محتاط شخص ہے تو بہتر ہے تم لوگ میرے معاملے سے ہاتھ اٹھا لو۔'' میرے لہجے میں غصہ شامل ہو گیا تھا۔ ''میں اپنی لڑائی خود اور خدا کے بھروسے پر لڑ سکتا ہوں۔''

''پلیز شہباز صاحب! یوں شرمندہ نہ کریں۔'' وسیم نے عاجزی سے کہا۔ ''یہ بات کہنے کی جرأت میں بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ عادل نے بھی ایسی بات نہیں کہی ہے۔''

''نہیں کہی ہے تو جلد کہہ دے......'' میں بولتے بولتے رک گیا، سونیا کافی کی ٹرے لے کر آ رہی تھی۔

''کون کیا...... کہہ دے گا؟'' اس نے ٹرے میز پر رکھی۔

میں ہنسا۔ ''یہی کہ تم سے بہتر کھانا کوئی نہیں بناتا۔''

''بے وقوف مت بنائیں۔'' وہ فخر سے ہنسی۔ ''ویسے میں شروع سے اچھا کھانا بناتی ہوں۔ وسیم بھائی سے پوچھ لیں۔''

''حالانکہ بی بی نے کفگیر چلانے سے پہلے ہاتھ پاؤں چلانے سیکھے تھے اور انہوں نے پہلی ڈش جو بنائی تھی اسے کھا کر میں دو دن باتھ روم یاترا پر رہا تھا۔'' وسیم نے بھی بناوٹی خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

''خدا خیر کرے۔'' میں نے خوف زدہ ہونے کی اداکاری کی۔ ''میں نے تو زیادہ ہی کھا لیا ہے۔''

''اوں، شہباز بھائی!'' اس نے احتجاج کیا۔ ''ابھی تو آپ میرے کھانوں کی تعریف کر رہے تھے، اب کیا مسئلہ ہو گیا؟''

''سوری بی بی!'' میں نے جلدی سے معذرت پیش کر دی۔

''شہباز بھائی، پلیز ایسے مت کہیں، آپ میرے لئے وسیم بھائی سے کم نہیں ہیں۔''

سونیا کے جانے کے بعد ہم دوبارہ عادل کے موضوع پر آئے۔ ''تمہاری آرگنائزیشن میں عادل کا کیا مقام ہے؟''

''میرے اور شکیل کے بعد اس کا نمبر ہے۔ اگر میں اور شکیل نہ رہے تو کمانڈر عادل ہوگا۔''

''میں نے محسوس کیا ہے...... تم لوگوں کے پاس وسائل کی کمی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے آرگنائزیشن بہت اچھا پرافٹ حاصل کرتی ہے۔''

وسیم نے سر ہلایا۔ ''بے شمار لوگ ہمارے مستقل کسٹمرز ہیں، ان کو درپیش مسائل ہماری ذمے داری ہوتے ہیں۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''شاید اس وجہ سے تم لوگ اتنے اونچے پیمانے پر کام کرتے ہو۔''

''سائنٹفک انداز میں۔''

''اس کے باوجود تمہارے ساتھی مرشد علی اور بلا چوہدری جیسے روایتی بدمعاشوں سے خوف زدہ ہیں۔'' میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔

''یہ بات نہیں ہے۔ مرشد علی کے پاس صرف بدمعاش ہی نہیں ہیں۔ سرکار میں اس کا اثر رسوخ بھی ہے اور اس کے لاکھوں مرید الگ ہیں۔ خاص طور سے پوٹھوہار کے علاقے میں اس کے مریدوں کی کمی نہیں ہے۔ رہا بلا چوہدری تو اس کا شمار لاہور کے نامی گرامی بدمعاشوں میں ہوتا ہے۔ بے شک وہ سلطان راہی اسٹائل کا بدمعاش ہے۔ یعنی اپنے علاقے میں اس نے لوگوں اور خاص طور سے غریبوں میں اپنی ساکھ بنا رکھی ہے۔ اہل علاقہ اس کی سرگرمیوں کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ پولیس حکام اور بعض مقامی سیاست دان اس کے سرپرست ہیں لیکن مرشد علی سے اس کے روابط کا علم نہیں ہے۔''

''تمہارے آدمی......'' میں نے کہنا چاہا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''ہاں رضا...... کیا رہا...... ٹھیک ہے......'' وہ خاموش ہو کر سنتا رہا خاصی لمبی رپورٹ تھی۔ آخر میں وسیم کسی قدر پُر جوش نظر آنے لگا۔ ''پوری طرح نگرانی کرو۔ یہ شخص نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔''

''کیا ہوا......؟ کس کے بارے میں بات ہو رہی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''فتح خان...... میرے ساتھیوں نے اسے تلاش کر لیا ہے۔ دریائے راوی کے کنارے ایک کاٹیج ہے۔ میرے ساتھیوں نے بلا چوہدری کے ڈیرے سے اس کا تعاقب کیا تھا۔''

''وسیم! یہ زبردست کام ہوا ہے۔'' مل کھڑا ہو گیا تھا۔ ''تمہارے آدمی کاٹیج کی نگرانی کر رہے ہیں ناں......؟''

''پوری طرح...... میں ابھی مزید آدمی اس طرف روانہ کرتا ہوں۔''

''آدمی نہیں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ہم خود جائیں گے۔ اس سے پہلے فتح خان ہوشیار ہو جائے، ہمیں اسے پکڑنا ہے۔''

''اتنی جلدی مناسب ہو گی؟'' وسیم نے ہچکچا کر پوچھا۔

''اس سے زیادہ مناسب بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''تم فتح خان کو نہیں جانتے...... اسے ذرا بھی شبہ ہو گیا تو وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو جائے گا بلکہ تمہیں اس کا تجربہ ہے۔ یاد ہے، جی ٹی روڈ پر وہ کیسے غائب ہو گیا تھا۔''

وسیم نے سر ہلایا۔ ''اوکے...... میں اپنی تیاری کرتا ہوں...... آپ......''

''میں تیار ہوں۔'' میں نے پسٹل تھپتھپایا۔ دس منٹ بعد دو گاڑیاں تیار تھیں۔ یہ سیاہ شیشوں والی کاریں تھیں۔ طاقتور انجن اور بڑے ٹائروں کی وجہ سے ہر سطح پر تیز رفتاری سے دوڑ سکتی تھیں۔ کُل چھ افراد تھے اور سب کے پاس خودکار ہتھیار تھے۔ عادل نہیں تھا۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا۔ وسیم نے آہستہ سے کہا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

کاریں تیز رفتاری سے دریائے راوی کی طرف روانہ ہو گئی تھیں۔ میں پچھلی نشست پر وسیم کے ساتھ تھا۔ آگے ڈرائیور تھا۔ وسیم نے اسلحہ چیک کیا۔ میں نے پوچھا۔ ''روشنی والے بم ہیں؟''

''نہیں، ان کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں نے اسے مختصراً فتح خان کے بارے میں بتایا۔ وہ حیران ہوا۔ ''یہ تو خبیث شے ہے۔''

''خبیث سے بھی زیادہ۔ یہ شخص سرتاپا مجرم ہے۔ اس کا ذہن ہمہ وقت مجرمانہ منصوبوں میں لگا رہتا ہے۔ انسان کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اپنی محبوبہ کو اس نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا کیونکہ اس نے فتح خان کو رہا کرانے کے لئے نگران کو اپنے جسم کی رشوت دی تھی اور فتح خان نے رہا ہوتے ہی اس کی گردن مروڑ دی تھی۔''

''میں سمجھ گیا اس شخص سے کسی بھی حرکت کی توقع کی جا سکتی ہے۔''

تقریباً پون گھنٹے بعد ہم دریائے روای کے کنارے بنے کاٹیج سے ذرا فاصلے پر تھے۔ وسیم نے ریڈیو پر نگرانی کرنے والوں سے رابطہ کیا۔ ''کیا پوزیشن ہے؟''

''وہ اندر ہے سر! اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔'' ریڈیو سے آواز آئی۔

''گڈ...... پوری طرح ہوشیار رہو۔'' وسیم نے کہا اور اپنے آدمیوں کو چاروں طرف سے کاٹیج گھیرنے کا حکم دیا۔

کاٹیج ہموار زمین پر تھا اور دوسرا کاٹیج کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا چاروں طرف ایسی کوئی آڑ نہیں تھی جس کے پیچھے چھپ کر کاٹیج کا محاصرہ کیا جاتا۔ میں نے وسیم کی توجہ اس طرف دلائی۔ ''اگر فتح خان ہوشیار ہو گیا اور اس نے اندر سے فائرنگ شروع کر دی تو تمہارے پاس کوئی آڑ نہیں ہے۔''

''پھر کیا کریں؟''

''اپنے آدمیوں سے کہو اپنی گاڑی لائیں۔ کاٹیج کے دائیں بائیں اور عقب میں گاڑیوں کے پیچھے مورچے بنالیں۔''

''اور سامنے کی طرف؟''

''سامنے فتح خان کی گاڑی ہے ناں......؟'' میں بولا۔

''لیکن وہ کاٹیج کے بالکل سامنے کھڑی ہے۔''

''کوئی بات نہیں...... اور یہ بتاؤ گیس کے بم ہیں۔''

''میرا خیال ہے، ڈکی میں دو پڑے ہیں۔''

''بس...... کام بن گیا۔ فتح خان کو بنا وارننگ کے گیس کے بم مار کر نکالا جا سکتا ہے ورنہ وہ اندر مورچا بند ہو گیا تو ہمیں پسپا ہونا پڑے گا۔ وہ اپنے ساتھی بھی بلوا سکتا ہے اور پولیس کو بھی کال کر سکتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اسے موقع نہیں دینا ہے۔'' وسیم نے اپنے ساتھیوں کو نئی حکمت عملی سمجھائی اور وہ گاڑیاں لے کر کاٹیج کو گھیرنے لگے لیکن فتح خان کے کاٹیج کے پاس کھڑی گاڑی اتنی نزدیک تھی کہ اس کے پیچھے مورچا بنانا مجھے نامناسب لگا تھا اس لئے تینوں گاڑیاں کاٹیج کے گرد اس طرح پھیلا دیں کہ ان سے چاروں طرف نظر رکھی جا سکے۔ گیس کے بم پھینکنے کا فریضہ عقبی طرف موجود افراد کا تھا۔ وسیم کے اشارے پر وہ بم اندر پھینکتے۔ میں سامنے والے حصے میں تھا، میرے ساتھ دو افراد تھے۔ وسیم نے خود عقبی حصہ سنبھالا تھا۔ اس نے مجھے بھی ایک چھوٹا ریڈیو سیٹ دے دیا تھا۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد اس نے گیس بم اندر پھینکنے کا حکم دیا تھا۔

دو آدمی احتیاط اور خاموشی سے آگے بڑھے۔ کاٹیج مختصر سا تھا اور اس میں چاروں طرف کھڑکیاں تھیں۔ لاہور کے امرا نے راوی کے کنارے اس قسم کے کاٹیج بنوا رکھے ہیں جہاں گرمیوں میں وہ تفریح کرنے اور بعض عیاشی کرنے آتے ہیں۔ وسیم کے آدمیوں نے بیک وقت دو مختلف کھڑکیوں کے شیشے توڑ کر گیس بم اندر اچھال دیئے تھے۔ پھر وہ واپس سے بھاگے اور گاڑیوں کے عقب میں چلے گئے۔ ہم سب مستعد تھے۔ میں نے اندر سے کسی عورت کے چلانے کی آواز سنی پھر کوئی مرد دھاڑا تھا۔ میں آواز سے شناخت نہیں کر سکا۔ ویسے بھی میں کاٹیج سے کوئی تیس میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اگر رات کا سکوت نہ ہوتا تو اتنی واضح آوازیں بھی نہ آتیں۔ اچانک کاٹیج کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک بدحواس اور دبلا سا شخص باہر آیا۔ کاٹیج کے سامنے لگے تیز روشنی کے بلب میں وہ واضح نظر آ رہا تھا۔ وہ فتح خان نہیں تھا۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور ایک

طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی بدقسمتی کہ اس کا رخ عقب میں کھڑی ہماری ایک کار کی جانب تھا جیسے ہی وہ کار کے نزدیک سے گزرنے لگا وسیم کے ایک ساتھی نے جھپٹ کر اسے کار کے عقب میں گھسیٹ لیا۔ وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کی خاموشی سے زمین پر لیٹ گیا۔

چند منٹ بعد کاٹیج کا دروازہ کھلا اور ایک ناکافی لباس والی لڑکی لڑکھڑاتی ہوئی باہر آ کر گری جیسے اسے کسی نے اندر سے دھکا دیا ہو۔ ظاہر ہے اندر فتح خان تھا اور وہی ان دونوں کو باہر دھکیل رہا تھا۔ غالباً وہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ باہر آنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟ لڑکی کھانس کھانس کر بے حال ہو رہی تھی۔ اس کے جسم پر ایک چھوٹی سی شرٹ تھی اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر فتح خان باہر نہیں آیا تھا میں حیران تھا کہ اس پر گیس نے اثر نہیں کیا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''فتح خان باہر آ جاؤ۔ ورنہ اندر دم گھٹ کے مر جاؤ گے۔''

اندر سے فتح خان کا قہقہہ سنائی دیا تھا۔ ''میرے پاس گیس ماسک ہے۔''

''فتح خان، تمہارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔ اس بار اندر گیس بم نہیں، فاسفورس بم پھینکا جائے گا۔ اگر جل کر مرنا نہیں چاہتے تو باہر آ جاؤ۔''

''تم بکواس کرتے ہو۔'' اس بار اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''تمہارے پاس ایک منٹ اور پینتالیس سیکنڈ رہ گئے ہیں۔'' میں نے خبردار کیا۔

''بھونکتے رہو شہباز ملک!''

''اوہ، تم مجھے پہچان گئے...... بہرحال اب ڈیڑھ منٹ باقی ہے اور فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے، کاٹیج چاروں طرف سے گھیرے میں ہے۔''

''میں باہر نہیں آؤں گا۔''

''ایک منٹ رہ گیا ہے فتح خان! کیوں بلاوجہ ایک گورے کے پیچھے مر رہے ہو...... میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا ورنہ گیس بم کی جگہ دستی بم پھینکنا کون سا مشکل تھا۔'' میں نے گھڑی دیکھی۔ ''اب تمہارے پاس تیس سیکنڈ ہیں۔ فتح خان، اسے مذاق میں مت لو، فاسفورس بم بہت تیزی سے آگ لگاتے ہیں۔ ایک بار بم پھینک دیئے تو تمہارے پاس بچنے کا امکان نہیں رہے گا۔''

اس بار فتح خان کی ہمت جواب دے گئی، اس نے یقین کر لیا تھا کہ جو لوگ گیس بم پھینک سکتے ہیں، ان کے پاس فاسفورس بم بھی ہوں گے۔ ''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔''

فتح خان دروازے پر نمودار ہوا، اس کے چہرے پر گیس ماسک تھا۔ باہر آتے ہی اس نے گیس ماسک اتار دیا تھا۔ اس کے ہاتھ خالی نظر آ رہے تھے۔ ''فتح خان، ہاتھ بلند کر کے آگے آؤ۔''

فتح خان آگے بڑھا۔ جیسے ہی وہ اپنی گاڑی کے پاس پہنچا، اچانک زمین پر گر گیا اور تیزی سے گاڑی کے اندر داخل ہو گیا، میں نے چلا کر کہا۔ ''وہ بھاگ رہا ہے، گاڑی میں گھس گیا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے فتح خان کی گاڑی کے دونوں ٹائروں کو رائفل سے نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ سنگل شاٹ سے میں نے جیپ کے ٹائروں کا نشانہ لیا۔ نتیجتاً دونوں ٹائر برسٹ ہو گئے، فتح خان جیپ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری دونوں گاڑیوں سے بھی وسیم کے آدمی آ گئے تھے اور انہوں نے جیپ کے ہاتھ

دو ٹائر بھی برسٹ کر دیئے تھے۔ ایک منٹ کے اندر فتح خان کو نہتا کر کے زمین پر سینے کے بل لٹایا جا چکا تھا۔ وسیم کے ایک ساتھی نے اس کے بازو میں ایک انجکشن لگایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ مزید ایک منٹ بعد ہم اسے کار میں ڈال کر وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ فتح خان میرے اور وسیم کے درمیان بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے جسم سے شراب اور پسینے کی ملی جلی بو آ رہی تھی۔ وسیم نے ناگواری سے کہا۔ ''کم بخت کھل کر عیاشی کر رہا تھا۔''

''میں نے کہا ناں...... یہ صرف اپنا مفاد دیکھنے والا شخص ہے، کتنی بے دردی سے اس شخص اور لڑکی کو باہر دھکیل دیا تھا۔ ان کا کیا کیا؟''

''میرے آدمیوں نے انہیں کار میں کے ساتھ ڈال دیا ہے۔'' وسیم نے کہا۔ ''ہوش میں آ کر جہاں سینگ سمائیں، چلے جائیں۔''

''اس نے کسی نہ کسی کو اطلاع کر دی ہو گی۔'' میں نے فکرمندی سے کہا۔ ''اپنے آدمیوں سے کہو واپس جانے کے لئے معمول سے ہٹ کر کوئی راستہ تلاش کریں۔''

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔'' وسیم نے پُرسوچ انداز میں کہا اور ریڈیو پر اپنے آدمیوں کو ہدایت دینے لگا۔

مجھے لاہور آنے کا اتفاق کم ہوا تھا اور میں نے اس کے زیادہ علاقے نہیں دیکھے تھے۔ خاص طور سے راوی کا علاقہ میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ اس لئے میں نہیں بتا سکتا کہ انہوں نے واپسی کے لئے کون سا راستہ اختیار کیا تھا لیکن یہ خاصا طویل راستہ تھا جو ناہموار بھی تھا۔ ہم پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس پہنچے تھے۔ فتح خان کو نیچے تہ خانے میں لے جایا گیا تھا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ''احتیاطاً اس کا مکمل معائنہ کراؤ اور اس کے جسم سے ہر شے الگ کر کے تلف کر دو...... ممکن ہے اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جو اس کی نشان دہی کر دے۔''

''اتفاق سے میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی۔'' وسیم مسکرایا۔ ''میں نے پہلے ہی اپنے آدمیوں سے کہہ دیا ہے، وہ اسے آلات سے بھی چیک کر لیں گے۔''

رات کے تین بج رہے تھے اور میں تھکن کے ساتھ خوشی بھی محسوس کر رہا تھا۔ فتح خان کا ہاتھ آ جانا بڑی کامیابی تھی۔ مجھے یقین تھا وہ بہت سارے معموں کی گتھیاں سلجھا دے گا تاہم یہ بھی حقیقت تھی اس سے کچھ اگلوانا آسان نہیں ہو گا۔ میں اپنے کمرے کی طرف آیا۔ فتح خان صبح سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔ مجھے راجا ناصر کا خیال آیا لیکن پھر میں نے سوچا اب صبح ہی بات کروں گا۔ میں لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ گزشتہ کچھ عرصے کی مستقل بھاگ دوڑ نے میری صحت پر اثر ڈالا تھا۔ اب میں پہلے جیسا اسٹیمنا اور قوت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ذرا سی بھاگ دوڑ مجھے تھکا دیتی تھی۔ صبح میں دیر تک سوتا رہا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے۔ میں منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا بستر پر چند جوڑے تہ کئے رکھے تھے۔ یہ یقیناً سونیا لائی تھی۔ میں نے شلوار کرتہ منتخب کیا تھا۔ ریڈی میڈ اور تقریباً میرے سائز کا تھا۔ ساتھ ہی نئی چپل تھی، میں باہر آیا۔ ڈائننگ روم خالی تھا میں نے آواز دی۔ ''ارے کوئی ہے جو ایک غریب لامکان شخص کو ناشتا کرائے۔''

سونیا مسکراتی ہوئی کچن سے نکلی تھی۔ ''شہباز بھائی، بیٹھیں...... میں ناشتا لاتی ہوں۔''

''ان نوازشوں کا شکریہ!'' میں نے لباس کی طرف اشارہ کیا۔

''شرمندہ نہ کریں۔'' وہ بولی اور کچن میں چلی گئی۔ اسی لمحے عادل، سونیا کو آواز دیتا ڈائننگ روم میں آیا،

مجھے دیکھ کر ٹھٹکا اور سردمہری سے بولا۔

''آپ...... کیسے ہیں؟''

''فائن...... تم سناؤ، فتح خان کا کیا حال ہے؟''

''ابھی تک اس نے زبان نہیں کھولی ہے۔ ویسے آپ نے اسے پکڑ کر غلطی کی ہے۔ اس طرح یہ جنگ مزید پھیل جائے گی۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''راجا ناصر کہاں ہے؟''

''اسے چھوڑ دیا گیا ہے اور فرق کیوں نہیں پڑتا ہے۔ ہمارے لئے مسائل بڑھیں گے۔''

اس کے لہجے پر مجھے غصہ آ گیا تھا۔ ''مسٹر عادل! تمہیں غالباً اس بات کی ادائیگی کی گئی ہے، یہ تمہاری ذمےداری ہے۔''

عادل نے غور سے مجھے دیکھا اور نرم پڑ گیا۔ ''سوری، میرا یہ مطلب نہیں تھا...... لیکن ان لوگوں سے الجھنا!''

''الجھنا پڑے گا۔ پہلے والے ٹھکانے سے نکلنے کے بعد تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ تمہارے دو آدمی مارے گئے اور اب بھی وہ تمہاری تلاش میں ہوں گے۔''

عادل کھڑا ہونٹ کاٹتا رہا تھا پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کا رویہ مخاصمانہ تھا۔ مگر یہ میرا دردسر نہیں تھا۔ وسیم خود اس سے نمٹ لیتا۔ سونیا ناشتا لے کر آئی تو کسی قدر سنجیدہ تھی۔ میں ناشتے کے دوران میں اس سے ہنسی مذاق کرتا رہا تھا تب کہیں جا کر اس کا موڈ بحال ہو۔ ناشتے کے بعد وہ کافی لے آئی تھی۔ اس دوران میں وہ مجھ سے میرے بارے میں سوال کرتی رہی۔ میں اسے اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں بتاتا رہا۔ پھر حالیہ واقعات اختصار سے سنائے۔ وہ ٹورنگ ایجنسی کا سن کر پُرجوش ہو گئی تھی۔ ''ہائے...... کاش آپ اس جھگڑے میں نہ پڑتے...... میں بھی ناردرن ایریا دیکھنا چاہتی ہوں، مجھے...... پہاڑ اچھے لگتے ہیں۔''

''میں ذرا اس چکر سے نکل جاؤں...... پھر میری طرف سے ایک ٹور تمہارے لئے گفٹ ہوگا۔''

''شہباز بھائی!'' اس بار وہ ذرا جھجک کر بولی۔ ''آپ کی شادی ہو چکی ہے؟''

''نہیں...... اور نہ ہی فی الحال امکان ہے۔''

''اور کوئی لڑکی جسے...... آپ...... میرا مطلب ہے......؟''

میں ہنسا۔ ''نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔''

لیکن یہ کہتے ہوئے میرے تصور میں دو سیاہ آنکھیں آ گئی تھیں۔ جو مجھ سے پوچھ رہی تھیں کیا واقعی کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے ان آنکھوں سے نظریں چرا لیں...... فی الحال میرے پاس ان آنکھوں کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ سونیا برتن سمیٹ رہی تھی، میں نے وسیم کے بارے میں پوچھا۔ ''وسیم کہاں ہے؟''

''وہ صبح سے تہ خانے میں ہیں۔''

''میں بھی تہ خانے کی طرف جا رہا ہوں۔'' میں نے کافی کا دوسرا مگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

فتح خان ایک کرسی پر اس طرح بندھا بیٹھا تھا کہ اس کے جسم پر صرف انڈرویئر تھا۔ پورے جسم پر جا بجا

چھوٹے چھوٹے زخم تھے۔ وسیم کا ایک آدمی ان پر رہ رہ کر نمک مرچ والا پانی چھڑک رہا تھا۔ خود وسیم ذرا دور دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ پانی پڑتا تو کراہ روکنے کے لئے فتح خان ہونٹ بھینچ لیا کرتا تھا۔ البتہ اس کا جسم شدتِ کرب سے بل کھا کر رہ جاتا تھا۔

''کیا رہا؟'' میں نے وسیم سے پوچھا۔

''ابھی پہلے اسٹیج پر ہے۔'' وسیم بولا۔

فتح خان کرب زدہ آواز میں ہنسا۔ ''آخری اسٹیج بھی کر کے دیکھ لو، ہمارا زبان نہیں کھلے گا۔''

میں نے پانی چھڑکنے والے کو اشارے سے روک دیا۔ ''اس کے زخم صاف کرو۔''

وسیم نے میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلایا تو اس کے آدمی نے فتح خان کے زخم صاف کرنے کے بعد ان پر ایک سفوف سا چھڑکا یہ تکلیف ختم کرنے والا سفوف تھا۔ اس سے فتح خان کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ وسیم کا آدمی اپنا کام کر کے باہر نکل گیا۔ میں ایک کرسی کھینچ کر فتح خان کے نزدیک بیٹھ گیا۔ ''فتح خان...... میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔''

''میری ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''جب مجھے موقع ملا، میں تیرے کو قتل کر دے گا۔''

''مجھے خوشی ہے تم نے صاف گوئی سے کام لیا...... اور امید ہے...... تم میرے سوالوں کے جوابات بھی اسی صاف گوئی سے دو گے۔''

''پوچھو...... اگر دینا ہوگا تو ہم دے گا۔''

میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ ''فتح خان، ڈیوڈ شا میرے پیچھے کیوں ہے۔ اس بات کا انکار مت کرنا، میں جانتا ہوں، تم مرشد علی کے نہیں ڈیوڈ شا کے نمائندے ہو۔''

فتح خان سوچتا رہا۔ خاصی دیر بعد اس نے کہا۔ ''درست ہے...... ڈیوڈ شا...... تمہیں اپنے قبضے میں دیکھنا چاہتا ہے...... لیکن کیوں، میں اس سے اتنا ہی بے خبر ہے جتنا کہ تم......''

''میں یہ بات نہیں مان سکتا، تم مکمل طور پر بے خبر نہیں ہو سکتے...... تم کچھ نہ کچھ جانتے ہو۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ خیال ہے تمہارا۔'' وہ مسکرایا۔

''صیم مرقدس کہاں ہے؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''میں نہیں جانتا۔''

میرا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ ''یعنی وہ زندہ ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو فتح خان ایک لمحے کے لئے بوکھلا گیا۔

''تم جو چاہے سمجھو۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔''

''اسلام آباد سے جب ہم جی ٹی روڈ سے روانہ ہوئے تو راستے میں ہم نے تعاقب کا پورا خیال رکھا تھا پھر تم ہمارا تعاقب کیسے کرتے رہے؟''

''یہ ڈیوڈ صیب کا طریقہ تھا...... تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔''

میں طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''شاید تم موبائل فون کی مدد سے تلاش کرنے والی مشین کی بات کر رہے ہو؟
یہاں بھی اس کی مدد سے میرا سراغ لگایا تھا۔''

''تم جانتا ہے؟'' فتح خان ایک بار پھر بوکھلا گیا تھا۔

''لیکن پہلی بار مجھے کیسے تلاش کیا تھا؟''

''تمہاری تصویریں لاہور کے سارے بدمعاشوں میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ اس طرح تمہارا پہلا سراغ لگا تھا۔''

''یہ جواب درست ہے لیکن میرے اس سے پہلے کئے گئے سوال کا ابھی تک جواب نہیں ملا۔ تم نے ہائی وے پر ہمارا تعاقب کیسے کیا تھا؟''

''بہت آسانی سے۔ تمہاری ایک گاڑی میں ایک چھوٹا سا آلہ لگا دیا تھا جو ہمیں بتاتا تھا، اب تم کدھر ہے۔''

''مجھے بے ہوش کر کے راناؤں کے حوالے کیوں کیا گیا تھا؟''

''مجھے نہیں پتا۔ ڈیوڈ صیب تم کو کہیں اور بھیجنا چاہتا تھا لیکن خود پاکستان آ کر...... تب تک کے لئے تمہیں ادھر رکھوایا تھا۔ شہر میں خطرہ تھا تمہارا ساتھی لوگ تمہیں تلاش کر لیتا۔''

''ڈیوڈ شا کب تک پاکستان آئے گا؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''چلو میں نے مان لیا...... لیکن میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ تمہیں علم ہی نہیں ہے کہ ڈیوڈ شا مجھے کیوں اغوا کرانا چاہتا ہے، آخر اس کا اب مجھ سے کیا مفاد ہے؟''

''میں نے کہا ناں ہم نہیں جانتا۔''

میں نے انکار سنا ہی نہیں۔ ''ڈیوڈ شا اس وجہ سے مجھے اب تک مرشد علی سے تحفظ دینے پر مجبور ہے ورنہ مجھے رانا کے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔''

''ہم نہیں جانتا۔'' اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب میرے ساتھ کیا کرو گے؟''

میں مسکرایا۔ ''فتح خان، تمہارے خیال میں تمہارے ساتھ کیسا سلوک مناسب ہوگا؟''

''ہم نے کبھی ایسا سوچا نہیں۔'' اس نے کہا۔

''تو اب سوچو...... جیسا تم چاہو گے، ویسا ہی سلوک ہوگا۔''

فتح خان نے بے یقینی سے کہا۔ ''تم سچ کہتے ہو؟''

''ہاں...... فی الحال تمہیں کھانا اور میڈیکل ایڈ دی جائے گی لیکن فتح خان، جو بھی فیصلہ کرنا خوب سوچ سمجھ کر کرنا کیونکہ تمہیں اس کی قیمت دینا ہوگی۔''

میں نے محسوس کیا کہ وسیم میری اس بات سے کچھ مضطرب نظر آنے لگا تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں، جب ہم تہ خانے سے باہر آئے تو اس نے بے چینی سے کہا۔ ''شہباز صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے تھے، اگر اس نے کہا کہ اسے چھوڑ دیا جائے تو ہم اسے چھوڑ دیں گے؟''

''ہاں، چھوڑ دیں گے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔
وسیم اچھل پڑا تھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں جناب! فتح خان، راجا صاحب کا مجرم ہے۔ ہم اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟''
میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''راجا صاحب کی فکر مت کرو، انہیں میں جواب دوں گا۔ فی الحال راجا صاحب کو فتح خان کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔''
وسیم چپ ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہے۔ میں نے گہری سانس لی۔
''وسیم! فتح خان بہت کچھ چھپا رہا ہے اور ہمیں اس سے معلومات حاصل کرنے کے لئے اسے چھوڑنا بھی پڑا تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہوگا کیونکہ ڈیوڈ شا اور اس کے عزائم فتح خان سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ فتح خان ایک مجرم ہے جسے کسی وقت بھی سزا دی جا سکتی ہے۔''
وسیم مطمئن نظر آنے لگا۔ ''میں سمجھ گیا تھا۔''
میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''وسیم، تم راجا صاحب کی فکر مت کرو۔ ان کو میں سمجھا لوں گا۔''
''جیسی آپ کی مرضی۔''
''دوسرے اگر فتح خان کو چھوڑا گیا تو ہم اس کا تعاقب کریں گے۔ اسے ایسے ہی نہیں چھوڑ دیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں دشمن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلوم ہونا چاہئے۔''
''آپ درست کہہ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے میں نے پہلے جاسوسی کے شعبے پر توجہ نہیں دی تھی۔''
''اب دو...... اس مقصد کے لئے آلات حاصل کرو۔ آلات نے جاسوسی کے کھیل کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ دیکھو، فتح خان ایک معمولی سے سگنل دینے والے آلے کی مدد سے ہمارا تعاقب کرتا رہا تھا۔ اب تو موبائل فون کی ٹریکنگ بھی ہو جاتی ہے۔''
''ہاں، میں نے ایک مشین منگوالی ہے۔ جاپانیوں نے بنائی ہے۔ یہ مشین ایک بار کسی موبائل فون کی فریکوئنسی پکڑ لے تو اس پر آنے والی یا اس موبائل سے کی جانے والی تمام کالز سنی جا سکتی ہیں۔''
''یہ زبردست چیز ہے۔''
''شاید کل تک مجھے مل جائے۔ میں نے فی الحال دو مشینیں منگوالی ہیں، اگر انہوں نے درست کام کیا تو پھر مزید مشینیں منگواؤں گا۔''
''فی الحال تم لوگ بھی موبائل فون کا استعمال بند کر دو۔''
''ہم نے تمام نئے کنکشن حاصل کر لئے ہیں، تمام پرانے کنکشن ترک کر دیئے ہیں۔''
''گڈ!'' میں نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''فتح خان کو باس اور ناشتا دلوا دو مگر بے حد احتیاط سے...... خطرناک آدمی ہے چالوں کا ماہر ہے۔ خالی ہاتھ سے بھی پانسا پلٹ دیتا ہے۔''
میرے سر میں ہلکا سا درد ہو رہا تھا اور طبیعت بھی گری گری سی لگ رہی تھی۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ پھر میں نے سونیا سے چائے یا کافی کا کہنے کا سوچا اور آخر میں اس سے کہنے کے بجائے خود بنا لینا بہتر سمجھا، میں اٹھ کر کچن میں آیا، ڈسپرین کمرے میں سے مل گئی تھی۔ کافی بنا کر میں نے دو

ڈسپرین لیں اور کمرے میں جانے کے بجائے تہ خانے کا رخ کیا۔ دروازے کے قریب مجھے عادل اندر سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے رکا پھر تیزی سے میرے پاس سے گزرنے لگا۔ فتح خان مکمل لباس میں تھا۔ اسے آزاد کر دیا گیا تھا لیکن اس طرح کہ اس کا ایک پاؤں فولادی زنجیر سے منسلک حلقے میں تھا اور یہ زنجیر دیوار میں پیوست تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

''اتنا اچھا سلوک کرنے کے لئے شکریہ!'' وہ بولا۔ ''تم شریف دشمن ہے۔''

''اس کے باوجود موقع ملنے پر مجھے ضرور قتل کرو گے؟'' میں ہنسا۔

''وہ میرا قسم کا معاملہ ہے۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''فتح خان...... اس بات کو برسوں گزر چکے ہیں۔ کیا تمہیں اب بھی یقین ہے کہ شینا نے مجھ پر جو الزامات لگائے تھے، وہ درست ہیں؟''

''اس نے جھوٹ بولا تھا۔'' فتح خان سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''پر اسے تمہاری وجہ سے مارا...... اس کا قاتل تم ہے۔''

''اچھی منطق ہے۔ جب اس نے جھوٹ بولا تو تم نے مان لیا۔ اب اس کا جھوٹ آشکار ہو چکا ہے۔ تب میرے لاگو کیوں ہو؟''

''کیونکہ وہ اور میں تمہاری وجہ سے پکڑے گئے تھے۔''

''اچھی وجہ ہے...... خیر اسے چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا جواب کیا ہے؟''

''میں...... میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ اس کی ایک قیمت ہوگی، وہ ادا کرو اور یہاں سے جاؤ۔''

''کیا قیمت ہوگی؟''

''مجھے...... ڈیوڈ شا اور اس کے عزائم کے بارے میں بتاؤ اور یہاں سے جاؤ۔''

''میں بتا چکا ہوں...... میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ٹھیک ہے...... میں نے قیمت بتا دی...... اب تم دے سکتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ یہیں رہو اور اب یہ تم سے اپنے طریقے سے پوچھیں گے۔''

''تم مجھے جانتے ہو، میں مر جاؤں گا۔''

''یہی تو مسئلہ ہے فتح خان! آج کل تشدد نے سائنس کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ایسے ایسے طریقے اختیار کر لئے ہیں کہ پتھر بھی بول ہی پڑتا ہے۔ مرنے بھلا کون دیتا ہے؟''

''میں پتھر کا ہی بنا ہے...... ٹوٹ سکتا ہوں...... لیکن جھک نہیں سکتا۔''

میں مسکرایا۔ ''فتح خان، تم بہت جلد جھکو گے اور وہ سب بتاؤ گے جو میں چاہتا ہوں۔''

میں اوپر آیا، وسیم لان میں جسمانی مشقیں کر رہا تھا۔ شروع میں، مَیں نے بھی ایسی ایکسرسائزز کی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یار، ہیروئن کے انجکشن مل سکتے ہیں؟''

''وہ چونکا۔ ''ہیروئن...... خدا خیر کرے؟''

''احمقانہ باتیں مت سوچو۔ میں فتح خان کے لئے کہہ رہا ہوں۔''

''اوہ، تو آپ اس پر یہ حربہ استعمال کریں گے؟''

''مجبوری ہے، وہ تشدد کے سامنے جھکنے والا شخص نہیں ہے۔''

''مل جائیں گے لیکن مجھے امید نہیں ہے، وہ کچھ جانتا ہوگا۔''

''تم اسے نہیں جانتے...... یہ وہ شخص ہے، جس نے راجا صاحب کے محل میں اس خفیہ سرنگ کا پتا چلا لیا تھا۔ جس سے صرف راجا اور اس کا سیکرٹری واقف تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ اس نے ڈیوڈ شا کے لئے کام کرتے ہوئے اس کے عزائم کے بارے میں کھوج نہ لگایا ہو۔''

''آپ کا خیال ہے وہ اس طرح بتا دے گا؟''

''امکان ہے...... ہیروئن سب سے پہلے آدمی کی قوتِ ارادی ہی تباہ کرتی ہے۔ اس کے عادی لوگ زندہ لاشوں میں بدل جاتے ہیں۔ بڑے بڑے مضبوط آدمی اس کے عادی ہو جانے کے بعد کیچوے کی طرح حقیر ہو جاتے ہیں۔''

''جیسا آپ کہتے ہیں...... ہم ویسا ہی کریں گے۔''

ڈسپرین لینے سے میری طبیعت خاصی سنبھل گئی تھی۔ میں نے وسیم اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ ورزش میں حصہ لیا۔ پھر کوٹھی کے عقبی حصے میں موجود سوئمنگ پول میں تیراکی کی۔ باہر آیا تو لنچ تیار تھا۔ کھانا کھا کر میں لمبی تان کر سو گیا۔ اس کے بعد آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی۔ میں نے تہ خانے کا رخ کیا تھا۔ وہاں فتح خان دیوار کے پاس مدہوش پڑا تھا۔ میں نے نگرانی کرنے والے سے پوچھا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟''

''جناب! اسے انجکشن دیا ہے۔'' نگران نے بتایا۔

یعنی وسیم نے میرے کہنے پر عمل شروع کر دیا تھا۔ میں مطمئن ہو کر باہر آیا۔ وسیم اپنے کمرے میں تھا۔ دستک کے جواب میں اس نے کہا۔ ''یس، کم ان۔''

وہ بستر پر بیٹھا ایک لیپ ٹاپ لیے بیٹھا تھا۔ اس نے فون کی تار نوٹ بک میں لگا رکھی تھی اور شاید انٹرنیٹ استعمال کر رہا تھا۔ ''سوری...... شاید میں مخل ہوا ہوں۔''

''ارے نہیں...... شہباز صاحب، آپ سے کیا پردہ...... میں ذرا ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا، اب میں نے فیصلہ کیا ہے، احکامات انٹرنیٹ سے جاری کروں گا۔''

''لیکن کمپیوٹر ہر جگہ تو دستیاب نہیں ہوتا۔''

وہ مسکرایا۔ ''موبائل تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ میرے تمام ساتھیوں کے پاس جدید ترین موبائل فون ہیں۔ جن سے انٹرنیٹ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وہ میری بھیجی ہوئی میلز اپنے موبائل پر چیک کر لیتے ہیں۔ اس میں اتنا زیادہ خطرہ بھی نہیں ہے۔''

''گڈ...... فتح خان کو پہلی ڈوز دے دی ہے۔ میں ابھی اسے دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

''احتیاطاً ابھی ہلکی مقدار دی ہے کیونکہ وہ عادی نہیں ہے۔ میں نے ایک ڈاکٹر سے معلوم کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ اگر روزانہ آدمی کو اس کا انجکشن دیا جائے تو ساتویں آٹھویں دن وہ ہیروئن کے لئے اپنی ماں کو

فروخت کرنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔"

"ممکن ہے فتح خان زیادہ وقت لے...... لیکن ہمارے پاس اس سے زیادہ وقت ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔"جب تک کوئی ایمرجنسی نہ آ جائے۔"

"وسیم! مجھے بھی انٹرنیٹ استعمال کرنا ہے۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ابھی میرا ذرا سا کام ہے اس کے بعد آپ یوز کر لیجئے گا۔"

کچھ دیر بعد اس نے لیپ ٹاپ میرے حوالے کر دیا۔ یہ خاصے چھوٹے سے سائز کا منی لیپ ٹاپ تھا جس میں تمام سہولتیں موجود تھیں۔ میں نے اپنا ای میل چیک کیا۔ حسبِ توقع ایمن کی میل تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے اپنا موبائل کیوں بند کر رکھا ہے؟ میں نے اسے جوابی میل کی اور تفصیل سے بتایا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ میں نے اس سے کہا کہ میں پاکستان کے وقت کے مطابق رات دس بجے ایم ایس این پر آن لائن ہوں گا۔ اگر وہ میری میل پڑھ لے تو خود بھی آن لائن ہو جائے۔ میل کر کے میں نے وسیم سے کہا۔"مجھے ایک کمپیوٹر چاہئے، انٹرنیٹ کی سہولت کے ساتھ۔"

"میرے پاس ایک اور لیپ ٹاپ ہے، آپ اسے استعمال کریں۔ فون لائن آپ کے کمرے میں بھی ہے۔"

وسیم نے ایک نیا لیپ ٹاپ مجھے دیا۔ سلور رنگ کی باڈی والا یہ سائز میں وسیم کے لیپ ٹاپ سے بڑا تھا۔ کیونکہ اس کی اسکرین بڑی تھی۔ اس میں کچھ پروگرام انسٹال کرنا تھے۔ میں سی ڈیز اور لیپ ٹاپ لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ رات تک اس میں الجھا رہا تھا۔ صرف کھانے کے لئے اٹھا تھا۔ بہر حال دس بجے تک کام ہو گیا تھا۔ انٹرنیٹ کے لئے فون کی وائر لگائی تو یاد آیا کہ میرے پاس انٹرنیٹ تو تھا ہی نہیں۔ بہر حال وسیم سے اس کے انٹرنیٹ کی آئی ڈی اور پاس ورڈ لیا۔ جیسے ہی میں ایم ایس این پر لاگ آن ہوا، ایمن موجود تھی۔

"کیا حال ہیں؟" اس نے لکھا۔

"تمہارے چچا کی مہربانیوں سے اچھے نہیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔"وائس پر آ جاؤ۔"

"تم ڈیوڈ شا کی بات کر رہے ہو؟" ہیڈ فون میں اس کی آواز آئی۔

"ہاں...... اس کے گرگے میرے پیچھے ہیں۔ جس رات تم سے بات ہوئی تھی، اسی رات انہوں نے حملہ کیا۔ قسمت تھی جو بچ گیا۔ اس کے بعد دوبارہ حملہ ہوا، اس بار بھی قدرت کو میری موت یا گرفتاری منظور نہیں تھی۔"

"میرے خدا...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی، ڈیوڈ اس حد تک مجرمانہ ذہن کا مالک نکلے گا۔"

"نہیں، انگریزوں کو سمندر پار کرتے ہی کچھ ہو جاتا ہے اور قانون کی حکمرانی کے بارے میں ان کے خیالات بدل جاتے ہیں۔"

"سیاست مت کرو۔"

"اسی کو تو سیاست کہتے ہیں۔" میں ہنسا۔"خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ، تم کب پاکستان آ رہی ہو؟"

اسلام آباد میں میرے وکیل کیس کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔" وہ بولی۔"کچھ مصروفیات بھی ہیں،

ممکن ہے اگلے ہفتے تک آؤں۔''

''کیا تمہارا چچا پسند کرے گا کہ تم اپنے باپ کو تلاش کرنے کے لئے حکومت پاکستان کو درخواست دو؟''

''بالکل بھی نہیں۔ اس طرح اس سے جائیداد اور خطاب چھن جائے گا۔''

''تب مشکل ہے کہ تمہارے دائر کئے ہوئے کیس پر کوئی کارروائی ہو...... یہاں کی ایک بہت بڑی بارسوخ سیاسی شخصیت تمہارے چچا کی بے دام......''

''اسے بار بار میرا چچا مت کہو...... مجھے نفرت ہے اس سے۔'' وہ جھنجلائی۔

''اوکے۔ ڈیوڈ شا کا مرید ہے۔''

''مرید...... کیا مطلب؟''

''مطلب بندۂ بے دام...... غلام ہونا۔''

''ہمارے ہاں اوپری طبقے میں آج بھی گوروں کو آسمانی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ تو مس ایمن ڈیوڈ شا کے اس غلام کے ہوتے ہوئے تمہاری دال گلنا محال ہے۔ حکومت بھی کچھ نہیں کرے گی اور برٹ شا بدستور غائب رہے گا۔''

''پتا نہیں کیوں، مجھے یقین ہے ڈیڈی زندہ ہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

فتح خان کے بعد صرف میں جانتا تھا کہ برٹ شا اس دنیا میں ہے۔ ایمن کا دل غلط نہیں کہہ رہا تھا لیکن میں اسے یہ بات کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس کی توجہ ہٹانے کے لئے میں نے موضوع بدل دیا۔ ''تم نے شادی کیوں نہیں کی؟''

''تمہیں بتایا تو تھا غم روزگار نے فرصت ہی نہیں دی۔ شہباز، میں تمہیں بتا نہیں سکتی میں نے کچھ دن کتنی مشکلوں میں کاٹے ہیں۔''

''اور اب؟''

''اب میں مطمئن ہوں...... اچھی جاب ہے۔ اچھی تنخواہ ہے۔ لندن میں فلیٹ ہے میرے پاس۔''

''گڈ اب تم اس قابل ہو کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکو۔''

''فی الحال اس بارے میں سوچا نہیں ہے۔'' اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''تم ڈیوڈ شا سے ملے ہو؟''

''ڈیوڈ شا سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے اُسے کچھ دیر کے لئے یرغمال بنایا تھا۔''

''یرغمال......!'' ایمن نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، ورنہ اس کے آدمی مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ میرا تو مشورہ ہے کہ تم بھی اس سے دور رہو۔''

ایمن نے گہری سانس لی۔ ''اس نے میرے باپ کی جاگیر اور خطاب پر قبضہ کیا ہے میں اسے اتنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گی۔''

''اسے مارو گولی اپنے بارے میں بتاؤ۔''

ایمن اپنے بارے میں بتاتی رہی پھراس نے اچانک پوچھا۔''میں کیسی لگی تمہیں؟''

''کیسی لگتی......کیا مطلب؟''

''بھئی......تم نے اتنے سال پہلے دیکھا تھا مجھے اوراب ٹی وی پر۔''

''معاف کرنا، ٹی وی پرتم خاصی بے حال سی نظر آئیں......اس لئے کہہ نہیں سکتا۔ہاں برسوں پہلے والی ایمن کو میں آج تک نہیں بھولا۔'' میرے لہجے میں شرارت آ گئی تھی۔

''مجھ میں زیادہ فرق تو نہیں آیا۔اس وقت میرا قد پانچ فٹ چھ انچ تھا۔اب سات انچ ہے۔وزن اس وقت ایک سو دس پونڈز تھا، آج ایک سو پندرہ ہے۔صرف پانچ پونڈز کا فرق پڑا ہے۔ہاں، میں نوخیز نہیں رہی، پختہ عمر کی لڑکی ہوں۔''

''ہاں فرق تو پڑا ہے پہلے خوب تھیں اب خوب تر ہو گئی ہو۔'' میں نے تسلیم کیا۔''کیا کسی اور نے یہ فرق نوٹ نہیں کیا؟''

''لوگ بڑھے بھی......نظروں نے پیغام بھی دیئے اور پھول بھی آئے......لیکن شہباز، نہ جانے کیا بات ہے، دل نے کسی کو قبول ہی نہیں کیا۔''

شاید باپ کو کھونے اور پھر مشکل حالات دیکھنے کے بعد اس کے اندر کی لڑکی مرجھا گئی تھی ورنہ جس ایمن سے میں ملا تھا، وہ کتنی شوخ و چنچل تھی۔مشکلات میں بھی ہنستی مسکراتی رہی تھی۔مگر اب حالات نے اسے سنجیدہ کر دیا تھا کچھ دیر بعد اس نے کہا۔''اب مجھے دفتر جانا ہے۔''

بارہ بج رہے تھے اور لندن میں شام کے سات بجے تھے۔''اس وقت......دفتر......؟''

''ہاں، میری ایک ڈاکومنٹری فلم کی ایڈیٹنگ ہے۔اس دوران میں میرا موجود رہنا ضروری ہے ویسے میں نارمل ورکرز کی طرح ڈیوٹی پر نہیں جاتی ہوں۔جب لندن میں ہوتی ہوں تو زیادہ تر گھر پر رہتی ہوں۔''

''اوکے......بائی......اب کب بات ہوگی؟''

''کل اسی وقت......میں کچھ کام بھی نمٹا لوں گی تو تمہیں بہتر طور پر بتا سکوں گی کہ کب تک پاکستان آ سکوں گی۔دراصل میرے چینل والے، کے۔ٹو کی طرف جانے والی ایک مہم کو اسپانسر کر رہے ہیں۔ممکن ہے، مجھے اس کے ساتھ کر دیا جائے، بائے!''

میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور ہیڈ فون سر سے اتار دیا۔

☆======☆======☆

میں ایکسرسائز سے فارغ ہوا تو پسینے پسینے ہو رہا تھا۔گزشتہ ایک ہفتے کی باقاعدہ ایکسرسائز سے میرے اسٹیمنا اور جسمانی حالت میں واضح بہتری آئی تھی۔وسیم مجھے سیلف ڈیفنس کے گُر بھی سکھاتا رہا۔خاص طور سے اس نے مجھے ٹانگوں کی اہمیت سمجھائی۔آدمی کے زمین پر کھڑے اور ڈٹے رہنے کا انحصار ہی ٹانگوں پر ہوتا ہے جب تک یہ مضبوط، توانا اور چست نہیں ہوں گی، سیلف ڈیفنس کے بارے میں سوچنا بھی حماقت ہے۔وسیم مجھے جو ایکسرسائز کراتا تھا، ان میں زیادہ تر ٹانگوں کے لئے تھیں۔ان سے بہت فرق پڑا تھا میری ٹانگیں پہلے بھی مضبوط تھیں لیکن ان کے مسلز نمایاں نہیں تھے اب ان کے مسلز نمایاں ہو گئے تھے۔بازوؤں، پیٹ اور سینے پر بھی

واضح فرق پڑا تھا۔

ایکسر سائز سے فارغ ہو کر جسم کو ٹھنڈا اور مسلز کو معمول پر رکھنے ۔کے لئے ایک گھنٹا سوئمنگ کی۔ وسیم اور اس کے ساتھی باقاعدگی سے مجھے اپنے درمیان دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ تہ خانے میں ہم فائرنگ اور ہتھیاروں کو استعمال کرنے کی مشق کرتے تھے۔ تہ خانے میں فائرنگ رینج بنائی گئی تھی۔ اس دوران میں فتح خان کو باقاعدگی سے ہیروئن کے انجکشن دیئے جارہے تھے جن کے اثر سے وہ زیادہ تر مدہوش پڑا رہتا تھا۔ اس نے کھانا پینا برائے نام کر دیا تھا۔ اس کے لئے جانے والا کھانا عام طور سے جوں کا توں واپس آ جاتا تھا۔ اسے انجکشن عادل لگاتا تھا اور مجھے خوشی ہوئی تھی کہ اس کا رویہ اب بدل گیا تھا۔ البتہ سونیا مجھ سے ایسی گھل مل گئی تھی جیسے میری سگی بہن ہو۔ وسیم سے وہ بے پناہ محبت کرتی تھی لیکن ان میں بے تکلفی نہیں تھی ۔ یہ محبت، ادب واحترام میں لپٹی ہوئی تھی۔ عادل بھی سرد مہر ہونے کے باوجود وسیم کا بے حد احترام کرتا تھا لیکن میں سونیا سے جیسے ہنسی مذاق کرتا تھا تو اس کی شاید بچپن کی تشنگی اس معاملے میں دور ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صبح سے شام تک میرے گرد منڈلاتی تھی اور اس کے لبوں سے نکلنے والی ''شہباز بھائی!'' کی صدائیں ہمہ وقت میرے کانوں میں گونجا کرتی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے وسیم کے ساتھ تہ خانے کا رخ کیا۔ آج فتح خان کو انجکشن دیتے ہوئے آٹھواں دن تھا اور اسے چوبیں گھنٹے کے بعد انجکشن دیا جاتا تھا اور آج اسے ابھی تک انجکشن نہیں دیا گیا تھا۔ وسیم نے بتایا تھا، شام سے اس کی حالت دگرگوں ہونے لگی تھی اور کچھ دیر پہلے وہ انجکشن کے لئے چیخ چلا رہا تھا۔

''میرا خیال ہے، آج فتح خان لائن پر آجائے گا۔'' میں نے کہا۔

''ممکن ہے...... اور یہ بھی ممکن ہے اسے مزید انجکشن دینا پڑیں۔'' وسیم نے کہا۔ ''میں نے ڈاکٹر سے دوبارہ بات کی تھی، اس کا کہنا ہے بعض مضبوط قوتِ ارادی رکھنے والے افراد کو عادی ہونے میں وقت لگتا ہے۔''

لیکن فتح خان کی حالت ردّی ہو رہی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی گڑگڑانا شروع کر دیا تھا۔ ''خدا کے لئے...... انجکشن دے دو۔ میں مر رہا ہوں۔'' وہ چٹکیوں سے اپنے بازو نوچ رہا تھا۔ انگلیوں اور ہتھیلیوں پر دانت کے کاٹنے سے خون رس آیا تھا ۔ وحشت میں اس نے اپنی قمیص کئی جگہ سے پھاڑ لی تھی۔ زنجیر کھینچنے سے اس کی ٹانگ پر زخم سا بن گیا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ وسیم نے عادل کی طرف دیکھا جو پہلے سے تہ خانے میں تھا۔ اس نے اپنی جیب سے سرنج اور انجکشن نکالا تو فتح خان کی حالت اس کتے کی سی ہو گئی جو زنجیر سے بندھا کئی دن سے بھوکا ہو اور اس کے سامنے گوشت رکھ دیا گیا ہو۔ وہ بے ساختہ زنجیر گھسیٹتا ہوا عادل کی طرف لپکا پھر زنجیر کی حد ختم ہوئی اور وہ زمین پر گر گیا۔ اسے خاصی چوٹ آئی تھی لیکن چوٹ کے بجائے وہ صرف انجکشن کی فکر میں تھا۔ غالباً اسے گولی ماردی جاتی تب بھی مرنے تک وہ انجکشن ہی مانگتا۔

''دے دو...... خدا کے لئے...... دے دو۔'' وہ پھر گڑگڑایا۔

میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''فتح خان...... میں نے کہا تھا ناں...... یہاں ہر شے کی ایک قیمت ہے اس انجکشن کی بھی ایک قیمت ہے۔''

''میرے...... پاس کچھ نہیں ہے۔'' اس نے حسرت سے کہا۔

''تمہارے پاس ہے...... دینے کے لئے۔''

''کیا...... کیا ہے...... لے لو، سب لے لو۔ مجھے انجکشن دے دو۔ میں مر رہا ہوں۔'' اس نے زمین پر شدتِ کرب سے بل کھانا شروع کر دیا۔

''میرا خیال ہے اسے انجکشن دے دیں...... تیس گھنٹے ہو گئے ہیں۔ کہیں مر نہ جائے۔'' عادل نے مشورہ دیا۔

''ہاں، دے دو...... لیکن پورا نہیں، صرف تھوڑا سا...... جس سے اس کی تکلیف کم ہو۔'' وسیم نے سوچ کر کہا۔ ''پورا دے دیا تو یہ بولنے کے قابل نہیں رہے گا۔''

''عادل نے انجکشن دینا چاہا لیکن وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑا تب کہیں عادل نے انجکشن لگایا۔ فوراً ہی فتح خان کا لرزتا بدن پُرسکون ہوتا چلا گیا تھا۔ پھر وہ چت لیٹ کر کتے کی طرح ہانپنے لگا تھا۔ عادل نے صرف تہائی سرنج انجکٹ کی تھی۔

''فتح خان...... اب تم زیادہ بہتر حالت میں ہو۔ میرے سوالوں کا جواب دو گے تو پورا انجکشن ملے گا۔''

''پوچھو...... پوچھو...... ہم بتائے گا۔''

''حکیم قادس کہاں ہے؟'' میں نے پہلا سوال کیا۔

''ادھر ہی ہے...... لاہور میں۔''

''یعنی وہ زندہ ہے؟ لیکن تم نے اسے کیوں پکڑا ہے، وہ تمہارے کس کام کا ہے؟''

''ہم کو نہیں پتا...... ڈیوڈ صاحب جانتا ہے، اس نے کہا تھا اس نے تم کو بھی پکڑنے کو کہا تھا ہم کو نہیں پتا کہ کیوں کہا تھا؟''

''قادس کو کہاں رکھا ہے؟''

فتح خان نے شیخوپورہ کے قریب ایک فارم کا بتایا۔ ''وہ ادھر ہے۔''

''فارم کس کا ہے؟''

''سراج الحق قریشی نامی شخص کا ہے۔ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔''

''تم مشہور اسمگلر قریشی کی بات کر رہے ہو ناں......؟'' وسیم نے چونک کر کہا۔

''ہاں...... ہاں، وہی ہے۔''

''میں اسے جانتا ہوں۔ انڈیا سے دبا کر اسمگلنگ کرتا ہے سرحدی حکام سے گہرے تعلقات ہیں اس شخص کے۔''

''ڈیوڈ شا کب پاکستان آئے گا؟''

''دو تین دن بعد۔'' فتح خان بولا۔ ''وہ قادس کو لے کر شمالی علاقے کی طرف جائے گا۔''

میں نے فتح خان سے مزید سوالات کئے اور وہ تمام سوالوں کے فرفر جواب دیتا رہا تھا۔ اس دوران میں اس کے منہ سے مستقل رال بہہ رہی تھی جسے وہ بار بار ہاتھ سے صاف کر رہا تھا۔ اس کی گرسنہ نگاہیں سرنج پر مرکوز تھیں۔ یہ جاننے کے لئے کہ وہ جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا، میں نے ایک سوال کئی بار کیا لیکن اس نے ہر بار ایک ہی جواب دیا تھا۔ حکیم قادس کے زندہ ہونے کی خبر اچھی تھی، ایک تو وہ باکمال طبیب اور راجا کا خاص آدمی تھا جسے

صرف میرے ہاتھ کے علاج کے لئے راجا کے علاقے سے لایا گیا تھا۔ دوسرے میرے ہاتھ کی کمزوری کا علاج اس کے پاس تھا۔ جب میں پورے طور پر مطمئن ہو گیا تو میں نے عادل سے کہا۔

''اسے انجکشن دے دو۔''

عادل نے بقیہ رہ جانے والا انجکشن بھی اسے لگا دیا اور ایک منٹ کے اندر وہ آسودہ سا ہو کر فرش پر لیٹ گیا تھا۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ ''آپ کا حربہ کامیاب رہا۔ ویسے یہ خیال آپ کو کیسے آیا؟''

''فتح خان اپنے دشمنوں کو اس طرح سے بھی سزا دیتا ہے۔ وہ انہیں ہیروئن کا عادی بنا کر اور پھر بغیر ہیروئن کے ان کے تڑپ تڑپ کر مرنے کا نظارہ کرتا ہے۔ اس نے مجھے خود بتایا تھا، میں نے سوچا اس کا حربہ کیوں نہ اسی پر آزماؤں۔''

''جیسے کو تیسا۔'' وسیم ہنسا، ہم اوپر آئے۔ باہر خاصی سردی تھی۔ اس لئے ہم نے نشست گاہ کو ترجیح دی۔ وسیم نے اپنے ایک ساتھی کو کافی بنانے کو کہا۔ ''شہباز صاحب! قادس کا مل جانا بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ راجا صاحب خوش ہو جائیں گے۔''

بشرطیکہ قادس ابھی تک وہیں ہو، اتنا تو دشمن بھی جانتے ہیں کہ فتح خان کے علم میں جو کچھ ہے، وہ ہم بھی جان سکتے ہیں اس لئے عین ممکن ہے انہوں نے محتاط ہو کر حکیم کو کہیں اور منتقل کر دیا ہو۔''

''یہ بھی ممکن ہے ابھی تک وہیں ہو...... اگر انہوں نے حکیم کو وہاں رکھا ہے تو اس کا مطلب ہے، وہ ممکنہ حد تک محفوظ جگہ ہے اس لئے حکیم کو بدستور وہیں رکھا جا رہا ہے۔''

''تم اپنے آدمیوں کو نگرانی پر لگا دو۔ ہمیں بہر صورت پتا چلنا چاہئے کہ قادس وہاں ہے یا نہیں، اس کے بعد ہی ہم اسے چھڑانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

وسیم نے سر ہلایا اور موبائل فون پر کسی کو پیغام بھیجنے لگا۔ ان دنوں وہ کال کرنے کے بجائے ایس ایم ایس سے کام چلا رہا تھا۔ میں اس سے معذرت کر کے اٹھ گیا۔ مجھے ابھی ایمن سے بات کرنی تھی۔ جب میں نیٹ پر لاگ آن ہوا تو وہ پہلے سے موجود تھی۔ اس نے مجھے پیغام بھیجا۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔''

''کیوں؟'' میں نے مائیک میں پوچھا۔

''برطانوی وزارتِ داخلہ کے توسط سے پاکستانی وزارتِ داخلہ کو میرے باپ کی گمشدگی کا کیس ری اوپن کرنے کی جو درخواست بھیجی گئی تھی، وہ منظور ہو گئی ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' میں نے اس کا موڈ خراب کرنے سے گریز کیا ورنہ مجھے معلوم تھا، ہمارے ہاں اس درخواست کو کیسے ری اوپن کیا جائے گا۔ سیکرٹری داخلہ کے حکم سے درخواست درجہ بدرجہ اس تحصیل کے تھانیدار تک پہنچے گی، جہاں برٹ شا غائب ہوا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے پوری ''تفتیش'' کر کے رپورٹ اوپر بھیج دے گا جو درجہ بدرجہ ہوتی سیکرٹری داخلہ اور وہاں سے برطانیہ بھیج دی جائے گی۔ رپورٹ میں یہی درج ہو گا کہ دوبارہ کوشش کے باوجود غائب ہونے والے برطانوی شہری کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

''میں نے آج اتنے دنوں بعد نیا ڈریس پہنا ہے۔ بال سیٹ کرائے ہیں، تمہیں دکھاؤں؟''

''ہاں دکھاؤ۔'' میں نے کہا۔
اس نے ویب کیم کا پیغام بھیجا۔ یعنی انٹرنیٹ کے ذریعے ویڈیو لائیو دکھانا...... میں نے پیغام قبول کیا۔ چند لمحے بعد اسکرین کے ایک باکس میں ایمن کی تصویر نمودار ہوئی، وہ کیمرا سیٹ کر رہی تھی۔ تصویر رک رک کر آ رہی تھی۔ ''میں نظر آ رہی ہوں؟''
''ہاں...... لیکن تصویر رک رہی ہے۔''
''تمہاری طرف نیٹ سلو ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب دیکھو مجھے۔''
اس نے گلابی رنگ کا لباس پہنا تھا، جس میں اس کی دلکشی نمایاں تھی۔ سنہری مائل بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ وہ رقص کرنے کے انداز میں گھومی تو بال بھی ہوا میں پھیل گئے تھے۔ پھر وہ ہنستی ہوئی اپنے کمپیوٹر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''ہاں، اب بتاؤ...... میں کیسی لگی؟''
''اچھی لگ رہی ہو۔''
''صرف اچھی......؟'' اس کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔
''نہیں، بہت اچھی۔''
''صرف بہت اچھی۔''
''تو بابا...... تم بتا دو...... کتنی اچھی لگنا چاہتی ہو؟'' میں نے زچ ہو کر کہا۔
''سب سے اچھی...... دنیا کی ہر شے سے...... ہر عورت سے اچھی۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کھل کر کہہ دیا تھا۔ میں سناٹے میں رہ گیا تھا۔ میں کوئی نادان یا کم عمر لڑکا نہیں تھا۔ ایک پختہ مرد تھا۔ عورت کے اس لہجے اور جذبات کو اچھی طرح سمجھنے والا۔ مجھے معلوم تھا وہ کیا کہہ رہی تھی۔
''واہ...... برسوں پرانی ہونے والی ایک ملاقات کی بنیاد پر......'' میں ہنسا۔
''چلو اب مل لیتی ہوں...... ویسے بھی میں پاکستان آ رہی ہوں۔''
''لیکن...... تم مجھ سے نہیں مل سکتیں۔ میں مفرور ہوں...... روپوش ہوں...... منظر عام پر آیا تو پولیس مجھے گرفتار کر لے گی۔''
''تو میں تم سے ملنے آ جاؤں گی۔''
''پہلے تم پاکستان تو آؤ...... پھر اس بارے میں طے کر لیں گے۔'' میں نے اسے ٹالا۔
''شہباز! تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟'' اس نے موضوع نئے انداز سے چھیڑا۔ ''کیا کوئی کہانی ہے۔ میں نے سنا ہے تمہارے ہاں پسند کی شادی بہت بڑا مسئلہ ہے۔''
''بڑے سے بھی خاصا بڑا...... لیکن خدا کا شکر ہے، میرے ساتھ یہ مسئلہ نہیں ہے۔ بس کاروباری مصروفیات نے فرصت ہی نہیں دی اور آج کل دشمنوں سے فرصت نہیں ہے، جن میں تمہارا چچا...... میرا مطلب ہے ڈیوڈ شا...... فی الحال سرفہرست ہے۔''
''سوال یہ ہے کہ اسے پاکستان اور تم سے کیا دلچسپی ہے؟''
''معاملہ وہی ہے۔ تمہارے دادا جان کی ہمالیہ والی مہم کا...... ڈیوڈ شا نے راجا عمر دراز سے تصویر حاصل کر

لی ہے اور مزید کسی منصوبہ بندی میں لگا ہے۔ ڈیوڈ شا کا ایک خاص آدمی ہمارے قبضے میں ہے، اس نے بہت کچھ بتایا ہے۔"

"وہی دیوانگی...... جس کا شکار میرا باپ ہوا تھا۔" ایمن نے گہری سانس لی۔ "نہ جانے وہ منحوس تصویر اور کتنے لوگوں کی جان لے گی؟"

"ایمن...... وہ دیوانگی سہی لیکن اس میں کچھ نہ کچھ صداقت ہے ورنہ تمہارے خاندان کی تین نسلیں اس کے پیچھے پاگل نہ ہوتیں۔"

"براہِ کرم مجھے ان نسلوں میں شامل نہ کرو۔ میں نے کبھی ان چیزوں کے بارے میں نہیں سوچا جو میرے گرینڈ پا ہمالیہ سے لائے تھے۔"

"لیکن تمہارے الفاظ بتا رہے ہیں کہ تم ان پر اپنا حق ضرور سمجھتی ہو۔ جبکہ تمہیں پہلے ہی پتا ہے کہ راجا عمر دراز ان پر دعویٰ رکھتا ہے۔"

"رکھتا ہوگا۔" اس نے بے زاری سے کہا۔ "میں نے کہا ناں...... مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف اپنے ڈیڈی کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ اگر وہ زندہ ہیں تو کہاں ہیں اور مر گئے ہیں تو ان کی لاش مجھے ملنا چاہئے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں۔" میں نے معذرت کی۔ "تم واقعی اس کی حق دار ہو۔ اگرچہ میں خود مارا مارا پھر رہا ہوں لیکن...... تمہاری اس معاملے میں جو بھی مدد ہوگی، کروں گا بلکہ ایک مدد ابھی کر سکتا ہوں۔"

"وہ کیا؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"تمہیں فتح خان یاد ہے ناں...... جسے تمہارے باپ نے ہائر کیا تھا؟"

"ہاں، اس نے ڈیڈی کے خلاف سازش کی تھی بلکہ مجھے شبہ ہے ڈیڈی کو غائب کرنے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ تمہیں یاد ہے ناں...... وہ ہیروں والا بکس......؟"

"ہاں، صرف تمہارے ڈیڈی اس کے بارے میں جانتے تھے۔"

"فتح خان نے ان ہیروں کے لالچ میں میرے ڈیڈی کے ساتھ کچھ کیا تھا۔"

"درست...... میرا بھی یہی شک ہے۔ یہی فتح خان پاکستان میں تمہارے انکل ڈیوڈ شا کا خاص آدمی بنا ہوا ہے۔"

"اوہ نو......!" وہ حیران رہ گئی تھی۔

"یہ بات سو فی صد یقینی ہے اور فتح خان اس وقت میرے قبضے میں ہے۔"

"میرے خدا کیا آج میرے حیران ہونے کا دن ہے؟"

"مجھے اب تک خیال نہیں آیا تھا، اب میں اس سے پوچھوں گا۔ تمہارے ڈیڈی کے بارے میں۔"

"کیا وہ بتا دے گا؟" ایمن کے لہجے میں شک تھا۔

"میں جس طرح پوچھوں گا، وہ ضرور بتائے گا۔"

"تشدد؟" اس نے ہچکچا کر پوچھا۔

"میں اسے انگلی بھی نہیں لگاؤں گا، اس پر تشدد نہیں ہوگا، اسے کوئی کچھ نہیں کہے گا مگر وہ بتائے گا۔"

"تب پلیز، اس سے ڈیڈی کے بارے میں معلوم کرو، اس سے مجھے بہت مدد مل سکتی ہے۔"

"میں پوری کوشش کروں گا...... لیکن ایمن تم اس معاملے میں اپنا دل مضبوط رکھنا۔ کیونکہ اتنا طویل عرصہ کوئی کسی کو قید نہیں رکھتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو ناں......؟"

"ہاں۔" اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

"آئی ایم سوری!"

"نہیں، اس میں تمہارا قصور نہیں ہے؟"

میں اسے تسلی دیتا رہا۔ اس وقت فتح خان سے پوچھنا بے کار تھا کیونکہ وہ انجکشن کے زیر اثر مدہوش پڑا تھا اور غالباً اتنا مجبور بھی نہیں تھا کہ مجھے مطلوبہ سوالوں کا جواب دے دیتا۔ اس سے کل شام پوچھنا ہی مناسب ہوتا۔ جب وہ انجکشن کے لئے بے تاب ہوتا۔ میں ایمن کو گڈ بائے کہہ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ایک منٹ رکنے کا کہہ کر ایمن کو رخصت کیا۔ پھر اٹھ کر دروازہ کھولا، وسیم تھا۔ "سوری، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا...... لیکن میرے آدمیوں کی جانب سے اہم اطلاع ملی ہے، انہوں نے مذکورہ فارم سے ایک تصویر کھینچ کر بھیجی ہے۔"

"اوہ، کس کی؟" میں چونکا۔

وسیم اندر آیا، اس نے اپنی جیب سے ایک چار بائی چھ کی تصویر نکالی۔ "میرے آدمیوں نے اندھیرے میں تصویر کھینچنے والا کیمرا اور ٹیلی لینس استعمال کر کے تصویر اتاری ہے۔ تصویر واضح نہیں ہے پھر بھی مجھے شبہ ہے یہ حکیم قادس ہے۔"

میں نے تصویر دیکھی۔ "ہاں، لگ رہا ہے۔" میں نے غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ "لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتے۔"

"میرے ساتھ آیئے۔" وسیم نے کہا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لایا۔ اس نے نوٹ بک کے ساتھ سکینر لگایا اور تصویر کو سکین کر کے نوٹ بک میں منتقل کیا۔ تصویر نوٹ بک کی اسکرین پر نمودار ہوئی تھی۔ اس کے بعد وسیم نے تصویر کو بہتر بنانے کے لئے فوٹو شاپ کا سافٹ ویئر کھولا اور اس کی مدد سے تصویر کو بہتر اور واضح کرنے لگا۔ ذرا دیر میں تصویر خاصی روشن اور بہتر ہو کر سامنے آئی تھی۔ اس بار میں نوے فی صد یقین سے کہہ سکتا تھا کہ تصویر حکیم قادس کی تھی۔ "یہ حکیم ہی ہے۔" میں نے وسیم سے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" اس نے سر ہلایا۔ "اس کا مطلب ہے حکیم قادس اس کوٹھی میں ہے اور فارم کے ایک حصے میں ہے۔"

"تمہارے آدمی فارم میں داخل ہو چکے ہیں؟"

"نہیں، انہوں نے ذرا دور پوزیشن سنبھالی ہے۔ وہ آنے جانے والے راستے کی نگرانی کر رہے ہیں"

"حکیم قادس کی یہ تصویر کس وقت اتاری گئی؟"

"اب سے کوئی ایک گھنٹا پہلے۔"

''اور تمہارے پاس اتنی جلد آ بھی گئی؟'' میں چونکا۔

''وسیم مسکرایا۔ ''ٹیکنالوجی کا کمال ہے جناب! ڈیجیٹل کیمرے سے تصویر کھینچی اور موبائل کی مدد سے ایم ایس کر کے مجھے بھیج دی گئی۔ میں نے جدید ترین لیزر پرنٹر سے اس کا پرنٹ نکال لیا تھا۔''

''حکیم بظاہر کھلی جگہ پر ہے۔'' میں نے تصویر ایک بار پھر غور سے دیکھی۔

''میرے آدمیوں کا کہنا ہے اسے کچھ دیر کے لئے باہر لایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے، تصویر کھینچنے کے چند منٹ بعد اسے اندر لے جایا گیا تھا۔''

''اپنے آدمیوں سے کہو...... انہیں شک کا موقع نہ دیں...... اور اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ اندر کتنی افرادی قوت ہے۔''

''میں نے کہہ دیا ہے۔'' وسیم نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا اندر گھسنے کا ارادہ ہے؟''

''ظاہر ہے...... حکیم قادس کو حاصل کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہی میرے ہاتھ کو مکمل طور پر درست حالت میں لا سکتا ہے۔''

وسیم چلا گیا تھا اور میں سونے کے لئے لیٹ گیا تھا۔ اگلے روز میں صبح کے وقت تہ خانے میں گیا تھا۔ فتح خان فرش پر بچھی چٹائی پر مزے سے خراٹے لے رہا تھا۔ شاید اس کا نشہ ابھی جما ہوا تھا ورنہ وہ اتنے سکون سے نہ سو رہا ہوتا۔ میں نے اس کے پاؤں پر ٹھوکر ماری تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا تھا، مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا...... میں بدلہ لے گا۔''

''اس کا اعلان تو تم پہلے ہی کرتے رہے ہو۔ خیر، یہ بعد کا مسئلہ ہے۔ اس وقت میں تم سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔''

''شام کو پوچھنا، جب میں انجکشن کے بدلے سب بتانے کو تیار ہوں گا۔''

''ابھی بتا دو...... تو شام کی اذیت سے بچ جاؤ گے جیسے ہی طلب شروع ہوئی، انجکشن مل جائے گا۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر سر ہلا کر بولا۔ ''پوچھو...... کیا پوچھنا ہے؟''

''فتح خان! تم نے برٹ شا کے ساتھ کیا، کیا تھا؟''

''میں نے اسے مار کر جنگل میں پھینک دیا تھا۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا پھر ذرا تجسس سے پوچھا۔ ''اتنا عرصہ بعد تم کو برٹ شا کیوں یاد آیا؟''

میرا دل ڈوبنے لگا۔ اگرچہ مجھے اس جواب کی توقع تھی لیکن میں ایمن کو یہ بات کس طرح بتاتا، وہ کل کتنی پُر امید تھی کہ اس کے باپ کی تلاش کا کیس ری اوپن کرنے کی درخواست پاکستان کی حکومت کو بھیج دی گئی تھی۔

''سوال مت کرو فتح خان...... اور تم نے اتنی آسانی سے اسے کیسے مار دیا، کیا تمہیں اس سے وہ ہیرے حاصل کرنے تھے جن کے پیچھے تم پاگل ہو رہے تھے؟''

''میں نے کوشش کی تھی...... وہ نہیں مانا...... پھر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اسے مار دیا۔ بعد میں مجھے افسوس ہوا تھا۔''

''یعنی وہ ہیرے اب تک غائب ہیں؟''

"ہاں، ورنہ میرے کوڈیوڈ شا کا نوکری کرنے کی کیا ضرورت تھی پھر تو میں اسے نوکر کر رکھ سکتا تھا۔"
اس کی دلیل میرے دل کو لگی تھی۔ وہ ہیرے واقعی اتنے ہی قیمتی تھے۔ میں نے پھر پوچھا۔ "کیا تمہیں وہ جگہ یاد ہے جہاں برٹ شا کی لاش پھینکی تھی؟"
"نہیں، اتنا پرانا بات ہے...... میں پھر اُدھر نہیں گیا...... اور اب لاش اُدھر کدھر ہوگا۔ جانور اُس وقت کھا گیا ہوگا...... اب تو اس کا ہڈی بھی نہیں ہوگا اُدھر۔"
"فتح خان! تم نے جس فارم میں حکیم قادس کی موجودگی کا بتایا تھا، وہ وہیں ہے...... اور شاید آج رات ہم اسے وہاں سے نکال لائیں۔"
"بے شک لاؤ۔ پر اِدھر سخت پہرا ہوتا ہے۔ اندر کم سے کم درجن بھر مسلح افراد ہوتا ہے۔ اسلحہ بھی بہت ہے۔"
میں کرید کرید کر فتح خان سے فارم اور کوٹھی کا اندرونی نقشہ دریافت کرتا رہا اور اہم باتوں کو نوٹ کرتا رہا تھا۔ میرا ارادہ تھا، شام کو جب انجکشن کا وقت آئے گا تب فتح خان سے ایک بار پھر ان باتوں کی تصدیق کروں گا۔ ممکن ہے وہ ابھی غلط بیانی سے کام لے رہا ہو لیکن شام کو وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے اوپر آ کر وسیم کو تلاش کیا لیکن وہ کوٹھی میں نہیں تھا، شاید باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے سونیا سے فون کے بارے میں پوچھا۔ کوٹھی میں دو عدد فکسڈ لائن فون تھے اور موبائل فون بھی کئی عدد تھے لیکن میں ان کی مدد سے ندیم سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ ٹھکانا بہت اہم تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ذرا سی بداحتیاطی سے یہ دشمن کی نظر میں آ جائے، سونیا نے کہا۔
"ہمارے پاس ایک سی ڈی ایم اے ہے۔"
"یعنی وائرلیس فون؟"
"ہاں، وہی جو پبلک کال آفس میں آج کل استعمال ہو رہا ہے۔ فارغ پڑا ہے، آپ کہیں تو میں لا دیتی ہوں۔"
"اسے استعمال کرنے میں خطرہ تو نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے، اس کی مدد سے اس جگہ کا سراغ تو نہیں لگایا جا سکے گا؟"
"نہیں...... کیونکہ اسے جعلی نام اور شناختی کارڈ کی مدد سے حاصل کیا گیا تھا۔ پتا بھی کہیں اور کا ہے۔ آپ اسے بلاخوف استعمال کر سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "رکیں، میں ابھی لاتی ہوں۔"
وہ کچھ دیر بعد ایک وائرلیس فون لے آئی۔ میں نے اسے بجلی سے پلگ کر کے دیکھا۔ درست کام کر رہا تھا۔ اس میں خاصے یونٹس بھی تھے۔ "چلے گا...... اب ایسا کرو، ملازم سے ایک کپ کافی میرے کمرے میں بھجوا دو۔"
"میں فون لے کر اپنے کمرے میں آیا، پلگ کر کے میں نے ندیم کا گھر کا نمبر ملایا۔ آج اتوار تھا، لہٰذا اسے گھر پر ہونا چاہئے تھا۔ فون اس کی بیوی شازیہ نے ریسیو کیا۔ میری آواز سن کر وہ چلائی۔
"شہباز بھائی! آپ کہاں تھے...... یہاں غضب ہو گیا ہے۔"
"کیا ہوا...... ندیم ٹھیک ہے؟" میرا دل اس کے انداز پر دھڑک اٹھا تھا۔

"ہاں، ندیم ٹھیک ہیں...... یہ لیں، ان سے بات کریں۔"

"شہباز!" ندیم کی برہم آواز سنائی دی۔ "کہاں مر گئے ہو...... سب کے فون بند پڑے ہیں، میں صبح سے ٹرائی کر رہا ہوں۔"

"ہوا کیا ہے؟"

"ہونا کیا ہے...... تم سب اپنی من مانیاں کرتے ہو اور میری زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے۔"

"کچھ بکواس بھی کرو گے یا آزاد شاعری ہی کرتے رہو گے؟"

"مونا اور سفیر کل شام سے غائب ہیں۔"

"غائب ہیں، کیا مطلب......؟"

"غائب ہونے کا مطلب غائب ہونا ہی ہوتا ہے۔ کل شام کے وقت سفیر، مونا کو لے کر حویلی سے نکلا تھا۔ اس کے بعد وہ واپس نہیں آئے۔ سفیر جو گاڑی لے کر گیا تھا وہ حویلی سے دو میل دور خالی کھڑی پائی گئی تھی۔"

"میرے خدا!" میرے منہ سے نکلا۔ "یہ سفیر کو باہر جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" ندیم سخت بھنایا ہوا تھا۔ "اگر مونا بی بی کی طبیعت ناساز تھی تو اس کے لئے ڈاکٹر گھر پر بھی آ سکتا تھا۔ اسے باہر لے جانا ضروری نہیں تھا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔ مجھے سفیر سے اس حماقت کی توقع نہیں تھی۔"

"لیکن مجھے تھی...... مونا بی بی کا حویلی میں دم گھٹ رہا تھا، اس نے سفیر کو اکسایا ہوگا، ڈاکٹر کو دکھانے کے بہانے دونوں آؤٹنگ پر نکلے ہوں گے۔" ندیمؔ نے اندازہ لگایا۔

"ان کا پھر پتا چلا؟"

"سفیر کے بھائی نے رپورٹ درج کرا دی ہے اغوا کی۔ فی الحال کچھ پتا نہیں ہے۔ پولیس سے بھی امید نہیں ہے...... جو کرنا ہے خود کرنا ہے...... تُو راجا کے ان گرگوں سے بات کر۔"

"تُو فکر نہ کر۔ اگر مونا اور سفیر کو دشمنوں نے اٹھایا ہے تو ان کا بھی ایک خاص بندہ ہماری تحویل میں ہے۔"

"یار، مجھے زیادہ فکر مونا کی ہے۔ تُو جانتا ہے مرشد علی اور اس کا بھائی مونا کے بارے میں کیسے عزائم رکھتے ہیں۔ میں نے مرشد علی سے بات کی ہے لیکن وہ انکار کر رہا ہے، اس اغوا میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔"

"اسے تو انکار کرنا ہے۔ تُو فکر نہ کر...... اللہ سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔ ہم اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کریں گے۔"

"بس یار! تجھ سے بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا ہے ورنہ میں بہت پریشان تھا۔ یار، مجھ سے رابطہ رکھنا۔ ان کا پتا چلے تو مجھے فوراً بتانا۔"

اسے تسلی دے کر میں نے فون بند کر دیا لیکن خود اندر سے میرا تشویش سے برا حال تھا۔ اس موقع پر جبکہ حالات ہمارے حق میں جا رہے تھے۔ مونا اور سفیر کا غائب ہونا سارے کئے کرائے پر پانی پھیرنے کے مترادف تھا۔ ان پر غصہ کر کے خون جلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے ان کو چھڑانے کا طریقہ سوچنا تھا۔ میں نے وسیم کا پوچھا، وہ ابھی تک باہر سے نہیں آیا تھا۔ سونیا میری بے چینی سے تاڑ گئی تھی۔ "کیا بات ہے شہباز بھائی، آپ

پریشان لگ رہے ہیں؟"

"نہیں کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے اسے ٹالا۔

"آپ مجھ سے چھپاتے ہیں۔" وہ دکھی ہوگئی تھی۔

"اوہ نہیں...... بابا، خبر ہی ایسی ہے۔ میرے ساتھی مونا اور سفیر غائب ہیں، کل شام سے۔"

"یہ تو بہت بری خبر ہے۔" اس کے چہرے پر تشویش پھیل گئی تھی۔

"ہاں، اس لحاظ سے زیادہ بری ہے کہ ان کے دشمن کے ہتھے چڑھنے کا امکان ہے۔"

"مرشد علی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"امکان یہی ہے...... یا یہ بھی ہوسکتا ہے، یہ فتح خان کے اغوا کا ردِعمل ہو۔"

"اس سے پوچھتے ہیں۔"

"ہاں، یہ تم نے اچھی بات کی...... ورنہ میرا تو ذہن سُن ہو رہا ہے۔"

میں تہ خانے کی طرف آیا تو سونیا میرے ساتھ تھی۔ فتح خان چٹائی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ آہٹ سن کر وہ چونکا اور پھر ہمیں دیکھ کر سیدھا ہو گیا۔ اس نے خاص طور سے سونیا کا معائنہ کیا تھا۔

"فتح خان، یہ بتاؤ کہ ڈیوڈ شا کے لئے اور کتنے افراد کام کرتے ہیں؟"

"میرے ساتھ تو پندرہ بیس افراد ہیں۔ باقیوں کا مجھے نہیں پتا۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

"یعنی اس نے اور بھی لوگوں کو ہائر کیا ہے؟"

فتح خان نے سر ہلایا۔ "اس جیسا آدمی کسی ایک شخص پر اعتبار کیسے کر سکتا ہے۔"

"اس کا کوئی گروپ راولپنڈی سائیڈ پر بھی کام کر رہا ہے؟"

"اکثر وہی ہیں...... لاہور تو میں تمہاری خاطر آیا تھا۔"

"میرے ساتھیوں کی نگرانی بھی جاری ہے؟"

"ڈیوڈ شا نے مجھ سے تو نہیں کہا...... ممکن ہے دوسرے لوگوں سے یہ کام لیا ہو۔" فتح خان نے جواب دیا۔ وہ بار بار دزدیدہ نظروں سے سونیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک محسوس کی جا سکتی تھی۔ "تم مجھ سے اس بارے میں سوال کیوں کر رہے ہو، کیا تمہارا کوئی ساتھی غائب ہے۔"

"بکواس بند کر کتے!" اچانک سونیا نے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری تھی۔ فتح خان الٹ کر گرا تھا۔ وہ اٹھا تو اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ اس نے بے پروائی سے خون صاف کیا۔

"تم عادل کی بیوی ہو؟"

"تمہیں کیسے معلوم؟" میں نے حیرانی سے کہا کیونکہ اس کے سامنے کسی کا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ سونیا عادل کی بیوی ہے؟

"شاید کوئی بول رہا تھا، میں نشے میں تھا پر یاد رہ گیا۔" اس نے کہا۔

"فتح خان میرے دو ساتھی غائب ہیں، انہیں تصویر والے چکر میں مرشد علی نے اغوا کیا تھا۔"

"مرشد......" وہ حقارت سے بولا۔ "اس گدھے کو سوائے بدمعاشی کے اور کچھ نہیں آتا تھا۔ اس قسم کا

سارے کام میں کرتا تھا تمہارے ساتھیوں کو بھی اسپتال سے میں نے اغوا کیا تھا۔“

میں مسکرایا۔”تو یہ نیکی کا کام ہے؟“

”میرا مطلب ہے...... مرشد اور اس کے ساتھی پلاننگ سے کوئی کام نہیں کر سکتے، وہ صرف مار دھاڑ کرنے والے لوگ ہیں۔“

”تمہارا کیا اندازہ ہے، میرے ساتھی کہاں ہو سکتے ہیں؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”راولپنڈی میں اپنے ٹھکانوں کا پتا بتاؤ، جہاں ان لوگوں کو رکھا جا سکتا ہے؟“

”وہاں میرے علم میں ایسا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ میں خود مرشد علی کے گھر میں رہتا تھا“

صاف ظاہر تھا، وہ بتانے سے گریز کر رہا تھا اور فی الحال وہ مجبور بھی نہیں تھا۔ ابھی انجکشن کی طلب کا مرحلہ نہیں آیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے شام کو بات کریں گے۔ میں اور سونیا اوپر آئے، وہ فتح خان کو ٹھوکر مار کر اپنا غصہ کسی حد تک سرد کر چکی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔”اب تم تہ خانے میں مت جانا...... وہ جس طرح تمہیں دیکھ رہا تھا، یہ بات مجھے پسند نہیں تھی لیکن میں بے بس آدمی پر ہاتھ اٹھانے کے خلاف ہوں۔“

”بے حیا شخص ہے۔“ سونیا غصے سے سرخ ہو گئی۔”اگر یہ آپ لوگوں کے لئے ضروری نہ ہوتا تو اس کی آنکھیں نکال لیتی۔“

”فکر مت کرو، اسے اس سے بھی زیادہ سخت سزا ملے گی۔ آج ان شاء اللہ حکیم قادس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد اسے بھی راجا کے حوالے کریں گے۔ وہ اسے سخت سزا دے گا۔ ان کے ہاں اپنے مجرموں کو بڑی وحشت ناک سزائیں دی جاتی ہیں۔“

”کاش کہ میں اسے سزا پاتے دیکھ سکوں۔“

وسیم آ گیا تھا۔ میں نے اسے مونا اور سفیر کے غائب ہونے کا بتایا تو وہ پریشان ہو گیا تھا۔”میرے خدا...... یہ کیا، کیا انہوں نے؟“

”یار، اب تو جو ہونا تھا، ہو گیا ہے۔ مجھے شبہ ہے انہیں فتح خان کے جواب میں اغوا کیا گیا ہے۔ اس طرح وہ درحقیقت ڈیوڈ شا کی قید میں ہو سکتے ہیں۔ فتح خان سے ان کے راولپنڈی اور اسلام آباد کے ٹھکانوں کا پتا کرنا ہے لیکن فی الحال وہ بتانے پر مجبور نہیں ہے۔“

وسیم میرا مفہوم سمجھ گیا تھا۔”فکر مت کریں۔ شام تک وہ سب بتائے گا۔“

میں کچھ سوچ رہا تھا، وسیم کی بات سن کر چونکا۔”یار وسیم! میں نے ہیروئن کے عادی افراد دیکھے ہیں۔ فتح خان بے شک عادی ہو گیا ہے لیکن مجھے اس کے انداز میں وہ خاص بات محسوس نہیں ہو رہی ہے جو ہیروئن کے عادی افراد میں ہوتی ہے۔“

وسیم مسکرایا۔”عام افراد اور فتح خان میں کچھ تو فرق ہو گا۔“

”شاید تم درست کہہ رہے ہو۔ یہ بتاؤ، صبح سے کہاں تھے؟“

”میں اور عادل فارم کا جائزہ لینے گئے تھے۔ چھوٹا سا فارم ہے جس میں زیادہ تر پھل دار درخت لگے

ہیں۔ البتہ اس میں بنی کوٹھی شاندار اور وسیع رقبے پر پھیلی ہے شاید دو ایکڑ رقبے پر ہے۔''

''مشن کے لحاظ سے کیسی ہے یہ کوٹھی؟''

''دفاعی انتظامات خاص نہیں ہیں۔ دیواریں آٹھ نو فٹ اونچی ہیں لیکن ان پر خاردار تاریں نہیں ہیں، گیٹ پر ایک مسلح شخص ہے۔ رات کو بارہ بجے کے بعد اندر کتے کھول دیئے جاتے ہیں۔''

''وسیم، ہمیں مغرب کے قریب وہاں دھاوا بولنا ہوگا۔''

''مغرب کے قریب!'' اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''نصف رات کو کیوں نہیں؟''

''میرا تجربہ ہے، سورج نکلتے اور غروب ہوتے وقت آدمی سُست ہوتا ہے۔ صبح نیند کی وجہ سے اور دن میں تھکن کی وجہ سے...... نصف رات کے وقت ایسے لوگ چاق و چوبند ہوتے ہیں۔ یہی وقت سب سے بہتر ہو گا۔ پھر ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس وقت بھی کوئی حملہ کر سکتا ہے، وہ آسانی سے مار کھا جائیں گے۔''

وسیم ہچکچا رہا تھا۔ ''لیکن اس طرح تو ہم خود بھی ان کی نظروں میں آ جائیں گے۔''

''رات کو وہ کتوں کی وجہ سے فوراً ہوشیار ہو جائیں گے۔ تب بھی ان کی نظروں میں تو آئیں گے پھر ہم روشنی میں پوزیشن سنبھال لیں گے اور تاریکی ہوتے ہی اندر گھسنے کی کوشش کریں گے۔''

وسیم ہچکچاہٹ کا شکار تھا لیکن میں نے اسے قائل کر ہی لیا۔ وسیم نے بتایا کہ اس نے کرائے پر مزید چھ افراد کا بندوبست کیا ہے کیونکہ یہاں لاہور میں اس کے پاس افرادی قوت کم ہے۔ ''ان کو ہمارے مشن کے بارے میں تو علم نہیں ہے۔''

''ان کو صرف وہ کرنا ہے جو ہم کہیں گے۔ ان کو نہ تو ہمارے ٹھکانے کا علم ہے اور نہ ہی اس جگہ کا جہاں ہم نے حملہ کرنا ہے، ویسے وہ تمام تربیت یافتہ افراد ہیں۔''

''یعنی ہم شام کے قریب روانہ ہوں گے؟''

''نہیں، فاصلہ زیادہ ہے۔ ہمیں سہ پہر کے وقت گھر سے نکلنا ہوگا۔'' وسیم نے کہا۔ ''میں بندوبست کرتا ہوں۔''

وسیم کے جانے کے بعد سونیا نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ لیکن مونا اور سفیر کے اغوا کا سن کر میری بھوک مر گئی تھی۔ میں نے برائے نام ہی چکھا تھا۔ اس کے بعد تیار ہونے کے لئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ موسم کی مناسبت سے فلالین کی پتلون اور جرسی کی ہائی نیک شرٹ منتخب کی۔ کیونکہ سورج ڈوبنے کے بعد سردی میں تیزی سے اضافہ ہوتا تھا۔ غسل کر کے میں نے لباس تبدیل کیا۔ فی الحال میرے پاس صرف ایک پستول تھا لیکن اسلحہ لازماً ہمارے ساتھ ہوتا۔ پھر مجھے اس لائٹ گرینیڈ کا خیال آیا جو میں نے اسلحہ خانے سے لیا تھا۔ جس کے پھٹنے پر شدید قسم کی روشنی نکلتی تھی، میں نے اسے بھی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ بظاہر دیکھنے میں یہ پین لگتا تھا۔ وسیم لے ساتھی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ پورچ میں گاڑیاں تیار کی جا رہی تھیں کیونکہ کارروائی کچے علاقے میں کرنی تھی اس لئے دو عدد فور وہیل ڈرائیو زلی گئی تھیں۔ ان میں ایک ہلکی جیپ تھی اور دوسری لینڈ روور تھی۔ سونیا اور عادل اندر سے اسلحہ لا رہے تھے۔ رائفلیں، پستول اور ان کے اضافی میگزینز، ہینڈ گرینیڈ اور اسموک گرینیڈ تھے۔

سارا اسلحہ گاڑیوں کے خفیہ خانوں میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ تین بجے وسیم آ گیا تھا۔ اس نے بتایا۔
''کرائے کے آدمی تیار ہیں، وہ ہمیں شیخوپورہ روڈ پر ملیں گے۔''
''یہاں سے کون کون ساتھ جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔
''میں آپ اور چار دوسرے ساتھی، عادل دو افراد کے ساتھ یہاں رکے گا۔''
''میں ساتھ جانا چاہتا ہوں۔'' عادل نے جلدی سے کہا۔
''نہیں، فتح خان کی نگرانی اہم ہے، اسے بھی خطرناک سمجھو۔ ذرا سی بے پروائی سے یہ شخص نکل جائے گا۔ اسے اپنے قبضے میں رکھنا بے حد ضروری ہے۔''
''اور بھائی میں؟'' سونیا نے کہا۔
وسیم مسکرایا۔ ''ظاہر ہے، تمہیں تو قطعی نہیں لے جا سکتے۔ تم بھی یہاں کی ذمے داری سنبھالو۔''
ساڑھے تین بجے کے قریب ہم گھر سے روانہ ہوئے۔ فتح خان سے راولپنڈی میں ڈیوڈ شا اور مرشد علی کے ٹھکانوں کے بارے میں معلوم کرنے کی ذمے داری عادل کے سپرد کر دی گئی تھی۔ میں نے اپنا حلیہ بدلنے کے لئے سر پر گول ٹوپی کے ساتھ گول شیشوں والی عینک لے لی تھی۔ شیو بڑھ آئی تھی اور مجھے امید تھی کہ قریب سے دیکھے بغیر مجھے کوئی شناخت نہیں کر سکے گا۔ گاڑیاں تیز رفتاری سے فاصلہ طے کرنے لگیں۔

میں ایک بڑے گورکھ دھندے میں پھنس گیا تھا جس کا سرا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میرے پاس ٹکڑوں کی صورت میں معلومات موجود تھیں جن سے ایک خاکہ بن رہا تھا لیکن پوری تصویر سامنے نہیں آ رہی تھی۔ واقعات کے دو ٹریک تھے، ایک ٹریک راجا عمر دراز، ڈیوڈ شا اور مجھ سے تعلق رکھتا تھا۔ جب کہ دوسرا ٹریک مرشد علی، نادر علی، مونا، سفیر اور مجھ سے تعلق تھا۔ یعنی دونوں طرف کے واقعات آ کر مجھ پر جمع ہو رہے تھے۔ ڈیوڈ شا، مرشد علی اور فتح خان ایک طرف تھے جبکہ دوسری طرف میں، میرے ساتھی، راجا عمر دراز اور اس کے ساتھی تھے لیکن ہم سب کے مقاصد مختلف تھے۔ میں اپنا دفاع کرنا اور اپنی پُرسکون زندگی کی طرف لوٹ جانا چاہتا تھا جبکہ مرشد علی مجھے ایسا کرنے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ دوسری طرف عمر دراز اور شا خاندان میں گزشتہ ساٹھ برس سے جاری کش مکش ڈیوڈ شا کی صورت میں ایک نئے موڑ تک چلی آئی تھی اور فی الحال دونوں طرف سے واقعات کا کوئی انجام نظر نہیں آ رہا تھا۔
''کیا سوچ رہے ہیں؟'' وسیم نے مجھے سوچ میں ڈوبا پا کر پوچھا۔
''سوری، میں ذرا کھو گیا تھا۔''
''شہباز صاحب، فکر نہ کریں...... حالات سے لڑتے رہنا ہی کامیابی ہے۔ حوصلہ ہار دینے سے صرف ناکامی ملتی ہے اور لڑتے رہنے والے کبھی کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔''
میں ہنسا۔ ''یار، فکر مت کرو۔ میں مایوس کن خیالوں میں نہیں کھویا تھا۔ دراصل میں سوچ رہا تھا کہ میرے معاملات اور پھر راجا عمر دراز کے معاملات آپس میں کتنے گتھ گئے ہیں کہ اب ہمارا مفاد تقریباً ایک ہے۔''
''میں راجا صاحب کو اتنا تو نہیں جانتا ہوں...... لیکن اتنا سمجھتا ہوں۔ آپ کے لئے وہ بے غرض انسان

ہیں۔"

"میں جانتا ہوں...... میں اس راستے کی بات کر رہا ہوں جس طرف واقعات چل رہے ہیں۔"

وسیم نے سر ہلایا۔ "شہباز صاحب، بس میں اس تصویر والے معاملے کی دیوانگی سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ڈیوڈ شا نے اس کے حصول کے لئے مرشد علی کے کتنے آدمی مروا دیئے تھے۔ کتنے بے گناہ بھی مارے گئے، کوئی اور ہوتا تو مرشد علی اسے کچا چبا جاتا لیکن ڈیوڈ شا کے قدموں میں وہ بچھا جا رہا تھا۔"

"میرے خدا...... بے گناہ پر یاد آیا، میں رحمت خان کو تو بھول ہی گیا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی فتح خان کے قبضے میں تھے۔" میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "فتح خان ہمارے قبضے میں ہے اور مجھے اس سے پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔"

"میں نے پوچھا تھا۔ رحمت خان کی بیٹی کے بارے میں۔ بیوی کی لاش تو سڑک کے کنارے مل گئی تھی، اس کی موت طبعی تھی۔"

"اسے بھی قتل کہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "شاید وہ اپنے بعد اپنی بیٹی کے ساتھ بھی وہی سلوک نہ برداشت کر سکی اور مر گئی۔"

وسیم نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اسے فتح خان نے داشتہ بنا رکھا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ اسے اپنے کسی رشتے دار کے ہاں رکھوا آیا ہے۔ اسے اپنی عورت کہتا ہے۔"

"میں اس حرام زادے کی گردن مروڑ دوں گا۔" میں نے بھڑک کر کہا۔ "اس پھول سی بچی کو اپنی عورت کہتا ہے۔"

"اپنا قبضہ مستحکم رکھنے کے لئے اس نے نام نہاد نکاح بھی پڑھا رکھا ہے۔"

اشتعال کے عالم میں، مَیں نے فتح خان کو ایک سو ایک گالیاں دیں۔ "آج سے اس کا انجکشن بند کر دو۔ کتے کی طرح تڑپ کر مرے گا۔"

"شہباز صاحب، فی الحال یہ کام مشکل ہے۔" وسیم نے آہستہ سے کہا۔ "ابھی فتح خان کی ضرورت ہے۔"

"اوہ...... ہاں۔" میں ذرا ٹھنڈا ہوا تھا۔ "لیکن اسے بخشنا نہیں ہے۔"

ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم شیخوپورہ روڈ پر اس فارم کے سامنے تھے۔ راستے سے ایک سیاہ کار بھی ہمارے پیچھے آنے لگی تھی۔ اس میں وسیم کے حاصل کردہ کرائے کے آدمی تھے۔ مزید تین آدمی پہلے سے اس علاقے میں موجود تھے۔ گاڑیوں کو طے شدہ جگہ پر کھڑا کر دیا گیا۔ یہ ایک نالے کے کنارے اُگی اونچی گھاس تھی جس میں گاڑیاں چھپا کر ہم فارم کی طرف بڑھے۔ وسیم نے سب سے پہلے ریڈیو پر اپنے آدمیوں سے رابطہ کر کے رپورٹ لی تھی۔ اس قسم کے ریڈیو ہم سب کے پاس تھے اور کانوں پر مائیک اور فون کا سیٹ تھا۔ اس لئے رپورٹ بھی سب سن رہے تھے۔ اس کے مطابق صبح سے اب تک کوئی چھ گاڑیاں فارم ہاؤس میں آ کر جا چکی ہیں۔ ان میں ایک دو افراد ہی تھے۔ فارم پر کوئی نہیں رکا۔ سب واپس گئے تھے۔ وسیم نے آپریشن پلان بتایا۔ اس کے مطابق ایک شخص کو گاڑیوں کے پاس رکنا تھا، دو افراد کوٹھی کے باہر رہتے اور چھ اس کے احاطے میں پوزیشن

سنبھالتے۔ چھ افراد اندر جا کر حکیم قادس کو تلاش کرتے اور اسے باہر لاتے۔ ایک ٹیم جس میں تین افراد تھے ایک سمت سے کوٹھی میں اور دوسری ٹیم دوسری سمت سے اندر داخل ہوئی۔ مسلح افراد کو دیکھتے ہی گولی مار دینی تھی اور غیر مسلح افراد کو صرف کور کرنا تھا۔

ہمیں دائیں بائیں سے اندر جانا تھا۔ کوٹھی کے باہر رہ جانے والے دو افراد نے چوکیدار کو قابو کرنا تھا۔ دونوں دستے چھ چھ کے گروپ میں درختوں کی آڑ میں کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ جب تک ہم دائیں بائیں دیوار تک پہنچے چوکیدار کو قابو کر لیا گیا تھا۔ وسیم نے پلاسٹک کی کھل جانے والی سیڑھیوں کا بندوبست بھی کیا تھا۔ انہیں دیوار سے لگا کر ہم یکے بعد دیگرے اندر کود گئے۔ رپورٹ کے مطابق احاطہ خالی تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی تاریکی تیزی سے چھائی تھی۔ احاطے میں کہیں کہیں روشنی جلا دی گئی تھی لیکن کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں پانچ دوسرے افراد کے ساتھ بائیں جانب سے اندر کودا تھا۔ ریڈیو پر ہمارا برابر ایک دوسرے سے رابطہ تھا۔ ابھی تک کسی فرد سے سامنا نہیں ہوا تھا اور یہ بات مجھے عجیب سی لگ رہی تھی۔ ہم اتنی آسانی سے اندر گھس آئے تھے صرف ایک چوکیدار تھا جسے آسانی سے قابو کر لیا گیا تھا۔ کوٹھی میں بجلی تھی اور برقی قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ میں نے ریڈیو پر آہستہ سے وسیم سے کہا۔

''یہاں کوئی نہیں ہے۔''

''اس طرف بھی کلیئر ہے۔''

''میں دو افراد کو لے کر اندر جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں بھی......''

تین افراد کو باغ میں پوزیشن سنبھالنے کا کہہ کر میں دو افراد کے ساتھ اندر کی طرف بڑھا تھا۔ باغ اتنا وسیع تھا کہ اس میں درجنوں افراد چھپ سکتے تھے۔ تین افراد کا تو پتا ہی نہیں چلتا۔ کوٹھی بھی خاصی بڑی تھی اور اس طرف بے شمار کھڑکیاں تھیں، دروازہ صرف ایک تھا اور کھلا بھی تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہمارے لئے ہی چھوڑ دیا گیا ہو۔ میں دونوں ساتھیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ یہ ایک گیلری تھی جس کے دائیں بائیں درجن بھر سے زیادہ دروازے تھے، میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی تھی۔ وہاں غیر فطری سناٹا تھا، میں نے ریڈیو پر کہا۔

''وسیم، میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔''

''میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں......ہم ٹریپ......''

وسیم کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ باہر سے فائرنگ اور چیخوں کی آواز آئی، وسیم دھاڑا تھا۔ ''باہر نکلو، ......''

ہم لوگ پلٹے تو جس دروازے سے آئے تھے، وہ زوردار آواز سے بند ہو گیا۔ میں نے گھر جانے والے کی طرح چاروں طرف دیکھا۔ فائرنگ اور چیخوں کی آواز بڑھ گئی تھی۔ میں نے ایک کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ لاک تھا۔ اسی لمحے گیلری کا ایک دروازہ کھلا اور اس سے ایک شخص ری پیٹر لئے نمودار ہوا۔ میرے ساتھی نے اس پر فائر کئے تھے لیکن اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا اور جب اس نے ری پیٹر چلائی تو فائرنگ کرنے والے کے سینے میں چھ انچ قطر کا سوراخ ہو گیا تھا، وہ اچھل کر نیچے گرا اور گرنے سے پہلے مر گیا تھا۔ اس

بار میں نے اور دوسرے ساتھی نے بیک وقت برسٹ مارے۔ اس بار بھی اسے کچھ نہیں ہوا۔ اس نے ری پیٹر لوڈ کر کے فائر کیا تو میرا دوسرا ساتھی بھی پیٹ سے نکلنے والی آنتیں سنبھالتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

''دھوکا..... دھوکا.....'' کوئی میرے ذہن میں چلا رہا تھا۔ رائفلوں میں نقلی میگزین تھے۔ ان میں گولیاں نہیں تھیں، میں ریڈیو پر چلایا۔ ''وسیم! نکل جاؤ...... ہمارے ہتھیاروں میں نقلی گولیاں ہیں...... میرے خدا..... !''

لمبا اور گنجا شخص تیسری بار ری پیٹر لوڈ کر رہا تھا اور اس بار میری باری تھی۔ اس سے پہلے وہ مجھ پر فائر کرتا میں نے رائفل اس پر کھینچ ماری۔ یہ اقدام اس کے لئے غیر متوقع تھا۔ بچنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے فائر کیا اور گولی خاصی بلندی سے گزر گئی، مجھے اتنی مہلت ملی تھی کہ میں نے کمر سے لگا پستول نکال کر گنجے کے سر میں گولی اتار دی۔ اسی لمحے عقب سے کسی نے میرے سر پر وار کیا تھا۔ وار شدید تھا۔ میں بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن چکرا کر گر پڑا تھا۔ میرے اردگرد شور جاری تھا۔ کسی نے مجھے پاؤں سے پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔ میرے ہاتھ کسی نم شے سے ٹکرائے جو فرش پر پھیلی تھی۔ میرے ذہن پر تاریکی چھا رہی تھی۔ اس سے لڑتے ہوئے میری توجہ دوسری چیزوں سے ہٹ گئی تھی، میں کچھ دیکھ اور سن نہیں رہا تھا اچانک ایک جھٹکے سے مجھے کہیں پھینکا گیا۔ میرا سر زمین سے ٹکرایا تھا، تاریکی بڑھنے لگی تھی۔

''کیا مر گیا ہے؟'' کسی نے پوچھا۔ مجھے آواز پر شک ہوا۔

''نہیں زندہ ہے۔ بس بے ہوش ہوا ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

''کسی نے میرے گال پر زور سے تھپڑ مارا۔ ''شہباز خان! آنکھ کھول کر ہم کو دیکھو۔''

''میں نے بمشکل آنکھ کھولی۔ شاک نے مجھے چوکنا کر دیا تھا۔ آواز سن کر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آنکھوں سے دیکھا...... تب یقین آیا، وہ فتح خان تھا...... لیکن فتح خان کو ہم کوٹھی کے تہ خانے میں چھوڑ آئے تھے، وہ یہاں کہاں......!

''میرے کو پہچانا...... میں فتح خان ہے۔'' اس نے اپنا مکروہ چہرہ میرے قریب لاتے ہوئے کہا اور میرے چہرے پر ٹکر ماری۔ تاریکی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

*

مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر اس دنیائے رنگ وبُو سے بیگانہ رہا۔ درمیان میں ایک بار ہلکا سا ہوش آتا محسوس ہوا ہی تھا کہ بازو میں کوئی شے چبھی اور میں ایک بار پھر بے خبر ہو گیا۔ جب مجھے پوری طرح ہوش آیا تو میں ایک سپاٹ دیواروں والے کمرے کے فرش پر بچھے ایک بدبودار کمبل پر دراز تھا۔ میرے سر کے زخم کی بینڈ یج کر کے کوئی پین کلر بھی دے دیا گیا تھا اس وجہ سے سر میں درد نہایت معمولی سا رہ گیا تھا بس چھونے یا دبانے پر محسوس ہوتا تھا۔ پیاس سے گلا خشک ہو رہا تھا، یہ کم سے کم پندرہ سولہ گھنٹے پانی نہ ملنے کا قدرتی ردِعمل تھا۔ روشن دان سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی۔ یہ شاید دن کا آخری حصہ تھا۔ میں اٹھ بیٹھا تو نزدیک ہی رکھا پانی کا کٹورا نظر آیا جس میں لبالب پانی بھرا تھا۔ میں نے بے تابی دکھانے کے بجائے پہلے احتیاطاً اسے سونگھا، زبان سے چکھ کر دیکھا، سوائے کورے پانی کی مہک اور ذائقے کے اور کچھ نہیں تھا پھر بھی میں گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگا۔ پاس ہی ایک چھوٹی سی گول ٹوکری میں چند سیب رکھے تھے۔ یہ گویا قید کرنے والوں کی جانب سے میرے لئے کھانے پینے کا انتظام تھا۔

میں نے چند گھونٹ سے زیادہ پینے سے گریز کیا۔ خالی پیٹ اتنا پانی مسئلہ بن سکتا تھا۔ ایک سیب لے کر پہلے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیواروں پر چونا تھا، دروازہ بھی تازہ تازہ وارنش کیا گیا تھا۔ وارنش کی تیز بُو آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ یہ کمرا کسی نوتعمیر شدہ یا زیرِتعمیر مکان کا ایک حصہ ہے۔ سیب کھاتے ہوئے میں نے اپنے ہوش و حواس کے آخری لمحات پر غور کیا۔ ہمیں گھیر لیا گیا تھا۔ میں نے وسیم اور اس کے ساتھیوں کے چیخنے کی آوازیں سنی تھیں۔ ساتھ ہی فائرنگ کا شور بھی ہوا تھا، یہ سوچ کر میرا دل بیٹھنے لگا کہ وہ اس فائرنگ کا نشانہ بن گئے تھے۔ نہ جانے زندہ بھی تھے یا نہیں؟ اور سب سے ناقابلِ یقین بات وہاں فتح خان کی موجودگی تھی۔ وہی فتح خان، جسے میں عادل کی کوٹھی کے تہ خانے میں چھوڑ آیا تھا، بے بسی اور لاچاری کی تصویر بنا میرے حساب سے انجکشن کے لئے رو، گڑگڑا رہا ہو گا لیکن میں نے اس کوٹھی میں ایک دوسرے فتح خان کو دیکھا تھا پہلے کی طرح خباثت سے بھرپور اور دشمن پر پوری قوت سے وار کرنے والا۔ یہ عقل کو چکرا دینے والی بات تھی۔ بے بس اور مقید فتح خان اتنی جلد اور پورے ہوش وحواس کے ساتھ اس جگہ تک کیسے جا پہنچا؟ اور اس نے اتنی جلدی ہمارے لئے جال بھی بچھا لیا! ممکن ہے میں اسے اپنی نظر کا دھوکا سمجھتا مگر فتح خان ایک ہی تھا اور میں اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہی لہجہ اور وہی انداز۔ اس جیسا دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے مجھے اپنے سر کی ضرب سے بے ہوش کیا تھا یعنی وہ پوری

طرح فٹ تھا۔ پھر وہ انجکشن کے لئے تڑپنے اور ہماری ہر بات ماننے والا شخص کون تھا، لازمی طور پر وہ بھی فتح خان تھا۔

معاملہ اتنا پیچیدہ تھا کہ سوچنے سے میرے سر میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ ساتھ ہی مجھے عادل اور سونیا کی فکر بھی تھی۔ وہ پیچھے رہ گئے تھے، اور لازماً مشکل میں تھے۔ فتح خان کا فرار اور مجھے بے ہوش کرنے سے قبل کا فاتحانہ انداز یہی ظاہر کرتا تھا کہ حالات اور میرے ساتھی بھی اس کے قابو میں تھے۔ فی الحال مجھے اپنے حالات پر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ میں کہاں ہوں اور کن لوگوں کے قبضے میں ہوں۔ کیا یہاں سے فرار ممکن ہے۔ کیونکہ یہاں سے فرار ہو کر ہی میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں جان سکتا تھا یا ان کی مدد کر سکتا تھا۔ دو عدد سیب کھا کر میں نے تھوڑا پانی اور پیا۔ بھوک اور پیاس کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا تھا۔ میں نے دروازے کا جائزہ لیا۔ یہ ٹھوس لکڑی کا تھا اور ظاہر ہے باہر سے بند تھا۔ میں نے دروازہ پیٹا اور انتظار کرنے لگا کہ کسی طرف سے ردعمل آئے۔ دوسری بار دروازہ پیٹنے پر باہر سے کسی نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''مجھے باتھ روم جانا ہے، فوراً......'' میں نے بلند آواز سے کہا۔

''ایک منٹ!'' بولنے والا شاید دروازے کے قریب آیا۔ اس نے تالا کھولا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ یہ کوئی ساڑھے چھ فٹ اونچا اور ڈرم جیسی جسامت والا شخص تھا۔ اس نے شاید کوئی نشہ کر رکھا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ تالا کھول کر وہ پیچھے ہو گیا تھا۔ اس نے ٹرپل ٹو رائفل اٹھا رکھی تھی جو اس کے جہازی سائز ہاتھوں میں کھلونا لگ رہی تھی۔ اس نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہاتھ اوپر کرو۔''

میں نے ہاتھ اوپر کئے ''اور کوئی حکم؟''

''دائیں طرف چلو۔'' اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ اور جسم بالکل ساکت تھے۔

میں دائیں طرف بڑھا۔ یہ بھی ایک کمرا تھا اور اس کے دائیں طرف ایک چھوٹا دروازہ تھا جو باتھ روم ثابت ہوا۔ حوائج ضروریہ اور غیر ضروریہ سے فارغ ہو کر میں واپس آیا تو وہ اسی پوز میں کھڑا تھا ''ہاتھ اوپر رکھو۔''

میں نے ہاتھ اوپر کرتے ہوئے پوچھا۔ ''فتح خان کہاں ہے؟''

''میں کسی فتح خان کو نہیں جانتا، اندر چلو۔''

میں کمرے میں آیا۔ ''پھر مجھے یہاں کون لایا تھا؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے کہا اور دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔ اتنی دیر میں، میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ شخص ذہنی لحاظ سے اتنا چوکس نہیں ہے لیکن اسے جو کام سونپا جاتا ہے، اسے نہایت توجہ سے کرتا ہے۔ میرے بارے میں شاید اسے بتا دیا گیا تھا کہ میں نہتا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہوں اس لئے وہ میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مجھ پر سے نظر نہیں ہٹائی تھی اور نہ ہی رائفل کو جنبش دی تھی۔ ذرا دیر بعد میں باقی ماندہ پانی اور سیب معدے میں ڈال کر بے فکری سے لیٹ گیا۔ یہ صورتِ حال میرے لئے نئی نہیں تھی اس لئے جو بھی ہوتا دیکھا جاتا۔ میری گھڑی میری کلائی پر تھی اور اس کے مطابق شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ روشن دان سے آنے والی روشنی بہت کم رہ گئی تھی۔ شاید سورج ڈوبنے والا تھا۔ کمرے میں بلب تھا مگر اس کا سوئچ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد بلب خود بخود روشن ہو گیا۔ یقیناً اسے باہر سے روشن کیا گیا تھا۔ چھ بجے دروازہ کھلا اور

دیوقامت نے ایک بوتل اور ٹرے اندر رکھ دی ٹرے میں رکھے پیالے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ وہ غرایا۔

"پڑے رہو۔" اس نے رائفل کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ میں ساکت ہو گیا اس نے ٹرے سرکا کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اٹھ کر پیالا دیکھا۔ اس میں مرغی کا سوپ تھا۔ سوپ میں بوٹیوں کے ریشے اور انڈے کے ابلے ہوئے ٹکڑے بھی تیر رہے تھے۔ اس سے زبردست خوشبو اٹھ رہی تھی۔ جس نے میرے اندر سیبوں سے نکل جانے والی بھوک کو جگا دیا تھا۔ میں نے پیالا اٹھا کر چمچے سے سوپ چکھا۔ یہ کنگ سائز پیالا تھا جس میں عام طور سے دیہاتوں میں دودھ یا اسی طرح کی اشیاء پی جاتی ہیں۔ چائے کے شوقین بزرگ عام طور پر اسی سائز کے پیالے میں چائے نوش کرنا پسند فرماتے ہیں۔

میں نے سوپ پینا شروع کیا تو اس وقت میرے ہاتھ رکے جب پیالہ خالی ہو گیا۔ یک لخت میرے اعصاب میں ڈھیلا پن آ گیا پہلے تو میں اسے پُرخوری کا خمار سمجھا لیکن جب یہ خمار میرے حواس پر طاری ہونے لگا اور کمرے کے در و دیوار مع بلب اور دروازے کے میری نظروں کے سامنے گھومنے لگے تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ ساقی نے کچھ ملا دیا تھا سوپ میں، چکرا کر گرنے سے بہتر سمجھا کہ خود کمبل پر دراز ہو جاؤں۔ کمبل پر لیٹا تو چکروں کی شدت سے آنکھیں کھولنا بھی محال لگ رہا تھا نہ جانے کب اس چکراتے ذہن کے ساتھ میں ایک بار پھر بے ہوشی کی آغوش میں جا سویا۔ نہ جانے دشمن میرے ساتھ کیا کھیل، کھیل رہے تھے۔ مجھے مارنے کے بجائے اس طرح زندہ رکھنے میں ان کا کیا مفاد تھا؟ فی الحال میرے چکراتے ہوئے ذہن میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆======☆======☆

اگلی بار میں جاگا تو اس طرح دو افراد کے درمیان سینڈوچ بنا ہوا تھا کہ میرے ہاتھ سامنے کر کے بندھے ہوئے تھے۔ اسی طرح دونوں پاؤں بھی بندھے تھے۔ یہ کسی بڑی گاڑی کا عقبی حصہ تھا۔ چاروں طرف یوں پردے پڑے تھے جیسے پردہ دار خواتین کی گاڑیوں میں ہوتے ہیں کہ ان پر ڈرائیور کی نظر بھی نہ پڑے۔ انجن کی آواز سے لگ رہا تھا کہ یہ کوئی بڑی گاڑی تھی۔ میں نے خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ "لگتا ہے اب شادی کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔ میرے ساتھ نکاح بالجبر کی واردات ہونے والی ہے۔ تم لوگ شاید میرے ہونے والے سالے ہو۔"

"بکومت!" بائیں طرف موجود شخص غرایا۔

"کیا سالا ہونا اتنی بری بات ہے؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔ "یا تم مجھے اپنی ماں کے لئے زیادہ موزوں سمجھتے ہو؟"

وہ حسبِ توقع مشتعل ہوا اور اس کا بائیں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا۔ میں تیار تھا اس کے باوجود جب پستول کا دستہ سر پر لگا تو مجھے چکر آ گیا اور میں نے مارنے والے کے شانے سے سر ٹکا لیا۔ میری کوشش تھی کہ بے حال ہونے پاؤں، دوسرے نے سرد لہجے میں کہا۔

"یہ کیا، کیا؟"

''بکواس کیے جا رہا تھا۔'' پہلے نے مشتعل لہجے میں کہا۔ ''حرام زادہ، ماں کا نام لیتا تھا۔''

''باس کا حکم ہے، اسے بغیر کسی نقصان کے مطلوبہ جگہ پہنچانا ہے۔'' دوسرے والے کا لہجہ مزید سرد ہو گیا تھا۔ ''اب اس کے سامنے وضاحت کرنا کہ اسے کیوں بے ہوش کیا بلکہ اپنی ماں کو بھی لے آنا۔''

غالباً پہلے والے کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ اس نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ ''اس نے مجھے غصہ دلا دیا تھا اس لئے......''

''باس بھی تمہاری قوتِ برداشت کا امتحان لے گا۔''

اس سارے چکر کا مقصد یہ جاننا تھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے اور لے جانے والے کون ہیں؟ یہ کسے باس کہہ رہے ہیں؟ اب دونوں چپ تھے، دوسرے نے مجھے ہلایا۔ ''پوری طرح بے ہوش ہے ممکن ہے مر جائے۔ اگر یہ مر گیا تو جانتے ہو کیا ہو گا؟''

''کیا ہو گا، قیامت آ جائے گی؟'' پہلے نے چڑ کر پوچھا۔

''اپنے لئے تو آ گئی سمجھو، باس کے لئے یہ شخص بہت اہم ہے۔''

پہلے والے نے دبی زبان میں باس کی شان میں گستاخی کی۔ ''دیکھ لوں گا اسے بھی، میرا نام شمشاد ہے۔''

''ضرور دیکھ لینا۔'' دوسرے نے طنز کیا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ جیپ ناہموار اونچے نیچے راستوں پر چل رہی تھی اور راستے میں موڑ بھی بہت زیادہ تھے۔ جیپ کسی پہاڑی علاقے میں سفر کر رہی تھی۔ انجن کی آواز اور پھر فور وہیل ڈرائیور سے یہ گاڑی جیپ ہی لگ رہی تھی۔ گاڑی کا ہیٹر آن تھا کیونکہ سامنے سے گرم ہوا کی لہریں آ رہی تھیں پھر بھی سردی کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے جسم پر کپڑوں کے اوپر ایک سادہ سے سوئٹر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جو ظاہر ہے انہی لوگوں نے مجھے پہنایا تھا۔

''میں سردی سے تنگ آ گیا ہوں۔'' کچھ دیر بعد پہلے والے نے کہا۔ ''نہ جانے کب یہ کام ختم ہو گا اور ہم لاہور جائیں گے۔ پہلے اس لڑکی اور مرد کو پہنچایا تھا، اب اسے لے جا رہے ہیں۔''

''لگتا ہے تم اپنی زندگی سے تنگ آ گئے ہو تبھی اتنی بکواس کر رہے ہو۔'' دوسرے نے آہستہ سے کہا۔ ''ڈرائیور تمہارا چاچا نہیں ہے اس نے تمہاری گل افشانیاں باس تک پہنچا دیں تو اپنا انجام سوچ لینا۔''

''کیا کرے گا وہ چینی خر کار!'' پہلا حقارت سے ہنسا۔

میں نے خود کو بمشکل چونکنے سے باز رکھا۔ چینی نقوش فتح خان کے تھے۔ لڑکا اور لڑکی کے ذکر نے بھی میرے خون کی گردش تیز کر دی تھی، وہ یقیناً مونا اور سفیر تھے؟ ظاہر ہے انہیں بھی فتح خان نے اغوا کرایا ہو گا۔ بے شک وہ میری قید میں تھا لیکن اس کے کارپرداز تو آزاد تھے۔ مجھے بھی اب وہیں لے جایا جا رہا تھا۔ کیا سب کا حشر ایک ساتھ برپا کرنا تھا؟ میں اپنے سر کی تکلیف سے توجہ ہٹانے کے لئے ان کی باتیں غور سے سنتا رہا تھا۔ اب خاموشی ہوئی تو سر کا زخم یاد آنے لگا تھا۔ شکر ہے میں وار کے لئے تیار تھا اس لئے بچت ہو گئی ورنہ میں پھر بے ہوش ہو جاتا اور اتنی قیمتی معلومات سے محروم رہ جاتا۔ اس کے لئے مجھے اس ہاتھ چھوڑ بڑبولے کا بھی شکر گزار ہونا چاہئے تھا جس کی زبان میں اس کے ہاتھ سے کہیں زیادہ خارش ہو رہی تھی۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد جیپ نے ایک

تقریباً عمودی قسم کی چڑھائی چڑھنا شروع کی۔ پہلے والے نے اعلان کیا۔ ''ہم پہنچ گئے ہیں۔''

''پتا ہے، اپنا منہ بند رکھ۔'' دوسرے نے بیزاری سے جواب دیا۔

جیپ کسی بلند پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ پہلے والے کی زبان میں پھر کھرک (کھجلی) اٹھی۔ ''پتا نہیں اس پہاڑ پر یہ جگہ بنانے کی کیا تک تھی؟''

''تو کیا تیرے باپ کا مقبرہ بنتا؟'' دوسرے نے جھنجلا کر کہا تھا۔

راستے کا عمودی پن کم ہوا اور بالآخر جیپ ایک ہموار جگہ پہنچ کر رک گئی۔ ''چل اسے اتار۔'' دوسرے والے نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور فوراً ہی یخ ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ میں نے خود کو لرزنے سے بمشکل روکا۔ انہوں نے مجھے باہر کھینچا اور جب اٹھایا تو میرا سر پیچھے کی طرف جھول رہا تھا۔ شاید دوپہر کا وقت تھا کیونکہ سورج اوپر تھا۔ یعنی جہاں تک میری نگاہ جاتی تھی بلند و بالا جنگلات سے ڈھکے پہاڑ تھے جن کی چوٹیوں پر برف تھی۔ نومبر کا آغاز تھا اور اس علاقے کا موسم نہایت یخ تھا۔ میرا اندازہ گاڑی کے بارے میں درست تھا، یہ جیپ تھی اور اس کے شیشے سیاہ رنگ کے تھے۔ جیپ کسی عمارت کے پورچ میں کھڑی تھی۔ عمارت کی ساخت کا اس نامعقول قسم کے زاویے سے جائزہ لینا تقریباً ناممکن تھا اور دوسرے مجھے بمشکل ایک منٹ کھلی فضا میں گزارنے کا موقع ملا تھا۔ پھر مجھے اندر لے جایا گیا۔ یہ کوئی طویل راہداری تھی۔ جو کارپٹ سے ڈھکی تھی۔ دیواروں کے ساتھ سجاوٹ کے لئے مختلف اشیا تھیں۔ اسی حالت میں مجھے ایک تہ خانے میں لے جایا گیا۔ بالآخر انہوں نے مجھے ایک دبیز قالین پر پٹخا اور گدھوں کی طرح ہانپنے لگے۔ یہ تہ خانے کا مرکزی حصہ تھا۔ اس کے آگے شاید مزید حصے تھے کیونکہ دو عدد دروازے مجھے نظر آئے تھے۔ تہ خانہ ہونے کی وجہ سے موسم کی شدت کم ہو گئی تھی مگر پھر بھی خاصی سردی تھی۔

''باس کہاں ہے؟'' دوسرے نے کہا۔ ''اس نے کہا تھا، اسے یہاں تک پہنچانا ہے۔''

''تو پھر چلو، اسے یہاں پڑا رہنے دو۔'' پہلے والے نے بے تابی سے کہا۔ ''ویسے بھی ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔''

''ابھی نہیں۔ جب تک باس ہمیں جانے کی اجازت نہیں دے گا، ہم یہاں سے کیسے جا سکتے ہیں؟''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' سیڑھیوں کی طرف سے فتح خان کی آواز آئی۔ ''تم میری اجازت کے بغیر نہیں جا سکتے۔''

''باس، آپ۔'' دوسرے نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ ''ہم اسے لے آئے ہیں۔''

''میرے کو معلوم ہے۔ جیپ کا ڈرائیور میں ہی تو تھا۔'' فتح خان نے اطمینان سے کہا تھا۔

''نہیں۔'' بڑبولے کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''ہاں...... میں نے وہ سب سنا جو تم میرے بارے میں فرما رہا تھا۔''

''باس، خدا کے لئے رحم!'' پہلے والے نے چلا کر کہا۔

''اندر چلو۔'' فتح خان کا لہجہ سرد تھا۔

''باس، اسے معاف کر دو۔'' دوسرے نے گویا سفارش کی۔

''بکواس بند کرو، تم بھی چلو۔'' فتح خان نے اسے جھڑکا۔

''نہیں۔'' پہلے والا ہذیانی انداز میں بولا پھر اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر اسے سیڑھیوں سے آگے جانا نصیب نہیں ہوا۔ فتح خان نے عقب سے اس کے دل میں گولی اتار دی، وہ منہ کے بل گرا اور چند لمحے تک ہاتھ پاؤں پٹخنے کے بعد ساکت ہو گیا تھا۔ فتح خان نے دوسرے سے کہا۔''اس کی لاش اٹھاؤ، اندر چلو۔''

''م......میرا قصور باس! میں تو اسے چپ کراتا رہا تھا۔'' دوسرے نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس کی لاش ٹھکانے لگاؤ۔'' فتح خان ہنس کر بولا لیکن اس کے لہجے میں چھپی سفاکی میں بخوبی محسوس کر رہا تھا۔ دوسرا بے چارہ رحم کے لئے دہائیاں دیتا اپنے ساتھی کی لاش اٹھا کر اس کے ہمراہ کمرے میں لے گیا اور پھر میں نے دوسرے فائر کی آواز سنی۔ فتح خان نے اسے بھی ختم کر دیا تھا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا اور بولا۔''شہباز خان! اٹھ جاؤ، میرے کو پتا ہے تم ہوش میں ہے۔''

''شہباز ملک!'' میں نے بیٹھتے ہوئے تصحیح کی۔''ویسے ان بے چاروں کا قصور اتنا زیادہ تو نہیں تھا کہ تم انہیں مار ہی ڈالتے!''

''ان کا قصور اس سے بھی بڑا تھا۔ انہوں نے یہ جگہ دیکھ لیا تھا، اس جگہ سے ہر بندے کو واقف نہیں ہونا چاہیے۔''

''یعنی تم نے پہلے بھی کئی بندے مارے ہیں؟'' میں نے غور کیا۔

فتح خان مکارانہ انداز میں مسکرایا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ میں نے پوچھا۔''اس کمرے میں کیا ہے، جو وہ بڑبولا اس میں جانے کا سن کر پاگل ہو گیا تھا؟''

''دعا کرو...... تمہیں اس کمرے میں نہ جانا پڑے۔'' اس نے جواب دیا اور میرے بندھے ہاتھ اور پیروں کا معائنہ کیا۔

''لیکن شاید میں تمہیں اس کمرے میں لے جاؤں۔'' میں نے کہا۔''جب میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں پوچھوں گا۔''

''کیا تم اس پوزیشن میں ہے؟'' اس نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

''فتح خان! پوزیشن کی بات مت کرو۔ تم جانتے ہو، میں نے کبھی حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی، کئی مواقع ایسے آئے جب میں تمہیں بہ آسانی اس دنیا سے رخصت کر سکتا تھا۔''

''میں تمہارا احسان مند ہے۔'' وہ بدستور غیر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''فتح خان! میرے ساتھی کہاں ہیں؟ مونا، سفیر، وسیم، سونیا اور عادل؟'' اس بار میں نے کسی قدر ملتجی لہجے میں کہا۔

''مونا اور سفیر اِدھر ہی ہیں۔ وسیم اور وہ لڑکی سونیا غائب ہے۔ وسیم زخمی تھا، وہ واپس بھاگا لیکن جب میرے آدمی اس کے ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں صرف بے ہوش عادل تھا۔''

''وسیم زخمی تھا...... کیسے؟''

''وہ خوش قسمت تھا جو بچ گیا، اس کے ساتھ آنے والوں میں صرف تم بچے ہو یا وسیم...... باقی سب

مارے گئے۔"

"اور عادل؟"

فتح خان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔"میرا خون منگول ہے...... میرا جدِ اعلیٰ چنگیز خان ایسے لوگوں کے لئے ایک ہی حکم دیتا تھا۔ جو اپنوں سے غداری کر کے اس سے ملتا تھا، ان کو تلوار کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔"

میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی تھی"تمہارا مطلب ہے عادل......؟"

"تم نے غور نہیں کیا، میں تمہارے سامنے بالکل ٹھیک ٹھاک کھڑا ہوں۔"

میری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹنے لگے۔ اسے انجکشن دینے والا عادل تھا۔ ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ وہ اسے ہیروئن کے انجکشن دیتا ہے مگر ہم نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ انجکشن واقعی ہیروئن کا تھا یا طاقت کا۔ عادل کا انداز اگرچہ شروع سے مخاصمانہ تھا لیکن میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس حد تک چلا جائے گا۔ وہ فتح خان سے مل گیا تھا۔ لیکن اس نے ایسا کیوں کیا۔ فتح خان نے یہ سوال میری آنکھوں میں پڑھ لیا تھا۔

"سربراہ بننے کے لالچ میں اس نے میرا ساتھ دیا۔ اس کا کہنا تھا اس کے بدلے میں اسے تم سے اور وسیم سے چھٹکارا دلوا دوں۔"

"اس نے میرے اور وسیم کے قتل کی بات کی تھی؟" میرے انداز میں بے یقینی تھی۔

وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔"تو چھٹکارا کیسے دلاتے ہیں؟"

"میرے خدا...... عادل اس حد تک گر جائے گا، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

"شاید وہ لوگ بھی اس کی اصلیت سے واقف ہو گئے تھے اس لئے اسے وہیں کوٹھی میں چھوڑ گئے تھے ورنہ اسے بھی ساتھ لے جاتے۔"

"تم نے کیا، کیا اس کے ساتھ؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"میں بے ہوش آدمی پر گولی ضائع نہیں کرتا۔" فتح خان سفاکی سے بولا۔"میں نے اس کا گلا دبا کر......"

"حرام زادے!" میں نے بندھے پیروں سے اس کے پاؤں پر پوری قوت سے ٹھوکر ماری۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا، ڈکرا کر الٹ گیا۔ میں نے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن بندھے ہاتھ پیروں سے یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ فتح خان گالیاں بکتا اٹھا اور میرے سینے پر ٹھوکر ماری۔ اس بار میں منہ کے بل گرا۔ لیکن اس نے میرے قریب آنے سے گریز کیا اور دور کھڑا گالیاں اور دھمکیاں دیتا رہا۔ میں تکلیف برداشت کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس نے بہت زور سے ٹھوکر ماری تھی۔"فتح خان...... تمہیں بہت سارے بے گناہوں کے خون کا حساب دینا ہو گا۔"

"ہم دے لے گا، تم اپنی فکر کرو۔"

"تم کس کے لئے کام کر رہے ہو، مرشد علی یا ڈیوڈ شا کے لئے؟"

"مرشد علی!" وہ حقارت سے بولا۔"ہم سمجھتا تھا دنیا کا سب سے کمینہ اور سفاک آدمی ہم ہے، پر یہ مرشد علی...... بہت ہی ذلیل آدمی ہے۔"

"کم سے کم تمہارے مقابلے میں۔" میں نے سر ہلایا۔"گویا تم ڈیوڈ شا کے لئے کام کر رہے ہو۔ ڈیوڈ شا

کہاں ہے؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''بکواس...... تمہیں پتا نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے، تم مجھے نہیں بتانا چاہتے۔''

''چلو ایسا ہی سمجھو لو۔'' وہ ہنسا۔

''فتح خان، یہ کون سا علاقہ ہے؟ راجا عمر دراز کا؟'' اچانک مجھے خیال آیا۔

''نہیں، پر اس سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔''

''حکیم قادس کو تم لوگوں نے کیوں پکڑ رکھا ہے؟''

''ڈیوڈ صاحب جانے...... اس کے حکم پر ہم نے حکیم کو اغوا کیا تھا۔''

میں نے غور کیا۔ ''تو وہ سارا چکر حکیم قادس کو اغوا کرنے کے لئے تھا۔ میں مفت میں تم لوگوں کے ہاتھ آ گیا۔''

''ایسا ہی سمجھ لو۔ ڈیوڈ صاحب تمہیں مرشد سے بچانا چاہتا تھا اس لئے اس شرط پر اس کے حوالے کیا کہ تم کو نقصان نہ ہو۔''

''اس مہربانی کی وجہ؟'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''یہ بھی ڈیوڈ صاحب جانے۔'' اس نے شانے ہلائے۔

''مونا اور سفیر کہاں ہیں؟''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''دو دن سے مرشد علی پاگل کتے کا مافق میرے پیچھے لگا ہے۔''

''مونا اور سفیر کے لئے؟''

''صرف لڑکی کا واسطے۔ کہتا ہے، لڑکی صرف دو دن کے لئے اس کے حوالے کر دی جائے، ڈیوڈ صاحب کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''اس نے ہمیں لالچ بھی دیا تھا، دس لاکھ کا...... جب نہیں مانا...... تو دھمکیاں بھی دی تھیں پر فتح خان ان جیسے زنخوں سے نہیں ڈرتا جو صرف کمزور لوگوں پر اکڑتے ہیں۔''

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے، میرے ہاتھ پاؤں کھول کر دیکھو۔'' میں نے چیلنج کیا۔

''میں بے وقوف نہیں ہے۔'' وہ مسکرایا اور پھر اس نے سیڑھیوں کی طرف منہ کر کے کسی کو آواز دی۔

''گلے خان، اِدھر آ۔''

''یہ گلے خان کیسا نام ہے؟''

وہ ہنسا۔ ''گل خان اصل نام ہے۔ پر میں گلے خان کہتا ہوں۔ میرا کتے کی طرح وفادار ہے۔''

چند لمحے بعد جو شے اندر آئی، اسے گلے خان نہیں بلکہ گلگلے خان کہنا زیادہ مناسب تھا۔ پانچ فٹ کی اونچائی اور ڈھائی فٹ کے قطر میں تقریباً ڈھائی سو پونڈ وزن قید تھا اور تھل تھل کرتا تھا۔

''حکم خان صیب!'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''اسے بھی ان دونوں کے ساتھ بند کرنا ہے۔'' فتح خان نے حکم دیا۔

''اس کا پاؤں بندھا ہے۔'' اس نے میرا جائزہ لیا۔

''پاؤں کھول دو۔'' فتح خان نے پستول نکال لیا، اسی پستول سے اس نے کچھ دیر پہلے اپنے دو ساتھی مارے تھے اور ان کو مار کر بھی بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ جیسے اس نے دو انسانی جانیں نہیں لی تھیں بلکہ دو چیونٹیاں مسل دی تھیں۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا، اگر میری طرف سے اسے خطرہ ہوا تو وہ بے دریغ مجھے بھی گولی مار دے گا۔ گلے خان نے میرے پاؤں کی رسی کھولی۔

''کھڑے ہو جاؤ۔'' وہ جس طرح ہانپ رہا تھا، لگتا تھا اپنا وزن اٹھانا بھی اس کے لئے دشوار تھا لیکن مجھے اس نے نہایت آسانی سے اٹھا لیا تھا پھر اس نے مجھے دھکا دیا۔ ''چلو، خدائی خوار۔''

اس نے مجھے کمرے میں موجود دوسرے دروازے کی طرف دھکیلا۔ میرے پیچھے وہ تھا اور اس کے عقب میں فتح خان۔ وہ میری طرف سے پوری طرح محتاط تھا۔ مجھ سے اس نے ایک خاص فاصلہ برقرار رکھا تھا۔ گلے خان نے چابی سے اس دروازے کا تالا کھولا۔ اس طرف ایک راہ داری تھی اور اس کے دونوں جانب لوہے کی سلاخیں نظر آ رہی تھیں۔ شاید باقاعدہ قید خانہ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کتنے عرصے بعد مونا اور سفیر کو دیکھتا۔ بے شک قید میں ہی سہی لیکن میں اپنے پیاروں کو دیکھ سکتا تھا، ان سے مل سکتا تھا۔ راہداری کے دونوں طرف سلاخیں لگا کر چار سیل بنا دیئے گئے تھے۔ پہلے دونوں سیل خالی تھے۔ میں نے بے ساختہ آواز دی۔

''مونا...... سفی کہاں ہو تم؟'' میری آواز مرتعش تھی۔

وہ دونوں تڑپ کر آئے۔ مونا بائیں طرف کی دوسری کوٹھری میں تھی اور سفیر دائیں طرف کی تیسری کوٹھری میں تھا۔ مونا چلائی۔ ''شوبی!'' اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اس کی طرف لپکا، سلاخوں سے ہاتھ ڈال کر اس کا سر تھپکنے لگا۔

''مونا...... میری گڑیا!...... روؤ مت، چپ کرو...... شاباش، دیکھو میں بھی آ گیا ہوں۔''

''شوبی!'' اس بار سفیر نے گلوگیر لہجے میں پکارا اور میں سلاخوں سے ہی اس سے چمٹ گیا۔

''تُو ٹھیک ہے ناں......؟'' میں نے اسے ٹٹولا۔

''دیکھ لو شہباز خان!'' عقب سے فتح خان نے پکار کر کہا۔ ''تمہارا ساتھی ایک دم ٹھیک ٹھاک اور فٹ فاٹ ہے۔''

میں نے پلٹ کر کہا۔ ''فتح خان! انہیں کھول دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں، ہم کوئی ایسی حرکت نہیں......''

''فتح خان کسی پر اعتبار کرنے والا شخص نہیں ہے۔ ورنہ مرشد کی بات نہ مان لیتا۔ دس لاکھ کسے برے لگتے ہیں!''

''یہ تم نے اپنے حق میں اچھا کیا۔ ورنہ تم یہ دس لاکھ استعمال کرنے کے لئے زندہ نہ رہتے۔'' میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ اس کے اشارے پر گلے خان نے مجھے سفیر کے برابر والی دوسرے نمبر کی کوٹھری میں دھکیل دیا۔

''اب تم آرام کرو۔'' فتح خان نے سامنے آ کر کہا۔

''حکیم قادس کہاں ہے؟''

''اسی کوٹھی میں...... لیکن اوپر ہے۔ وہ ذرامعزز قیدی ہے۔''

فتح خان اور اس کا ملازم باہر چلے گئے میں نے دروازہ لاک ہونے کی آواز سنی۔ ایک گہرا سانس لے کر میں نے اس جگہ کا جائزہ لیا۔ یہ جگہ بند تھی لیکن یہاں گھٹن نہیں تھی۔ ایک طرف لکڑی کا بستر تھا جس پر فوم کا پتلا گدا بچھا تھا اوڑھنے کے لئے ایک ہلکا کمبل تھا۔ روشنی کے لئے راہداری کے وسط میں دو ٹیوب لائٹیں جل رہی تھیں اور ان کی روشنی کافی زیادہ تھی۔ ان کے جاتے ہی سفیر نے کہا۔ ''تو کیسے پھنسا یار؟''

''میں تو شروع سے ہی پھنسا ہوا ہوں لیکن یہ تم لوگوں کو کیا سوجھی تھی، اچھی بھلی محفوظ حویلی سے نکل گئے۔ ڈاکٹر کو گھر پر بھی بلایا جا سکتا تھا۔''

''بس یار! اتنے دن سے کہیں نکلے نہیں تھے اور بور ہو رہے تھے۔'' سفیر نے شرمندگی سے کہا۔ ''سوچا تھا کہ مونا کو ڈاکٹر کو دکھا دیں گے اور کچھ گھوم پھر لیں گے۔''

''اور یہاں پہنچ جائیں گے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہ بتا کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔''

''نہیں...... بس میں نے ذرا مزاحمت کی تو کم بختوں نے بے دردی سے سر پر ڈنڈا دے مارا۔''

''مونا نے پوچھا۔'' تم کیسے پکڑے گئے؟''

''نہ پوچھو، بڑی لمبی داستان ہے، آہستہ آہستہ سناؤں گا۔ کیا تم لوگوں کو علم ہے، ہم ڈیوڈ شا کے قبضے میں ہیں۔''

''ہاں، فتح خان نے مجھے بتا دیا تھا۔ وہ ہم سے آج ہی ملا ہے۔ ورنہ ہم اس سے پہلے اجنبی افراد کی تحویل میں تھے اور مرشد علی کا سوچ کر میرا خون خشک ہو رہا تھا۔''

''اس نے کوشش کی تھی بقول فتح خان کے...... لیکن وہ مانا نہیں۔ ہمیں براہ راست ڈیوڈ شا نے اغوا کرایا ہے۔ حکیم قادس بھی اسی کے قبضے میں ہے۔''

''ڈیوڈ شا کس چکر میں ہے؟'' سفیر نے پوچھا۔

''یہ تو شاید فتح خان بھی نہیں جانتا اور ایک مزے کی بات بتاؤں کہ پچھلے کچھ عرصے میں میرا ایمن سے رابطہ ہے۔ برٹ شا کی بیٹی اور ڈیوڈ شاہ کی بھتیجی۔''

''واقعی، کیا وہ تم سے ملی تھی؟'' مونا نے بے چینی سے کہا۔ ''حویلی میں ٹی وی پر میں نے اس کے کئی پروگرام دیکھے تھے۔''

''نہیں، انٹرنیٹ پر رابطہ ہوا تھا۔ وہ پاکستان آنے والی تھی یا آ چکی ہوگی۔ برطانوی وزارت خارجہ کے توسط سے پاکستانی حکام سے اپنے گمشدہ باپ کی تلاش کے لئے ایک کوشش اور کرنے کی درخواست کی ہے۔''

''تم یاد تھے اسے؟'' سفیر کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''ہم بھولنے والی شے نہیں ہیں پیارے۔'' اس وقت شام کے چار بج رہے تھے۔ میں نے انہیں اپنی داستان سنانی شروع کی۔ زہرہ کا ذکر میں نے مونا کی وجہ سے ذرا احتیاط سے کیا تھا۔ بعد میں جب میں نے خادم حسین کے مارے جانے اور زہرہ کے غائب ہونے کا ذکر کیا تو مونا افسردہ ہوگئی۔ وہ میرے سامنے تھی اس لئے

سا اس کے تاثرات دیکھ سکتا تھا۔

''کاش! خادم حسین تمہاری بات مان کر وہاں سے فوری روانہ ہو جاتا۔'' سفیر نے کہا۔

''یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی سنسنی خیز انگلش مووی دیکھ رہے ہیں۔'' مونا نے کہا۔

''مجھے خود بھی یقین نہیں آیا تھا۔ بہر حال اب ذرا عادی ہو گیا ہوں۔''

رات آٹھ بجے تک میں نے اپنی داستان مکمل کر لی تھی۔ عادل کی غداری اور پھر موت کا سن کر وہ دنگ رہ گئے۔ سفیر نے بے تابی سے کہا۔ ''یار، وسیم ٹھیک ہو گا نا...... مجھے اس بندے سے نہ جانے کیوں محبت محسوس ہوتی ہے۔''

''خدا نے اسے بچا لیا ورنہ فتح خان اور عادل نے بہت مضبوط جال بچھایا تھا۔ مجھے امید ہے، وہ خیریت سے ہوگا۔ وہ عادل کو بے ہوش کر کے سونیا کو نکال لے گیا تھا۔''

''خدا کے بعد وہی ہمارے کام آتا رہا۔'' مونا نے کہا۔

''ہاں، لیکن ہم اپنی جدوجہد میں کسی شخص پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمیں اپنی جنگ خود لڑنا ہوگی۔''

''مرشد علی جیسے شخص سے؟'' سفیر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں، کیوں کہ ہم اس جیسے شخص کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال سکتے۔ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے، مرنا تو ہے پھر کیوں نہ ہم جدوجہد کریں۔ مرشد علی ہمارے جیسا انسان ہے بلکہ ہمیں اس پر برتری حاصل ہے کیونکہ ہم حق پر ہیں۔''

''کیا اس جیسا شخص حق یا ناحق کا مطلب سمجھتا ہے؟'' سفیر نے ایک بار پھر طنزیہ کہا۔

''سفیر، جب معاملہ زندگی اور موت کا آتا ہے تو سب سے کمزور انسان وہ نکلتا ہے جس کا ضمیر کمزور ہو۔''

''مرشد علی جیسے افراد کے پاس سرے سے ضمیر ہی نہیں ہوتا ہے۔'' مونا نے لقمہ دیا۔

''اس لحاظ سے مرشد علی بہت کمزور ہے بشرطیکہ ہم اسے یقین دلا دیں کہ ہم اس کے خلاف آخری حد تک جانے کو تیار ہیں۔''

''یعنی مرنے، مارنے کو تیار ہیں؟'' سفیر نے پوچھا۔

''بالکل......! اس کے بعد دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتا ہے؟''

''یہ یقین ہم کیسے دلائیں گے؟'' سفیر بولا۔ ''جبکہ ہم خود یہاں فتح خان کی قید میں ہیں۔''

''دیکھو سفی! کوئی بھی عمل سے پہلے صرف ایک خیال ہوتا ہے، ہم آج سوچیں گے تو کل عمل کریں گے ں! اور ممکن ہے ہمیں یہ بات بتانے کا موقع یہیں مل جائے۔''

''اس کے بعد......؟''

''یار، کچھ مستقبل کے لئے بھی چھوڑ دو۔''

''بات حلق سے نہیں اتر رہی ہے۔''

''اس صورت میں بہتر ہوگا کہ تم فتح خان سے چھٹکارا پاتے ہی ملک سے باہر نکل جانا کیونکہ اس صورت م دونوں آزاد فضا میں سانس لے سکو گے۔'' میرا لہجہ سرد تھا۔

''سفیر!'' مونا چلائی۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم...... ہم شوبی کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' سفیر نے شرمندگی سے کہا۔

''پھر کیا مطلب تھا؟'' مونا برہمی سے بولی۔ ''تم نے پوری بات سنی ہی نہیں اور بحث کرنا شروع کر دی۔'' اس کے بعد مونا نے اسے بے بھاؤ کی سنائیں یہاں تک کہ مجھے مداخلت کرنا پڑی تھی۔

''بی بی، آج کے لئے اتنا کافی ہے۔''

''آپ چپ رہیں...... بجائے اسے کچھ کہنے کے الٹا شہ دے رہے ہیں۔'' غصے میں وہ آپ جناب پر اتر آئی تھی۔ ''کتنی آسانی سے کہہ دیا آپ نے...... ہم باہر چلے جائیں۔ آپ کو چھوڑ کر!''

''سوری!'' سفیر نے اس بار زیادہ شرمندگی سے کہا تھا۔ ''خدا کی قسم، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

مونا جواب دینے کے بجائے سلاخوں سے سر ٹکا کر رونے لگی۔ اس بار میں بھی بوکھلا گیا۔ ''اوہ! مونا...... اُلو کی پٹھی...... دیکھو، تم نے رونا بند نہ کیا تو میں یہ سلاخیں توڑ دوں گا۔''

''سلاخیں بہت مضبوط ہیں۔'' اس نے روتے روتے کہا۔

''مونا...... میں وعدہ کرتا ہوں، آئندہ کبھی ایسی بات نہیں کروں گا۔'' سفیر نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''تمہاری قسم...... ہم شوبی کا ساتھ دیں گے، فتح یا موت...... دونوں میں سے ایک شے ہمارا مقدر ہوگی۔''

''ان شاء اللہ...... مرشد علی جیسے لوگ اوپر سے پہاڑ نظر آتے ہیں لیکن اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ وہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔''

بمشکل مونا کا موڈ بحال کیا۔ ابھی ہم نے باتوں کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا تھا کہ گلے خان نازل ہوا۔ اس نے کھانے کی تین عدد تھالیاں اٹھا رکھی تھیں۔ ان میں خمیری روٹی اور بھنا ہوا بھیڑ کا گوشت تھا۔ ساتھ میں پانی کی تین عدد پیٹ بوتلیں تھیں اس نے تھالیاں سلاخوں کے نچلے حصے سے اندر سرکا دیں ''کھانا کھالو، ام ایک گھنٹے بعد آئے گا۔ لیٹرین لے جانے کا واسطے۔''

میرا پیٹ قطعی خالی تھا اس لئے میں نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ وہ دونوں بھی کھانے لگے۔ مونا نے کہا۔ ''پتا نہیں یہاں کے پانی کی تاثیر ہے یا آب و ہوا کا اثر ہے، بھوک کھل کر لگتی ہے حالانکہ ہم سارا دن بیٹھے یا لیٹے رہتے ہیں۔''

''غلط!'' سفیر نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔ ''میں سارا دن آرام ہی نہیں کرتا ہوں بلکہ ایکسرسائز بھی کرتا ہوں۔''

کھانا معقول مقدار میں تھا اس لئے پیٹ کے ساتھ نیت بھی بھر گئی۔ پھر لذیذ بھی تھا۔ اس میں پہاڑی کھانوں والی سادگی اور لذت تھی۔ لیکن یہ امیروں والا کھانا تھا۔ یہاں گوشت دولت مند ہی کھاتے ہیں۔ غریب غربا بلکہ متوسط طبقے کے لوگ بھی سبزیوں اور اناج پر گزارا کرتے ہیں کیونکہ مویشی ان کی دولت ہوتے ہیں اور ان سے ہی کماتے ہیں۔ دس بجے گلے خان آیا اور سب سے پہلے مونا کی کوٹھری کا دروازہ کھولا اور اسے اوپر لے گیا۔ میرے اندر اندیشے سر سرانے لگے مگر یہ اندیشے میں نے اپنے اندر ہی رکھے۔ پندرہ منٹ بعد مونا کی واپسی ہوئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ گلے خان نے اگلا دروازہ میری کوٹھری کا کھولا اور غرا کر بولا۔ ''چلو جلد

کرو۔"

میں اس کے ساتھ اوپر آیا۔ کوٹھی کے ایک حصے میں شاید ملازمین کے لئے باتھ روم اور لیٹرین بنے تھے۔ یہ بھی صاف ستھری حالت میں تھے لیکن اس جگہ کے شایان شان نہیں تھے کہ جس گیلری سے گزر کر تہ خانے تک رسائی حاصل کی جاتی تھی، یہ لیٹرین اور باتھ روم اس کے دائیں جانب ایک اور راہداری کے آخری میں تھے، وہ حصہ ملازمین کے لئے مخصوص لگ رہا تھا۔ میں باہر آیا تو گلے خان مستعد تھا، مجھے شرارت سوجھی۔ "گلے خان! اگر میں بھاگ جاؤں تو مجھے کیسے پکڑو گے؟"

وہ خلاف توقع مسکرایا۔ "ام...... ام کچھ نہیں کرے گا، تم بھاگ جاؤ۔"

میں دنگ رہ گیا۔ "بھاگ جاؤں؟"

"ہاں...... باہر جانے کا راستہ معلوم ہے تم کو؟"

میں نے کھوجتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم پیچھے سے گولی مار دو گے۔"

"نہیں مارے گا۔" اس نے کمال فراخ دلی سے کہا۔

"اگر مار ہی دی تو میں فریاد کس سے کروں گا؟"

اس نے سوچا اور اپنی جیب سے پستول نکال کر اس کا میگزین الگ کر دیا۔ اس نے میگزین میری طرف بڑھایا۔ "اب جاؤ۔"

میں میگزین لیتے ہی باہر والے دروازے کی طرف لپکا۔ اگر اس کے پاس دوسرا میگزین تھا تب بھی اسے لگانے میں کچھ وقت تو لگتا! میں نے گیلری کے ساتھ ساتھ مڑتے ہوئے پیچھے دیکھا، وہ خراماں خراماں چلتا ہوا آ رہا تھا اور اس کا اطمینان ظاہر ہے بے سبب نہیں تھا۔ میں بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ باہر ایسے کون سے انتظامات ہیں جن کے بل بوتے پر یہ اتنا مطمئن ہے۔ جیسے ہی میں نے باہر پورچ میں کھلنے والا دروازہ کھولا، وہاں موجود سیاہ بالوں کا ایک ڈھیر غراتا ہوا میری طرف لپکا۔ اگر میں نے دروازہ بند کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر کی ہوتی تو کتا اندر گھس آتا۔ یہ جہازی سائز کتا تھا اور جسے بھنبھوڑتا اسے کتے کے کاٹے کے انجکشن بھی نہیں لگوانے پڑتے، اسے صرف پوسٹ مارٹم کی ضرورت پیش آتی ہو گی۔ کتا کسی بلڈوزر کی طرح دروازے سے ٹکرایا تھا۔ اگر کنڈی نہ لگی ہوتی تو میں کسی صورت اسے نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے ہانپتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا کہ دروازہ بے حد ٹھوس اور مضبوط لکڑی کا بنا تھا۔ گلے خان پیچھے کھڑا ہنس رہا تھا پھر اس نے بلند آواز سے کہا۔ فرنگی بھاگ جا۔"

"یہ فرنگی ہے؟" میں نے خفگی سے کہا۔ "اتنا کالا اور جسیم...... اسے ویسٹ انڈین کہنا چاہئے۔ شکر ہے میں نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔"

"تمہارا قسمت...... فرنگی فرار کی کوشش کرنے والے دو افراد کو مار چکا ہے۔ لاش کا بھی ٹکڑے کر دیتا ہے، مشکل سے چھوڑتا ہے۔"

"باہر یہی ہے؟"

"نہیں، اس کا دوسرا بھائی بھی ہے۔ وہ پچھلی طرف ہوتا ہے، روسی۔"

"فرنگی اور روسی، اچھے نام رکھے ہیں۔" میں ہنسا۔ "یہ لوگ بھی ہمارے سابق حکمرانوں کے نام پر اپنے

کتوں کے نام رکھتے تھے۔''

''اسی واسطے ان کا نام رکھا ہے۔'' گلے خان نے میگزین کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔''پرام کو یہ کتا لوگ بہت پیارا ہے۔ اتنا سا تھا جب ہم نے دونوں کو پالا۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا اور میگزین لے کر جیب میں رکھ لیا۔''یہ صرف ہم کو پہچانتا ہے۔''

''فتح خان کو بھی نہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، خان جی نے کوشش بوت کیا پر فرنگی اور روسی نہیں مانا۔ ایک بار خان جی نے غصے میں آ کر ان کو گولی مارنے کا سوچا پر ام پاؤں پڑ گیا۔''

''تم فتح خان کو کب سے جانتے ہو؟''

''اب چلو...... ابھی تمہارے ایک اور ساتھی کو لانا ہے۔'' اس نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا۔

''ذرا دیر بعد میں اپنی کوٹھری میں تھا اور سفیر اس کے ساتھ اوپر جا چکا تھا۔ اب تک مجھے گلے خان کے سوا اس جگہ اور کوئی ملازم نظر نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی فتح خان کہہ چکا تھا اس جگہ کو خفیہ رکھنے کے لئے وہ اب تک کئی افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا جن میں تازہ اضافہ مجھے یہاں لانے والے دو افراد تھے۔ گلے خان پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ مسئلہ اس کے بعد باہر جانے کا تھا۔ مجھے یاد آیا جس وقت مجھے لایا گیا، کوٹھی کے باہر کتے نہیں تھے۔ ممکن ہے دن میں کتے بند رکھے جاتے ہوں اور صرف رات کو انہیں کھولتے ہوں۔

جب گلے خان سفیر کو بند کر کے جانے لگا تو میں نے اس سے پوچھا۔''فتح خان کہاں ہے؟''

''ہم کو نہیں معلوم۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ کبھی صاف لہجے میں بات کرتا تھا اور کبھی بھول کر گلابی اردو پر اتر آتا تھا۔

''مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''خان جی آئے گا تو ہم بتا دے گا۔'' اس نے کہا اور چلا گیا۔

''تمہیں اس منحوس صورت سے کیا ضروری کام پڑ گیا؟'' مونا نے پوچھا۔ اس نے سردی سے بچنے کے لئے اپنے گرد کمبل لپیٹ لیا تھا۔

''ڈیوڈ شا نے ہمیں ایسے ہی قید نہیں کروایا ہے، اس کے پیچھے اس کا کوئی بہت بڑا مفاد ہے ورنہ وہ اب تک ہمیں مرشد علی کے حوالے کر چکا ہوتا۔''

''ہم سے اس کا کیا مفاد ہو سکتا ہے؟'' سفیر نے دریافت کیا۔

''شاید تصویر والا معاملہ ہے۔ حکیم قادس کو بھی اسی نے اغوا کرایا۔ یہ جان کر تم لوگوں کو حیرت ہوگی کہ جب ہمارے قافلے پر فتح خان اور اس کے ساتھیوں نے حملہ کیا تو ان کا مقصد میرا نہیں بلکہ حکیم کا اغوا تھا، میں تو گریبی میں ہاتھ آ گیا۔''

''یعنی حکیم اہم شخصیت ہے۔'' سفیر نے غور کیا۔''لیکن کس لحاظ سے؟''

''تم بھول رہے ہو، وہ بعض ایسی دواؤں کا موجد ہے جو بظاہر بے کار ہو جانے والے جسمانی حصوں کو بھی بحال کر دیتی ہیں۔ میرا ہاتھ اس کا ثبوت ہے۔ اس کے پاس ایسی دوائیاں بھی ہیں جو گہرے سے گہرے زخم

بھی چوبیس گھنٹے میں بھر دیتی ہیں۔تم سوچ سکتے ہو......ان دوائیوں کے فارمولے بین الاقوامی سطح پر کس قیمت پر بک سکتے ہیں!"

"میرے خدا...... وہ تو انمول ہوں گے۔ملٹی نیشنل دوا ساز کمپنیاں ان فارمولوں کے عوض منہ مانگے دام دینے کو تیار ہوں گے۔"سفیر نے بے ساختہ کہا تھا۔

"اس نقطہ نظر سے سوچا جائے تو حکیم قادس کا اغوا سمجھ میں آتا ہے۔" میں نے کہا۔"لیکن اس نے ہمیں کیوں اغوا کرایا ہے، یہ فی الحال سمجھ سے باہر ہے۔"

مونا کسی سوچ میں گم تھی۔سفیر نے اسے چھیڑا۔"کیا بات ہے.....کھوئے کھوئے سے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔"

مونا جھینپ گئی۔"بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔"

"خواتین کی صحبت کا لازمی اثر یہی ہوسکتا ہے۔"سفیر نے ہنس کر جواب دیا۔

"مونا سنجیدہ ہوگئی۔"سفی! اگر ڈیوڈ شا نے ہمیں مرشد علی کے حوالے کر دیا تو۔"

میں اور سفیر ایک دم چپ ہو گئے۔درحقیقت یہ سوال میرے ذہن میں تھا لیکن اس کا ہم سے کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔عین ممکن تھا ڈیوڈ شا اپنا مفاد پورا ہو جانے کے بعد ہمیں مرشد علی کے حوالے کر دیتا۔اس کا چیلا بھی خوش ہو جاتا۔کچھ دیر بعد سفیر نے ڈوبے لہجے میں کہا۔"وہ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"اسے کون روک سکتا ہے؟"مونا کے لہجے میں تلخی آ گئی۔"ہم یہاں بے بس ہیں اور کسی کو ہمارے بارے میں علم بھی نہیں ہے جو ہمیں چھڑانے کی کوشش کرے۔"

"تب تم بتاؤ، ہم کیا کر سکتے ہیں؟"سفیر جھنجلا گیا۔

"نہیں سفیر......مونا نے اچھا سوال کیا ہے۔اگر ہمیں مستقبل میں مرشد علی کے حوالے کر دیا گیا تب ہم کیا کریں گے اور اس کا بہت زیادہ امکان ہے، ڈیوڈ شا نے ہمارا اچار تو نہیں ڈالنا! جب اس کا کام نکل جائے گا تو اس کے لئے سب سے مناسب یہی ہوگا کہ مرشد علی کو خوش کرے اور اس کی وفاداری کے صلے میں ہمیں اس کے حوالے کر دے۔"

"سوال وہی ہے تب ہم کیا کریں؟"

"ہمیں آرام سے بیٹھنے یا گپوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے رہائی کی تدبیر سوچنی چاہیے۔"

"یہی میں بھی کہنا چاہتی تھی۔ممکن ہے یہ وقت گنوا کر ہم پچھتائیں۔"مونا نے جوش سے کہا۔"کیا ہم اس موٹے پر قابو نہیں پا سکتے؟"

میں نے انہیں اس جگہ کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں بتایا۔جس میں گلے خان کے ساتھ دو عدد گدھے کے سائز کے کتے بھی شامل تھے۔

"یعنی ہمیں ایک گلے خان اور اس کے دو عدد کتوں سے نمٹنا ہوگا۔"سفیر نے کہا۔

"ممکن ہے دن میں کتے بند کر دیئے جاتے ہوں...... یہ بتاؤ تم دونوں کو گلے خان کے علاوہ یہاں کوئی اور نظر نہیں آیا۔"

''نہیں۔'' مونا بولی۔ ''لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں کوئی اور نہیں ہے۔''

''اگر ہم دن میں گلے خان پر قابو پالیں تو یہاں سے نکلنے کی سبیل ہو سکتی ہے۔'' سفیر بولا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''گلے خان کتنی بار کھانا دینے آتا ہے؟''

''تین بار۔'' مونا نے بتایا۔ ''صبح، دوپہر، شام۔''

میں نے غور کیا۔ ''صبح کے ناشتے سے پہلے بھی اوپر لے جاتا ہے...... رفع حاجت کے لئے؟''

سفیر نے کہا۔ ''ہاں! اور جس وقت یہ ہمیں باہر نکالتا ہے، بس اسی وقت موقع پا کر ہم اسے قابو کر سکتے ہیں۔''

''کیسے، اب اس پر غور کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ ''سمجھ لو ہمارے پاس اس کام کے لئے دو دن ہیں۔ اگر یہ وقت گزر گیا تو پھر موقع نہیں ملے گا۔''

''دو دن......'' مونا چونکی۔ ''وہ کیسے؟''

''ارے بابا! سمجھا کرو...... یہ سمجھ کر کام کرنا ہے کہ بس اتنا ہی وقت ہے ہمارے پاس۔''

مگر خمارِ گندم نے زیادہ دیر سوچنے کا موقع نہیں دیا اور میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ سردی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ بستر کے جس حصے پر سو رہا تھا، بس وہی گرم تھا۔ باقی جیسے برف کی سل بن گیا تھا۔ کروٹ بدلتا تو اچھل جاتا تھا۔ تنگ آ کر میں اٹھ گیا اور کمبل اوڑھ کر کوٹھری میں چہل قدمی کرنے لگا۔ مجھے سفیر کی آواز آئی۔ ''تو بھی اٹھ گیا ہے۔''

''بڑی خوف ناک سردی ہے یار!'' میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میری تو بستر سے نکلنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی ہے۔'' مونا بولی۔

''کچھ دیر بعد میں نے کمبل اتار پھینکا اور وہ ایکسر سائز کرنے لگا جو اس دس بائی آٹھ فٹ کی کوٹھری میں ممکن تھیں۔ سفیر کی کوٹھری سے بھی ایسی ہی آوازیں آ رہی تھیں وہ بھی ایکسر سائز کر رہا تھا۔ مونا نے کہا۔ ''مہربانی کر کے آپ حضرات اپنے کمبل میری طرف پھینک دیں تا کہ میں کچھ دیر سکون سے سو سکوں۔''

میں نے اپنا کمبل تہ کیا اور سلاخوں سے ہاتھ نکال کر مونا کو پکڑا دیا۔ البتہ سفیر نے صاف انکار کر دیا۔

''ابھی میں کمبل اوڑھوں گا، اس لئے معذرت!''

''شوبی، دیکھی تم نے اس شخص کی خودغرضی۔'' مونا جلے کٹے لہجے میں بولی۔

''میں تو دیکھ رہا ہوں، بہتر ہے تم بھی دیکھ لو۔'' میں نے اوپر لگی یخ بستہ سلاخیں پکڑ کر لٹکتے ہوئے کہا۔ ''آخر کو عمر تمہیں گزارنی ہے۔''

''میری پیٹھ میں خنجر نہ گھونپ دوست!'' سفیر کراہا۔ ''یہ پہلے ہی مجھ سے فلرٹ ہوتی جا رہی ہے، کہیں ایسا نہ......''

''شروع ہو گئی، آپ دونوں کی بک بک۔'' مونا چڑ کر کمبل میں روپوش ہو گئی۔

نصف گھنٹے تک مسلسل ورزش کرنے سے جسم گرم ہو گیا تھا۔ ویسے بھی صبح کا آغاز تھا، اس لئے سردی کی شدت کم ہوتی جا رہی تھی۔ مونا نے ٹھیک کہا تھا اس علاقے کے پانی یا آب و ہوا میں ایسی کوئی بات تھی کہ کھانا

فوراً ہضم ہو جاتا تھا۔ رات کو میں نے ڈٹ کر کھایا تھا اوط صبح تک پیٹ خالی لگ رہا تھا۔ رہی سہی کسر ورزش نے پوری کردی تھی۔ میں نے سفیر سے دریافت کیا۔ ''گلے خان ناشتا کب تک لاتا ہے؟''

''نو بجے!'' اس نے آگاہ کیا۔

''یعنی پورا ایک گھنٹا باقی ہے؟'' میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

''کچھ سوچا تُو نے؟'' سفیر نے کہا۔

''یار پیٹ میں کچھ جائے تو سمجھ میں بھی آئے۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ جو تم فتح خان سے ملنے کے لئے کہہ رہے تھے؟''

''اس کے لئے میرے پاس کچھ خاص اطلاعات ہیں۔'' میں نے جلدی سے سفیر کی بات کاٹی۔

کچھ دیر بعد مونا بھی اٹھ گئی۔ وہ دونوں یہاں سے فرار کے بارے میں بات کرتے رہے اور میں ہوں ہاں کرکے انہیں ٹالتا رہا۔ ساڑھے آٹھ بجے گلے خان نیچے آیا اور یکے بعد دیگرے مونا اور سفیر کو اوپر لے گیا۔ آخر میں میری باری آئی لیکن جب میں باتھ روم سے نکلا تو وہ مجھے تہ خانے میں لے جانے کے بجائے کوٹھی کے ایک کمرے میں لایا۔ دبیز قالین کے ساتھ ایک کونے میں جلتے آتش دان کی وجہ سے کمرے میں خوش گوار حرارت رچی ہوئی تھی۔ فتح خان قالین پر بیٹھا تھا اور اس کے سامنے فٹ بھر اونچی چوکی پر پُرتکلف ناشتا سجا ہوا تھا۔

''آؤ شہباز خان! ناشتا کرو۔'' فتح خان نے مسکرا کر کہا۔

''خیریت...... اتنی خاطر تواضع......'' میں نے بھری ہوئی میز پر نظر ڈالی۔ ''کہیں تم نے مجھے سفرِ آخرت پر روانہ کرنے کا فیصلہ تو نہیں کرلیا؟''

''اوہ نہیں...... شہباز خان، فتح خان کم سے کم تمہیں دھوکے سے نہیں مارے گا، جب مارے گا بول کر مارے گا۔''

میں چوکی کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''یہ عنایت صرف مجھ پر ہی کیوں...... تہ خانے میں میرے دو ساتھی بھی ہیں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''ان کو بھی ناشتا دیا جارہا ہے۔''

''یہی ناشتا دے رہے ہو! اگر نہیں تو میرے لئے وہی ناشتا منگوالو، جو ان کو دیا ہے۔''

''تم ان کے چکر میں مت پڑو۔'' اس نے جھنجلا کر کہا۔

''کام بتاؤ، مجھے کس لئے بلایا ہے؟'' میں نے رکھائی سے کہا۔

''وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''شہباز! تمہارے ساتھیوں کو بھی یہ ناشتا مل جائے گا، میرا دماغ مت خراب کرو۔''

میں نے مناسب سمجھا کہ ناشتا کرلوں۔ فتح خان نے یقیناً کسی خاص مقصد کے تحت مجھے بلایا تھا، ناشتے میں پراٹھے اور دیسی انڈے تھے، تلے ہوئے اور ابلے ہوئے، مکھن اور سوجی کا حلوا تھا۔ شہد اور میٹھی روٹیاں تھیں۔ میں نے سب چیزوں سے انصاف کیا۔ آخر میں الائچی والا سبز قہوہ آیا۔ فتح خان بظاہر غیر مسلح نظر آرہا تھا

لیکن مجھے یقین تھا، چوکی تلے اس کے سامنے کوئی نہ کوئی ہتھیار رکھا تھا۔ کئی بار میرے دل میں آیا کہ اچانک چوکی الٹ کر اس ہتھیار پر قبضہ کرلوں لیکن ہر بار اس خیال نے روک لیا کہ وہاں اگر کوئی ہتھیار نہ ہوا تو......؟ یہ تو طے تھا، فتح خان کسی پر اعتماد کرنے والا شخص نہیں تھا۔ قہوہ نوشی کے دوران اس نے ایک چھوٹے سے واکی ٹاکی سیٹ پر گلے خان سے کہا۔ ''نیچے والوں کو بھی یہی ناشتا دو۔''

''تمہارے ٹھاٹ باٹ متاثر کن ہیں۔'' میں نے چاروں طرف اشارہ کیا۔ ''ورنہ ایک زمانے میں تم عمر دراز کے ملازموں میں شمار ہوتے تھے۔''

وہ مسکرایا۔ ''ہر آدمی کو ترقی کا حق ہے ممکن ہے کل عمر دراز کا اولاد میری اولاد کا ملازم ہو۔''

''عین ممکن ہے۔'' میں نے تسلیم کیا۔

''تمہارے پاس میرے لئے کون سی اطلاع ہے؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''میرے پاس!'' میں نے بے حد تعجب سے کہا۔ ''میں نے کب کہا کہ میرے پاس تمہارے لئے کوئی اطلاع ہے۔''

''تم نے مجھے نہیں کہا...... لیکن کہیں اور کہا تھا۔'' فتح خان مسکرایا اور ایک مختصر ساڈیجیٹل ریکارڈر میرے سامنے رکھ کر اس کا پلے کا بٹن دبا دیا۔ چند سیکنڈ بعد میری آواز سنائی دی۔ جب میں سفیر سے کہہ رہا تھا کہ میرے پاس فتح خان کے لئے اہم اطلاع ہے۔ اس نے بٹن دبا کر ریکارڈر آف کر دیا۔ ''اب بولو، شہباز خان!''

''تم ہماری باتیں سن رہے تھے؟''

''نہیں، یہ تو خود بخود ریکارڈنگ ہوتا ہے، میں آ کر سن لیتا ہوں۔''

''تہ خانے میں خفیہ مائیک لگے ہیں۔'' میں مسکرایا۔ ''مجھے پہلے ہی شبہ تھا اور میں نے اطلاع والی بات اسی لئے کی تھی۔''

''مجھے بے وقوف مت بناؤ۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔ ''تمہیں کہاں سے شبہ ہونے لگا۔ اب تم بتانا نہیں چاہ رہے۔''

''فرض کرو، ایسا ہی ہے...... تم نے مجھے قید کر رکھا ہے تو میں تمہیں یہ سب کیوں بتاؤں؟''

''اگر تم اپنی اور اپنے ساتھیوں کی چمڑی بچانا چاہتا ہے تو ضرور بتائے گا۔'' وہ عیاری سے بولا۔ ''تم خود سوچ لو، ان کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''فتح خان، مجھے نہیں معلوم کہ تم نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو کس نیت سے پکڑا ہے اور ہمارے بارے میں تمہارے عزائم کیا ہیں لیکن تم نے ہمیں آرام سے رکھا ہے اور اب تک کوئی تکلیف نہیں دی ہے۔ ہماری تذلیل نہیں کی ہے اس لئے میں تمہیں بتا رہا ہوں۔''

''کیا بات ہے؟'' اس نے بے تابی سے کہا۔

''برٹ شا کی بیٹی...... ایمن شا تمہیں یاد ہوگی...... اس نے برطانوی وزارت خارجہ کی مدد سے پاکستان میں اپنے باپ کی گمشدگی کا مردہ کیس پھر سے کھلوایا ہے اور اس کیس میں نامزد ملزم تم ہو۔''

ایک ثانیے کے لئے فتح خان کے چہرے پر تشویش لہرائی تھی پھر اس نے کہا۔ ''کچھ بھی نہیں ہوگا۔ پولیس

خانہ پری کر کے پھر کیس بند کر دے گی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن ممکن ہے، کوئی پروگریس ہو ہی جائے۔"

"ہوئی بھی تو دیکھا جائے گا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "فتح خان، وہ جواہرات بہت قیمتی تھے۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ کہ تم برٹ شا کو اتنی آسانی سے نہیں مار سکتے۔ ان جواہرات کا پتا صرف وہی جانتا تھا۔"

فتح خان کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا اندازہ ہے تم نے برٹ شا کو قید کر لیا ہوگا اور اس سے جواہرات کا پتا پوچھتے رہے ہو گے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "تم نے ٹھیک کہا...... میں نے ایسا ہی کیا تھا۔"

اگرچہ میں کچھ دیر پہلے اپنا خیال ظاہر کر چکا تھا لیکن فتح خان کے اقرار نے مجھے دم بخود کر دیا تھا۔ خاصی دیر بعد میں نے کہا۔ "یعنی برٹ شا آج بھی زندہ ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میرے پاس...... پاگل ہو گیا ہے۔ کبھی روتا ہے...... کبھی ہنستا ہے، کبھی تین تین دن کھانا نہیں کھاتا، کبھی سارا دن کھانا مانگتا ہے۔"

"تم نے اس پر تشدد کیا ہوگا؟" میں نے شکی لہجے میں کہا۔

"کیا تھا پر اتنا بھی نہیں کہ وہ پاگل ہو جائے۔ پاگل تو وہ دو سال بعد ہوا تھا۔"

"اور اتنے سالوں سے تمہاری قید میں ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں...... میں نے اسے آرام سے رکھا ہے۔"

"حیرت ہے، وہ تمہارے قبضے میں ہے...... اور اتنے سال سے ہے اور تم اس سے ایک بات نہیں اگلوا سکے۔ یہ بات حلق سے نہیں اترتی۔"

"میں نے ہر ممکن کوشش کی۔ ایک بار تو وہ مرنے کے قریب ہو گیا تھا۔ خدا کی قسم میں نے اپنی زندگی میں اتنا ضدی آدمی نہیں دیکھا۔"

"کیا وہ مزید تشدد سے بچنے کے لئے دیوانہ بنا ہے؟"

"ممکن ہے...... لیکن میں مزید خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر وہ سچ مچ پاگل ہو گیا تو ہیرے ہمیشہ کے لئے میرے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔"

"کیا یہ بات یقینی ہے کہ ہیرے اسی مقام پر ہیں، جہاں برٹ شا نے چھپائے تھے۔"

"اس وادی میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ حکومت نے جنگل کاٹنے پر پابندی لگا دی ہے۔ اب وہاں سوائے چرواہوں کے اور کوئی نہیں ہے۔"

"اور وہ چرواہے یقیناً تمہارے آدمی ہوں گے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں خطرہ نہیں لے سکتا کہ کوئی اور اس طرف آئے۔ ہیرے اتفاق سے بھی کسی کو مل سکتے ہیں۔"

''اس معاملے میں تمہارے آدمیوں کی نیت بھی خراب ہوسکتی ہے ممکن ہے کسی کو ہیرے مل جائیں اور وہ خاموشی سے انہیں ہضم کر جائے؟''

''نہیں وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا ان کو انجام معلوم ہے۔''

''فتح خان اتنی بڑی دولت کی خاطر آدمی اپنے باپ کی پروانہ کرے اپنے دین ایمان کی پروانہ کرے تو تم کیا چیز ہو، خیر آج کل ان کی مالیت کیا ہوگی؟''

''کم سے کم بیس کروڑ امریکی ڈالرز!''

''اوہ...... یعنی بارہ ارب روپے!''

''ممکن ہے، اس سے بھی زیادہ قیمت ہو۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''لے چلو۔ تمہاری قید میں ہوں۔''

''نہیں، اس معاملے میں مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''یعنی تم چاہتے ہو کہ میں برٹ شا کے پاس جاؤں اور اس سے ہیروں کی جائے وقوع اگلوانے کی کوشش کروں؟''

''تم ذہین آدمی ہے۔ میں تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گا۔ تم اس سے بات کرو، اس کی بیٹی کے بارے میں بتاؤ۔ ممکن ہے وہ ہیروں والی جگہ بتا دے۔''

''میں کوشش کروں گا، لیکن فتح خان! یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ وہ بیٹی کا سن کر ہیروں کی جگہ بتا دے گا۔''

''کیا اسے اپنی بیٹی سے محبت نہیں ہے۔ وہ اس سے نہیں ملنا چاہتا؟''

''اسے بیٹی سے محبت ہے اور وہ اس سے ملنا بھی چاہتا ہوگا لیکن اسے سب سے زیادہ خطرہ اپنی جان کا ہوگا۔ تبھی اس نے تمہیں ہیروں کی جگہ نہیں بتائی۔ اسے بجا طور پر خطرہ ہوگا کہ جیسے ہی ہیرے تمہارے ہاتھ آئے، تم اسے ماردو گے۔''

''شروع میں میرا یہی ارادہ تھا، میں اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔'' فتح خان نے اعتراف کیا۔ ''لیکن اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا، میں نے سارا بندوبست کرلیا ہے۔ ہیرے ملتے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''یہاں سے......؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''اس ملک سے...... ہیرے یورپ کی کسی پارٹی کو بیچ دوں گا اور خود سینٹرل ایشیا کے کسی ملک میں جائیداد خرید کر مزے سے رہوں گا۔''

''بشرطیکہ برٹ شا اپنے حواسوں میں ہو اور ہیرے تمہارے حوالے کرنے پر راضی ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں یہ کام کرنا ہوگا شہباز خان!'' فتح خان بولا تو اس کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔

''میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''ورنہ......؟''

وہ سفاکانہ انداز میں مسکرایا۔ ''تم جانتا ہے، تمہارا دوساتھی میرے پاس ہے۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔''

''ایسا ہی سمجھ لو...... اگر تم برٹ شا سے ہیروں کا جگہ نہیں اگلوا سکا تو میں لڑکی کو مرشد علی کے حوالے کر دے گا۔''

میں بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ ''تم ایسا نہیں کرو گے فتح خان!''

اس نے جیب سے ریوالور نکال لیا۔ ''نہیں کرے گا بشرطیکہ مجھے ہیرے مل جائیں۔''

''تم احمقانہ شرط لگا رہے ہو جو کام تم اتنے سالوں سے نہیں کر سکے، وہ میں اتنی جلدی کیسے کر سکتا ہوں! برٹ شا مجھے کیوں بتانے لگا؟''

''بتائے گا، جب تم اسے اس کی بیٹی کے بارے میں بتائے گا تو وہ ضرور بتائے گا۔ تم کہے گا کہ ایمن شا اس کی تلاش میں پاکستان آنے والا ہے۔ اگر اس نے ہیروں کا پتا نہیں لگایا تو اس کا بیٹی بھی ادھر آ جائے گا۔''

''کیا تم ایمن کو بھی اغوا کرا لو گے؟''

''ضرورت پڑا تو ایسا بھی کرے گا مگر ابھی تم اسے سمجھاؤ۔ اپنی بیٹی کو مصیبت میں نہ ڈالے، شرافت سے ہیرے میرے حوالے کر دے۔''

''میں کوشش کروں گا لیکن تم نے جو دھمکی دی ہے اس نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ اگر تم نے مونا کو مرشد علی کے حوالے کر دیا تو......''

''میں جانتا ہے، لیکن میں مجبور ہوگا۔ کیونکہ پھر مجھے ایمن چاہئے ہوگی اور مرشد علی مجھے مونا کے بدلے ایمن لا کر دے گا۔''

فتح خان گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کا ماہر تھا۔ بظاہر وہ مجھ سے نرمی سے پیش آ رہا تھا مگر درحقیقت اس نرمی کے پردے میں اپنا کام نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور اب اس نے مجھے دھمکی دے کر خود کو بے نقاب کر دیا تھا، اس کے اچھے سلوک اور نرمی کے پس پشت وہ ہیرے تھے جو اسے برٹ شا سے حاصل کرنے تھے۔ میں غور کرتا رہا، فتح خان کے الفاظ پر مجھے قطعی شبہ نہیں تھا۔ وہ ان افراد میں سے تھا جو اپنے مفاد کے لئے کسی حد سے گزرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہا کرتے تھے۔ فتح خان بغور مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا سوچ رہا ہے شہباز خانا!''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے، کام نکل جانے کے بعد تم ہمیں مرشد علی کے حوالے نہیں کرو گے؟''

''میں کیا ضمانت دے۔ ویسے بھی مرشد علی میرا یار تھوڑی ہے۔ مجھے اس سے کوئی کام ہوگا تب میں لڑکی کو اس کے حوالے کرے گا۔''

''فتح خان، گزشتہ کچھ عرصے میں تم نے جو رنگ دکھائے ہیں، جس طرح روپ بدلے ہیں، تم پر اعتبار کرنا ذرا مشکل ہو گیا ہے۔''

''تم بے شک اعتبار مت کرو۔ پر یہ کام تیرے کو کرنا پڑے گا۔'' فتح خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تم اس کے لئے مجبور ہے۔''

فتح خان صحیح کہہ رہا تھا، میں مجبور تھا۔ وہ مجھے باہر لایا جہاں گلے خان جیپ کی صفائی کر رہا تھا۔ اسی جیپ میں مجھے لایا گیا تھا۔ فتح خان نے ایک بڑی سی سیاہ عینک میری طرف بڑھائی۔ ''اسے پہن لو۔''

میں نے عینک پہن لی جس نے میری آنکھوں کو اس طرح ڈھانپ لیا کہ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

کانوں کے عقب میں کمانیاں اس طرح پھنس گئی تھیں کہ عینک ذرا بھی نہیں ہل رہی تھی اور اس میں ذرا سا بھی رخنہ نہیں تھا۔ گلے خان نے مجھے بازو سے پکڑ کر جیپ کے عقبی حصے میں بٹھا دیا۔ وہ خود بھی میرے برابر میں آ گیا تھا۔ پھر اس نے سیٹی بجائی۔ فتح خان جلدی سے جیپ میں سوار ہوتے ہوئے غرایا۔ ''میرے کو بیٹھنے دے۔''

گلے خان ہنسا۔ ''فکر نہ کرو خان! میرے ہوتے یہ تم کو کچھ نہیں کہیں گے۔''

''اور تُو ابھی مر گیا تو کیا میں جیپ میں ہی بیٹھا رہوں گا۔'' فتح خان جھنجلا کر بولا۔

''خان جی، اس صورت میں تمہیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ان کتوں کے لئے یہ جیپ بھی کھلونا ہے۔''

فتح خان نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ غالباً گیٹ پر رو کی، گلے خان نے اتر کر گیٹ کھولا اور جیپ کے باہر آنے پر بند کر دیا۔ کسی کتے کو ہشکارتا ہوا میرے پاس آ بیٹھا۔ ''اب جب تک ہم نہیں آئیں گے، نہ تو کوٹھی سے کوئی باہر جا سکتا ہے اور نہ اندر آ سکتا ہے۔'' فتح خان نے کہا۔

''اگر تمہارے اندیشے کے مطابق گلے خان کسی وجہ سے انتقال کر گیا تب واپسی کی کیا صورت ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے کو کیا ہوگا؟'' گلے خان نے خفگی سے کہا۔

''تمہاری جسامت دیکھ کر دل کے دورے کی توقع کسی وقت بھی کی جا سکتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن ناگہانی انتقال کی اور بھی وجوہات ہو سکتی ہیں، خاص طور سے اس پیشے میں۔''

''بکواس بند کرو۔'' گلے خان غرایا تھا اسی لمحے جیپ نے ناک کے بل اترنا شروع کر دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم سامنے سے لڑھک کر ونڈ و شیلڈز توڑ کر جیپ کے سامنے جا پڑیں گے۔ خدا خدا کر کے جیپ سیدھی ہوئی۔

''فتح خان، ہمیں کہاں جانا ہے؟''

''زیادہ دور نہیں ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ پاکستان میں شہروں سے نکل کر اگر آپ کے فاٹا کے باشندے سے تھر کے صحرا کا پوچھیں گے تو وہ اسی طرح بے پروائی سے کہے گا۔ ''زیادہ دور نہیں ہے۔'' اس لئے فتح خان کی بات پر یقین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ سفر ابھی کئی گھنٹے تک جاری رہتا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد جیپ سڑک چھوڑ کر کچے اور پتھریلے راستوں پر اتر آئی تھی اور میں کچھ اسی طرح حرکت کر رہا تھا جیسے مجھے کسی کنکریٹ مکسر میں ڈال کر ہلایا جا رہا ہو۔ میرے گلے خان پر گرنے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن جب گلے خان جیپ کی حرکت کے نتیجے میں میرے اوپر آتا تھا تو مجھے بند آنکھوں سے دن میں تارے نظر آ جاتے تھے۔ یہ بے ہودہ اور اذیت ناک سفر کوئی ایک گھنٹا جاری رہا۔ پھر جیپ رک گئی۔ گلے خان پہلے خود اترا پھر اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے اتار لیا۔ اسی طرح بازو پکڑے ہوئے وہ مجھے کسی بند جگہ لے گیا کیونکہ اس جگہ بند رہنے والی مخصوص بو رچی ہوئی تھی۔ مجھے فتح خان کی آواز آئی، وہ کسی سے پوچھ رہا تھا، بڈھا کیسا ہے؟''

''سو رہا ہے..... کل رات بھر روتا رہا۔'' کسی نے نسوانی لہجے میں جواب دیا مگر آواز مردانہ تھی۔

وہ یقیناً برٹ شا کے بارے میں بتا رہا تھا۔ کسی نے میری آنکھوں سے عینک کھینچ لی۔ یہ عجیب سا شخص تھا۔ گٹھا ہوا مضبوط جسم لیکن چہرے پر نسوانی خدوخال کے ساتھ نسوانی ہی تاثرات بھی تھے۔ رہی سہی کسر اس

وقت پوری ہوگئی جب اس نے لہک کر کہا۔ ''قربان جاؤں...... سوہنے کیسے ہاتھ لگے خان جی کے؟''

''یہی سوال میں بھی کر سکتا ہوں۔'' میں نے اس کا جائزہ لے کر پوچھا۔ یہ جگہ کچی مٹی کی دیواروں پر مشتمل تھی جس پر لکڑی کی چھت تھی۔ لکڑیوں کے اوپر مٹی کی لپائی کی گئی تھی۔ ایک طرف لکڑی کی مشعل روشن تھی جسے شاید چربی میں بھگویا گیا تھا کیونکہ نہایت ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔ اگر برٹ گزشتہ گیارہ برسوں سے ایسی جگہ قید تھا تو اس کا دماغی توازن سچ مچ متاثر ہو سکتا تھا۔ یہ جگہ کسی مہذب انسان کے رہنے کے قابل نہیں تھی۔ فتح خان میرے پاس آیا۔

''وہ سو رہا ہے...... میں تمہیں یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ اب یہ تم پر ہے، اسے کتنی جلدی اپنی راہ پر لگاتے ہو۔''

''یہاں چھوڑ جاؤ گے؟'' میں نے بوکھلا کر کہا۔

''ہاں اور تمہارے پاس صرف دو دن ہیں۔'' فتح خان کے لہجے میں رکھائی آ گئی تھی۔

''دو دن بعد تم مجھے واپس لے جاؤ گے؟'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں...... اور مونا کو مرشد علی کے حوالے کر دوں گا۔'' وہ بولا یہ ایک طرح کی دھمکی تھی پھر اس عورت نما مرد یا مرد نما عورت سے کہا۔ ''مقدر، اسے بھی اس کے پاس لے جا...... پوری دیکھ بھال کرنا...... خطرناک آدمی ہے، کئی قتل کر چکا ہے۔ بھاگ گیا تو تیری خیر نہیں ہوگی۔''

''فکر مت کرو خان جی! بندی کے ہوتے ہوئے...... اس کی روح ہی جا سکتی ہے یہاں سے۔''

''میرے ساتھی تمہارے قبضے میں ہیں۔ میں بھلا انہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟''

فتح خان میری بات پر طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''شہباز! بے وقوف کسی اور کو بنانا...... پر یاد رکھنا، اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو یہ بات تمہارے ساتھیوں کے حق میں بہت ہی بری ہوگی۔ تم سوچ سکتے ہو ان کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟''

''ہاں...... اس لئے میں فرار کی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔''

مقدر جس کا اپنا مقدر درست نہیں لگ رہا تھا، گلے خان کے ساتھ مجھے برٹ شا کے قید خانے تک چھوڑنے آیا۔ اوپر کی کچی کوٹھری کے مقابلے بس اندر پختہ قید خانہ تھا جسے سلاخوں کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ اندر گھاس کے ڈھیر پر ایک میلا کچیلا ڈھیر پڑا تھا۔ دیوار پر وہی بدبودار مشعل جل رہی تھی لیکن یہ قید خانے سے باہر تھی۔ اندر فضلے کا تعفن نہیں تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں اس کا کوئی معقول بندوبست تھا۔ لوہے کا دروازہ کھول کر مقدر نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی میں اندر گیا، وہ دروازے کو تالا لگا کر رخصت ہو گئے۔ فرش پر خشک گھاس کے ڈھیر تھے اور ان کی وجہ سے یہاں پر سردی معقول حد تک کم تھی، میں نے ایک طرف گھاس جمع کی اور اسے بستر کی شکل دے کر اس پر بیٹھ گیا۔ سرد علاقہ ہونے کی وجہ سے اس کا امکان کم ہی تھا کہ گھاس میں پسو یا اس قبیل کے زہریلے کیڑے مکوڑے پائے جاتے ہوں۔ میں سوچ رہا تھا، فتح خان نے مجھے کس چکر میں ڈال دیا ہے۔ شاید مجھے اور میرے ساتھیوں کو اغوا کرنے کا مقصد بھی یہی تھا اور ڈیوڈ شا کا نام وہ صرف دھوکا دینے کے لئے لے رہا تھا۔ مجھے بہرصورت برٹ شا سے ہیروں کا پتا اگلوانا تھا میں کسی صورت اپنے یا

اپنے ساتھیوں کا مرشد علی کے قبضے میں جانا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ ہمارے خون کا پیاسا ہے، بھائی کی مستقل معذوری کے امکان نے اسے چراغ پا کر دیا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ برٹ شا کے ساتھ کیسا طرز عمل اختیار کروں۔ خاصے غور وخوص کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے بے نیازی کا رویہ اپنانا ہوگا۔ برٹ شا کو پہچاننے سے گریز کرنا ہوگا۔ شاید اس طرح وہ کھل جاتا ورنہ اگر وہ پاگل پن کا ڈھونگ رچا رہا تھا تو کسی صورت میرے سامنے نہیں کھلتا۔ یہ فیصلہ کر کے میں گھاس پر دراز ہو گیا۔ اب مجھے انتظار تھا کہ وہ کب جاگتا ہے تا کہ میں اپنی اداکاری کا آغاز کروں۔ وقت گزر رہا تھا اور برٹ شا جاگنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ غالباً وہ تھک کر سویا تھا۔ بقول مقدر کے وہ گزشتہ رات روتا رہا تھا اور رونے کے لئے جاگنا ضروری تھا۔

دو گھنٹے بعد تنگ آ کر میں نے خود اسے اٹھانے کا فیصلہ کیا لیکن طریقہ بلاواسطہ استعمال کیا۔ میں سلاخیں تھام کر مرحوم اداکاروں سلطان راہی اور محمد علی کے ملے جلے انداز میں ڈائیلاگ بولنا شروع کئے۔ فتح خان اور اس کے چیلوں کو للکارنے کے ساتھ ان کی ایسی کم تیسی کرنے کا دعویٰ بھی کرنے لگا۔ اتنا واویلا سن کر قبر کے مردے اور سینما گھروں میں سوئے تماشائی تک جاگ جاتے تھے تو برٹ شا کیسے نہ اٹھتا! اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا چند چیخیں ماریں اور پھر قہقہے لگانے لگا۔ اس بار میں نے بھی بوکھلانے کی اداکاری کی۔ ''مجھے نکالو یہاں سے......سؤر کے بچو......اپنے پاگل باپ کے ساتھ بند کر دیا ہے۔''

''پاگل......ہوگا......تُو......'' عقب سے برٹ شا اردو میں دھاڑا۔

میں نے مڑ کر ڈرے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ بے تحاشا بڑھے ہوئے بالوں، داڑھی اور مونچھوں کے ساتھ وہ زمانہ قبل از انسانیت کا کوئی وحشی لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ ویسے اس نے پتلون اور قمیص کے اوپر لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی لیکن کوئی شے سلامت نہیں تھی۔ اس کے پاؤں میں مقامی طرز کے چمڑے کے جوتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں بھی انہوں نے پکڑ رکھا ہے؟''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''انہوں نے نہیں، میں نے انہیں قید کر رکھا ہے۔''

''تت......تم پاگل ہو؟'' میں سلاخوں کے ساتھ چپک گیا۔ ''میرے پاس مت آنا۔''

''میں پاگل نہیں ہوں۔'' اس بار اس نے نرمی سے کہا۔ ''لیکن یہ تمہیں کیوں پکڑ لائے ہیں؟''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''فتح خان سے میری پرانی دشمنی ہے۔ گیارہ سال سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

''گیارہ سال سے!'' وہ چونکا۔ ''میں بھی اتنے ہی عرصے سے قید ہوں۔'' غیر ارادی طور پر وہ انگریزی لہجے پر اتر آیا تھا۔

''میرے خدا......تم گیارہ سال سے یہاں ہو لیکن کیوں......فتح خان نے تمہیں کیوں اس طرح قید کر رکھا ہے؟''

''لمبی کہانی ہے۔'' وہ گھاس پر بیٹھ گیا۔ ''اور تمہیں کیوں لایا ہے؟''

''پتا نہیں......گیارہ سال پہلے پاکستان کے شمالی علاقے کی سیر کرنے آیا تھا۔ اتفاق سے فتح خان سے

ٹکراؤ ہو گیا۔" میں نے کہا اور اسے غور سے دیکھا۔ "تم شاید انگریز ہو۔ لہجے سے بھی لگتے ہو۔ کیا ایسٹ انڈیا کمپنی جاتے ہوئے تمہیں یہاں بھول گئی تھی؟"

"بکومت، میں اتنا عمر رسیدہ نہیں ہوں۔" اس نے برا مان کر کہا۔

"تم کیسے انگریز ہو، تعارف کرائے بغیر بات کر رہے ہو، میں نے سنا ہے انگریز بغیر تعارف کے گالی کا داب بھی نہیں دیتے۔"

"برٹ شا!" اس نے کھا جانے والے انداز میں کہا۔

"برٹ شا!" میں نے یوں کہا جیسے مجھے یہ نام جانا پہچانا لگ رہا ہو۔ پھر اچھل پڑا۔ "میرے خدا، تم ایمن شا کے باپ ہو...... تبھی میں کہوں مجھے جانے پہچانے سے لگ رہے ہو، مجھے پہچانا، میں شہباز ملک ہوں؟"

"شہباز ملک!" اس نے چونک کر کہا پھر اضطرابی انداز میں بولا۔ "تم ایمن کو جانتے ہو؟"

"ہاں...... کیوں نہیں، میں ہی تو اسے پہاڑوں سے نکال کر لے گیا تھا۔ بہت دنوں تک تمہاری تلاش کی جاتی رہی۔ پھر ایمن مایوس ہو کر اپنے وطن چلی گئی۔ پچھلے دنوں میرا اس سے رابطہ تھا۔"

"رابطہ تھا!" وہ لرزتی آواز میں بولا۔ "کیسی ہے میری بچی؟ میری ایمن!"

"ٹھیک ہے، صحافی بن گئی ہے۔ ایک ٹی وی چینل پر کام کرتی ہے۔ اس نے وزارتِ خارجہ کے توسط سے یہاں تمہارا کیس ری اوپن کرایا ہے۔"

"بے کار ہے۔" اس نے مایوسی سے کہا۔ "یہ لوگ مجھے پہلے نہیں تلاش کر سکے تو اب کیسے تلاش کر لیں گے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا لیکن فتح خان نے تمہیں کیوں قید کر رکھا ہے؟ تمہارے بارے میں میرا خیال تھا کہ اس نے تمہیں قتل کر دیا ہے۔"

برٹ شا نے محتاط نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا اور میرے پاس سرک آیا۔ "تم بھول رہے ہو۔ میں نے وہ ہیرے چھپا دیئے تھے جن کے پیچھے فتح خان پاگل ہو رہا تھا۔"

"اس نے اتنے عرصے سے تمہیں ہیروں کی خاطر قید کر رکھا ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں، وہ مجھ سے اب بھی ہیروں کا مطالبہ کر رہا ہے۔"

"اور تم نے ہیروں کی خاطر اتنی لمبی قید کاٹی ہے۔ اس طرح غیر انسانی حالات میں؟" اس بار میرا لہجہ اور بھی حیرت لئے ہوئے تھا۔

"ہیروں کی خاطر نہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "اپنی جان بچانے کے لئے...... جس دن فتح خان کو وہ ہیرے مل گئے، وہ زمین سے ہیرے نکال کر ان کی جگہ مجھے دفن کر دے گا۔ میں اس پر بالکل بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔"

خلاف توقع برٹ شا بہت جلدی کھل گیا اور اس نے میرے اندازوں کی تائید بھی کر دی، وہ صرف جان بچانے کے لئے منہ بند رکھے ہوئے تھا۔ اب تک اس نے اذیتیں اور یہ خوف ناک قید بھی برداشت کر لی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "تم پاگل بنے ہوئے تھے۔"

''ہاں۔'' وہ چونکا۔ ''لیکن تمہیں کس نے بتایا؟'' اس کے لہجے میں شک نمایاں تھا۔

مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا، میں نے جلدی سے بات بنائی۔ ''مجھے جو مرد نما عورت یہاں قید کر کے گیا ہے اس نے بتایا ہے۔''

''مقدر!'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ ''بہت ظالم آدمی ہے۔ شروع میں اس نے مجھ پر وحشیانہ تشدد کیا۔ میری پشت داغ دار کر دی۔ اس کے ظلم سے بچنے کے لئے مجھے پاگل بننا پڑا تب کہیں جا کر اس سے جان چھوٹی۔''

''سوال یہ ہے کہ فتح خان نے مجھے کیوں پکڑوایا ہے۔ خاصے عرصے سے میں نے اسے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس وادی سے نکلنے کے بعد ہمارا کوئی معاملہ ہوا ہے۔''

''وہ تمہیں شاید ہیروں کے لئے لایا ہے۔ یقین کرو، وہ ان ہیروں کے پیچھے اتنا پاگل ہے کہ اسے ساری دنیا کو قتل کرنا پڑے تو وہ سب کو مار دے گا۔''

''یعنی میں ہیرے تم سے لے کر اسے دے دوں؟'' میں نے احمقانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن تم مجھے وہ ہیرے کیوں دینے لگے؟''

''فتح خان بہت مکار ہے۔'' برٹ شا نے آہستہ سے کہا۔ ''شاید تمہارے ذریعے سے وہ اندازہ لگانا چاہتا ہے کہ میں سچ مچ پاگل ہوں یا بنا ہوا ہوں۔ میرے خدا!'' وہ خوف زدہ انداز میں اچھل پڑا تھا۔ ''شاید اس نے یہاں کوئی خفیہ آلہ چھپا دیا ہو جو ہماری باتیں اس تک پہنچا رہا ہو، میں نے حماقت کی۔''

''میرا خیال ہے، ایسا کوئی آلہ نہیں ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''اس جگہ ویسے بھی بجلی نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے یقین تھا، فتح خان نے ہماری گفتگو سننے کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر رکھا ہوگا۔

مگر برٹ شا کی تسلی نہیں ہوئی۔ ''تم اسے نہیں جانتے، تم اسے نہیں جانتے۔''

''چلو فرض کرو، وہ ہماری باتیں سن رہا ہے اور جان گیا ہے کہ تم نے فرضی پاگل پن طاری کر رکھا ہے، وہ یہ بھی جان گیا ہے کہ تم نے جان کے خوف سے زبان بند رکھی تھی لیکن اگر وہ تمہیں جان کی ضمانت دے تو کیا تم ہیرے اس کے حوالے کر دو گے؟''

''میں فتح خان پر ایک فی صد اعتبار نہیں کر سکتا۔'' اس نے صاف جواب دیا۔ ''وہ بے شک جان جائے اور مجھ پر پھر سے تشدد کرے، ہیرے اسے کسی صورت نہیں ملیں گے۔''

''برٹ شا! ایمن پاکستان آنے والی ہے۔ تمہاری تلاش کے سلسلے میں اگر اس نے ایمن کو بھی اغوا کر لیا تو کیا تم تب بھی ہیرے دینے سے انکار کرو گے؟''

''نہیں، نہیں۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''ایمن کا نام بھی مت لو۔ یہ شیطان اس کے بھی پیچھے پڑ جائے گا۔''

وہ چپکے چپکے رونے لگا، ایمن کا نام لے کر، وہ باپ بھی تھا۔ میرا دل اس کے لئے ہمدردی سے بھر گیا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''برٹ شا...... اس جہنم سے نکلنے کی سوچو۔ اس سے پہلے کہ ایمن بھی یہاں آ پھنسے۔''

''میں ہیرے اسے دے دوں گا۔ بے شک وہ مجھے بھوکے کتوں کے آگے ڈلوا دے لیکن ایمن کو کچھ نہ کہے۔'' اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یاد ہے، تم نے ہیرے کہاں چھپائے تھے؟''

''اتنے عرصے بعد بالکل ٹھیک سے تو نہیں یاد ہے لیکن وادی دیکھوں گا تو یاد آ جائے گا۔''

میرا خیال تھا کہ یہ سب سن کر فتح خان دوڑا دوڑا آئے گا لیکن اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ دوپہر ہوئی اور پھر شام۔ مقدر نے کھانے میں سوکھی روٹیاں اور پتلی لسی دی۔ برٹ شا نے بتایا کہ رفع حاجت کے لئے ایک کونے میں پتھر کی سل ہٹانے سے خانہ کھلتا تھا۔ یہ خانہ شاید کوئی نالی تھی کیونکہ جہاں تک نظر کام کرتی تھی، نالی نظر آتی اور اس میں فضلہ کبھی بھرا نہیں تھا۔ صفائی کے لئے ڈول میں پانی اور مگ بھی تھا، پینے کے لئے ایک طرف رکھے گھڑے میں دوسرے تیسرے دن تازہ پانی بھر دیا جاتا تھا۔

''شدید سردی میں کیسے گزارا کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ گھاس دیکھ رہے ہو، یہ سردی کو بے کار کر دیتی ہے۔ یقین کرو، ان گیارہ سالوں میں کبھی سردی نے مجھے پریشان نہیں کیا۔ یہ لوگ سردیوں میں مجھے موٹے اونی کمبل دیتے ہیں۔''

''لگتا ہے، تم باقاعدہ ورزش کرتے ہو۔'' میں نے اس کے مضبوط جسم پر غور کیا۔ ''ورنہ اتنے عرصے کی بے کاری آدمی کو چاٹ جاتی ہے۔''

''ہاں...... مجھے ورزش کرنا پڑتی ہے...... ورنہ کیچوا ہو کر رہ جاؤں۔ یہ مجھے سادہ لیکن اچھی خوراک دیتے ہیں۔ اس وجہ سے صحت بنی ہوئی ہے۔ گیارہ سال سے وہسکی اور سگار کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، یہ بھی اچھی صحت کی علامت ہے۔'' اس نے حسرت سے کہا۔ اسے سگار اور شراب کی محرومی کا سخت افسوس تھا۔

''برٹ شا کیا تمہیں امید تھی کہ تم رہا ہو سکو گے، اپنی دنیا میں واپس جا سکو گے؟''

''نہیں، کبھی امید تھی لیکن کچھ عرصے سے مکمل مایوسی ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''برٹ تمہاری جائیداد اور خطاب پر تمہارا کزن ڈیوڈ شا قابض ہو گیا تھا۔''

''اوہ، وہ بدمعاش لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے، میری بیٹی موجود تھی؟'' اس نے دانت پیسے۔

''اس بے چاری نے یہاں سے جانے کے بعد چند سال بڑی مشکل میں گزارے۔ بہر حال اب وہ خوش ہے۔''

''ڈیوڈ سانپ ہے۔'' اس نے اپنے کزن کے بارے میں سچ بیانی کی۔

''میرا اس سے بھی واسطہ پڑ چکا ہے۔ میں تمہاری رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔''

''وہ چونکا۔ ''کب کیسے؟''

''اس تصویر کے سلسلے میں...... جس کے لئے تم آئے تھے۔''

''وہ تصویر......!'' برٹ اچھل پڑا تھا۔

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''وہ ہر معاملے میں تمہارا وارث بن رہا ہے۔ تصویر کے معاملے میں بھی...... تمہیں شاید معلوم نہیں، فتح خان، ڈیوڈ شا کے لئے کام کرتا رہا ہے۔''

''اس کے لئے......'' برٹ شا کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

''فکر مت کرو۔ میرا خیال ہے فتح خان نے تمہیں سب سے چھپا کر رکھا ہے، ورنہ اب تک ڈیوڈ شا تمہیں مروا چکا ہوتا۔ وہ اس جاگیر اور خطاب کے اصل مالک کو کیسے چھوڑتا جس پر آج کل وہ خود قابض ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... لیکن فتح خان اور ڈیوڈ شا کا گٹھ جوڑ بہت خطرناک ہے، خاص طور سے راجا عمر دراز کے لئے۔''

''راجا صاحب کی فکر مت کرو۔ وہ ان سے کم نہیں ہیں۔ ڈیوڈ شا نے اگرچہ ان سے وہ تصویر حاصل کر لی ہے لیکن راجا صاحب کا کہنا ہے، وہ اس کے لئے بے کار ہے۔''

برٹ شا نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''تم راجا صاحب کے بہت نزدیک لگتے ہو۔ کیا تم اس تصویر کی اہمیت سے باخبر ہو؟''

''اگر میں کہوں ہاں تو کیا تم مان لو گے؟'' میں مسکرایا۔

''ہاں...... تم فی الحال حالات تو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔'' اس نے سر ہلایا۔

''ایک بات بتاؤ، تم لوگ اس تصویر کے لئے کیوں پاگل ہو رہے ہو، کیا صرف اس لئے کہ وہ تصویر ایک انجانی سرزمین کے بارے میں ہے؟''

''نہیں۔ ہم وہاں جانا اور وہاں کے عجائبات دنیا کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔''

''میرا نہیں خیال ہے کہ تم یا ڈیوڈ شا...... یا کوئی بھی عمر دراز کے بغیر اس انجانی سرزمین تک جا سکے کیونکہ وہاں جانے کے راستے سے صرف وہی واقف ہے۔''

''ایسا نہیں ہے، کوئی دوسرا بھی کوشش کر سکتا ہے۔'' برٹ شا بولا، اس کے انداز میں جذب جھلکنے لگا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی، وہ گیارہ سال سے اس جگہ قید تھا۔ رہائی سے مایوس تھا اور اس جگہ جانے کے خواب دیکھ رہا تھا جہاں کبھی اس کا باپ گیا تھا۔ کیا خواب واقعی اتنے طاقتور اور پُرکشش ہوتے ہیں کہ بدترین صورت حال میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

''برٹ شا، اگر تمہارے سامنے یہ ہیرے اور اس پُراسرار وادی کا سفر رکھ دیا جائے تو تم کسے چنو گے؟''

''وادی کا سفر...... اس کے لئے میں کچھ بھی چھوڑ سکتا ہوں۔''

''راجا عمر دراز وہاں جا کر آ چکا ہے، پھر وہ دوبارہ کیوں نہیں گیا؟''

''وہ چور احمقانہ رومانیت کا شکار ہے۔'' برٹ شا نے حقارت سے کہا۔ ''وہ ان پاگلوں میں سے ہے جو پُراسرار اشیاء کو کھوجنے کے بجائے ان کی پوجا کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔''

''میں راجا عمر دراز کے بارے میں تمہارے اس تبصرے سے متفق نہیں ہوں۔ وہ ان چند عقل مند افراد میں سے ہے جن سے میں ملا ہوں۔ یہ درست ہے کہ وہ اس سرزمین کے بارے میں کسی قدر جذباتی ہے لیکن وہ پاگل اور پُراسرار اشیاء کو پوجنے والوں میں سے نہیں ہے۔''

''تب اس میں ہمت نہیں ہے۔ وہ اس راز کو جان کر بھی دنیا کے سامنے نہیں لانا چاہتا۔''

''شاید وہ ایسا مناسب نہیں سمجھتا، اسے کم ہمت نہیں کہہ سکتے ہیں۔''

''کیوں؟'' برٹ شا نے چونک کر پوچھا۔

''میرا خیال ہے، وہ باوقار آدمی ہے۔ اس میں تم سفید فاموں جیسی ہوس نہیں ہے۔''

''احمقانہ بات ہے۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''دنیا میں اگر ایسی کوئی شے ہے تو اسے سب کے سامنے آنا چاہئے۔''

''اور اس کے لئے تم کزنز آپس میں مقابلہ کر رہے ہو۔'' میں نے طنز کیا۔

''میں تو یہاں قید ہوں، ڈیوڈ شا آزاد اور بااختیار ہے۔''

''یقین کرو، اسے تمہارے بارے میں بھنک بھی پڑ گئی تو وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر سب سے پہلے تمہارا کام تمام کرنے کی کوشش کرے گا۔''

''اس صورت میں فتح خان مجھے ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ کیونکہ وہ ڈیوڈ کے لئے کام کرتا ہے۔'' اس نے غور کر کے کہا۔

''اگر اسے ہیرے مل جائیں تو وہ ڈیوڈ کی پروا بھی نہیں کرے گا۔'' میں نے کہا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد مقدر نے رات کا کھانا دیا۔ ابلی ہوئی سبزیوں میں گوشت کے ریشے تیر رہے تھے اور ساتھ میں تنوری روٹی تھی۔ اس قسم کا سادہ لیکن مقوی کھانا اس خطے میں عام تھا۔ مقدر کھانا دے کر چلا گیا۔ برٹ شا نے آگاہ کیا۔ ''اب یہ جا کر شراب پیئے گا، ناچے گائے گا اور پھر سو جائے گا۔''

سچ مچ کوئی ایک گھنٹے بعد گانے کی آواز کے ساتھ گھنگھرو بجنے کی آواز آنے لگی۔ وہ اپنی بھونڈی آواز میں اقبال بانو کے مشہور گانے کا حشر نشر کر رہا تھا۔ ''پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے...... تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے۔''

''یہ بک بک کب تک جاری رہے گی؟'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر پوچھا۔

''جب تک یہ بالکل ہی نشے میں دھت ہو کر سو نہیں جائے گا۔''

برٹ کا کہنا درست ثابت ہوا، وہ تقریباً بارہ بجے چپ ہوا اور ہم بھی سونے کے لئے لیٹ گئے۔ میں برٹ شا سے ذرا فاصلے پر تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہیں کبھی فرار کا خیال نہیں آیا۔''

''کئی بار آیا...... دو بار فرار بھی ہوا تھا۔''

''فرار ہوئے تھے۔'' میں نے دلچسپی سے کہا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''ظاہر ہے پکڑا گیا۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''ورنہ یہاں کیوں ہوتا!''

''اگر اب فرار ہونے کا موقع ملے تو کیا کرو گے؟''

''کیا کروں گا، ارے سیدھا برطانوی سفارت خانے کا رخ کر کے جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔''

کچھ دیر بعد وہ خراٹے لینے لگا۔ میں بھی سو گیا۔ یہ واقعی حیرت انگیز گھاس تھی، اتنی دبیز اور گرم کہ اوپر کا کمبل بس خانہ پری کی چیز لگ رہا تھا۔ ورنہ گزشتہ رات جو میں نے فتح خان کی کوٹھی کے تہ خانے میں گزاری تھی، بہت مشکل رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ فتح خان اگلے روز مجھ سے رپورٹ لینے آئے گا۔ میں ناشتے کے بعد اس کا

انتظار کرتے ہوئے برٹ شا سے باتیں کرنے لگا۔ وہ ایمن کے بارے میں بتانے لگا کہ اس نے کتنی محبت اور محنت سے اس کی پرورش کی تھی۔ اس نے اسے مروجہ تعلیم کے علاوہ بھی بہت کچھ سکھایا تھا۔ بچپن میں ایک بار سمندر کے کنارے تیرتے ہوئے لہر اسے بہا کر لے گئی تھی۔ لوگ اسے بچانے کو دوڑے لیکن وہ خود ہی جدوجہد کر کے ساحل تک آنے میں کامیاب رہی۔ برٹ شا کے لہجے میں ایمن کے لئے محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میں سنتا رہا، کبھی کبھی درمیان میں سوال بھی کرتا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی لیکن فتح خان نہیں آیا جب مقدر دوپہر کا کھانا دینے آیا تو میں نے اس سے فتح خان کا پوچھا۔ ''اس سے کہو، مجھے چھوڑ دے ورنہ......''

''خان جی، ادھر نہیں ہے۔'' اس نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ ''آرام سے بیٹھو، کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے کہو، میں ہوں ناں......؟''

''کیا تم مجھے جانے دو گے؟''

''اس دنیا سے۔'' وہ بولا۔ ''لیکن اس قید خانے سے نہیں۔''

''بے کار ہے۔'' عقب سے برٹ شا نے کہا۔ ''اسے فتح خان سے کم مت سمجھو۔''

''یہ مجھے زیادہ اچھی طرح جانتا ہے۔'' مقدر بولا اور بل کھا کر واپس چلا گیا۔

''تم فتح خان سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟'' اس کے لہجے میں شک تھا۔

''یہ تم سے کس نے کہا؟''

''میں صبح سے محسوس کر رہا ہوں، تم انتظار والی کیفیت میں ہو۔''

میں ذرا حیران ہوا۔ واقعی میں اس سے اپنی کیفیت نہیں چھپا سکا تھا لیکن میں نے نفی میں جواب دیا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''دراصل کل تم سے ملنے کی حیرت تھی اور آج مجھ پر قید کی دہشت طاری ہو رہی ہے۔''

وہ اٹھ بیٹھا۔ ''سچ بتاؤ...... تمہیں فتح خان نے تو نہیں بھیجا ہے؟''

''یہ سوال تمہارے ذہن میں کیوں آیا؟''

''کیونکہ وہ بلاوجہ روگ پالنے کا عادی نہیں ہے۔ اگر تم اس کے محض دشمن ہو تو وہ تمہیں ختم کر دے گا۔ اس طرح قید میں نہیں رکھے گا۔''

''یہ تم سے کس نے کہا کہ وہ صرف میرا دشمن ہے اور مجھ سے اس کا مفاد نہیں ہے؟''

''تم نے اس بارے میں بتایا نہیں ہے۔''

''بتانے والی بات ہوتی تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوتا۔''

اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''کہیں اس کا تعلق مجھ سے اور ہیروں تو نہیں ہے؟''

''تم کچھ بھی سمجھنے کے لئے آزاد ہو۔'' اس بار میں نے بھی خشک لہجہ اختیار کیا۔

''معاف کرنا۔'' وہ شرمندگی سے بولا۔ ''اتنے عرصے کی قید نے میرا دماغ الٹ دیا ہے، اپنے سائے تک کو شک سے دیکھنے لگا ہوں۔''

''اپنے سائے کو تم ضرور شک سے دیکھو لیکن دوسروں کو معاف رکھو۔''

''خدا کے لئے دوست، مجھے معاف کر دو۔'' اس نے گڑگڑا کر کہا تھا، پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ''کیا ایمن سچ مچ پاکستان آنے والی ہے؟''

''اس سے آخری بار میری جو بات ہوئی تھی، اس سے کچھ ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ یہاں آنے کی تیاری کر رہی ہے۔''

''اسے یہاں نہیں آنا چاہئے۔'' برٹ شا نے اضطرابی انداز میں کہا۔ ''تمہارا اس سے رابطہ کیسے ہوا، فون کے ذریعے؟''

''نہیں، انٹرنیٹ کے ذریعے۔''

''انٹرنیٹ کیا......؟'' اس نے منہ کھول کر کہا۔

اسے سمجھنا پڑا کہ انٹرنیٹ کیا چیز ہوتی ہے اگرچہ 1990ء کے عشرے تک انٹرنیٹ نے عام فرد تک رسائی حاصل کر لی تھی لیکن ابھی اس نے عوامی صورت اختیار نہیں کی تھی اور زیادہ تر اداروں تک محدود تھا۔ بہر حال برٹ شا جدید دنیا کا تعلیم یافتہ باشندہ تھا اس لئے بات جلد اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے سر ہلایا۔

''ان گیارہ سالوں میں دنیا بہت تیزی سے بدل گئی ہے۔''

''خاصی تیزی سے۔'' میں نے بتایا۔ ''چند سال پہلے تک ہمارے ہاں فکسڈ فون حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف سمجھا جاتا تھا، اب چھابڑی والا بھی موبائل فون لئے گھومتا ہے۔''

''ہماری طرف کے ایک دانشور سائنس داں نے پیش گوئی کی تھی کہ اس صدی کے آخر تک ترقی کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی، ہر دس سال بعد دنیا بدل جائے گی۔''

''دنیا کی اکلوتی سپر پاور اس کے لئے بڑی محنت کر رہی ہے، اس کی کوشش ہے کہ ایک دو سال میں دنیا کا نقشہ بدل جائے۔ کم سے کم مسلم ممالک اور ہمارا ملک اس کا پورا پورا ساتھ دے رہا ہے۔''

''سیاست مت کرو۔'' اس نے منہ بنایا۔

''حالانکہ یہ تم لوگوں کی سیاست ہے، اپنی مرضی اور دھونس دھاندلی کر لو اور جب غریب ملک یا اس کے لوگ شور مچائیں تو اسے سیاست قرار دے دو۔ ویسے آج کل ایک نعرہ بہت مقبول ہو رہا ہے۔''

''کون سا نعرہ؟'' وہ چونکا۔

''دہشت گردی کا۔ اس نعرے سے مغربی دنیا وہ کام لے رہی ہے جو وہ چار پانچ سو سال کی تاریخی کالونی ازم سے حاصل نہیں کر سکی۔''

وہ پھر منہ بنا کے بولا۔ ''یہ کیا بکواس ہے؟''

''یہی تو میری اور بہت سارے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ مسلح اور جارح شخص لوگوں کو مارے اور امن کا علم بردار کہلائے اور جو اپنی جان بچانے کی کوشش کرے وہ دہشت گرد۔ مغربی دنیا آج کل یہی کر رہی ہے۔''

نائن الیون اور اس کے بعد کے حالات نے اسے کسی قدر فکر مند کر دیا تھا، آخر اس نے پوچھا۔ ''ایمن صحافی ہے، کہیں اسے بھی عراق یا افغانستان......''

''وہ ماحولیاتی صحافی ہے۔'' میں ہنسا۔ ''اس کا کسی میدانِ جنگ میں جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ دوسرے وہ میدانِ جنگ میں جائے بغیر بھی بہت سارے خطرات سے دوچار ہے۔''

''یہاں آنے سے......''

''نہیں، اپنے ملک میں بھی۔ تمہاری بازیابی اور تلاش کی کوشش کر کے لازمی طور پر ڈیوڈ شا چوکنا ہو گیا ہو گا۔''

''ڈیوڈ بہت سفاک شخص ہے۔'' برٹ شا نے فکرمندی سے کہا۔ بچپن سے اس کے رجحانات تشدد پسندانہ تھے۔ ایک بار اسے چند مہینے کے لئے نفسیاتی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کی پالتو چینی مرغیوں کو زہر دے کر ہلاک کر دیا تھا اور پوچھنے پر صرف اتنا کہا کہ وہ دیکھنا چاہتا ہے، زہر کے اثر سے ایک جاندار کس طرح جان دیتا ہے۔''

''تم نے جانوروں پر اس کا تشدد دیکھا ہے، یہاں اس نے اس تصویر کے حصول کے لئے درجنوں انسانوں کو بے دریغ مروا دیا ہے۔''

''ایمن خطرے میں ہے۔''

''لیکن یہاں بیٹھ کر تم اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔''

''پھر میں کیا کروں؟''

''فتح خان سے بات کرو۔ اس سے معاملہ طے کرو اور یہاں سے نکلو، اگر کسی طرح ڈیوڈ شا کو تمہارے بارے میں علم ہو گیا تو یہ کام ناممکن ہو جائے گا، تم جانتے ہو ڈیوڈ کو ہیروں سے نہیں تمہاری جان لینے سے دلچسپی ہو گی۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ غالباً وہ میری تجویز کا جائزہ لے رہا تھا۔ ''فتح خان سے معاملہ کیسے ہو گا، ابھی وہ سب مان جائے گا، لیکن جب ہیرے اس کے ہاتھ میں آ جائیں گے، تو کیا وہ مجھے ڈیوڈ کے حوالے کر کے نمبر نہیں بنا لے گا؟''

''یہ خدشہ تو میرے دل میں بھی ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''دوسرا سوال یہ...... کہ تم فتح خان سے معاملہ کرنے پر اتنا زور کیوں دے رہے ہو؟''

''کیونکہ مجھے بھی ایمن کی فکر ہے۔''

''ایمن کا باپ میں ہوں۔''

''برٹ شا مجھے تم سے اور تمہاری بیٹی سے ہمدردی ہے۔ اگر تم اسے کسی اور پیمانے سے ناپنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔''

''میں تم پر شک نہیں کر رہا ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں صرف بات واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

میں چپ ہو گیا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے پورا ایک دن ہو گیا تھا اور اب صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ مجھے فتح خان کی دھمکی کی فکر تھی اور ساتھ ہی یہ حیرت بھی کہ مجھے یہاں بھیج کر وہ اتنا مطمئن ہو کر کیوں بیٹھ گیا تھا! شام

ہوئی، مقدر رات کا کھانا لایا۔ اس بار وہ دو الگ تھالوں میں کھانا لایا تھا، ایک تھال مجھے دیا اور دوسرا برٹ شا کو پکڑا دیا۔ جب تک ہم کھانا کھاتے رہے، اس نے باہر سے مشکیزے میں لا کر پہاڑی سائز ڈول اور گھڑے میں پانی بھرا۔ کھانا کھانے کے پندرہ منٹ بعد برٹ شا نے جماہی لی۔ ''مجھے آج نیند محسوس ہو رہی ہے۔''

''سو جاؤ۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''حیرت ہے، مجھے شاید ہی کبھی اتنی جلدی نیند آئی ہو۔'' وہ کہتے ہوئے اپنی جگہ پر لیٹ گیا اور چند منٹ بعد اس کے خراٹے نشر ہو رہے تھے۔ تقریباً دس پندرہ منٹ کے بعد مقدر آیا، اس نے خاموشی سے تالا کھولا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں باہر نکلا اس نے تالا لگایا اور مجھے اس کوٹھری میں لایا جہاں میری آنکھوں سے تاریک عینک اتاری گئی تھی۔

''اس نے کھانا کھالیا؟'' مقدر نے پوچھا۔

''آخری نوالے تک۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کھانے میں کیا تھا، وہ چند منٹ کے اندر سو گیا؟''

''ایک خواب آور دوا تھا۔'' فتح خان اندر آتے ہوئے بولا۔

''تم کہاں تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک چکر میں پڑ گیا تھا۔ ابھی میں تمہیں لینے آیا ہوں۔''

''فتح خان، میں نے اسے تقریباً راضی کر لیا ہے۔''

''اسے مارو گولی، میرے ساتھ چلو۔''

''اس وقت...... جیپ پر......؟'' میرا خون خشک ہو گیا تھا۔

''تم فکر مت کرو۔ سارا راستہ میرا دیکھا ہے۔ میں آنکھ بند کر کے جیپ چلا سکتا ہے۔''

''اب ایسا بھی مت کرنا۔'' میں نے کہا اور مقدر نے مجھے عینک پہنا دی۔

اس بار سفر میں میرے ساتھ مقدر بیٹھا تھا۔ جیپ سُست رفتاری لیکن مستقل رفتار سے اس دشوار ترین راستے پر سفر کر رہی تھی۔ مقدر نے سیٹ بیلٹ باندھ دی، اس سے جھٹکے تو کم نہیں ہوئے تھے لیکن میں لڑھکنے سے بچ گیا۔ دن کے مقابلے میں رات ہونے کی وجہ سے زیادہ دیر لگی تھی۔ میرا اندازہ تھا، ہم کوئی تین گھنٹے بعد کوٹھی تک پہنچے تھے۔ پورچ سے گیلری تک آتے آتے میری قلفی جم گئی۔ اونچی پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے یہاں سردی کی شدت زیادہ تھی۔ فتح خان نے جس طرح پٹڑی بدلی تھی، اس سے لگ رہا تھا، حالات میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ کہاں تو کل تک وہ برٹ شا سے ہیرے اگلوانے کے لئے اتنا بے تاب تھا کہ مجھے اس کام کے لئے صرف دو دن کی مہلت اور اتنی خوف ناک دھمکی دی تھی اور کہاں اب وہ برٹ شا اور ہیروں کو جہنم میں جھونکنے کا مشورہ دے کر مجھے وہاں سے نکال لایا تھا۔ کوٹھی میں سناٹا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ حالات کی تبدیلی کی وجہ میرے سامنے آئے گی لیکن اس کے بجائے گلے خان میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے تہ خانے میں اپنے سیل میں پہنچا دیا۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ سفیر اور مونا بے خبر سو رہے تھے۔

ان کے بستر یقیناً گرم ہو چکے تھے لیکن میرا بستر برف کی سِل بنا ہوا تھا اور اس پر لیٹنا کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ بہر حال لیٹنا تو تھا۔ میں کمبل لے کر لیٹ گیا۔ سفر نے جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا مگر اس سردی میں آسانی سے

نیند کہاں سے آتی اس لئے میں غور وفکر کرنے لگا۔ فتح خان اتنی رات گئے جس طرح مجھے عجلت میں لایا تھا، کوئی گڑبڑ لگ رہی تھی۔ لیکن فتح خان کو کسی کی کیا فکر ہو سکتی تھی! اچانک ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا خیال آیا۔ کہیں فتح خان نے مرشد علی سے ہمارا سودا تو نہیں کرلیا۔ ہمارا سودا مرشد علی کے مزید انتقام کے لئے ہی نہیں، بلکہ اس کی سیاسی بقا کے لئے بھی ضروری تھا۔ ہم زندہ رہتے اور اس کے خلاف لڑتے رہتے تو اس کے سیاسی مخالفین ہماری حمایت اور مدد کر کے اس کے لئے مزید مشکلات کھڑی کر سکتے تھے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ہم سے چھٹکارا حاصل کر لے اور اس کے لئے وہ بڑی سے بڑی قیمت دینے کو تیار ہوگا۔ فتح خان کی زندگی کا محور و مرکز ہی پیسا تھا اور وہ پیسے کے لئے ہی سب کچھ کرتا تھا۔ اگر مرشد علی اسے بڑی رقم کی پیش کش کرتا تو وہ ہمیں اس کے حوالے کر سکتا تھا۔ اسے مرشد علی سے اور فوائد بھی حاصل ہو سکتے تھے۔

نہ جانے کب مجھے نیند آئی پھر مجھے مونا کی آواز نے جگایا تھا۔ وہ مجھے آوازیں دے رہی تھی۔

''شوبی! اٹھو...... تم کب آئے...... شوبی؟''

''رات کو......'' میں نے کمبل سے سر نکال کر کہا۔ ''تم دونوں تمام مویشی بیچ کر سو رہے تھے۔''

''ہمیں جگا دیا ہوتا۔''

''نہیں بے کار تھا۔ خود میرا تھکن اور نیند سے برا حال تھا۔''

''فتح خان، تجھے کہاں لے گیا تھا؟''

گلے خان کے آنے تک میں نے تفصیل سے انہیں دو دن کی رُوداد سنائی۔ برٹ شا کے زندہ ہونے کا سن کر وہ اچھل پڑے تھے۔ ''میرے خدا، وہ گیارہ سال سے فتح خان کی قید میں ہے؟'' مونا بولی۔

''دونوں ہی بلا کے ضدی ہیں۔ فتح خان کو ہیرے درکار ہیں اور برٹ شا کو آزادی۔ دونوں ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔''

''فتح خان کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے برٹ شا سے؟'' سفیر نے پوچھا۔

''اسے برٹ شا سے خطرہ ہے، آزادی کے بعد وہ پاکستانی حکام پر دباؤ ڈال کر اس کے خلاف کارروائی کروا سکتا ہے۔ فتح خان پہلے ہی پولیس کو مطلوب ہے۔''

اتنے میں گلے خان اندر آیا، اس نے سفیر اور مونا کی کوٹھریوں کو بیک وقت کھولا۔ ''پہلے تم دونوں جائے گا۔''

گلے خان نے غالباً ایک چکر بچانے کے لئے ان کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ پندرہ منٹ بعد ان کی واپسی کے بعد میری کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ ''اب تمہاری باری ہے۔''

''کیا چکر ہے استاد!'' میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ''آج بڑی عجلت میں لگ رہے ہو، کیا اوپر کوئی مہمان آیا ہے کیا؟''

اس وقت ہم سیڑھیوں کے پاس تھے، گلے خان نے منہ بنایا۔ ''ابھی تم دیکھ لے گا۔''

باتھ روم سے فارغ ہو کر اور سرد ترین پانی سے اخلاقاً منہ ہاتھ دھو کر میں باہر نکلا تو گلے خان نے مجھے واپس تہ خانے کی طرف لے جانے کے بجائے دائیں طرف کی ایک ایسی گیلری کا رخ کیا جہاں میں اس سے

پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔ ایک بڑے سے دروازے کے سامنے رک کر اس نے دستک دی اور چند لمحے بعد دروازہ کھول کر اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں اندر داخل ہوا لیکن وہ باہر ہی رہا اور دروازہ بند کر دیا۔ اندر ایک شاہانہ طرز کی کرسی پر ڈیوڈ شا خاصے شاہانہ قسم کے لباس میں بیٹھا تھا اور فتح خان اس کے سامنے پشتینی ملازموں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ ان دونوں نے میری آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں کچھ دیر تک اُنہیں دیکھتا رہا پھر بے پروائی سے دیوار گیر آتش دان کے اوپر لگی سینری کو غور سے دیکھنے لگا۔ سینری میں گھوڑوں کے ایک ریوڑ کو سنہری جنگلات کے دامن میں ایک چراگاہ میں مصروف روزگار دکھایا گیا تھا۔

''شہباز ملک!'' ڈیوڈ شا کی آواز گونجی تو میں نے نوٹس نہیں لیا۔

''تم نے سنا نہیں؟'' اس بار فتح خان دھاڑا۔

''ہاں، سنا تھا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا اس تصویر کا تعلق بھی کسی انجانی سرزمین سے ہے۔''

''اگر میں کہوں ہاں تو....؟''

''میں تمہیں چیلنج نہیں کروں گا کیونکہ ایسے احمقانہ دعوے لوگ کرتے ہی رہتے ہیں۔''

ڈیوڈ شا اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے لاف گزاف کرنے کی عادت نہیں ہے، میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''کام کی بات کرو۔'' میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''بے کار کی باتیں کرنا تمہارے جیسے آدمی کو زیب نہیں دیتا۔''

''کام بھی بتا دیا جائے گا۔ فی الحال تمہیں چند طبی مراحل سے گزرنا ہوگا، تمہارے اس ہاتھ کا معائنہ ہو گا۔'' اس نے میرے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔

''ضرور...... کیا تم نے حکیم قادس کو بھی اسی لئے اغوا کیا ہے؟''

اس سوال پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر سرد لہجے میں کہا۔ ''تم زیادہ ہی چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''کیا واقعی...... میں چالاک ہوں نہیں؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''اسے لے جاؤ۔'' ڈیوڈ شا نے بے زاری سے کہا۔ فتح خان نے واکی ٹاکی پر گلے خان کو طلب کیا اور دونوں مجھے کوٹھی کے عقبی حصے میں لان کے آخری سرے پر بنی دو کمروں کی چھوٹی سی عمارت میں لائے، اس کے اوپر سرخ کھپریل کی چھت تھی۔ اس کے ایک کمرے میں دو سفید فام مصروف عمل تھے۔ انہوں نے سفید کوٹ پہن رکھے تھے اور کمرے میں کئی طرح کی مشینیں نظر آ رہی تھیں۔ غالباً وہ ان مشینوں کو سیٹ کرنے میں مصروف تھے۔

''ابھی وقت لگے گا۔'' ایک نے ناگواری سے فتح خان کو اطلاع دی۔ ''اسے ابھی سے کہاں لے آئے؟''

''کتنی دیر لگے گی؟'' فتح خان نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔

''تقریباً دو گھنٹے۔''

''بہتر ہو گا تم مجھے ناشتے سے فارغ کرا دو۔'' میں نے فتح خان کو مشورہ دیا۔

''اس معائنے سے پہلے ناشتا نہیں مل سکتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ معائنے کی شرط ہے۔''

''عجیب احمقانہ شرط ہے۔''

ان مشینوں میں زیادہ تر چھوٹی اور کمپیوٹرائزڈ تھیں۔ وہ انہیں خاص ترتیب میں نصب کر رہے تھے، کمرے میں ہر طرف تاروں کے جال پھیلے تھے۔ مجھے ایک چھوٹی سی ایکسرے مشین بھی نظر آئی۔ اس گورے نے فتح خان کو مشورہ دیا جو پہلے بھی بولا تھا۔ ''فی الحال اسے یہاں سے لے جاؤ، جب مشینیں تیار ہوں گی تو بتا دیں گے۔''

''اسے ڈیوڈ صاحب نے یہاں بھیجا ہے۔'' فتح خان بولا پھر اس نے واکی ٹاکی پر شاید ڈیوڈ شا سے رابطہ کیا۔ ''ابھی تک یہ لوگ تیار نہیں ہیں، کہتے ہیں دو گھنٹے اور لگ سکتے ہیں۔ اب کیا حکم ہے؟''

جواب سن کر فتح خان نے واکی ٹاکی بند کر دیا اور مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم باہر لان پر نکل آئے۔ لان بھی چھوٹا سا ہی تھا در اصل اس پہاڑی کی اوپری سطح زیادہ بڑی نہیں تھی۔ جس پر یہ کوٹھی واقع تھی۔

''تو یہ وجہ تھی، مجھے رات کو واپس لانے کی؟'' میں نے فتح خان سے کہا۔

''تم نے عقل مندی کی جو ڈیوڈ صاحب کے سامنے برٹ شا کا ذکر نہیں کیا۔ گلے خان نے تمہیں اس کے انجام سے آگاہ کر دیا ہوگا۔''

دفعتاً گلے خان کے وسیع وعریض چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ظاہر ہے اس نے مجھے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی اور یہ بات میں فتح خان کو بتا دیتا تو اس کی شامت آ جاتی لیکن میں نے اس سے گریز کیا۔ ''فی الحال تو دھمکیوں پر گزارا چل رہا ہے۔ بائی داوے! اگر ڈیوڈ شا کو برٹ شا کی موجودگی کا علم ہو جائے تو کیا ہوگا؟''

''تمہارا وفات!'' فتح خان نے خوں خوار لہجے میں کہا۔

''تبھی میں نے نہیں بتایا۔ ویسے مجھے معلوم ہے، ڈیوڈ شا کیا کرے گا۔''

''کیا کرے گا؟'' فتح خان نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

''تمہارے ساتھ تو نہ جانے کیا کرے گا لیکن اپنے کزن کو فوری طور پر اپنے آباؤ اجداد کے پاس بھیج دے گا۔''

''تمہارا مطلب ہے قتل کر دے گا؟'' فتح خان نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''ہاں، اگر اسے زندہ رکھنا اور اس سے ہیرے حاصل کرنا چاہتے ہو تو ڈیوڈ کو برٹ شا کی بھنک بھی مت پڑنے دینا۔''

''میں ایسا ہی کرے گا۔'' فتح خان بولا۔ ''پر تم کو اس سے کیا ہمدردی ہے؟''

''میری ڈیوڈ شا سے دشمنی ہے اور اس کا ہر دشمن میرا دوست ہے۔''

فتح خان نے گلے خان کو جانے کا اشارہ کیا اور اس کے جانے کے بعد دھیمے لہجے میں بولا۔ ''یہ بتاؤ، برٹ شا ہیرے دینے پر راضی ہے؟''

''بشرطیکہ اسے ضمانت دی جائے کہ اسے کام نکل جانے کے بعد مارا نہیں جائے گا۔''

''میں ضمانت دے گا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''میں نے نفی میں سر ہلایا۔'' وہ زبانی کلامی نہیں، ٹھوس ضمانت چاہتا ہے۔''

''یہ کیسے ہوگا؟'' فتح خان نے اپنی خش خشی داڑھی کو کھجایا۔

''یہ سوچنا تمہارا کام ہے برٹ شا کو ایسی کوئی ضمانت دو کہ وہ ہیرے تمہارے حوالے کرنے پر راضی ہو جائے۔''

''ایک بات بتاؤ، کیا برٹ شا اور ڈیوڈ شا میں دشمنی ہے؟''

''اتنی سی بات تو ایک بچہ بھی سمجھتا ہے۔ ڈیوڈ شا نے برٹ شا کے غائب ہوتے ہی اس کی بچی کے نابالغ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی جائیداد اور خطاب کو ہتھیا لیا۔ برٹ شا اسے کیسے معاف کر سکتا ہے۔ دوسرے ڈیوڈ شا کیا جاگیر اور خطاب سے دست بردار ہو جائے گا؟''

''تم ٹھیک کہتا ہے۔''

''سنو...... اگر تم برٹ شا کو رہا کر دو گے تو وہ تمہارے خلاف کچھ کرنے کے بجائے سب سے پہلے وطن جا کر اپنی جائیداد واپس حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور ممکن ہے سرے سے واپس ہی نہ آئے۔ تمہارے پاس اتنا وقت ہوگا کہ اپنا سب بیچ کر اور ہیرے لے کر وسط ایشیا کی طرف نکل جاؤ۔''

''یہ تم میرا اتنی خیر خواہی کیوں کر رہا ہے؟'' اس نے شکی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کیونکہ میری بھی ولی خواہش ہے کہ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ تاکہ میرا ایک جنجال تو کم ہو۔ پہلے ہی میری پریشانیاں کم نہیں ہیں۔''

''اگر میرے کو ہیرے مل جائیں تو میں بالکل دفع ہو جائے گا۔'' فتح خان نے یقین دلانے کے انداز میں کہا۔

''یہ یقین مجھے نہیں، برٹ شا کو دلاؤ۔''

اس لمحے مجھے یقین آ گیا کہ لالچ اچھے خاصے عقل مند آدمی کی مت بھی مار دیتا ہے۔ فتح خان بالکل بچوں کی طرح ردِعمل ظاہر کر رہا تھا اور میری باتوں پر اتنے خضوع و خشوع سے سر ہلا رہا تھا جیسے مجھ سے بڑا اس کا خیر خواہ اس دنیا میں کوئی نہ ہو۔ اس وقت وہ اپنے باس ڈیوڈ شا سے بھی فرنٹ لگ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''تم ڈیوڈ شا کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''کیسے چھوڑ دوں...... ابھی تو اس نے مجھے بچایا ہوا ہے۔ پیسا بھی یہی دے رہا ہے کوٹھی بھی اس کی ہے۔'' اس نے اشارہ کیا۔

''یہ کوٹھی ڈیوڈ شا کی ہے!'' میں حیران ہوا تھا۔

''ادھر پاکستان میں اس کے پاس بہت جائیداد اور دولت ہے، بڑے بڑے لوگوں سے اس کے تعلقات ہیں۔''

''یعنی یہ یہاں ہاتھ پاؤں پھیلا رہا ہے۔''

''کہتا ہے مجھے مشرق پسند ہے، شاید ہمیشہ کے لئے یہاں رہ جائے۔''

''اور شہروں میں بھی اس کے ٹھکانے ہیں؟''

''ہر بڑے شہر میں، کراچی، لاہور، اسلام آباد اور ادھر پشاور میں بھی۔'' اس نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔ ''ادھر کاغان، ناران، بلتستان، ہر جگہ اس کا ٹھکانا ہے۔''

اچانک مجھے یاد آیا۔ ''سنو، میں نے صبح اپنے ساتھیوں سے برٹ شا کی بات کی تھی اگر وہ ڈیوڈ شا نے سن لی تو......؟''

''ہم بچے نہیں ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''اندر قید خانے کا مائیک خراب کر دیا ہے۔ ابھی اس کا آدمی رات کو ٹھیک کرے گا، تب تک تم اپنے ساتھی لوگ کو سمجھا دینا۔''

''ٹھیک ہے...... لیکن اب تم بھی محتاط رہو۔ جتنی جلدی ممکن ہو، برٹ شا سے معاملہ طے کر لو اور اب اس کا نام بھی مت لینا۔ ان گوروں کو نہیں جانتے ہو تم...... وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔''

دو گھنٹے بعد گورے ٹیکنیشین نے مشینری کی تنصیب کا اعلان کیا۔ مجھے اس کمرے میں لے جایا گیا۔ ایک کرسی پر میرا ہاتھ ہتھے سے باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد اس پر ایک چمڑا پلیٹ دیا گیا، جس سے متعدد تاریں نکل کر ایک مشین میں جا رہی تھیں۔ ڈیوڈ شا بھی وہاں آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی دونوں گورے محتاط اور مؤدب نظر آنے لگے تھے۔ ایک گورا مشین کی اسکرین پر ریڈنگ لے رہا تھا۔ تقریباً چند منٹ تک میرے ہاتھ پر چمڑا چڑھا رہا آخر میں اس نے رپورٹ پیش کی۔ ''ہاتھ ہر لحاظ سے نارمل ہے، بس پشت کے مسلز ذرا کمزور ہیں۔ جن کی وجہ سے اسے کبھی کبھی گرفت کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔''

''یہ درست کہہ رہا ہے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

دوسرے گورے نے میرے ہاتھ سے چمڑا اتار کر چھوٹے چھوٹے الیکٹروڈ چپکانے شروع کر دیئے۔ اکثر مریضوں کو جن کے دل کا کارڈیو گراف لینا ہو، اس قسم کے الیکٹروڈ لگا دیئے جاتے ہیں۔ یہ اس کی چھوٹی قسم تھی جو میری کلائی سے لے کر انگلیوں کی پوروں تک چپکائے تھے، یہ الیکٹروڈ بھی ایک چھوٹی سی مشین سے منسلک تھے اور مشین سے ایک لیپ ٹاپ کمپیوٹر لگا تھا دوسرا گورا اس کے بٹنوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ اسکرین پر ایک ہاتھ نما گراف آ رہا تھا۔ پھر اس گراف کو واضح کیا جانے لگا۔ ذرا سی دیر میں اسکرین پر خلیات نما چیزیں حرکت کرتی نظر آنے لگیں۔ ان خلیوں کے درمیان سبزی مائل کوئی مادہ سا تھا۔

''یہ کیا چیز ہے؟'' ڈیوڈ شا نے پوچھا۔

''ایک کیمیکل...... جو خلیوں کے درمیان ہے۔ نارمل میں بھی خلیوں کے درمیان میں ایسا کوئی کیمیکل نہیں پایا جاتا ہے اس کے تجزیے کے لئے ہمیں اس کے ہاتھ سے نمونہ لینا ہوگا۔''

''لے لو۔ مجھے کب تک رپورٹ ملے گی؟''

''تجزیے کے لئے اسے اسلام آباد لے جانا ہوگا۔'' گورے نے کہا۔ ''کم سے کم دو دن لگیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈیوڈ شا نے سر ہلایا اور مجھ سے بولا۔ ''آؤ، میرے ساتھ......''

''جناب نمونہ!'' کمپیوٹر چلانے والے گورے نے کہا۔

''ابھی کچھ دیر میں یہ آ جائے گا۔''

ڈیوڈ شا مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لایا۔ ''بیٹھو۔'' ڈیوڈ شا نے نرمی سے کہا۔

میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ڈیوڈ شا نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''حکیم قادس باکمال آدمی ہے اس کے پاس ناممکن کو ممکن کر دکھانے والی کچھ ادویات ہیں۔''

''میں براہِ راست دو بار ان دواؤں کا اثر دیکھ چکا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''میں جانتا ہوں...... اگر یہ ادویات بین الاقوامی مارکیٹ میں آ جائیں تو......''

''ملٹی نیشنل کمپنیوں کو لوٹ کھسوٹ کا ایک اور موقع مل جائے گا۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں جو مفید ایجادات کو عام لوگوں تک پہنچاتی ہیں۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔ ''بہرحال یہ بحث کا موقع نہیں ہے۔ حکیم کا کہنا ہے کہ وہ دوا میں چند مقامی جڑی بوٹیاں استعمال کرتا ہے لیکن ان کا اصل جزو ایک خاص پتھر کی راکھ ہے جو راجا عمر دراز کے پاس ہے۔''

''یہ بھی درست ہے۔''

''مجھے وہ پتھر چاہئے۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''حاصل کر لو جیسے تصویر حاصل کی تھی۔''

''نہیں، اب میں اسے دوسرے طریقے سے حاصل کروں گا۔'' میں نے ڈیوڈ شا کو پہلی بار مسکراتے دیکھا۔ ''وہ پتھر مجھے تم لا کر دو گے شہباز ملک!''

''میں......؟''

''ہاں تم!'' وہ بولا۔

''اور اب تم مجھے میرے ساتھیوں کے حوالے سے دھمکی دو گے؟'' میں نے گہری سانس لے کر تلخ لہجے میں کہا۔

''کیا تم نہیں جانتے، مرشد علی تم تینوں کے خون کا پیاسا ہے۔ اگر تم اس کے ہاتھ آ گئے تو وہ تمہارا کیا حشر کر سکتا ہے، خاص طور سے اس نازک لڑکی کا......''

''مرشد علی کی آڑ کیوں لیتے ہو۔ کیا تم میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہے کہ براہِ راست مجھے دھمکی دے سکو۔'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''شہباز ملک! مجھے وہ پتھر چاہئے۔ اگر راجا عمر دراز تمہیں نہ دے تو تم اسے چرا کر لاؤ گے۔'' وہ میری بات نظر انداز کر کے بولا۔

''اس کام کے لئے تم یقیناً مجھے آزاد کر دو گے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن مونا اور سفیر میرے پاس ہوں گے۔''

''ظاہر ہے، ورنہ میں تمہارا کام کیسے کروں گا؟'' میں نے سر ہلایا۔

''اب تم جا کر نمونہ دے دو...... ممکن ہے اس ایک نمونے کی وجہ سے تاریخ میں تمہارا نام محفوظ رہ جائے۔''

''مجھے ایسے نام کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

☆======☆======☆

گوروں نے میرے ہاتھ سے میرے ٹشوز کا ایک نمونہ لیا تھا۔ اس کے بعد مجھے ناشتا فراہم کیا گیا تھا۔ کمرے میں پہنچا تو مونا اور سفیر بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مونا مجھے دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔

''کہاں تھے تم...... یہ تمہیں کہاں لے جاتے ہیں؟''

''بتاتا ہوں۔'' میں نے گلے خان کے رخصت ہونے کا انتظار کیا۔

''لگتا ہے فتح خان تجھے زیادہ ہی پسند کرنے لگا ہے؟'' سفیر ہنسا۔

''گلے خان جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوا، میں نے انہیں اوپر پیش آنے والے واقعات مختصراً سنائے۔

''خاص بات یہ ہے کہ تہ خانے میں لگے مائیکروفون ناکارہ ہیں۔''

''میرے لئے تو مائیکروفون کی موجودگی کی اطلاع ہی نئی ہے۔'' سفیر بولا۔

''تم بھول رہے ہو، مائیکروفون کی مدد سے فتح خان میری بات سن کر مجھے برٹ شا کے پاس لے گیا تھا۔ میں نے وہ بات ہی اس لئے کی تھی کہ مجھے مائیک کا شبہ تھا۔''

''اب یہ مائیک کیسے خراب ہو گئے؟'' مونا نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے تم لوگ سو رہے ہو...... ابھی کیا بتایا ہے میں نے۔'' میں بھنا کر بولا۔ ''فتح خان نے بتایا ہے۔''

''کیا تم اس کی بات پر اعتبار کر سکتے ہو؟''

''فی الحال تو اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔''

''کیوں......؟'' مونا نے کہا۔

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہے ورنہ معاملات خراب تر ہو جائیں گے۔ ڈیوڈ شا کا مطالبہ میں بتا چکا ہوں، وہ میری مدد سے اس پتھر کو حاصل کرنا چاہتا ہے، جس سے معجزہ اثر ادویات بنتی ہیں۔''

''لیکن نکلیں گے کیسے؟''

''میرے ذہن میں ایک پلاٹ تھا لیکن میں مائیک کے شبے کی وجہ سے خاموش رہا تھا۔''

''ممکن ہے اب بھی فتح خان نے جھوٹ بولا ہو۔''

''ہاں، ممکن ہے...... لیکن ہمیں خطرہ مول لینا چاہئے۔ اسے ناؤ اور نیور سمجھو۔''

''کرنا کیا ہے؟'' مونا نے پوچھا۔

''بی بی، تمہیں صرف خاموش بیٹھنا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور سفیر سے کہا۔ ''مجھے تمہاری پتلون میں بیلٹ نظر آ رہی ہے۔''

''ہاں ہے، لیکن میں اسے اتار نہیں سکتا، پتلون ذرا ڈھیلی ہے۔'' اس نے اعتراض کیا۔

''اس کے بغیر کام نہیں ہوگا۔ سنو، جب رات کو گلے خان ہمیں باتھ روم یا ترا پر لے جانے کے لئے آئے گا تب میں باہر نکلتے ہی اس پر حملہ کروں گا۔ اسے دھکیل کر تمہاری کوٹھری کی طرف لاؤں گا۔ جیسے ہی وہ سلاخوں سے لگے، عقب سے اس کی گردن میں بیلٹ ڈال کر اس کا سر سلاخوں سے ٹکرانا۔''

''گلے خان کا سر...... بہت مشکل ہے، اس بلڈوزر کو کھینچنا۔'' سفیر نے مردہ سی آواز میں کہا۔

''تب سکون سے بیٹھا رہ۔ میں جا رہا ہوں راجا کے پاس۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''کیا ہو گیا ہے تجھے۔ پہاڑوں کو سر کرنے والے کو اتنا کم ہمت نہیں ہونا چاہئے۔''

"اسے چھوڑو شوبی!" مونا نے تلخی سے کہا۔ "یہ تو حویلی سے نکلنے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔"

"اپنی ضد کا نتیجہ دیکھ لیا؟" سفیر نے بھنا کر بولا۔ "میں کم ہمت نہیں ہوں لیکن اگر نا کام رہے تو......؟"

"تب بھی قید تو ہیں ناں......؟" مونا بولی۔

اگلے نصف گھنٹے میں ہم جزئیات کے ساتھ طے کر چکے تھے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ سفیر نے اپنی بیلٹ کی ریہرسل شروع کر دی اور میں کسی ہتھیار کی تلاش میں تھا جس سے گلے خان پر باہر سے حملہ کر سکوں مگر اس کوٹھری میں ایسی کوئی شے نہیں تھی، بیڈ لکڑی کا ضرور تھا لیکن اس میں لگی لکڑی کا نکالنا ممکن نہیں تھا۔ دوسرے تختہ لے کر کوٹھری سے باہر آنے کی اجازت مجھے کون دیتا! اس لئے مجھے جو کرنا تھا، اپنے ہاتھوں پیروں سے ہی کرنا تھا۔

"رات کے وقت ہمیں جسمانی طور پر خود کو تیار رکھنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"فکر مت کرو، اس کے آنے سے پہلے وارم اَپ کر لیں گے۔" سفیر بولا۔

"مونا کچھ متفکر نظر آ رہی تھی۔ سفیر کے پوچھنے پر اس نے کہا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ گلے خان گینڈے کی طرح مضبوط ہے۔"

"ہم بھی شیر سے کم نہیں ہیں۔" سفیر نے جواب دیا۔ "تم نے دیکھا ہوگا بڑے شکار کو ہمیشہ دو تین یا زیادہ شیر مل کر گراتے ہیں۔"

"میں نے آج تک ایک شیر کو بھی شکار گراتے نہیں دیکھا۔" مونا طنزیہ لہجے میں بولی۔ "ہمیشہ شیرنیاں ہی شکار کرتی ہیں اور جب وہ شکار مار گراتی ہیں تو شیر کھانے کو آ جاتے ہیں۔"

"دیکھا...... جانوروں میں بھی کچن اور کھانا مہیا کرنا ماداؤں کی ذمے داری ہوتی ہے۔" سفیر نے چہکا۔

"یہ تُو نے پتے کی بات کی۔" میں نے اسے داد دی۔ "ہم مردوں کی حماقت دیکھو، نہ صرف کما کر لاتے ہیں بلکہ پکانے میں بھی عورتوں کی مدد کرتے ہیں۔"

"تو مت کیا کرو۔" مونا خفا ہوگئی۔

"سچ ہے کہ ہم مردوں نے ہی انہیں سر پر چڑھا رکھا ہے۔" سفیر کا لہجہ جلانے والا تھا۔

"مونا منہ پھلا کر بستر پر جا بیٹھی۔ "میں کچھ نہیں سن رہی۔"

"بس بھائی، ہم مردوں کی قسمت ہی خراب ہے، ورنہ جنت میں عیش نہ کر رہے ہوتے۔"

"صرف بابا آدم۔" مونا سے رہا نہ گیا۔ "تم سب کہاں سے وجود میں آتے؟"

"واقعی، ہم سب کہاں سے آتے؟" سفیر نے حیرت سے کہا تو مونا کھسیا گئی تھی۔

"بدتمیز ہو تم دونوں؟" اس نے جھینپ کر کہا۔

"یہ بھی آپ کی عنایت ہے، کسی قابل تو سمجھا۔" سفیر معنی خیز لہجے میں بولا تو مونا نے چپ ہونے میں عافیت سمجھی تھی۔ باتوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ باہر روشنی اچانک کم ہوگئی ہے۔ میں نے باہر جھانکا، دو میں سے ایک ٹیوب لائٹ بند ہوگئی تھی۔ میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

"شاید مائیک کی تبدیلی ہونے والی ہے۔"

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ پہلے گلے خان کھانا لایا۔ اس کے بعد وہ ایک گورے کے ساتھ آیا۔

گورے نے اسٹول رکھ کر ٹیوب لائٹ کی ٹیوب نکالی۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔'' وہ اسے دیکھ کر بولا۔ ''میرا خیال ہے، اس کا کوئیک چارجر خراب ہو گیا ہے، اسے بدل دیتے ہیں۔''

اس نے کوئیک چارجر پٹی سے الگ کیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہ ٹیوب لائٹ کے عام کوئیک چارجر سے بڑا تھا۔ شاید اس میں مائیک بھی پوشیدہ کیا گیا تھا۔ اس نے کِٹ سے ویسا ہی کوئیک چارجر نکال کر اسے نصب کر دیا۔ ٹیوب لگائی اور گلے خان کو اشارہ کیا۔ اس نے باہر جا کر بٹن آن کیا اور ٹیوب جل اٹھی۔ گورا گلے خان کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ میں نے دیکھا تھا، پہاڑی کے ایک طرف سے بجلی کی تاریں کوٹھی تک آ رہی تھیں۔ یعنی علاقے میں بجلی موجود تھی۔ شاید متبادل بندوبست جیسے یو پی ایس بھی تھا کیونکہ سفیر اور مونا نے ایک لمحے کے لئے بھی لائٹ جاتے نہیں دیکھی تھی۔ جبکہ اس علاقے میں لوڈ شیڈنگ عام تھی۔

اب منصوبے پر بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے ہم موجودصورتِ حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ اپنے پرانے دور کی باتیں کرتے رہے پھر میں آرام کرنے کا کہہ کر لیٹ گیا۔ رات کے مرحلے سے پہلے میں اپنی توانائیاں پوری طرح بحال رکھنا چاہتا تھا۔ میرے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔

ابھی لیٹے ہوئے مشکل سے نصف گھنٹا ہوا تھا کہ گلے خان نازل ہو گیا۔ اس نے میری کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ ''چلو تم کو اوپر بلایا ہے۔''

میں اٹھ کر باہر آیا۔ ''کس نے بلایا ہے۔ فتح خان...... یا ڈیوڈ شا نے۔''

''سوال مت کرو۔'' اس نے غرا کر کہا۔ ''اور چلو۔'' اس نے مجھے دھکا دیا پہلے تہ خانے والے کمرے میں لا کر قید خانے کا دروازہ لاک کیا اور پھر مجھے سیڑھیوں سے اوپر لا کر تہ خانے میں جانے والا دروازہ بھی لاک کر دیا۔

''خیریت، آج تو زیادہ احتیاط کر رہے ہو۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ویسے مطمئن رہو، ہمارا فرار کا ارادہ نہیں ہے۔''

''ام شکرگزار ہے۔'' اس نے اچانک آہستہ سے کہا۔ ''تم نے خان جی سے بولا نہیں۔''

''اوہ...... وہ معمولی سی بات تھی۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''اور ویسے بھی تم سے میری کوئی ذاتی دشمنی تو نہیں ہے۔''

''تمہیں ڈیوڈ صیب نے بلایا ہے۔'' اس نے آگاہ کرنے کے انداز میں کہا۔

''ڈیوڈ شا اپنے کمرا خاص میں حکیم قادس کے ساتھ موجود تھا۔ میں نے اسے خاصے عرصے بعد دیکھا تھا، وہ کمزور اور سہا ہوا نظر آیا۔ میں سیدھا اس کے پاس گیا۔ زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا حال ہیں، حکیم صاحب!''

اس نے بے بسی سے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھ کر اپنی زبان میں چند جملے کہے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے اتنی مختصر گفتگو کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ ہمیشہ تقریر کیا کرتا تھا۔ میں دنگ رہ گیا جب ڈیوڈ شا نے اسی کی زبان میں جواب دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تم اس کی زبان جانتے ہو؟''

''میں اس علاقے کی کئی زبانیں جانتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''قادس ایک منفرد زبان بولتا ہے جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ راجا عمر دراز کے شاہی خاندان کی مخصوص زبان ہے جسے اس خاندان کے افراد اور ان کے خاص ملازمین ہی سمجھتے ہیں۔''

''مشرق میں اس قسم کی پیچیدگیاں عام ہیں لیکن تم نے یہ زبان کیسے سیکھی؟''

''اس سے۔'' اس نے حکیم قادس کی طرف اشارہ کیا۔

میں ایک بار پھر دنگ رہ گیا تھا۔ ''اتنی کم مدت میں؟''

''ہاں، مجھ میں زبانیں سیکھنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ میں سترہ زبانیں اور جانتا ہوں جو تمہارے ملک سے باہر بولی جاتی ہیں۔ یہاں کی سات زبانیں اس کے علاوہ ہیں۔''

''میں خاصا متاثر ہوا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

ڈیوڈ شا کی تیوری پر بل پڑ گئے تھے۔ ''تمہارے خیال میں، مَیں جھوٹ بول رہا ہوں۔''

''نہیں، ایسا میں کیسے سوچ سکتا ہوں۔ جبکہ تم ابھی اپنی بات ثابت بھی کر چکے ہو۔'' میں نے حکیم کی طرف اشارہ کیا۔ ''بائی داوے، یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

''یہ تمہارے ہاتھ کا معائنہ کرنا چاہتا ہے۔''

''تو کرے، بلکہ اس سے کہو، میرے ہاتھ میں کمزوری باقی ہے۔ خاص طور سے ٹھنڈا ہونے پر بے حس ہو جاتا ہے۔''

''میں نے اس سے ذکر کیا تھا لیکن فی الحال اس کے پاس تمہارے علاج کے لئے ادویات نہیں ہیں۔''

''مجھے یاد ہے، جب ہم اسلام آباد سے چلے تھے تو اس کے پاس میرے علاج کے لئے تمام دوائیں موجود تھیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، اغوا کرنے والوں کی غلطی سے وہ تھیلا ضائع ہو گیا، جس میں دوائیں تھیں۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ پھر اس نے حکیم قادس سے کچھ کہا اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''جو کام تم لوگ مشینوں سے لیتے ہو، یہ بغیر کسی مشین کے کرتا ہے۔'' میں نے حکیم کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم درست کہہ رہے ہو۔ مشرق میں ایسی حیرت انگیز چیزیں عام ہیں لیکن نتائج غیر یقینی ہوتے ہیں۔ اس کے لئے ان کے کاموں کو سائنٹفک کرنا ضروری ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بعض چیزوں کو سائنٹفک کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کو بروئے کار لانے میں انسان کا اور اس کے جذبات کا عمل دخل لازمی ہوتا ہے۔''

''میں تم سے ان موضوعات پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔''

''موضوعات!'' میں ہنسا۔ ''حالانکہ میں نے تو موضوع پر بھی بات کرنے کی کوشش نہیں کی صرف اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ورنہ مجھے معلوم ہے تم اپنے ارادے پر بہر صورت عمل کرو گے۔''

''جب میں اور ڈیوڈ شا گفتگو کر رہے تھے تب حکیم قادس میرے ہاتھ کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ کبھی اسے غور سے دیکھتا اور کبھی انگلیوں سے دبا کر معائنہ کرتا۔

ڈیوڈ شا نے اٹھ کر ایک طرف رکھی بوتل سے اپنے لئے جام بنایا اور ٹہل ٹہل کر اس کی چسکیاں لینے لگا۔

میں نے کہا۔ ''مسٹر شا، سوال یہ ہے کہ عمر دراز سے وہ پتھر حاصل کرنے کا فائدہ! کیوں کہ وہ تھوڑا ہی ہوگا اور بڑے پیمانے پر ان ادویات کی تیاری کے لئے وہ ناکافی ہوگا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''دوسرے جہاں سے یہ پتھر مزید مقدار میں مل سکتا ہے وہاں بھی اس کی بہت زیادہ مقدار نہیں ہوگی۔''

''اتفاق سے میرا بھی یہی خیال ہے۔'' اس نے دوسرا پیگ تیار کیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ معجزاتی ادویات محدود تعداد میں ہی بنیں گی اور ہر کس و ناکس کے لئے نہیں ہوں گی۔''

''تمہارا ذہن مجھ سے خاصا ملتا ہے۔'' اس نے تعریفی انداز میں کہا۔

''خدا نہ کرے۔'' میں نے کہا جس پر وہ خاصا جز بز ہوا مگر میں نے کوئی نوٹس لئے بغیر گفتگو جاری رکھی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ادویات صرف ان لوگوں کے لئے ہوں گی جو ان کی منہ مانگی قیمت ادا کر سکیں گے۔''

''رائٹ!'' اس نے خالی جام ایک طرف پھینک دیا۔ ''مسٹر ملک، تمہارا یہ اندازہ بھی درست ہے۔ میرا بالکل یہی ارادہ ہے۔ تم واقعی ذہین آدمی ہو۔''

''تمہاری جیسی فطرت کے لوگ کوئی کام مفادِ عامہ کے لئے کر ہی نہیں سکتے۔ یہ بات سمجھنے کے لئے آدمی کا اتنا ذہین ہونا ضروری نہیں ہے۔''

حکیم قادس نے میرے ہاتھ کا معائنہ مکمل کر کے ڈیوڈ شا کو رپورٹ دی۔ وہ بغور سنتا رہا پھر مجھ سے کہا۔

''اس کی رپورٹ بھی وہی ہے جو مشینوں سے ملی تھی۔ تمہارے ہاتھ کی طاقت میں ابھی کمی ہے، اس کا کہنا ہے تمہارا دو ہفتے اور علاج ہو تو یہ کمی مکمل طور پر دور ہو جائے گی۔''

''اور علاج کے لئے وہ پتھر درکار ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔

''ہاں، اگر تم وہ پتھر لے آئے تو ادویات کی پہلی آزمائش تمہارے ہاتھ پر ہوگی۔'' اس نے لالچ دینے والے انداز میں کہا۔

''ایک بات بتاؤ...... بلکہ اس سے پوچھو، پتھر کے اثرات اس نے خود دریافت کئے تھے یا راجا عمر دراز نے اسے بتائے تھے؟''

ڈیوڈ شا چونکا۔ پھر اس نے مقامی زبان میں یہ سوال حکیم قادس سے کیا، اس نے مرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ڈیوڈ شا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اس کا کہنا ہے پتھر کے اثرات اسے راجا عمر دراز نے بتائے تھے اور ادویات کے لئے اسے پتھر بھی وہی مہیا کرتا رہا ہے۔''

''گویا پتھر راجا عمر دراز کے پاس ہے اور وہی جانتا ہے کہ یہ کہاں سے ملے گا؟ اگر میں تم کو پتھر لا بھی دوں، تب بھی تم اس مقام کا پتا کیسے چلاؤ گے، جہاں پتھر پایا جاتا ہے۔'' ڈیوڈ شا سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ''یہ بعد کا مسئلہ ہے۔'' خاصی دیر بعد اس نے کہا۔ ''فی الحال تو وہ پتھر ملے۔''

''تم مجھے کب رہا کر رہے ہو؟''

اس نے مشکوک انداز مجھے دیکھا۔ بڑی جلدی ہے تمہیں؟"

"غالباً تم بھول رہے ہو، ہم یہاں قید میں ہیں اور قید سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"بس اسلام آباد سے رپورٹ آنے دو۔" وہ بولا۔ "اس کے بعد تمہیں چھوڑا جائے گا۔ ابھی تم جا کر آرام کرو۔"

گلے خان مجھے لے جانے آیا تھا۔ راستے میں، مَیں نے اس سے آہستہ سے پوچھا۔ "فتح خان کہاں ہے؟"

"ادھر نہیں ہے، ڈیوڈ صیب نے اسے کسی کام سے شہر بھیجا ہے۔" اس نے سادگی سے بتا دیا۔

"اسلام آباد!" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"اور کون سا شہر ادر سے قریب ہے۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

یعنی آج رات فتح خان کوٹھی میں موجود نہیں ہوگا۔ میں نے سوچا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ وہ خطرناک آدمی تھا۔ خطرناک تو گلے خان بھی کم نہیں تھا لیکن فی الحال میں فتح خان پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کوٹھی میں موجود ہوتا تو مجھے روکنے کی کوشش کرتا اور عین ممکن تھا اس کوشش میں ہم دونوں میں سے ایک اپنی جان سے جاتا۔ گلے خان نے مجھے میری کوٹھری میں بند کر دیا۔ مونا اور سفیر نے اس طلبی کی وجہ پوچھی اور میں نے سادگی سے اوپر ہونے والی تمام باتیں بیان کر دیں۔ ڈیوڈ شا کو برا بھلا بھی کہا انہوں نے بھی میرا ساتھ دیا۔ بلکہ مونا نے یہ جان کر کہ مجھے "کچھ دنوں میں" رہا کر دیا جائے گا باقاعدہ رو کر فریاد کی تھی کہ میں باہر جا کر ان دونوں کو بھول نہ جاؤں۔

"میں کیوں بھولوں گا۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "تمہیں بچانا تو میرا فرض بنتا ہے۔ آج کل مجبوری کا دوسرا نام فرض ہے۔"

"دفع ہو جا...... مت کرنا ہمارے لئے کچھ۔" سفیر خفا ہو گیا۔

"یارا، ناراض کیوں ہوتا ہے۔ آج کل تو خون سفید ہو گیا ہے۔ بھائی، بھائی کا نہیں ہے۔ اگر باہر جا کر میں بھول گیا تو یہ کون سی بڑی بات ہو گی۔"

مونا ہنسنے لگی۔ "تم ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"ہاں، خدا کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے؟"

"تم مجھے پیدائشی بے وقوف قرار دے رہے ہو۔" مونا خفا ہو گئی۔

"نہیں، اس کا پتا دو تین سال کی عمر میں چلا ہو گا۔ ہماری...... بعض فلمی ہیروئنیں بھی عقل مند لگتی ہیں، جب تک بولیں نہ۔"

"اب میں نہیں بولوں گی۔" مونا نے منہ پھلا لیا تھا۔

"یہ تم نے ذہانت کی بات کی ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "لیکن مجھے شبہ ہے، تم اس پر قائم رہ سکو گی۔"

اس کے بعد مونا نے سچ مچ چپ سادھ لی تھی۔ میں نے اور سفیر نے اسے گفتگو پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن

کوشش کی حتیٰ کہ اسے دھمکی دینا پڑی کہ اب اگر ہم نے اسے تنگ کیا تو وہ رونا شروع کر دے گی۔ سفیر بوکھلا گیا۔ خدا کے لئے...... ہرگز نہیں، میں اب نہیں بولوں گا۔"

"لگتا ہے، تو پہلے بھی بھگت چکا ہے۔"

"اب چپ بھی کر و یار!" سفیر بھنا گیا تھا۔ "مجھے آرام کرنے دو۔"

یہ اشارہ تھا کہ اس نے سلاخوں سے بیلٹ نکال کر گلے خان کی گردن میں پھنسانے کی مشق کرنی ہے جبکہ مجھے اور مونا کو باہر کی طرف سے ہوشیار رہنا تھا تاکہ جیسے ہی کوئی اندر آنے لگے، ہم سفیر کو ہوشیار کر دیں اور وہ بیلٹ پہن لے۔ اس کا بیلٹ اتارنا شک کا باعث بن سکتا تھا اس لئے وہ بیلٹ پہنے رہتا تھا۔

باہر شاید بارش ہوئی تھی یا سردی کی تازہ لہر آئی تھی۔ شام چھ بجے ہی سردی مزاج پوچھنے لگی اور ہم نے کمبل اوڑھ لئے تھے۔ رات کے کھانے کے بارے میں ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ کھانا نہیں کھانا ہے۔ ورنہ ممکن ہے سُستی کی وجہ سے کمانڈو ایکشن درست طور پر نہ ہو سکے۔ گلے خان کا لایا کھانا بیڈ کے نیچے ڈال کر خالی برتن اسے واپس کر دیتے۔ میں سوچ رہا تھا کہ گلے خان پر قابو پانے کے بعد ہمارا دوسرا قدم کیا ہونا چاہئے، یہ بات تو طے تھی کہ ہم آسانی سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ڈیوڈ شا کے ساتھ کچھ ہرکاروں کی موجودگی بھی لازمی تھی اور ان سے زیادہ خطرناک گلے خان کے روسی اور فرنگی تھے۔ اس کے باوجود مجھے اعتماد تھا۔ ایک بار ہم نے گلے خان پر قابو پا کر ان سلاخوں سے رہائی حاصل کر لی تو ہم پر اتنی آسانی سے کوئی قابو نہیں پا سکے گا۔ گلے خان کے پاس پستول لازمی ہوگا اور اوپر بھی کوئی ہتھیار مل سکتا تھا۔

مائیک کسی قدر خطرہ تھے لیکن فتح خان نے بتایا تھا کہ وہ ریکارڈ پر ہوتا ہے ظاہر ہے کوئی ہر وقت ہماری باتوں پر کان لگا کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ کم سے کم فتح خان سے اس کی امید نہیں تھی لیکن ڈیوڈ شا بہت شاطر اور کسی پر اعتبار نہ کرنے والا شخص تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے کسی کو بٹھا دیا ہو اور جب ہم گلے خان پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوں نیچے کی کارروائی اوپر مائیک پر سن کر وہ لوگ نیچے آ دھمکیں اور ہم اڑنے سے پہلے ہی گرفتار ہو جائیں۔ بہر حال اب یہ سب سوچنا بے کار تھا۔ ہمیں عمل کرانا تھا، پھر اس کا جو بھی نتیجہ سامنے آئے۔ اس روز دونوں وقت کا کھانا میں نے لیٹ کھایا تھا۔ اس کے باوجود رات آٹھ بجے تک میرے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تھے اور ان دونوں کا حال اس سے زیادہ برا تھا۔ میں نے غور کیا کہ جب کھانا آئے گا تو کیا میں اسے بیڈ کے نیچے پھینک سکوں گا؟

ساڑھے آٹھ بجے گلے خان کھانا لایا تو میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ نہ کچھ کھا لوں۔ غالباً یہی کام مونا اور سفیر نے بھی کیا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ آسرا ہو گیا ہے تو باقی کھانا میں نے بیڈ کے نیچے ڈال دیا۔ اگرچہ رزق کو اس طرح پھینکتے ہوئے دل دکھا تھا، مگر مجبوری تھی، برتن خالی کرنا ضروری تھا ورنہ گلے خان چونک جاتا۔ میں نے مونا کو انگوٹھے سے اشارہ کیا، اس نے بھی جواب میں یہی اشارہ کیا اور پھر اشارے سے بتایا کہ سفیر بھی اپنا کام کر چکا ہے۔ میں اور سفیر وارم اَپ ہونے لگے۔ چہل قدمی کے بعد اچھل کود کر جسم گرم کیا۔ گلے خان کھانا لانے عام طور سے ایک گھنٹے بعد آتا تھا۔ یعنی نو یا ساڑھے نو بجے۔ پہلے نو اور پھر ساڑھے نو بج گئے لیکن گلے خان نہیں آیا۔ مجھے تشویش لاحق ہونے لگی۔ کہیں سچ مچ مائیک کام تو نہیں کر رہے تھے؟ اور فتح خان نے مجھ سے

جھوٹ بولا تھا۔ اس نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں اور اب گلے خان محتاط ہو گیا تھا۔

ان دونوں کے ذہنوں میں بھی یہی خدشات تھے لیکن مائیک کی وجہ سے وہ کھل کر کہنے سے ہچکچا رہے تھے۔ آخر سفیر نے باالفاظ دیگر کہا۔ ''یار، میرا تو پیٹ گڑبڑ کر رہا ہے۔ یہ گلے خان ابھی تک نہیں آیا ہے۔''

''آ جائے گا۔'' مونا نے گویا خود کو تسلی دی۔ ''کبھی کبھی اسے دیر ہو جاتی ہے۔''

میں نے خود کو وارم اَپ کرنا جاری رکھا اور سفیر کو مشورہ دیا۔ ''ذرا چہل قدمی کر لو۔ شاید مسئلہ کچھ دیر کے لئے ٹل جائے۔''

''یا مزید مسئلہ بن جائے۔'' مونا ہنسی۔

دس بجے مجھے بھی تشویش لاحق ہونے لگی۔ اس دوران میں سفیر نے کئی بار باتھ روم کا رونا رویا۔ شاید وہ چیک کرنا چاہ رہا تھا کہ مائیک پر کوئی فرد موجود ہے جو اس کی فریاد پر توجہ دے سکے لیکن کوئی نہیں آیا اور یہ اس لحاظ سے اطمینان بخش تھا کہ مائیک پر کوئی براہِ راست ہماری باتیں نہیں سن رہا بلکہ ریکارڈنگ چل رہی ہے۔ مگر گلے خان کا نہ آنا تشویش ناک تھا۔ ''یار! کہیں وہ بھول تو نہیں گیا؟'' میں نے کہا۔

''ممکن ہے سو گیا ہو۔'' مونا نے بھی خیال آرائی کی۔

''خدا کے لئے...... کیا مجھے ساری رات جبر کر کے جاگنا پڑے گا۔'' سفیر گھبرا گیا۔

''اسی لمحے باہر والے دروازے پر آہٹ ہوئی اور دروازہ کھلنے پر گلے خان کی صورت نظر آئی۔

''معاف کرنا...... ام اوپر صاحب لوگ کی خدمت کر رہا تھا۔'' اس نے معذرت کرتے ہوئے مونا کی کوٹھری کا دروازہ کھولا۔

''کیا مطلب...... صاحب لوگ! کیا اوپر بہت سارے لوگ ہیں؟'' مونا نے باہر آتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

''نہیں، گورا صاحب تو تین ہے۔ پر کھانے پینے میں نخرا بہت کرتا ہے۔ خاص طور سے پینے میں۔''

گلے خان مونا کو لے کر اوپر چلا گیا۔ میں نے ہاتھ نکال کر سفیر کو تیار رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے جواباً ہاتھ نکال کر مجھے اوکے کا اشارہ کیا تھا۔ گلے خان جب مونا کو لے کر آتا تو ہم میں سے کسی کو بھی لے جا سکتا تھا۔ اگر وہ میری طرف آتا تو سفیر کو مختصر سے نوٹس پر بیلٹ تیار کرنا پڑتی۔ یہ بھی ممکن تھا، گلے خان پہلے اس کی طرف جاتا۔ اس لئے اس نے بیلٹ باندھ رکھی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا، میں نے سفیر سے کہا۔ ''یار، تمہارا پیٹ گڑبڑ ہے، پہلے تم چلے جانا۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟''

''ہاں...... شکریہ دوست!'' سفیر نے جواب دیا۔

''میں چاہتا تھا کہ وہ پہلے چلا جائے اور جب میں نکلوں تو وہ تیار ہو۔ بلکہ بہتر یہ ہوتا کہ میں واپس آتا تب ہم حرکت میں آتے۔ میں نے کہا۔ ''یار! میرے واپس آنے تک سو مت جانا۔''

سفیر سمجھ گیا۔ ''فکر مت کرو، میں جاگتا رہوں گا۔ جب تم واپس آؤ گے تب میں بات کر کے ہی سوؤں گا۔''

وقت آہستہ سے گزر رہا تھا۔ لمحے رینگ رہے تھے۔ بے تابی کی شدت سے میرا دل پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ مونا کو لے کر گئے ہوئے پندرہ منٹ سے اوپر ہو چکے تھے اور مجھے کسی قدر تشویش ہونے لگی تھی۔ مونا کو اتنی دیر نہیں کرنی چاہئے تھی۔ پھر بیس منٹ ہو گئے تو سفیر بھی فکرمند ہو گیا۔ ''یار! مونا ابھی تک نہیں آئی۔''

''مجھے بھی پریشانی ہو رہی ہے۔''

''شوبی یار! میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ مونا کسی مشکل میں ہے۔''

''پچھلی صدی کا عاشق مت بن۔'' میں نے اس کا مذاق اڑایا لیکن اندر سے میری پریشانی بڑھ گئی تھی۔ اتنی دیر کرنے کا مطلب تھا کہ اوپر کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ وہ ایک لڑکی تھی اور اس کے ساتھ اس سے بڑھ کر ہو سکتا تھا جتنا کہ میرے یا سفیر کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ عورت ہونا اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی اور ہم دشمن کی قید میں تھے جو ہمارے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لئے آزاد تھا۔

''یار شوبی! اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔'' سفیر کی وحشت زدہ آواز آئی۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا ورنہ اندر سے میرا حال اس سے مختلف نہیں ہو رہا تھا۔

''میں یہ سلاخیں نہ توڑ سکا تو ان سے ٹکرا کر......''

''سفیر، خدا کے لئے خود کو قابو میں رکھ...... اپنا اصل کام نہ بھول۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''اسی لمحے دروازے کی طرف آہٹ ہوئی۔'' میں اور سفیر سلاخوں سے چپک گئے تھے۔ آنے والا گلے خان تھا لیکن وہ اکیلا تھا اس کے ساتھ مونا نہیں تھی۔

''مونا کہاں ہے؟'' سفیر نے دھاڑ کر پوچھا۔

''مونا کہاں ہے؟'' میں نے بھی کہا، مجھے گلے خان کا انداز معمول سے ہٹ کر لگ رہا تھا۔'' گلے خان! جواب دو۔''

''وہ اسے لے گئے۔'' اس نے آہستہ سے کہا، وہ اپنی چابیاں ٹٹول رہا تھا۔

''کون......؟'' سفیر چلایا۔

''صاحب کے دونوں گورے آدمی...... میں لڑکی کو لا رہا تھا، وہ نشے میں ادھر آ گئے اور اسے زبردستی لے گئے۔''

''اور تم دیکھتے رہے، بے غیرت!'' سفیر پھر دھاڑا۔

''میں کیا کرتا، وہ صاحب کا آدمی ہے۔ میں اس کے ملازم کا ملازم۔'' گلے خان کا لہجہ کمزور تھا۔

''سنو گلے خان! وہ ایک مسلمان لڑکی ہے۔ وہ کافر اس کی عزت برباد کر دیں گے۔ تم کیسے مسلمان ہو؟'' میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

''ہم بے غیرت نہیں ہے...... پر کیا کرے......؟''

''سنو، ہمیں آزاد کرو، ہم خود ان سے نمٹ لیں گے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' وہ خوف زدہ نظر آیا۔ پہلی بار میں نے اسے خوفزدہ دیکھا تھا۔ ''خان جی، مجھے قتل کر دے گا۔''

''اور وہ لڑکی، جسے تم لے کر گئے تھے۔'' میں نے سلاخوں کو جکڑتے ہوئے کہا۔

''اسے واپس لانا تمہاری ذمے داری ہے۔''

''میں کیا کرے؟'' گلے خان نے بے بسی سے کہا۔

''ادھر آؤ، میں بتاتا ہوں۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''کیا......؟'' وہ غیر ارادی طور پر سر جھکا کر قریب آیا۔

میں نے اس کا سر پکڑ کر سلاخوں سے ٹکرایا۔ یہ کام میں نے اتنی تیزی سے کیا تھا کہ وہ بالکل نہیں سمجھ سکا۔ میں نے پوری قوت صرف کر دی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا اور اس کے حلق سے دھاڑ نکلی تھی لیکن میں اس کی دھاڑوں پر توجہ دیئے بغیر مسلسل اور پوری قوت سے اس کا سر سلاخوں سے ٹکراتا رہا۔ سفیر دبی دبی زبان اور جوش کے ساتھ مجھے بڑھاوا دے رہا تھا۔ کوئی نصف درجن بار سلاخوں سے سر ٹکرانے کے بعد جب وہ جھولنے لگا تو میں نے ہاتھ مار کر سب سے پہلے اس کا پستول تلاش کر کے نکال لیا۔ پستول بستر پر پھینک کر میں نے چابی تلاش کی اور اس کا گچھا ہاتھ میں آتے ہی آخری بار پوری قوت سے گلے خان کا سر سلاخوں سے ٹکرا کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ کراہ کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے اندر میں نے دروازہ کھول لیا اور پستول لے کر باہر نکلا۔ سفیر کی کوٹھری کا تالا کھولا تو وہ لپک کر نکلا۔ ''سفی، اس کی تلاشی لے، پستول کے اضافی میگزین دیکھ۔''

جب سفیر اس کی تلاشی لے رہا تھا تو اس نے مزاحمت کی کوشش کی۔ میں نے پستول کا دستہ اس کے سر پر دے مارا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ سفیر نے ایک عدد اضافی میگزین نکال لیا۔

''اب اسے کوٹھری میں ڈال جلدی۔'' میں نے کہا اور سفیر کے ساتھ مل کر اسے اپنی کوٹھری میں ڈال کر اسے لاک کر دیا۔ یہ سب مشکل سے دو منٹ کے اندر ہوا تھا۔ ویسے مجھے گلے خان کو بے ہوش کر کے افسوس ہو رہا تھا۔ وہی ہمیں درست طور پر بتا سکتا تھا کہ مونا کو لے جانے والے دونوں گورے اس بڑی سی کوٹھی میں کہاں تھے؟

''شوبی! چل...... کیا سوچ رہا ہے؟'' سفیر نے میرا بازو پکڑ کر ہلایا۔

''سفی! ہوش میں رہ کر کام کرنا ہے۔ کسی جذباتی قدم کی وجہ سے ہم پکڑے گئے تو مونا کی کیا مدد کریں گے؟''

''میں سمجھ رہا ہوں...... تُو چل۔''

میں نے چابیاں اپنے قبضے میں رکھی تھیں اور قید خانے کے دروازے کو بھی لاک کر دیا تھا۔ ممکن ہے گلے خان کے پاس اضافی چابیاں ہوں اور وہ کوٹھری کا تالا کھول لے۔ بہرحال اب وہ قید خانے سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔ سیڑھیوں کے اوپر والا دروازہ کھلا تھا اور فی الحال بے حد خاموشی تھی۔

''یار! اتنی خاموشی کیوں ہے؟'' سفیر نے اضطرابی سرگوشی کی۔

''سفیر! تُو اس طرف جا...... لیکن اکیلے کچھ مت کرنا...... میں اس طرف جاتا ہوں۔ اگر پھنس جائے تو چیخ مار کر مجھے خبردار کر دینا۔'' میں نے بائیں طرف والی گیلری کی طرف اشارہ کیا۔ یہ باہر جاتی تھی اور خود اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں ڈیوڈ شا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے کمرا کھولنا چاہا مگر وہ لاک تھا۔ اچانک مجھے کسی کی ہلکی سی آواز آئی۔ آواز راہداری میں مخالف سمت والے کمرے سے آئی تھی۔ میں نے کی ہول سے اندر

جھانکا، سامنے ایک کاؤچ پر موٹا اس طرح پڑی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور منہ پر کپڑا بندھا تھا، اس کے علاوہ وہ ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھی۔ اس نے سر ہلا کر ناک سے آواز نکالی اور شاید میں نے ایسی ہی آواز سنی تھی۔ میں تیزی سے واپس آیا۔ میں سفیر کو دیکھ رہا تھا لیکن وہ مجھے گیلری میں کہیں نظر نہیں آیا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ وقت کم تھا، مجھے موٹو کو ان کے چنگل سے نکالنا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر دست درازی کرتے۔

میں نے تیزی سے سوچا اور دروازے پر دستک دی۔ ''کون ہے۔'' چند لمحے بعد اندر سے کسی نے انگریزی میں کہا، بولنے والا گویا نشے میں تھا۔

''ام...... گلے خان سیب!'' میں نے ممکنہ حد تک گلے خان کی سی آواز نکالی۔

''کیا ہے؟''

''ضروری بات ہے سیب...... جلدی کرو۔''

اس نے جھنجلا کر دروازہ کھول دیا۔ ''کیا بات......''

اپنے سینے پر رکھے پستول کو دیکھ کر اس کی زبان رک گئی۔ میں نے اسے اندر دھکیلا تو وہ بلا چوں و چرا اندر چلا گیا۔ اس کا دوسرا ساتھی موٹا کے پیروں سے بندھی رسی کھول رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس کی گدی پر پستول والا ہاتھ مارا اور وہ منہ کے بل زمین پر گرا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ دروازہ کھولنے والے گورے کی گھگی بندھ گئی تھی۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ لڑائی بھڑائی اس کے لئے نئی چیز تھی۔ وہ صرف مردانگی کے زعم میں موٹا کو اٹھا لائے تھے، اس کے باوجود میں اس کی طرف سے پوری طرح محتاط تھا۔ ''فرش پر اوندھے منہ لیٹ جاؤ۔ ہاتھ پشت پر رکھو۔''

اس نے پھرتی سے حکم کی تعمیل کی تھی۔ میں نے اس کی تلاشی لی، اس کے پاس کوئی ایسی شے نہیں تھی جسے ہتھیار کہا جا سکتا۔ ایک موبائل فون نما آلہ تھا جو میں نے آف کر کے ایک طرف پھینک دیا پھر بے ہوش فرد کی تلاشی لی اور اس کے پاس سے ایک پستول نکل آیا۔ اس دوران میں موٹا ناک سے آوازیں نکالتی رہی تھی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''ایک منٹ گڑیا!'' میں نے اس کے ہاتھ کھولے اور کہا۔ ''اب پاؤں اور منہ کھول لو لیکن منہ بند رکھنا۔''

اس کے بعد میں زمین پر پڑے شخص کی طرف متوجہ ہوا، اس کی گدی پر پستول کی نال رکھ کر پوچھا۔ ''یہاں اور کتنے افراد ہیں؟''

میں نے لہجہ خونخوار رکھا تھا، وہ لرزنے لگا۔ ''مم...... مجھے مارنا مت۔''

''میرے سوال کا جواب دو۔'' میں نے گھٹنا اس کی ریڑھ کی ہڈی پر رکھ کر دباؤ ڈالا۔

''ڈیوڈ شا اور وہ مقامی موٹا......''

''ان کے علاوہ......؟''

''کک...... کوئی نہیں ہے۔'' اس نے تڑپ کر کہا۔ ''میری کمر......''

''اگر یہ بات غلط نکلی تو......'' میں نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔

''بائی گاڈ، میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

اس دوران میں مونا نے اپنا پاؤں اور منہ بھی کھول لیا تھا۔ وہ لپکی اور باہوش شخص کو ٹھوکریں مارنے لگی۔ اس کے منہ سے دبی دبی گالیاں اور سسکیاں نکل رہی تھیں۔ میں نے اسے روکا نہیں، اس کی بھڑاس نکل جاتی، پھر مجھے خیال آیا۔

''مونا، وقت کم ہے...... ہمیں یہاں سے نکلنا بھی ہے۔''

''وہ چونکی، جوش وغضب سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ''سفی کہاں ہے؟''

''وہ دوسری طرف گیا تھا، یہ بتاؤ...... یہ کیسے لائے تمہیں؟''

''ان حرام زادوں کی نیت خراب ہوگئی۔ وہ موٹا ان کی منت سماجت کرتا رہا، ویسے تم لوگ کیسے نکلے؟''

میں نے اسے مختصراً بتایا کہ ہم کیسے نکلے۔ ''مونا! فتح خان یا کوئی اور آدمی نہیں ہے، یہ اچھا موقع ہے، یہاں سے نکلنے کا۔''

''ان دونوں کا کیا کرنا ہے؟'' اس نے گوروں کی طرف اشارہ کیا۔

''انہیں بھی گلے خان کے ساتھ سیل میں بند کر دیتے ہیں۔''

''میرا دل چاہ رہا ہے انہیں گولی مار دوں'، مونا نے دانت پیسے۔

''اگرچہ یہ اسی کے مستحق ہیں لیکن ہم قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے۔''

''تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔'' باہوش گورے نے کہا۔ ''باہر دو خوف ناک کتے ہیں۔ وہ کسی کو یہاں سے جانے نہیں دیتے۔''

''کتوں کا کیا کریں گے؟'' مونا نے ڈرے ہوئے انداز میں کہا۔

''ہم انہیں گولی مار دیں گے۔'' میں نے دل کڑا کر کے کہا اور باہوش گورے سے کہا۔ ''چلو، اپنے ساتھی کو اٹھاؤ۔

اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور سفیر اندر آیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا، فوراً ہی اس کے عقب سے ڈیوڈ شا نمودار ہوا تھا۔

سفیر کے عقب میں ڈیوڈ شا کو دیکھتے ہی میں پھرتی سے حرکت میں آیا۔ مونا کو صوفے کے عقب میں دھکا دیتے ہوئے خود میں نے بیڈ کے عقب میں چھلانگ لگائی گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ ڈیوڈ شا نے بھی شاید دھمکانے کے لئے ہی فائر کیا تھا۔ ''پستول پھینک دو شہباز!'' اس نے للکار کر کہا۔

''مونا نیچے رہو۔'' میں نے کہا اور جوابی فائر سفیر سے خاصی بلندی پر کیا تھا۔ ''ڈیوڈ! میرے ساتھی کو چھوڑ دو۔''

''اگر تم نے پستول نہ پھینکا تو میں دس تک گن کر اسے مار دوں گا۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور گننا شروع کر دیا۔

''ڈیوڈ شا...... تمہارے ان ساتھیوں نے مجھے مجبور کیا۔ میری ساتھی کی عزت کو کھلونا بنانا چاہا۔

''مجھے معلوم نہیں تھا ورنہ تمہیں زحمت نہ کرنی پڑتی۔''

''معاف کرنا، میں بے وقوف بننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اگر میں نے ہتھیار ڈال دیئے تو تم لوگ

ہمارے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لئے آزاد ہو گے۔ اس ذلت سے بہتر ہے، ہم ماریں اور مر جائیں۔"

"شوبی، پستول مت پھینکنا۔" سفیر نے چلا کر کہا۔

میں نے کہا۔ "ڈیوڈ شا، تم نے ہمارا فیصلہ سن لیا۔ اب جواب دو۔ ورنہ میں ان دونوں کو گولی مارنے جا رہا ہوں، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

"اوہ نہیں۔" باہوش گورا رو دینے والے انداز میں بولا۔ "ڈیوڈ، ہمیں بچاؤ۔"

بیڈ کراؤن کے عقب سے میں ڈیوڈ شاہ کو دیکھ رہا تھا، اس نے گنتی گننا بند کر دی تھی اور تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا، ایک بار قتل و غارت گری شروع ہو گئی تو اس سمیت کوئی نہ بچے گا۔ مونا کے ساتھ دست درازی کی کوشش نے کام خراب کر دیا تھا۔ میں نے اور سفیر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی صورت ہتھیار نہیں ڈالنے ہیں۔ ڈیوڈ شا کو دیا جانے والا تاثر کام کر گیا اور اس نے اچانک سفیر کے سر پر اپنے پستول کا دستہ مارا اور اسے دھکا دے کر پھرتی سے دروازے سے نکل گیا۔ میں لپکا، سفیر بے سدھ پڑا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا، ڈیوڈ شا بائیں طرف گیلری میں غائب ہو رہا تھا۔ اس کے پیچھے جانا فضول تھا۔ اسی لمحے مونا کی چیخ سنائی دی۔

"شوبی! ہوشیار......"

باہوش گورا موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بیڈ کے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ ریوالور کی جھلک دیکھتے ہی میں نے گولی چلا دی۔ گولی اس کے پہلو پر لگی۔ وہ شدید زخمی ہوا تھا، اس کے باوجود اس نے ریوالور اٹھانا چاہا۔ دوسری گولی اس کے سینے پر لگی تو اس کی ہمت جواب دے گئی میں لے آگے بڑھ کر ریوالور اس کی بے جان ہوتی انگلیوں سے نکال لیا۔ میں نے اسے اپنے دفاع میں گولی ماری تھی اس لئے مجھے ذرا بھی پچھتاوا نہیں تھا۔ مونا سفیر کو اٹھا رہی تھی، سفیر کے انداز میں کمزوری تھی۔ بہرحال وہ ہوش میں تھا۔ میں نے بھی سہارا دیا اور بستر پر لٹا دیا۔ سفیر نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ "شوبی! اسے دیکھ...... وہ نکل جائے گا۔"

"اس پر لعنت بھیج۔" میں نے کہا اور اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ مونا نے وہاں موجود پانی کی بوتل سے پانی نکال کر سفیر کو دیا۔ اس کا سر پھٹا نہیں تھا۔ گومڑ نکل آیا تھا۔ اس میں سخت درد ہو رہا تھا۔ مگر وہ خطرے سے باہر تھا۔ اب ہمارے پاس تین ہتھیار تھے۔ مونا بھی آتشیں اسلحے کا استعمال جانتی تھی۔ میں لے ریوالور اسے دے دیا۔ کمرے کی تلاشی لینے پر ان دونوں ہتھیاروں کے فاضل راؤنڈز بھی مل گئے تھے۔ سفیر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اصرار کیا۔ "شوبی! یہاں سے نکلنے کی کر۔"

"جلد بازی سے کام مت لے۔ ڈیوڈ شا آزاد ہے اور اس کوٹھی میں ہے۔ باہر خوفناک کتے ہیں، ان سے نمٹے بغیر ہم یہاں نہیں جا سکتے۔"

مونا خوفزدہ نظروں سے زخمی گورے کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ڈرے ہوئے انداز میں کہا۔

"شوبی!...... شاید یہ مر گیا ہے۔"

میں نے گلے پر نبض دیکھی۔ وہ ساکت تھی۔ دوسری گولی اس کے دل سے ذرا اوپر لگی تھی اور شاید وہ جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ دوسرا ابھی تک بے ہوش تھا لیکن کبھی کبھی جنبش کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ جاتا۔

میں نے مونا کے ہاتھ پیروں سے اتری رسی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے، مونا یہ عمل دیکھ رہی تھی۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''اسے باندھ رہا ہوں۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا۔

مونا جھنجلا گئی۔ ''کس لئے...... یہ تو بے ہوش ہے؟''

''بی بی! یہ ہمیشہ بے ہوش نہیں رہے گا۔ دوسرے مجھے جا کر گلے خان کو لانا ہے، وہی ہمیں یہاں سے بحفاظت نکال سکتا ہے۔''

''تم باہر نہیں جاؤ گے۔'' سفیر اٹھ بیٹھا۔ ''ڈیوڈ شاہ باہر موجود ہے۔ وہ تمہیں چھپ کر گولی مار سکتا ہے۔''

''وہ تو اس وقت بھی مار سکتا ہے، جب ہم یہاں سے نکل رہے ہوں گے، میں نے پستول چیک کیا۔ اس کے دو اضافی میگزین میرے پاس تھے۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا اور مونا سے کہا۔ ''مجھے کور دینا، میری پشت پر کوئی آئے تو اسے بلا جھجک گولی مار دینا مگر دیکھ لینا، مجھے ہی مت مار دینا۔''

''یہ میں دیکھوں گا۔'' سفیر اٹھتے ہوئے بولا۔

''سفیر نے دروازے کے قریب پوزیشن سنبھال لی۔ میں محتاط قدموں سے باہر نکلا۔ گیلری خالی تھی، میں دائیں بائیں کے تمام دروازے چیک کرتے ہوئے چل رہا تھا۔ تمام دروازے بند تھے۔ میں نے گیلری کے سرے پر پہنچ کر پہلے ساتھ لایا سیاہ کشن اوٹ سے نکال کر سرعت سے واپس کھینچ لیا۔ اگر دوسری طرف ڈیوڈ شا تھا تو اسے یہ تاثر ملتا کہ میں سر نکال کر دیکھ رہا ہوں، ممکن ہے وہ گولی چلا دیتا۔ دو تین بار ایسا ہی کرنے پر جب کوئی ردِعمل نہیں ہوا تو میں نے اپنا ذاتی سر نکال کر جھانکا۔ یہ گیلری بھی تا حد نگاہ ویران تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ڈیوڈ شا دوسری طرف ہوتا، میں نے مڑ کر سفیر کو نگرانی کرتے رہنے کا اشارہ کیا اور خود بائیں طرف والی گیلری میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے راستہ تہ خانے کی طرف بھی جاتا تھا اور ملازموں والے حصے کی طرف بھی۔ میں سوچنے لگا کہ ڈیوڈ شا اس طرف کیوں آیا تھا۔ تہ خانے میں جانے والا راستہ کھلا تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر اسے اندر سے بند کر لیا۔ اسے باہر سے بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے میں نیچے پہنچا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ چابی سے تالا کھول کر میں قید خانے میں داخل ہوا۔ گلے خان بستر پر چت لیٹا پلکیں جھپکا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ ''تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ ام کو چھوڑ دو۔'' اس نے غرا کر کہا۔

''کس خوشی میں؟ ہم جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا تمہیں گولی مارتا جاؤں۔ اس طرح یہاں بند ہو کر بھوک پیاس سے مرنے سے بہتر ہے گولی کھا کر فوراً مر جاؤ۔'' میں نے پستول بلند کیا۔

''رکنا...... رکنا......'' اس نے بوکھلا کر کہا۔ ''ام نہیں مرے گا۔ فتح خان صیب ام کو نکال لے گا۔''

''یہ تمہارے لئے اور بھی خطرناک صورتِ حال ہو گی۔ فتح خان کیا تمہیں بخش دے گا؟''

اس کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ ''خان جی...... ایسا نہیں کرے گا۔''

''بچنے کی ایک ہی صورت ہے، بھاگ جاؤ۔''

''تو دروازہ کھول دو۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔

''کس خوشی میں...... مجھے تم سے کیا فائدہ ہو گا؟''

''میں تمہیں باہر نکال سکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''روسی اور فرنگی کو صرف میں قابو میں کر سکتا ہوں۔''

''انہیں تو دو گولیوں میں قابو کیا جا سکتا ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم کو نہیں پتا...... وہ بوت چالاک ہے۔ اتنا بڑا کتا ایک گولی سے نہیں مرے گا، دو نے حملہ کیا تو کیا کرے گا؟''

''فتح خان کہاں گیا ہے؟''

''ام کو نہیں معلوم۔ پر وہ کل آئے گا۔''

''ڈیوڈ شاہ آزاد ہے اور کوٹھی کے اندر ہے، اس کے ایک ساتھی کو میں مار چکا ہوں، دوسرا میری قید میں ہے تمہاری طرح۔''

وہ چونکا۔ ''ڈیوڈ صیب بھاگ گیا؟''

''بھاگا نہیں، اس کوٹھی میں ہے۔ روسی اور فرنگی کے ہوتے ہوئے وہ باہر کیسے جا سکتا ہے؟''

''تم کو نہیں معلوم...... ادھر سے نکلنے کا ایک خفیہ راستہ بھی ہے۔ وہ صرف فتح خان کو معلوم ہے، اس نے ڈیوڈ صاحب کو بتایا ہوگا۔''

''صرف فتح خان کو......؟'' میں نے غور کیا۔ ''لیکن اس نے تو مجھ سے کہا تھا کہ یہ کوٹھی ڈیوڈ شا کی ہے؟''

''ہاں...... پر خریدا اور پھر اسے بنایا تو فتح خان نے تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کا اوپری حصہ میرے سامنے بنا ہے۔''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ کوئی خفیہ راستہ بھی ہے؟''

''کیونکہ خان جی اچانک آ جاتا ہے...... اچانک چلا جاتا ہے۔ کئی بار وہ اچانک غائب ہوا اور پھر دروازے سے آیا۔''

''یعنی خفیہ راستہ ہے لیکن ضروری ہے کہ ڈیوڈ شاہ کو بھی اس کا علم ہو۔''

''کل ڈیوڈ صیب بھی اسی طرح غائب ہوا تھا۔ پھر واپس آ گیا۔ ام کو یقین ہے راستہ اُدھر ملازموں والے کمروں سے ہے۔ سارے کمرے بند ہیں، سوائے میرے کمرے کے۔''

''جب وہ جا سکتا ہے تو آ بھی سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''گلے خان میں تمہیں اس شرط پر نکال رہا ہوں کہ ہمیں کوٹھی سے نکالو۔''

''میں تیار ہے۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔

''حکیم قادس کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اُدھر دو کمرے والی عمارت میں ہے۔'' اس نے کہا۔

میں گلے خان کو اوپر لایا۔ اس دوران میں، مَیں پوری طرح محتاط رہا تھا۔ ڈیوڈ شا کی طرف سے حملے کا خطرہ تھا۔ ظاہر ہے وہ اتنی آسانی سے ہمیں جانے نہیں دیتا۔ سفیر اور مونا چونکے تھے۔ گلے خان کو دیکھ کر مونا کو غصہ آ گیا اور اس نے اسے سخت برا بھلا کہا۔ ''تم بے غیرت...... یہ تمہارے سامنے مجھے کھینچ کر لے گئے اور تم دیکھتے رہے؟''

''بس کرو یار! ان کو ان کے کئے کی سزا مل گئی ہے۔''

''اس کو مل گئی ہے۔'' گلے خان نے لاش کی طرف دیکھا اور پھر بندھے گورے کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے ام سزا دے گا۔''

''وہ کیسے؟'' مونا نے پوچھا۔

''یہ مت پوچھو...... تم نے ام کو بے غیرت کہا ہے، اب اس کا خون امارا صفائی کرے گا۔''

''ہمارے پاس وقت نہیں ہے، یہاں سے نکلو۔'' میں نے اسے ٹوکا۔

گلے خان نے بندھے گورے کو شانے پر لاد لیا۔ ''امارے ساتھ آؤ، ام ابھی اس کا حشر تم سب کو دکھاتا ہے۔''

وہ مچلنے لگا اور حلق پھاڑ کر چلایا۔ ''کہاں لے جا رہا ہے مجھے...... چھوڑ دو مجھے۔''

''میرا خیال ہے اپنے کتوں کے حوالے کرنے کے لئے لے جا رہا ہے۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

''نہیں۔'' وہ پہلے سے زیادہ بلند آواز سے چلایا۔ ''چھوڑو مجھے...... خبیث کتے!''

''کتے اس کے ہیں...... یہ خود انسان ہے۔'' سفیر ہنسا۔ ''اس کی حالت دیکھ کر ہم تینوں خاص کر مونا بہت لطف اٹھا رہی تھی، اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اسے کتا کہہ رہے ہو...... اور خود کیا ہو؟''

میں، سفیر اور مونا تینوں محتاط تھے، جب گلے خان کے ساتھ باہر جا رہے تھے تو ہم تینوں ہر طرف نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں گلے خان کی بھی نگرانی کر رہا تھا۔ عین ممکن تھا، وہ کوئی چال چل جاتا، مگر ہم بہ خیریت باہر نکل آئے، گلے خان نے سیٹی بجائی۔ ذرا دیر بعد اس نے پھر سیٹی بجائی اور فکرمندی سے بولا۔ ''روسی اور فرنگی کدھر مر گیا ہے؟''

میں نے اس کی پشت پر پستول رکھ دیا۔ ''گلے خان اگر تم نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے کتوں کو ہم پر حملہ کرنے کا سگنل دیا ہے تو سب سے پہلے تم مرو گے۔''

''ام...... ام نے ایسا کوئی سگنل مگنل نہیں دیا۔'' وہ بولا اور آگے بڑھا۔ ''اوہ مارا...... یہ کیا؟''

پھر میں نے بھی لان کے وسط میں پڑے دونوں دیوقامت ہیولوں کو دیکھ لیا۔ وہ قطعی بے حس و حرکت تھے۔ گلے خان نے شانے پر لدے شخص کو بوری کی طرح گھاس پر پھینکا اور اُڑ کر ان ہیولوں کے پاس پہنچا۔ پھر اس کے دھاڑوں کی آواز آئی۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''خانہ خراب...... کسی نے امارا فرنگی، روسی کو مار دیا؟''

کتوں کے جسموں سے ڈھیروں خون نکلا تھا۔ گلے خان کے پاؤں، گھٹنے اور ہاتھ خون میں لت پت ہو گئے تھے۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ''اس پر نظر رکھو۔''

اور خود عمارت کی طرف بڑھا۔ کتوں کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ حکیم قادس کے حوالے سے اور جب میں پستول تانے عمارت میں گھسا اور باری باری دونوں کمروں کی تلاشی لی تو حکیم کو نہ پا کر میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ ڈیوڈ شا کتوں کو ختم کر کے حکیم قادس کو لے گیا تھا، اس جگہ اس کے لئے سب سے اہم شخص وہی تھا۔ میں نے اندر جتنی احتیاط اور تاخیر کی تھی، اس نے اس کا فائدہ اٹھایا تھا۔ مونا بھی اندر

آ ئی تھی اور وہاں نصب مشینوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ''شوبی یہ کیا ہے؟''
''اب نکلو یہاں سے...... اس سے پہلے کہ ڈیوڈ شاہ اپنے آدمی...... لا کر دھاوا بول دے۔'' میں نے مونا کو باہر کی طرف دھکیلا۔
گلے خان بالالفاظ دیگر کتوں کے قاتل کے لئے خطرناک عزائم ظاہر کر رہا تھا۔ مونا کو دیکھ کر وہ چپ ہو گیا، میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''انہیں ڈیوڈ شا نے مارا ہے۔ وہ حکیم کو نکال لے گیا۔''
''ام...... ام اسے چھوڑے گا نہیں۔'' اس نے کسی فلمی ہیرو کی طرح دھاڑ کر کہا۔
''ابھی فی الحال تو یہاں سے نکلنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پورچ میں کھڑی گاڑی کی چابی کہاں ہے؟''
''گاڑی میں ہوگی۔'' اس نے ناک صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اِدھر کوئی گاڑی سے چابی نہیں نکالتا ہے۔''
اس کا کہنا درست تھا۔ اس منی جیپ میں چابی لگی تھی۔ سامنے دو نشستیں اور عقب میں سامان رکھنے کا مختصر سا خانہ تھا۔ مگر اس کا انجن طاقتور تھا۔ میں نے گلے خان سے پوچھا۔ ''یہ کون سا علاقہ ہے؟''
''وادی کا غان کے پاس ہے۔ اس سڑک پر سیدھا جاؤ۔'' اس نے دور پہاڑوں میں بل کھاتی سیاہ ناگن جیسی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ''آگے جا کر یہ اسلام آباد جانے والی سڑک پر مل جاتی ہے۔''
میں چونکا، مجھے یاد تھا یہی سڑک راجا عمر دراز کی وادی کی طرف جاتی تھی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے ڈیوڈ شا نے حکیم قادس کے ساتھ کہاں کا رخ کیا ہوگا؟''
''ام نہیں جانتا۔'' اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ وہ ابھی تک اپنے کتوں کے غم میں مبتلا تھا شاید ان کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے لگا وہ درست کہہ رہا ہے۔
''گلے خان، اب ہم جا رہے ہیں۔ تمہارے لئے بھی بہتر ہے، فتح خان کے آنے سے پہلے یہاں سے چلے جاؤ۔''
''اب ام جی کر کیا کرے گا؟''
''احمقانہ باتیں مت کرو، زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی۔'' میں نے کہا۔
جیپ کا ٹینک تین چوتھائی فل تھا۔ عقب میں ڈیزل سے بھرا ایک دس لیٹر والا کین بھی تھا۔ گلے خان نے بتایا کہ اتنے ایندھن کے ساتھ ہم آرام سے اسلام آباد پہنچ سکتے تھے اور اس میں تقریباً چھ گھنٹے لگتے۔ میں اسے تاثر دے رہا تھا کہ ہمیں اسلام آباد ہی جانا ہے۔ سفیر کو چھوڑ کر میں اور مونا گلے خان کے ساتھ کوٹھی کے اندر آئے۔ کچن سے ہم نے کھانے کا سامان لیا اور آئل اسٹوو پر جلدی سے کافی تیار کر کے تھرماس میں بھر لی کھانے میں بسکٹ کے ڈبے، دودھ کے پیک اور خاص طریقے سے بنائی اور خشک کی ہوئی میٹھی روٹی تھی اس کے بعد گلے خان ہمیں رخصت کرنے باہر تک آیا بلکہ اس نے بھاگ کر جیپ کے لئے پھاٹک بھی کھولا تھا۔ ہم باہر آئے۔ گیٹ کے فوراً بعد خوف ناک اترائی تھی۔ مونا میرے برابر میں تھی اور سفیر عقبی حصے میں فٹ تھا۔ اب جیپ نے کتے کی طرح تھوتھنی زمین سے لگائی تو سفیر لڑھک کر مونا پر آ رہا تھا۔
''سنبھل کر بیٹھو۔ یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' مونا نے جھینپ کر کہا۔ ''سیٹ بیلٹ باندھو۔''

''معاف کرنا...... یہاں سرے سے سیٹ ہی نہیں ہے۔'' اس نے بھنا کر جواب دیا۔ ''اور اوپر سے اتنا سامان بھی مجھ پر لاد دیا ہے۔''

میں ان کی نوک جھوک سے محظوظ نہ ہو سکا کیونکہ میری ساری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ تاریکی میں ذرا اسٹیئرنگ بہکتا اور جیپ راستے سے اتر جاتی۔ خدا خدا کر کے ڈھلان ختم ہوئی، راستہ صراط مستقیم پر آیا لیکن پکی سڑک اب بھی ذرا فاصلے پر تھی، میں نے ان دونوں سے کہا۔ ''ذرا دیر کے لئے اپنی زبانیں بند کر لیں اور ہتھیار سنبھال لیں۔''

سفیر چوکنا ہو گیا۔ ''کوئی خطرہ ہے؟''

''ایسا سمجھ لے کر سڑک پر دشمنوں کی پوری فوج ہماری منتظر ہے۔''

☆======☆======☆

ان دونوں نے پستول سنبھال لئے تھے۔ ڈیوڈ شا کو فرار ہوئے ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ اگر آس پاس اس کا کوئی ٹھکانا تھا تو اتنی مہلت وہاں سے کمک لانے کے لئے کافی تھی۔ ویسے حیرت ہو رہی تھی، فتح خان اور ڈیوڈ شا نے صرف گلے خان پر اعتماد کافی سمجھا تھا۔ وقت پڑنے پر اس کا بھاری بھرکم جثہ سفید ہاتھی ثابت ہوا تھا۔ ڈیوڈ شا کی قسمت اچھی تھی کہ ہم کوٹھی کے خفیہ راستے سے ناواقف تھے اور اسے حکیم قادس سمیت نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ سڑک پر آتے ہوئے میرا دل دھڑکا تھا لیکن دشمن کا خدشہ محض خدشہ رہا تھا۔ اطمینان ہوتے ہی مونا نے کافی کا مطالبہ کیا۔ سفیر نے اس کے اور اپنے لئے کافی نکالی۔ سردی بلا کی تھی۔ میں نے فریاد کی۔ ''دوستو! میں نے کیا قصور کیا ہے؟''

''آپ توجہ سے ڈرائیونگ کریں۔ کافی سے بعد میں شوق کیجئے گا۔ کافی کے چکر میں ہمیں کسی کھائی میں پہنچا دیں گے۔'' سفیر نے ایک زوردار چسکی لے کر کہا۔

''بھاڑ میں گئی ڈرائیونگ۔'' میں نے جیپ روک دی۔ ''مجھے بھی کافی دو...... ورنہ یہاں بیٹھے ٹھٹھرتے رہنا۔''

مونا کپ بھی لائی تھی، اس نے تھرماس سے کافی نکال کر میٹھی روٹی کے ساتھ مجھے پیش کی۔ ''شوق فرمائیں جناب!''

''یار! مجھے خواب لگ رہا ہے۔'' سفیر نے خواب ناک سی آواز میں کہا۔ ''ہم کتنے عرصے بعد ایک ساتھ ہیں۔''

''اس موقع کو غنیمت سمجھ۔'' میں نے کافی کے بڑے بڑے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''نہ جانے تقدیر نے آگے کیا لکھا ہے؟''

''ان شاء اللہ بہتر ہی ہو گا۔ منہ سے اچھی بات نکالا کرو۔'' مونا نے کہا۔

''یار شوبی! میرا خیال ہے ہمیں سید حامیری حویلی کی طرف جانا چاہئے۔'' سفیر بولا۔ ''مونا کو وہاں چھوڑ کر ہم......''

''میں وہاں نہیں رہوں گی۔'' مونا نے اس کی بات کاٹی۔ ''جہاں تم وہاں میں۔''

"ہر دفعہ اتفاقات نہیں ہوتے۔" سفیر نے طنز کیا۔ "اگر گلے خان ضمیر کی خلش سے مجبور ہو کر نیچے نہ آتا تو ہمیں پتا بھی نہیں چلتا کہ اوپر تم پر کیا گزری ہے؟"

"سفی ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "تم اور تمہاری عزت ہمارے لئے دنیا کی ہر شے سے قیمتی ہے۔"

مونا رونے لگی، چپکے چپکے خاموشی سے آنسو بہاتے ہوئے۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد مونا سے کہا۔ "رومت...... فی الحال ہم اسلام آباد کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔"

وہ دونوں چونکے۔ "پھر کہاں جا رہے ہیں؟" سفیر بولا۔ "گلے خان کے سامنے تم کہہ رہے تھے اسلام آباد جانے کا؟"

"اگر میرا اسلام آباد جانے کا ارادہ ہوتا تو کیا یہ بات گلے خان کو بتانا ضروری تھی؟" میں نے طنز کیا۔

"ظاہر ہے، میں اسے مس گائیڈ کر رہا تھا۔"

"پھر کہاں جانا ہے؟" سفیر نے پوچھا۔

"راجا عمر دراز کے پاس...... اس کا آبائی محل اس علاقے میں ہے۔"

"وہی محل، جہاں انوکھے پھولوں کا باغ ہے۔" مونا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اور وہ روشنی والا پتھر بھی؟" سفیر بھی پُر جوش ہو گیا۔

"وہاں سے تم لوگ حویلی رابطہ کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دے سکو گے۔"

آسمان پر بادلوں کی وجہ سے تاریکی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی اور بعض اوقات جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی بھی ناکافی محسوس ہوتی تھی، میں پوری توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ یہ علاقہ جنگلات سے پُر تھا اور ان جنگلات میں جانوروں کی موجودگی لازمی تھی جو اکثر اوقات سڑکوں پر آ نکلتے تھے اور حادثات کا باعث بنتے تھے۔ پھر میری احتیاط کام آئی۔ اچانک پہاڑی بکرا سڑک پر نمودار ہوا اور ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی نے اسے اپنی جگہ جما دیا۔ اسے خطرے کا احساس نہیں تھا۔ میں نے بریک لگائی تو جیپ تقریباً اسے چھو کر رکی۔ لمس محسوس کرتے ہی اس نے لمبی زقند بھری اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔ مونا سیٹ بیلٹ کی وجہ سے اپنی جگہ رہی مگر سفیر لڑھک کر ہمارے درمیان آ گرا تھا۔

"یہ کس...... قسم کی ڈرائیونگ ہے؟" اس نے بھنا کر کہا تھا۔

"معاف کرنا یار! بکرا آ گیا تھا سڑک پر۔" میں نے دوبارہ جیپ آگے بڑھائی۔

مونا جو اونگھ رہی تھی، بیدار ہو گئی۔ "ہم سے غلطی ہوئی، ہمیں کمبل بھی لانا چاہئے تھے۔"

"اور غالباً بستر بھی۔" سفیر نے طنز کیا۔

"سردی بہت زیادہ ہے۔" مونا نے ہاتھ ملے۔

جیپ کا ہیٹر آن تھا، اس کے باوجود سردی مزاج پوچھ رہی تھی۔ باہر اس کی شدت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے اور ابھی خاصی رات باقی تھی۔

"میرا خیال ہے ہمیں کہیں پناہ حاصل کرنی ہوگی۔" میں نے کہا۔

یہ شاید قبولیت کا لمحہ تھا کیونکہ مونا نے کہا۔ ''وہ دیکھو، شاید کوئی مکان ہے اس طرف۔'' اس نے ذرا نشیب کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جیپ کی روشنی میں کسی مکان کی دیواریں چمکی تھیں۔ میں نے جیپ روک دی۔ سفیر نے جھانک کر معائنہ کیا۔

''یہ تو بھوت بنگلا لگ رہا ہے، تاریک اور ویران۔''

عمارت خاصی لمبی چوڑی اور اپنے انداز سے ڈاک ہاؤس نظر آتی تھی۔

''متروکہ سرکاری عمارت ہے۔'' میں نے ڈیش بورڈ کے خانے سے ٹارچ نکالتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کھنڈرات سے تو ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے۔'' سفیر نے تائید کی۔

''سفیر میرے ساتھ آؤ، مونا تم یہیں رکو۔''

''جی نہیں، میں بھی ساتھ چلوں گی۔'' اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

''چلو بابا! تمہارے بغیر ہم کچھ کرنے کے قابل کہاں ہیں۔'' میں نے باول نخواستہ کہا اور اترنے سے پہلے احتیاطاً چابی نکال لی کہ جو کچھ دیر بعد کام بھی آئی، باہر نکلتے ہی سردی کی شدت نے ایسا حملہ کیا کہ چند لمحے کے لئے حواس ہی گم ہو گئے تھے۔ جسم لرزنے لگے تھے اور منہ سے لایعنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ہمارے لباس اس شدت کی سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے قطعی ناکافی تھے۔

''خ...... خدا کے لئے...... جو کرنا ہے جلدی کرو۔'' مونا نے دانت بجاتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں اس عمارت کی طرف بڑھے، اس کے سامنے ٹوٹا پھوٹا پتھر کا برآمدہ تھا، اس کی سیڑھیاں تک ٹوٹ چکی تھیں لیکن ہم کسی نہ کسی طرح اوپر چڑھ گئے۔ عمارت واقعی ویران تھی اور یہ کوئی سابقہ ریسٹ ہاؤس ہی تھا لیکن نہ جانے کس محکمے کا تھا اور اتنی اچھی لوکیشن پر اسے یوں ویران چھوڑنے کی کیا وجہ تھی؟

''ممکن ہے، عمارت آسیب زدہ ہو؟'' مونا نے رائے دی۔

''اب ہو گئی ہے۔'' سفیر نے دانت نکالے۔ ''دو عدد بھوت اور ایک چڑیل یہاں آ چکی ہے۔''

''خبردار جو مجھے چڑیل کہا۔'' مونا بولی۔ ''تم اپنے بارے میں جو چاہے کہتے رہو۔''

''بیشتر کمروں کے دروازے غائب تھے۔ مقامی لوگ یا چور اُچکے نکال کر لے گئے ہوں گے۔ چھت ان کی پہنچ سے اوپر تھی۔ اس لئے محفوظ تھی۔ سارے ہی کمرے صاف تھے اور فرش پر سوائے منوں گرد کے اور کچھ نہیں تھا۔ البتہ ایک کمرے میں لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا فرنیچر اور اسی طرح کا کاٹھ کباڑ نظر آیا، خاص بات یہ تھی کہ اس کمرے میں صرف ایک دروازہ تھا اور اس کے جھولتے پٹ موجود تھے یعنی یہاں پر سردی سے بچا جا سکتا تھا۔

''بس رات یہاں گزاریں گے۔'' میں نے اعلان کر دیا۔

''یہاں اس بھوت بنگلے میں؟'' مونا اچھل پڑی۔ ''ہرگز نہیں۔''

''تب آپ جا کر جیپ میں سکون سے سو سکتی ہیں۔'' سفیر نے کہا۔ ''ہم یہاں آگ جلا کر آرام سے سوئیں گے۔''

''اچھا پھر میں بھی......'' اس نے ہچکچا کر کہا۔

''میں نے اور سفیر نے لکڑی نکال کر جمع کی۔ اب مسئلہ اسے آگ دکھانے کا تھا۔ سفیر نے کہا۔ ''جیپ

سے ڈیزل کا کین لاتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

ہم باہر برآمدے میں آئے تو مونا رک گئی، اس نے آہستہ سے کہا۔ "شش...... مجھے جیپ کے پاس کوئی نظر آرہا ہے۔"

"مونا...... تم یہیں رکو۔" میں نے پستول نکال لیا۔ خوش قسمتی سے ٹارچ کی روشنی محدود تھی ورنہ جیپ کے پاس موجود شخص ہوشیار ہو جاتا۔ میں نے سفیر کو دائیں طرف سے جانے کا اشارہ کیا اور خود بائیں طرف سے گیا۔ وہ شخص جیپ کے ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے پر جھکا غالباً لاک کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پستول کی نال اس کی گدی پر رکھ دی۔ "ہلنا مت۔ ہاتھ اوپر کرو۔"

مگر اس نے بے حد پھرتی سے گھوم کر پستول پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ میں بمشکل پستول اس سے بچا سکا تھا۔ اس کے بعد اس نے میرے سینے پر ٹکر مارنے کی کوشش کی مگر میں نے اس سے پہلے اس کے سر پر پستول کی نال ماری۔ اس نے دلدوز کراہ کے ساتھ سر تھام لیا۔ اس کے بعد سفیر نے اندھیرے سے نمودار ہو کر اس کے پہلو پر لات رسید کی۔ وہ لڑھک گیا۔

"کون ہو تم؟" میں نے اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ مقامی تھا، کم از کم لباس سے یہی محسوس ہوتا تھا۔ زمین پر ایک مڑا تڑا تار بھی پڑا تھا جس سے وہ جیپ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چہرے سے کم عمر لگتا تھا۔ دو افراد کو مسلح دیکھ کر اس کی ساری تیزی طراری ہوا ہو گئی تھی اب وہ ساکت پڑا تھا۔ سفیر نے اس کی تلاشی لی، اس کی جیب سے ایک چاقو نکلا جس کا پھل بٹن دبانے سے باہر آ جاتا ہے۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ گھگھیا کر بولا۔ "صاحب، میرے کو معافی دے دو۔"

"ضرور دیتے ہیں۔ اسے اندر لے چلو۔" میں نے جیپ کے عقبی حصے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ کین اور اس اچکے کو لے کر ہم اندر آئے، آگ جلائی اور پھر اس کا انٹرویو لیا۔ مجھے سو فی صد یقین تھا کہ اس نے نام سمیت اپنے تمام کوائف بالکل غلط بتائے تھے۔ وہ معمولی درجے کا اُچکا تھا۔ جیپ خالی کھڑی دیکھ کر اس کے دل میں لالچ آیا تھا کہ اندر سے رقم یا اور کوئی قیمتی شے مل جائے، تالا کھولنے میں اسے اتنی مہارت نہیں تھی اس لئے پکڑا گیا۔

"اب اس کا کیا کرنا ہے؟" سفیر نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"کرنا کیا ہے مار کر گاڑ دیتے ہیں...... کسی کو کیا پتا چلے گا؟" میں نے بھی دھیمی لیکن اتنی آواز میں کہا کہ وہ سن لے۔

"جانے دو یار ہمارا کیا بگاڑا ہے اس نے......"

"ہاں، یہ تو ہے۔" میں نے قائل وہ کر کہا۔ "لیکن بہت دنوں سے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"خدا کو مانو...... دو دن پہلے تم نے اُس بے چارے کو مارا تھا۔"

اس نامعلوم بے چارے کا سن کر اس بے چارے کی حالت خراب ہو گئی تھی اور اس نے ہمارے قدموں میں لوٹتے ہوئے خدا رسولؐ کے واسطے دینا شروع کر دیئے۔ ہمارا بھی اسے قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا، صرف ا را

دھمکار ہے تھے تاکہ جب وہ یہاں سے بھاگے تو بھاگتا ہی جائے، پلٹ کر نہ آئے۔ سفیر نے اسے باہر لے جا کر کہا۔ ''میں تین تک گنوں گا، اس کے بعد بھی تم نظر آئے تو گولی مار دوں گا۔'' کچھ دیر بعد وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ ''وہ تو بھوت کی طرح غائب ہو گیا۔ میرے تین کہنے تک اس کا نام ونشان نہیں تھا۔''

لیکن جب مرحلہ فرش کی صفائی کا آیا تو مونا نے صاف انکار کر دیا۔ ''بہت جلدی تھی، اسے بھگانے کی......اب خود صاف کرو۔''

''تم بھی یہ بات پہلے نہیں بتا سکتی تھیں۔'' سفیر بھنا کر بولا۔

بہرحال فرش صاف کرنا حماقت تھی کیونکہ اس پر کئی انچ موٹی مٹی کی تہ جمی تھی جسے کسی صورت صاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کا حل جیپ کے کور کی صورت میں نکلا۔ اسے مٹی پر بچھا کر ہم سب ہی اس پر لیٹ سکتے تھے لیکن میں نے پہلے ان دونوں کو لیٹنے کو کہا اور خود الاؤ کے پاس بیٹھ گیا۔ ہم میں سے کسی ایک کا جاگتے رہنا ضروری تھا۔ کمرے میں الاؤ کی وجہ سے سردی کی شدت قابلِ برداشت حد تک کم ہو گئی تھی۔ میں نے جیپ لا کر عمارت کے اس کمرے کے بالکل سامنے کھڑی کر دی تھی۔ دروازے میں ایک جھری برقرار رکھی تھی جس سے جیپ نظر آ رہی تھی۔

الاؤ کے پاس بیٹھ کر سردی میں آگ تاپنے میں کیا مزہ ہے، یہ بات وہی لوگ جانتے ہیں جن کی سرد راتیں الاؤ کے سامنے گزری ہوں۔ سفیر اور مونا ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر بے خبر سو گئے تھے پھر مونا نے کروٹ لی، اسے سردی لگ رہی تھی۔ وہ بچوں کی طرح سمٹ گئی تھی، میں نے کور کا کچھ حصہ اسے اُڑھا دیا تھا۔ الاؤ میں مزید لکڑی ڈالی۔ میرا ارادہ تھا کہ دو گھنٹے بعد سفیر کو اٹھا دوں گا لیکن الاؤ سے ایسی نیند بھری حدت اٹھی کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئی تھیں۔ نہ جانے کب میں الاؤ کے پاس ہی لڑھک کر سو گیا۔ پھر میری آنکھ مونا کے جھنجھوڑنے سے کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ ''کک......کیا ہوا......خیریت ہے؟''

''یس سر! صبح ہو گئی ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''سب گھوڑے گدھے بیچ کر سوتے رہے تھے اور یہ تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔'' اس نے سفیر کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کا تو باپ بھی اٹھے گا۔'' میں نے کہا اور ایک باریک تنکے سے سفیر کے کان میں سلائی گھمائی وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''کک......کیا ہوا یہ کیا حرکت ہے؟'' اس نے کان میں انگلی گھماتے ہوئے خفگی سے کہا اور ہم دونوں ہنسنے لگے، کچھ دیر بعد سفیر بھی کھسیائے ہوئے انداز میں ہمارے ساتھ ہنس رہا تھا۔

''سفی......شوبی......ہم کتنے عرصے بعد اس طرح بے فکری سے ہنس رہے ہیں؟'' مونا بولی۔

''مجھے سفیر کے ملازم کے ہاتھ کے سینڈوچز یاد آ رہے ہیں۔''

''اور کافی تو وہ غضب کی بناتا تھا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

''ان شاءاللہ وہ وقت آئے گا جب ہم اس طرح بے فکری سے ہنسیں گے اور کافی کے ساتھ سینڈوچز بھی کھائیں گے۔'' سفیر نے کہا۔ ''عزیز کو میں نے فی الحال حویلی بلوا لیا ہے۔ اسلام آباد والا مکان خالی ہے۔''

مونا چونکی۔ ''یہ بات ہمارے دشمنوں کو بھی معلوم ہو گی۔ کیا ہم چپکے سے اس مکان میں جا کر نہیں رہ

سکتے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس سے زیادہ آسانی اس میں ہے کہ ہم خود کو مرشد کے حوالے کر دیں۔"

"اس کے آدمی وہاں کی نگرانی کر رہے ہوں گے؟" سفیر نے میری طرف دیکھا۔

"سو فی صد۔" میں نے کہا۔ "اس وقت ہمارا راجا عمر دراز کے پاس جانا ضروری ہے۔ وہیں ہمیں پناہ اور اطلاعات ملیں گی۔"

"یعنی ہمارے لئے دوسروں کے سہارے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے؟" سفیر نے تلخی سے کہا۔

"یار! اتنا پریشان کیوں ہوتا ہے؟" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے بھی ماں، باپ کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ اپنے معاملات خود دیکھنے لگتا ہے اور پھر ایسا وقت آتا ہے جب وہ خود ماں، باپ کا سہارا بن جاتا ہے۔"

سفیر نے سر ہلایا۔ "تُو ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن ایسا کب تک ہوگا؟"

"دیکھ یار! ہم ڈیوڈ شا اور فتح خان کی قید سے نکل آئے بغیر کسی سہارے اور مدد کے، کیا یہ ہماری کامیابی نہیں ہے؟"

سفیر ہچکچایا۔ "ہاں، ہے تو...... لیکن ہمارا مسئلہ مرشد اور اس کے گرگے ہیں۔"

"یار! یہ بھی اس سے ملے ہوئے ہیں، سارے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ تُو فکر نہ کر...... اب ہم مرشد علی کو سبق سکھائیں گے۔"

ناشتے کے لئے ہمارے پاس بسکٹ اور میٹھی روٹیاں تھیں، انہیں کھا کر اور پانی پی کر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ باہر تیز دھوپ تھی لیکن حرارت سے خالی۔ البتہ سردی کی شدت میں رات کے مقابلے میں نمایاں کمی ہوئی تھیں آگ بجھا کر اور کور سمیٹ کر ہم نے روانگی کی تیاری کی۔ روانگی سے پہلے سفیر فطرت کی پکار پر اس متروک ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے کی طرف روانہ ہوا اور چند لمحے بعد ہی ہانپتا کانپتا، بھاگتا ہوا آیا، اس کی حالت دیکھ کر ہم پریشان ہو گئے تھے۔ مونا نے مذاق میں پوچھا۔ "خیریت تو ہے، کیا کوئی سانپ، بچھو یا دشمن دیکھ لیا؟"

"میرے خدا! اب پتا چلا...... ریسٹ ہاؤس کیوں چھوڑا گیا...... ہم ساری رات پُل صراط پر سوئے رہے تھے۔" سفیر ہانپتے ہوئے بولا۔

"کیا بک رہا ہے میرے یار......! عالمِ جنوں میں......"

"خود چل کر دیکھ لو۔" اس نے خفگی سے کہا۔

میں اور مونا اس کے ساتھ ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے میں آئے اور یہاں جو منظر سامنے آیا، اسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس طرف ڈھلان تھی اور ماضی میں جنگلات کی بے دریغ کٹائی نے مٹی کو ڈھیلا کر دیا تھا۔ لینڈ سلائیڈنگ ہوئی تو ریسٹ ہاؤس کے نیچے سے بھی مٹی سرک گئی تھی اور اس وقت نصف کے قریب ریسٹ ہاؤس عملاً خلا میں تھا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ نہ تو اس کی دیواروں میں دراڑیں آئی تھیں اور نہ ہی فرش کہیں سے تڑخا تھا۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ فٹ بھر سے زیادہ موٹی دیواروں کا وزن بے پناہ ہوگا۔ چھت اور پتھر سے بنا فرش بھی کم وزنی نہیں تھا لیکن تعمیر اتنی مضبوط تھی کہ اس نے باقی نصف ریسٹ ہاؤس کو

سنبھال رکھا تھا۔ مونا لرز گئی تھی۔

''اگر میں رات کو دیکھ لیتی تو کبھی اس میں نہ رکتی۔ بے شک باہر سردی سے اکڑ کر مر جاتی، یہ تو موت کا پل ہے۔''

''جو میرے ایمان کی طرح نہ جانے کب سے متزلزل ہے۔'' سفیر بولا۔ ''نہ جانے کب زمین بوس ہو جائے، اب یہاں سے چلو۔''

اچانک میری نظر عمارت تلے خالی ڈھلان سے سرکتی مٹی پر پڑی۔ میں چلایا۔ ''بھاگو...... شاید عمارت گرنے والی ہے۔''

ہم افراتفری میں اوپر کی طرف بھاگے اس دوران میں سلائڈنگ تیز ہو گئی تھی۔ مونا چلائی۔ ''عمارت جھک رہی ہے۔''

سچ مچ عمارت ڈھلان کی طرف جھک رہی تھی۔ مجھے جیپ کا خیال آیا۔ نہ جانے عمارت کے گرنے سے کتنے بڑے علاقے میں لینڈ سلائیڈنگ ہوتی۔ میں جیپ کی طرف بھاگا۔ زمین لرز رہی تھی۔ مٹی اپنی جگہ چھوڑ رہی تھی۔ سب سے پہلے مونا جیپ میں گھسی۔ میں نے کہا۔ ''جیپ سے اترو سڑک کی طرف بھاگو۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے۔ پیدل جائیں۔'' اس نے برہمی سے کہا۔

''میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے ریورس میں پیچھے لے جانے لگا۔ اس دوران میں عمارت کا سامنے والا حصہ رفتہ رفتہ پیچھے جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جیپ کے ٹائروں تلے مٹی سرک رہی تھی۔ جیپ اس رفتار سے پیچھے نہیں جا رہی تھی، جس رفتار سے اسے جانا چاہئے تھا حالانکہ میں نے ایکسی لیٹر پورا دبا دیا تھا۔ سفیر نہ جانے کہاں تھا، وہ جیپ میں نہیں آیا تھا۔ مٹی سرکنے سے فضا میں گرد کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ جس نے اردگرد کے منظر کو دھندلا دیا تھا۔ اچانک جیپ پیچھے کے بجائے آگے جانے لگی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' مونا خوف زدہ ہو کر بولی۔

''مونا...... نیچے کود جاؤ۔'' میں چلایا۔ ''اس جگہ بھی لینڈ سلائیڈنگ ہو رہی ہے۔''

لیکن وہ جیسے خوف سے منجمد ہو گئی تھی۔ مجبوراً میں نے اسے دروازہ کھول کر زور سے دھکا دیا۔ اس نے چیخ ماری تھی۔ میں خود بھی اسی طرح سے کود گیا کیونکہ جیپ دائیں پہلو سے ترچھی ہو کر نیچے جا رہی تھی، میں سرکتی مٹی میں گرا۔ اس پر کھڑے ہونا ممکن ہی نہیں تھا اس لئے میں لیٹے لیٹے ہی ہاتھ پیروں کے بل چھپکلی کی طرح اوپر جانے لگا۔ ساتھ ہی میں چیخ چیخ کر ان دونوں کو آوازیں دے رہا تھا۔ ''مونا...... سفیر...... کہاں ہو تم؟''

مٹی اتنی زیادہ اُڑ رہی تھی کہ چند فٹ سے زیادہ فاصلے پر بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک پاس سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی اور میرے ہاتھ میں مونا کا ہاتھ آ گیا۔ مٹی کی وجہ سے اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھیں میں نے اسے اپنے ساتھ کھینچنا شروع کر دیا۔

''لیٹے لیٹے اوپر کھسکو۔ کھڑے ہونے کی کوشش...... مت کرو۔''

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ کیچڑ میں تیرنے کے انداز میں ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ میں پہلے ہی اس انداز میں ہاتھ پاؤں چلاتے خود کو نیچے جانے سے روکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ ریت کی چادر سرک رہی تھی

جس کے ساتھ پتھر اور پودے بھی چلے آ رہے تھے۔ عمارت کے گرنے سے بہت بڑا خلا پیدا ہوا تھا جسے بھرنے کے لئے اوپر سے ریت گر رہی تھی اور یہی مجھے اور مونا کو نیچے کی جانب لے جا رہی تھی۔ سفیر نہ جانے کہاں تھا۔ میں چیخ چیخ کر اسے آوازیں دے رہا تھا۔ بڑے ہی خوف ناک لمحات تھے۔ مجھے معلوم تھا اگر ہم نے خود کو اس جگہ قائم نہ رکھا تو مٹی ہمیں نیچے لے جائے گی اور پھر اوپر سے آنے والی مٹی ہمیں زندہ دفن کر دے گی۔ اس علاقے کے باسیوں کے لئے لینڈ سلائیڈنگ نئی بات نہیں تھی، سال میں درجنوں واقعات ہوتے تھے۔ جن میں بے شمار جانیں جاتی تھیں۔ ہم آئے دن ٹی وی اور اخبارات میں ان کے بارے میں دیکھتے اور سنتے رہا کرتے تھے لیکن کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ خود بھی اس مصیبت میں پھنس جائیں گے۔

''شوبی......شوبی!'' مونا چلا رہی تھی۔

سرکتی مٹی پر پاؤں یا ہاتھ جمانا ناممکن تھا۔ اس میں ہاتھ پاؤں چلانا زیادہ مناسب تھا۔ ''مونا، اوپر چڑھنے کی کوشش کرو۔''

''کیسے؟'' اس نے کہا۔

''میں تمہارا ہاتھ چھوڑ رہا ہوں، ہاتھوں اور گھٹنوں کے بَل......سانپ کی طرح رینگ کر اوپر چڑھو۔'' میں نے کہا اور اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اسے اوپر دھکیلا اور خود بھی ہاتھ اور پاؤں مٹی میں گاڑ کر اوپر جانے لگا۔ میری کوشش تھی کہ مونا کے قریب رہوں اور اسے اوپر دھکیلتا رہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ مٹی کے سرکنے کی رفتار تیز ہو رہی تھی یعنی ہم اس خلا کے نزدیک ہو رہے تھے جو عمارت کے گرنے اور ڈھلان پر لڑھکنے سے پیدا ہوا تھا اور اس میں گرنے کا مطلب تھا کہ ہمارے بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتا۔ اوپر سے نہ جانے کتنی مٹی، ریت اور پتھر آ رہے تھے۔

موت کے خیال نے میرے اندر بجلی بھر دی تھی۔ میں اوپر جانے کے لئے دیوانہ وار ہاتھ پیر چلانے لگا۔ مونا نیچے پھسل رہی تھی مجھے اس کو بھی اوپر دھکیلنا پڑ رہا تھا۔ وہ نازک سی لڑکی ان حالات میں کس طرح اپنے حواس برقرار رکھ سکتی تھی، کمزور ہونے کے باوجود ہمت سے اوپر جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''مونا......حوصلہ رکھو...... شاباش، ہاتھ پیر چلاؤ......رکنا مت......ورنہ مارے جائیں گے۔''

''شوبی......سفیر......!'' مونا نے سسکی لی تھی۔

''وہ......پہلے ہی......اوپر جا چکا تھا۔'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''وہ ٹھیک ہوگا۔''

اچانک سرکتی ریت اور مٹی کی رفتار میں تیزی آئی تھی۔ شاید عمارت پوری طرح گر چکی تھی دھول مٹی کے ساتھ فضا شور اور گڑگڑاہٹ سے بھی بھر گئی تھی۔ شاید بہت بڑی لینڈ سلائیڈنگ شروع ہو چکی تھی۔ مونا خوف زدہ انداز میں چیخ رہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ ایک بار میں نے مٹی میں پاؤں مار کر اوپر جانا چاہا تو میرا پاؤں خلا میں گیا تھا۔ میرا دل ایک لمحے کو رک گیا۔ ہم اس خلا کے عین اوپر تھے جس میں مٹی پتھر گر رہے تھے۔ اس میں جانے کا مطلب موت کے منہ میں جانا تھا۔

''یا خدا......کیا ایسی بے بسی کی موت مقدر رہے۔'' میں نے بے ساختہ اس ہستی کو پکارا جو ہر انسان کا اوّل اور آخری سہارا ہوتا ہے لیکن ہم اسے آخر میں ہی پکارتے ہیں، اس پر بھی وہ فوری سنتا ہے۔ ٹالتا نہیں ہے۔ ابھی

الفاظ میرے منہ سے پوری طرح نکلے بھی نہیں تھے کہ میرے ہاتھ میں ایک رسی نما شے آ گئی۔ میں نے اسے مضبوطی سے تھاما۔ پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ رسی بھی اوپر سے آنے والی مٹی میں شامل ہے لیکن جب میں نے اسے کھینچا تو وہ تن گئی تھی۔

''مونا میری کمر پکڑ لو۔'' میں نے چلا کر کہا۔

مونا میری کمر سے چمٹ گئی اور میں اس رسی کے بل پر خود کو اوپر کھینچنے لگا تھا۔ مٹی کے ریلے کے ریلے آ رہے تھے۔ بعض اوقات رسی ہاتھ سے پھسلنے لگتی تھی لیکن میں نے اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس وقت زندگی اور موت کے درمیان یہی معمولی سی لکیر تھیں مونا پوری قوت سے میری کمر سے چمٹی تھی۔ مجھے فکر تھی اس کی گرفت کمزور نہ ہو۔ میں بار بار اسے مضبوطی سے پکڑنے کو کہہ رہا تھا۔ مٹی بری طرح اڑ رہی تھیں آنکھیں کھولنا ناممکن تھا۔ یہ کان اور ناک میں گھسی جا رہی تھی۔ حلق میں گھس گئی تھی۔ میں بار بار کھانستا تو تھوک کے ساتھ مٹی بھی باہر آتی۔ انچ انچ کر کے میں اوپر جا رہا تھا۔ ایک بار پھر میرے پیروں میں زمین آنے لگی تھی، یعنی میں خلا سے اوپر نکل چکا تھا۔ ابتدائی خطرناک سلائیڈنگ کے بعد اب اوپر سے مٹی آنے کی رفتار کم ہوگئی تھی۔ اچانک مونا نے چیخ ماری اور اس کی گرفت میری کمر سے ختم ہونے لگی اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے الگ ہوتی، میں نے پلٹ کر اسے تھام لیا۔ اس کا بازو میری گرفت میں آیا تھا۔

''مونا، کیا ہوا ہے...... پکڑو مجھے۔'' میں چلایا۔

مگر وہ بے حس و حرکت رہی، نہ جانے اسے کیا ہوا تھا۔ میرا دل خدشات سے بھر گیا۔ اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ میں نے ایک ہاتھ سے رسی تھام رکھی تھی اور دوسرے سے مونا کو۔ یہ میرا کمزور ہاتھ تھا۔ اگرچہ ابھی اس کی گرفت برقرار تھی لیکن کسی وقت یہ گرفت ختم ہو جاتی، اس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ایسے نازک مواقع پر پہلے بھی کئی بار میرا یہ ہاتھ مجھے دھوکا دے چکا تھا۔ میں نے مونا کو اوپر کھینچنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ مٹی کا بہاؤ رکاوٹ ڈال رہا تھا اور ڈھلان بھی خاصی ہو چکی تھی۔

''مونا...... اٹھو...... خدا کے لئے۔'' میں نے اس کے پیروں پر پاؤں سے ٹھوکر ماری۔

مونا تو نہیں ہلی البتہ میں نے محسوس کیا کہ اس کے بازو پر میرے ہاتھ کی گرفت ختم ہو رہی ہے۔ کمزوری نے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ گرفت قائم رہے مگر ہاتھ کی قوت ہی زائل ہو رہی تھی۔ ایک بار مونا میری گرفت سے نکل جاتی تو اسے نیچے جانے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں جاتی۔ گرفت قائم رکھنے کی کوشش میں میرا جسم لرزنے اور ذہن چکرانے لگا۔ اچانک مونا کا بازو میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے پھرتی سے اسے ایک پاؤں سے روک لیا۔ میرا پاؤں کمر کے پاس سے اس کے گرد لپٹا تھا لیکن یہ بہت مشکل اور اذیت ناک پوز تھا۔ مونا کو نیچے جانے سے بچانے کے لئے مجھے جلد کچھ کرنا تھا۔ کٹھن حالات کے باوجود میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

میں نے رسی کھینچ کر دانتوں سے پکڑی۔ اس کے بعد سیدھے ہاتھ سے مونا پکڑ کر آہستہ سے اوپر کھینچنا شروع کیا۔ دانتوں پر دباؤ پڑا تو ایسا لگا کہ رسی یا جبڑا دونوں میں سے ایک شے میرے منہ سے نکل جائے گی۔ بہرحال میں رسی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مونا کو اتنا اوپر کھینچنے کے بعد کہ وہ میرے پیروں کی گرفت میں آ سکے، میں نے

اس کی کمر کے گرد دونوں پیروں سے قینچی بنا کر گرفت کر لی اور سیدھے ہاتھ سے دوبارہ رسی تھام لی۔ اگرچہ یہ بہت مشکل کام تھا مونا کی کمر بہت کم تھی اور میں نے پیروں سے جو حلقہ بنایا تھا وہ زیادہ بڑا تھا لیکن وہ اس میں کسی نہ کسی طرح پھنس گئی تھی۔ ذرا سی دیر میں میرے دانت بجنے لگے تھے۔ سیدھے ہاتھ سے میں رسی تھام کر خود کو نیچے جانے سے روک سکتا تھا لیکن اوپر جانے کے لئے دونوں ہاتھوں کا استعمال لازمی تھا۔

اچانک مجھے سفیر کا خیال آیا اور میں نے چلا کر اسے آواز دی۔ ''سفیر!''

لیکن میرے منہ سے جو آواز نکلی تھی وہ ایک ذرا صحت مند سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔ چند فٹ کے فاصلے کے بعد اسے سننا ناممکن تھا۔ بہرحال سفیر کے دل کو راہ ہو گئی تھی کیونکہ اس نے مجھے اور مونا کو آواز دینا شروع کر دی تھی۔ ''مونا...... شوبی، کہاں ہو تم؟''

''اِدھر ہیں بھائی!'' میں دوبارہ سرگوشی میں چلایا۔

''مونا...... شوبی!''

''اُلو کے پٹھے، ہم یہاں ہیں۔''

اچانک، مجھے خیال آیا۔ جیب کی چابیوں پر جو کی چین تھی اس سے ایک سیٹی بھی منسلک تھی لیکن اسے نکالنے کے لئے ضروری تھا کہ میں رسی چھوڑتا۔ میں نے الٹے ہاتھ سے کوشش کی جو انگلیاں بے جان ہونے سے ناکام رہی۔ میں نے مونا کا گال تھپتھپایا۔ ''مونا اٹھو...... شاباش دیکھو، سفیر پکار رہا ہے، اسے جواب دو۔''

بار بار ہاتھ منہ پر مارنے سے وہ کسمسانے لگی۔ ''سفی...... شوبی...... بچاؤ۔''

''مونا...... دیکھو...... سفی پکار رہا ہے۔''

اور اب سفیر گلا پھاڑ پھاڑ کر ہمیں پکار رہا تھا۔ ہماری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس کی آواز میں دکھ بھی شامل ہوتا جا رہا تھا۔ ''ابھی ہم زندہ ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

دو تین تھپڑ کھا کر مونا کو ہوش آ گیا تھا اور یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔ میں نے ایک ہاتھ اور رسید کیا تو وہ جھنجلا گئی۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟''

''سوری، مجھے معلوم نہیں تھا...... سفیر کو آواز دو...... میری تو آواز نہیں نکل رہی ہے۔''

''سفیر...... کہاں ہے؟''

''ابھی تو اس کی آواز آ رہی تھی، ہمیں پکار رہا تھا۔''

''سفیر!'' مونا اتنی زور سے چلائی کہ میں اچھل پڑا۔

''اسے پکارتی رہو اور مجھے پکڑ کر اس رسی تک آؤ...... یہ تمہیں اوپر لے جائے گی۔''

''تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا؟''

''حسبِ معمول عین موقع پر دھوکا دے گیا ہے۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔

''مونا سفیر کو پکارتی اور مجھ پر سے گزرتی رسی تک گئی۔'' ہاں، میں رسی پکڑ کر اوپر جا سکتی ہوں، تم میرے ساتھ اوپر آؤ۔''

''مشکل ہے۔ تم اور سفیر مل کر رسی کھینچو گے تبھی میں اوپر آ سکوں گا۔''

اسی لمحے سفیر کے پکارنے کی آواز آواز آئی۔ مونا نے اسے جوش سے جواب دیا اور رسی کے سہارے اوپر چڑھتی چلی گئی۔ سلائیڈنگ رک گئی تھی اور فضا میں پھیلا گرد و غبار بھی کم ہو گیا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ مٹی میں پاؤں جما کر خود کو اوپر کھینچ سکوں لیکن ایک ہاتھ سے یہ کام آسان نہیں تھا۔ سفیر کی آواز قریب آنے لگی پھر میں نے اس کی مسرت بھری آواز سنی، اس نے یقیناً مونا کو دیکھ لیا تھا۔ ''شوبی نیچے ہے۔ اس کا بایاں ہاتھ کام نہیں کر رہا ہے، رسی کھینچو۔''

ان دونوں نے مل کر رسی کھینچنا شروع کر دی تھی، میں ذرا ذرا سرک کر اوپر جا رہا تھا اور کچھ دیر بعد میں ان کے ساتھ اس عظیم الشان گڑھے کے کنارے تھا جو لینڈ سلائیڈنگ سے پیدا ہوا تھا۔ نیچے ابھی تک گرد و غبار کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں اور مونا تو مٹی کے بھوت بن گئے تھے۔ سفیر کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ مونا نے قہقہہ مارا۔ ''قسم سے پورے بھوت لگ رہے ہو۔''

''کاش کہ میرے پاس آئینہ ہوتا'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''بیٹے، شکر ادا کر کہ جان بچ گئی ورنہ میں نے تو کلمہ بھی پڑھ لیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''تو کہاں تھا جب سلائیڈنگ شروع ہوئی۔''

''میں اس چٹان کی طرف بھاگا تھا۔'' سفیر نے ذرا فاصلے پر واقع چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس پر چڑھنے سے جان بچی تھی ورنہ مارا جاتا۔''

''ان بی بی نے منع کرنے کے باوجود جیپ میں سواری کی تھی۔'' میں نے مونا کو گھورا۔

''سلائیڈنگ نے مجھے ڈرا دیا تھا۔'' مونا بولی۔

''یہاں سے ہٹو...... ایسا نہ ہو یہ کنارہ بھی گر جائے۔'' سفیر نے کہا تو ہم سب بے اختیار پیچھے کی طرف بھاگے تھے اور پھر سڑک پر آ کر دم لیا تھا۔

''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ لینڈ سلائیڈنگ اتنی خطرناک ہو گی۔'' مونا نے طویل سانس لی۔

''حالانکہ ایک ہائکر کے طور پر تمہیں اس کا اچھی طرح اندازہ ہونا چاہئے۔'' سفیر بولا۔

''عملی طور پر واسطہ تو پہلی بار پڑا ہے۔'' مونا جھنجلائی۔ ''اور تم ہر وقت میرے پیچھے مت پڑ کے رہا کرو۔''

''بے چارے کے پاس یہی موقع ہے۔'' میں نے بالوں اور کپڑوں سے گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد تم ہی اس کے پیچھے پڑی رہا کرو گی۔''

مونا انجان بن گئی البتہ سفیر نے شرارت سے دریافت کیا۔ ''کس کے بعد؟''

''کسی کے بعد نہیں...... اب یہاں سے چلو...... کسی جگہ جائیں تو یہ مٹی اتاریں۔''

''ممکن ہے آس پاس کوئی ندی، نالا یا چشمہ مل جائے۔ کم سے کم منہ ہاتھ تو دھو لیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''یار! اس طرح سڑک پر پھرنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' سفیر نے سوچ کر کہا۔ ''سڑک علاقے میں آمد و رفت کا واحد ذریعہ ہے اور اس پر فتح خان...... ڈیوڈ شاپا ان کے گرگوں سے مڈبھیڑ کا پورا امکان ہے اور میرا ریوالور تو کھو گیا ہے۔''

خوش قسمتی سے میرا پستول قمیص کے اندر ہونے کی وجہ سے محفوظ تھا۔ اس کے دو میگزین بھی تھے البتہ مونا کا ریوالور سلائیڈنگ کے دوران گر گیا تھا۔ بہر حال ہم نہتے نہیں تھے۔ اس کے باوجود میں نے سفیر کی بات سے اتفاق کیا۔

''سڑک سے ہٹ کر سفر کرنا بہت مشکل اور دشوار ہوگا۔ ہم سمتیں بانٹ لیتے ہیں۔ میں سامنے نظر رکھوں گا تُو پیچھے اور مونا دائیں بائیں۔ جیسے ہی کوئی گاڑی نظر آئے گی، ہم سڑک سے ہٹ جائیں گے۔''

کچھ دیر بعد سفیر نے شکایت کی۔ ''مڑ مڑ کر دیکھنا بہت مشکل ہے۔''

''تُو الٹا چل سکتا ہے۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔

پھر مونا نے بھی دائیں بائیں دیکھنے پر شکایت کی، میں بھنا گیا۔ ''ایسا کرو...... تم لوگ ایک دوسرے کو دیکھو، چاروں طرف میں خود دیکھ لیتا ہوں۔''

یونہی چلتے چلتے اور لڑتے جھگڑتے ہم ایک بڑی سڑک پر جا نکلے۔ اسی لمحے سفیر نے خبردار کیا۔ ''پیچھے سے کوئی گاڑی آ رہی ہے۔''

ہم تینوں ایک ساتھ بھاگے اور ذرا بلندی پر موجود ایک بڑے سے پتھر کے عقب میں ہو گئے۔

''کیسی گاڑی تھی؟'' مونا نے پوچھا۔

''ابھی آئے گی تو دیکھ لینا۔'' سفیر نے جواب دیا۔

ذرا دیر بعد ایک نیلے رنگ کی فور وہیل نمودار ہوئی اور خاص بات یہ تھی کہ اس کی ڈرائیونگ نشست پر خود فتح خان براجمان تھا۔ وہ دھیمی رفتار سے ہمارے سامنے سے گزرا اور بائیں جانب مڑ گیا، میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا۔ ''ہمیں دائیں طرف جانا ہوگا۔''

''کہیں اس طرف ڈیوڈ شا نہ مل جائے۔'' سفیر بولا۔

''بے شک...... ویسے تم دونوں نے محسوس کیا، اس بار ہمارے ساتھ فتح خان کا رویہ نرم تھا۔''

''نرمی پر یہ حال ہے۔'' مونا نے طنز کیا۔

''تم لوگوں نے اسے زیادہ نہیں دیکھا ہے...... میں اسے جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ شاید ڈیوڈ شا کے حکم سے مجبور ہے ورنہ ہم سے تعرض بھی نہ کرتا۔''

''یہ ڈیوڈ شا کو اچانک حکیمی نسخوں کی کیا سوجھی؟'' سفیر نے دریافت کیا۔

''کمال کا سوال کیا ہے تُو نے...... خود میرے ذہن میں یہی بات تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے دو عقل مند ایک سے انداز میں سوچتے ہیں۔''

''اور بے وقوف آپس میں کبھی اختلاف نہیں کرتے۔'' مونا نے معصومیت سے لقمہ دیا۔

سفیر نے اسے گھورا۔ ''کیا تم نے ہمیں بے وقوف قرار دینے کی کوشش کی ہے؟''

''نہیں، مجھے کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' مونا کا لہجہ مزید سادہ ہو گیا۔

''چل بھائی...... ورنہ واقعی ہم یہی ثابت ہوں گے۔'' میں کھڑا ہو گیا۔

اس سڑک اور ہائی وے کے آس پاس خاصے اونچے اور گھنے درخت تھے۔ کہیں کہیں یہ چھدرے تھے

لیکن بلندیوں پر بے حد گھنے تھے۔ اس طرف بھی ٹمبر مافیا نے ہاتھ کی صفائی دکھانا شروع کر دی تھی کیونکہ میرا زیادہ تر کاروبار ہی شمالی علاقے سے متعلق تھا اس لئے مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ اس علاقے میں جنگلات کی قیمتی دولت کو کتنی بے دردی سے نقصان پہنچایا گیا ہے۔ جن پہاڑوں پر ایک زمانے میں درخت تھے، اب وہ اپنے سبز پیرہن سے محروم ہو کر ننگے ہو چکے تھے۔ اس کے اثر سے مٹی اپنی جگہ چھوڑ رہی تھی اور لینڈ سلائیڈنگ کے واقعات بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ ایک زمانے میں شمالی علاقے کے دریا طغیانی سے نا آشنا تھے اب ان میں ہر سال سیلاب آتا ہے کیونکہ درختوں سے عاری چوٹیوں پر برف بے حد تیزی سے پگھل جاتی ہے۔ پانی سیلاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عوام اور حکومت دونوں اس تباہی میں برابر کے شریک ہیں۔ لوگ اپنی اس قیمتی دولت کو جلا کر ختم کر رہے ہیں تو اس کی حفاظت کے ذمے دار رقم کے عوض ٹمبر مافیا کو جنگلات کے قتل عام کا پروانہ فراخ دلی سے عطا کر رہے ہیں۔

''کیا سوچ رہا ہے؟'' سفیر نے میرے شانے پر ہاتھ مارا۔

''یار! کچھ عرصے میں یہ علاقے اپنا سارا حسن کھو بیٹھیں گے۔'' میں نے اردگرد دیکھا۔ ''یہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔''

''ہاں بھائی، لیکن کیا، کیا جا سکتا ہے؟'' اس نے مایوسی سے کہا۔ ''ہم تو ورثے میں ملنے والی ہر اچھی شے کو برباد کرنے والی قوم بن گئے ہیں۔''

''فی الحال اپنی فکر کرو۔'' مونا نے ہمیں یاد دلایا۔ ''ہم دشمن کی قید سے فرار ہوئے ہیں اور پیدل، لاچار پھر رہے ہیں۔ نہ کوئی ٹھکانا ہے اور نہ ہی سمت کا پتا۔''

''لیکن دشمن سے دور بھی ہیں۔'' سفیر نے اسے تسلی دی۔

''جب تک وہ سر پر نہ آ جائیں۔'' مونا نے لقمہ دیا۔

''کوئی آ رہا ہے۔'' سفیر نے مڑ کر دیکھا اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ''شاید مرغیوں کا ٹرک ہے۔''

☆======☆======☆

پنجرے ٹرک کے دونوں طرف نکلے ہوئے تھے اندر ایک ڈرائیور اور اس کا ایک عدد کلینرز تھا۔ اسے روکنے کے لئے ہم تینوں سڑک کے وسط میں اس طرح کھڑے ہوگئے کہ وہ ہم پر سے گزرے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود میرے خیال میں اس نے محض اس لئے ٹرک روکا تھا کہ سب سے آگے مونا کھڑی تھی۔ اگر میں اور سفیر ہوتے تو شاید وہ ہم پر سے ٹرک گزار کر لے جاتا۔ دھول مٹی میں اَٹے ہونے کے باوجود مونا کا حسن دور سے نظر آ رہا تھا، یہ خیال سفیر نے ظاہر کیا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' ڈرائیور نے سر نکال کر پوٹھوہاری لہجے میں پوچھا، ویسے اس کی نظریں مونا پر مرکوز تھیں۔

''ہماری گاڑی لینڈ سلائیڈنگ کی نذر ہوگئی ہے۔'' میں نے پاس جا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''ہمیں اگلے گاؤں تک لفٹ چاہئے۔''

''آ جاؤ...... آ جاؤ۔'' اس نے فراخ دلی سے کہا۔

ٹرک کا ایک ہی خانہ تھا۔ لہٰذا سفیر اور کلینرز کو اوپر جانا پڑا اور مجھے اور مونا کو ڈرائیور کے ساتھ جگہ مل گئی۔ میں نے خود اس کے ساتھ بیٹھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مونا دروازے کے ساتھ تھی، جس کا ڈرائیور نے بہت برا منایا تھا اس نے کہا بھی۔ ''اِدھر کا سیٹ نرم ہے۔ خاتون کو اِدھر بھیج دو۔''

''یہ اِدھر ہی ٹھیک ہے۔'' میں نے رکھائی سے کہا اور اس نے جھٹکے سے ٹرک آگے بڑھا دیا۔

''کدھر سے آ رہا ہے تم لوگ؟''

''گئے تھے ذرا ایک کام سے۔'' میں نے کہا۔

''کس کام سے؟'' اس نے بال کی کھال نکالی۔

''ایک دشمن کا کام کرنا تھا۔'' میں نے گردن پر انگلی پھیری۔

''ایک کا......!'' وہ مذاق سمجھا۔

''نہیں، قسمت سے ایک اور دشمن بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کا کام اکٹھے کر دیا۔''

''بی بی بھی گیا تھا؟''

''اسی نے دونوں بندے مارے...... ہم تو بس اخلاقی مدد کر رہے تھے۔''

''تم مذاق اچھا کرتا ہے۔'' وہ ہنسا۔

''نہیں، میں قتل بھی اچھا کرسکتا ہوں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔ ''پر اس دفعہ اس نے ضد کی تھی، اس لئے اسے موقع دیا۔''

اس بار وہ کچھ ڈر گیا۔ اس نے ذرا دیر بعد پوچھا۔ ''کیا واقعی تم لوگوں کی گاڑی سلائیڈنگ میں ضائع ہو گئی۔''

''ہم جھوٹ نہیں بولتے ورنہ اس طرح کون بتاتا ہے کہ وہ دو قتل کر کے آ رہا ہے۔''

''دو نہیں تین۔ تیسرا جو بلاوجہ پستول نکال رہا تھا۔'' مونا نے لقمہ دیا۔

''اوہ...... اسے تو میں بھول گیا تھا۔'' میں نے سر ہلایا اور پھر ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ ''دوست، ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ ہمیں جھوٹا سمجھا جائے۔ میرا خیال ہے تم دل میں ہمیں جھوٹا سمجھ رہے ہو۔''

''نہیں، بالکل نہیں......'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس کی حالت خراب نظر آنے لگی تھی اور وہ بار بار کنکھیوں سے سامنے ڈیش بورڈ کی دیکھ رہا تھا۔ اس میں غالباً رقم تھی یا کوئی اسلحہ...... اس قسم کے ٹرک ڈرائیور عام طور سے اپنے ساتھ ہی دونوں چیزیں لے کر چلا کرتے تھے اور یہ تو سپلائی کا ٹرک تھا، اس کے پاس بھاری رقم کی موجودگی لازمی بات تھی۔

''فکر مت کرو۔ ہم ڈاکو نہیں ہیں...... اور نہ ہی جرائم پیشہ ہیں۔ یہ تو بس کچھ خاندانی دشمنی کا معاملہ ہے جو نمٹانا ہی پڑتا ہے۔ اس علاقے کی روایات سے تو تم واقف ہو؟''

''لہجے سے تو تم اس علاقے کے نہیں لگتے۔'' اس نے مشکوک لہجے میں کہا۔

''اصل میں پڑھ لکھ گئے ہیں، شہر سے تعلیم حاصل کی ہے۔''

مگر اس کا شک کم نہیں ہوا۔ ایک گھنٹے بعد ٹرک ایک چھوٹے سے قصبے میں داخل ہوا۔ اس جگہ موجود ہوٹلوں کے لئے وہ مرغی لے کر آتا تھا۔ ٹرک مین بازار میں رکا۔ مونا اتر گئی اور میں نے اترنے سے پہلے ڈرائیور سے کہا۔ ''جو کہا تھا، اس کا کسی سے ذکر مت کرنا ورنہ ہمارے دشمنوں میں بلاوجہ تمہارا اضافہ ہو جائے گا۔'' میں نے قمیص اوپر کر کے اسے پستول کی جھلک بھی دکھا دی۔ اس کا رنگ اُڑ گیا۔

''نہیں...... میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

سفیر بھی نیچے اتر آیا اور ہماری ہیت کذائی دیکھ کر لوگ جمع ہونے لگے۔ میں نے ایک ذرا معقول نظر آنے والے ہوٹل کا رخ کیا۔ اس کا مالک ہماری طرف لپکا۔ سواگت کے لئے نہیں، بھگانے کے لئے۔ ''کیا اے...... کدر آتا اے...... ایسے!''

''پیچھے ہٹو۔'' میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھکیلا اور غرا کر بولا۔ ''کیا ہم تم کو فقیر نظر آتے ہیں؟''

وہ گڑبڑا گیا۔ ''تو فیر ایسا کیوں لگتا؟''

''حادثہ پیش آیا تھا۔ سب سے پہلے ہمیں منہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی اور صابن دو اور پھر اپنے ہوٹل کی بہترین ڈش...... بہترین برتنوں میں لے آؤ۔''

''اچھا...... اچھا، ابی بندوبست فرماتا اے۔'' اس نے دانت نکالے اور اپنے لڑکے کو مقامی زبان میں گرم

پانی اور صابن لانے کا حکم دیا۔

"جناب نے یہ جو فراخ دلی سے آرڈر فرمایا ہے۔" مونا نے دبی زبان میں کہا۔ "اس کی ادائیگی کہاں سے کی جائے گی؟"

"گلے خان زندہ باد۔ اس کا بٹوا بھی اس کی طرح بھاری بھر کم ہے۔" میں نے بٹوا نکال کر مونا سے زیادہ ہوٹل کے مالک کو ہرے، سرمئی اور لال نوٹوں کی جھلک دکھائی، اس کا خاطر خواہ اثر ہوا کیونکہ اس کے بعد مالک نے ہوٹل میں ہنگامی حالات نافذ کر دیئے تھے۔ ہر شخص بھاگ دوڑ کرنے لگا اور یہ ساری بھاگ دوڑ ہماری خاطر تھی۔ عقب سے مرغیوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں اور سامنے ہوٹل کا باورچی مالک پر چلا رہا تھا۔ کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ آرڈر ایمرجنسی میں صحیح...... پر کھانا اتنی جلدی کیسے بن سکتا تھا۔ مالک کے اصرار پر اس نے گستاخانہ لہجے میں کہا۔

"توم...... خود بنالے۔"

مالک نے کھسیا کر ہمیں دیکھا اور دانت نکالے۔ "اماراوالد...... ذرا پاگل اے۔"

"والد!" میں دم بخود رہ گیا تھا۔ "یہ تمہارا باپ ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "یہ ہوٹل اسی نے بنایا...... ام چلاتا اے۔"

یعنی ناخلف بیٹے نے باپ کو معزول کر کے اسے باورچی کے درجے پر فائز کرتے ہوئے خود ہوٹل کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ "کھانا بے شک ذرا دیر سے ملے لیکن ہو قرینے کا۔"

میں، مونا اور سفیر اس طرف بڑھ گئے جہاں منہ ہاتھ دھونے کا انتظام تھا۔ گرم پانی اور صابن کے ساتھ صاف ستھرا تولیا بھی تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر اور ممکن حد تک خود کو صاف ستھرا کر کے ہم اپنے لئے خاص طور سے بچھائی گئی میز پر آ گئے۔ اس پر صاف سفید کپڑا بچھا تھا۔ ہوٹل کے مالک نے اس وقت ہمارے دل جیت لئے جب بیٹھتے ہی اس نے گرما گرم بھاپ اُڑاتی چائے لا کر دی۔

"جیو......" میں نے خوش ہو کر کہا۔ ایک بات بتاؤ، یہ کون سا علاقہ ہے؟"

اس نے پہلے حیرت اور پھر شک سے مجھے دیکھا۔ "آپ کو نہیں معلوم؟"

"ہم گلگت کے لئے سفر کر رہے تھے، راستہ بھٹک گئے۔"

"یہ کاغان ویلی کا علاقہ ہے۔" اس نے بتایا۔

"اچھا!" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "اس علاقے میں میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں۔ راجا عمر دراز صاحب! بہت دنوں سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"راجا صیب!" وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ آپ راجا صیب کا دوست اے؟"

"ہاں۔" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"ام کو مافی دو۔" وہ گڑگڑایا۔ "ام کو نہیں معلوم تھا۔"

"ہاں...... لیکن تم پریشان مت ہو۔"

"آپ اِدر بیٹھے او...... ام کو راجا صیب گدے پر بٹائے گا" اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ "منہ

کالا فرما کر۔"

"تم جانتے ہو...... راجا صاحب کا محل کس طرف ہے۔"

"دور اے...... پر ام اُدر لے جائے گا۔" اس نے نیازمندی سے سینے پر ہاتھ باندھ کر کہا۔

"یہ تو اچھا ہوا۔" مونا خوش ہوگئی۔ "ورنہ ہم بغیر گاڑی اور سامان کے کہاں جاتے۔"

میں نے ہوٹل کے مالک کو لینڈ سلائیڈنگ کے بارے میں بتایا۔ "ہماری گاڑی اس میں تباہ ہوگئی۔ سامان بھی اسی میں تھا۔"

"فکر مت کرو صیب! ام اسے بھی نکالے گا، آپ جگہ بتاؤ۔"

میرے کان کھڑے ہوگئے۔ معاملہ غلط رخ پر جا رہا تھا۔ جیپ ہماری نہیں تھی۔ اسے نکالنے کی صورت میں ہمارے لئے مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ پھر میں نے راجا عمر دراز کا نام لیا تھا اس لئے ہمارا سراغ بھی آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ "مجھے جگہ نہیں یاد ہے۔" میں نے جان چھڑانے کے لئے کہا۔ "فی الحال کھانا اور اس کے بعد ہمیں راجا صاحب تک پہنچانے کے لئے کسی گاڑی کا بندوبست کرو۔"

مونا نے سر ہلایا۔ "گاڑی کا بندوبست راجا صاحب خود کریں گے۔"

ہم جس طرح بے تکلفی سے تقریباً برابری کی سطح پر راجا صاحب کا ذکر رہے تھے اس سے وہ خاصا مرعوب نظر آ رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سفیر نے دانت پیسے۔

"آپ کو آج کل زیادہ ہی بکواس کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

"صحبت کا اثر لازم ہے۔" میں نے بھی دانت نکالے۔

ہوٹل کے مالک کا باپ چڑچڑا اور غصہ ور سہی لیکن وہ باورچی لاجواب تھا، اس نے کمال کے چکن پیس تلے اور کیا شاندار قسم کے تکے بنائے جو بھیڑ کے گوشت کے تھے، ساتھ میں تنوری نان تھے۔ کھانے کا مزہ آ گیا۔ اس کے بعد اس نے خاص قسم کی سبز چائے پلائی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ جب اس خاطر تواضع کا بل سامنے آیا تو میرے ہوش اُڑ گئے تھے۔ "پندرہ سو روپے! ہم نے ایسا کیا کھایا ہے؟"

"دے دو...... یار، مزے کیے ہیں، پیسے بھی تو لگاؤ۔" سفیر نے آنکھ ماری۔

میں نے بٹوا نکالا تو ہوٹل کے مالک نے بل لیا، پین سے پندرہ سو کی رقم کاٹی اور اسے پانچ سو کر دیا۔ وہ چالاک آدمی اس طرح ہمیں بتا رہا تھا کہ اصل بل تو پندرہ سو روپے بنتا ہے لیکن وہ ہم سے راجا صاحب کا مہمان اور دوست ہونے کی وجہ سے صرف پانچ سو لے رہا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح وہ راجا عمر دراز کی نظروں میں نمبر بناتا اور بل بھی وصول کر لیتا یعنی اصل بل...... میں نے پانچ سو کا نوٹ اس کے سامنے رکھا۔

"یہ رہا بل!"

اس نے دانت نکالے اور نوٹ لے لیا۔ پھر میں نے ہزار کا نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔

"اور یہ تمہاری میزبانی کے صلے میں۔"

اس نے پھر دانت نکالے اور یہ نوٹ بھی وصول کر لیا۔ اس کے بعد وہ بولا۔ "ایک جیپ آپ کو راجا صیب کے پاس لے جائے گا۔"

اس نے ہمارے لئے جس جیپ کا بندوبست کیا تھا اسے دیکھ کر لگتا تھا، وہ ہمیں راجا عمر دراز کے پاس نہیں بلکہ خدا کے پاس لے جانے کے لئے تھی۔ اس کی ظاہری حالت دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ جیپ شاید ٹیکسلا کے کھنڈرات سے برآمد ہوئی تھی۔ اسے ٹیکسلا میوزیم میں ہونا چاہیے تھا۔ ایک دبلا پتلا اور لمبا سا مقامی شخص جیپ کے بونٹ پر بیٹھا سگریٹ کے کش اتنے خشوع وخضوع سے لگا رہا تھا جیسے اس سے زیادہ ضروری کام دنیا میں اور کوئی نہ ہو۔ ''ہم اس جیپ میں جائیں گے؟'' مونا نے مشکوک لہجے میں ہوٹل کے مالک سے پوچھا۔

''ہاں...... جائے گا...... اس کا شکل مت دیکھو...... جیپ بوت اچا اے۔''

''اس میں کوئی شبہ نہیں ہے...... جب یہ فیکٹری سے نکلی تھی، تب اچھی تھی۔'' سفیر نے اس کی تائید کی۔ ''مگر اس پر آدمی صرف پل صراط عبور کرنے کی ہمت کرسکتا ہے۔''

''میں کم سے کم اس جیپ پر نہیں جاسکتی۔'' مونا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

یہ سن کر ہوٹل کا مالک پریشان نظر آنے لگا۔ مجھے یقین تھا، وہ جیپ کے مالک یا ڈرائیور سے پہلے ہی اپنا کمیشن وصول کرچکا تھا۔ اس نے ہمیں قائل کرنے کی سعی شروع کردی۔ ''آپ...... ایک بار دیکو، بیٹو...... جیپ بوت اچا۔''

''اس میں تم بیٹھو۔'' میں نے کہا۔ ''ہمارے لیے انسانوں والی سواری کا بندوبست کرو۔''

لیکن سفیر کچھ سوچ رہا تھا، وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ ''یار...... بحث کرنے کے بجائے...... یہاں سے نکلنے کی کرو۔ اس سے پہلے کہ کوئی نئی مصیبت آئے...... ہمیں راجا کے محل میں ہونا چاہیے۔''

اس کی بات مجھے درست لگی۔ واقعی ہمیں جیپ کے بجائے اپنی ذاتی حالت دیکھنا چاہیے۔ میں نے سر ہلایا۔ ''تو ٹھیک کہہ رہا ہے، ہمیں نکلنے کی کرنی چاہیے۔''

ہم جیپ کے ڈرائیور کے پاس آئے۔ ''کب تک روانگی ہوسکتی ہے؟'' سفیر نے پوچھا۔

''ابی چلو۔'' اس نے سگریٹ کے بچ جانے والے ٹوٹے کو بادل نخواستہ پھینکا۔

''تو بس چلو۔'' میں نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

''کیا......؟'' مونا بولی۔

''بحث کا وقت نہیں ہے، بس چلو۔'' سفیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

جیپ چلنے میں اتنی بری نہیں تھی، سیٹیں بھی ٹھیک تھیں۔ بس ظاہری حالت خراب تھی، میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''ہم کتنی دیر میں پہنچیں گے؟''

''کل صبح تک۔'' اس نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا!'' میں اچھل پڑا تھا۔ ''کل صبح؟''

''ہاں، راستہ خراب اے۔''

''رات کہاں رکیں گے؟''

''ایک گاؤں تک پہنچ جائے گا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''رات اُدر رکے گا۔ فیر کل چلے گا۔''

تن بہ تقدیر ہم بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے جیپ آگے بڑھائی۔ ''اُدر پرسوں سلائڈ ہوا اے۔''

"کیا ہم سڑک سے ہٹ کر گزریں گے؟"

"دو جگہ سے۔" اس نے سر ہلایا۔

"مارے گئے۔" مونا کراہی۔ "شاید راجا کے پاس ہمارے پیس پہنچیں۔"

"سارے...... راستے خراب نہیں ہوتے ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "کچھ اچھے بھی ہوتے ہیں۔"

"ہاں، یہی ایک دوفی صد!" سفیر نے لقمہ دیا۔

"میرا تو تھکن سے برا حال ہے۔" مونا سیٹ پر پھیل کر بولی۔

"بس زیادہ دیر نہیں...... تین چار گھنٹے بعد ہم مذکورہ گاؤں میں ہوں گے اس کے بعد تم لمبی تان کر سو سکتی ہو۔"

"بات جلدی کی نہیں...... رات ہونے والی ہے۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد یہ لوگ سفر نہیں کرتے ہیں، کیوں استاد؟" میں نے ڈرائیور کے شانے پر ہاتھ مارا، اس نے دانت نکالے۔

"ٹھیک فرمایا صیب!"

سردیوں میں دن چھوٹے اور خاص طور سے پہاڑی علاقوں میں بہت ہی چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ شام چار پانچ بجے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ابھی کیونکہ سرما کا آغاز تھا، اکتوبر کا دوسرا ہفتہ چل رہا تھا اس لئے ساڑھے پانچ بجے تک روشنی رہتی تھی۔ ابھی دو بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے، میں نے ڈرائیور سے وقت کے لحاظ سے پوچھا۔ "ہم کتنے بجے تک گاؤں پہنچیں گے؟"

"چھ بجے۔" اس نے جواب دیا۔

واقعی، لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے راستوں کی حالت خراب تھی۔ کئی مقامات پر مٹی کے تودے جمع ہونے سے اصل سڑک بند تھی اس لئے متبادل راستہ تلاش کرنا پڑا تھا اور یہ متبادل راستہ عام طور سے ایسا ہوتا تھا کہ جوڑ جوڑ الگ ہو جاتا تھا، کم سے کم اس وقت لگتا ایسا ہی تھا۔ شام ہو گئی تھی اور ہم ابھی تک پہاڑوں میں رینگ رہے تھے۔ ساڑھے پانچ بجے تقریباً تاریکی چھا چکی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "ابھی کتنی مسافت اور ہے؟"

"یہ تو ام کو نئیں معلوم۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"او بھائی! مزید کتنی دیر لگے گی؟" سفیر نے آسان الفاظ میں پوچھا۔

"ایک گھنٹا اور اے۔"

بہر حال یہ ایک گھنٹا محض ڈیڑھ گھنٹے میں پورا ہو گیا اور ہم سات بجے ایک گاؤں میں داخل ہوئے جہاں لوگ گھروں میں سونے کے لئے جا چکے تھے۔ ڈرائیور نے جیپ ایک باغ میں روکی جس میں اخروٹ اور سیب کے درخت تھے۔ اس نے باغ کے ساتھ ملے ہوئے گھر کا دروازہ بجایا اور اندر غائب ہو گیا۔

"یہ کہاں گیا؟" مونا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ اس کا گھر ہے۔" سفیر نے خیال ظاہر کیا۔ "کوئی کسی کے گھر میں ایسی بے تکلفی سے جا سکتا ہے؟"

ڈرائیور دس منٹ بعد آیا۔ "آؤ صیب!"

مکان لکڑی اور مٹی پتھر کا بنا تھا، اس کی چھت لکڑی کی تھی آدھا مکان زمین کے اندر تھا۔ گھٹا ہوا اور تازہ ہوا سے محروم۔ اس نے ہمیں رہائش کے لئے ایک کمرا دیا۔ اس مکان کو دیکھ کر مجھے سرمد علی کا گھر یاد آ گیا۔ وہ بھی ایسا ہی تنگ و تاریک اور گھٹا ہوا تھا۔ نہ جانے سرمد علی اور اس کے خاندان والے کیسے تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے گاؤں کے اسکول میں پڑھانا چاہتا تھا۔ سفیر اور مونا فرش پر بچھے ہوئے لیکن نرم قالین پر ڈھیر ہو گئے۔ ایک طرف مٹی کے تیل کا لیمپ روشن تھا۔ کچھ دیر میں ڈرائیور مالک گل آیا۔ اس نے ایک چھوٹی سی سینی پر قہوے کی پیالیاں رکھی تھیں۔ ''ابی کانا آتا اے۔'' اس نے اطلاع دی۔

''مالک...... یہ تمہارا مکان ہے۔'' میں نے قہوے کی چسکی لی۔

''اللہ کے فضل سے؟'' اس نے جواب دیا۔ ''اور امارا ابی بی اور بچہ لوگ اے۔''

''ہمیں کمبل بھی چاہئے۔'' مونا نے کہا۔ ''ایسے رات نہیں گزار سکتے ہم۔''

''ام ابی لایا۔'' اس نے مستعدی سے کہا اور چلا گیا۔ ہم مالک کے سامنے محتاط تھے، اس کے سامنے اہم خاص معاملات پر بات نہیں کی تھی۔ اب موقع ملا تھا۔ سفیر اور مونا میرے قریب کھسک آئے۔

''یار شوبی! جب فتح خان اور ڈیوڈ شا آئیں گے تو گلے خان کا کیا ہوا ہو گا؟''

''حالانکہ اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سارا حرامی پن ڈیوڈ شا کے ساتھیوں کا تھا۔'' میں نے کہا۔

''پھر بھی شامت غریب کی آتی ہے۔'' مونا تلخی سے بولی۔

''میرا نہیں خیال کہ گلے خان وہاں رکا ہو گا۔'' سفیر بولا۔ ''اتنی عقل اس کے پاس بھی ہے کہ فرار ہونے میں عافیت ہو گی۔''

''فتح خان کہاں جا رہا تھا؟'' مونا نے اچانک سوال کیا۔

''اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال ہے وہ کہاں سے آ رہا تھا؟'' سفیر نے پوچھا۔

''اس کا جواب بہت آسان ہے، وہ کوٹھی کی طرف سے آ رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور کہاں جا رہا تھا؟'' مونا نے پوچھا تو میں چونک گیا۔

''یہ واقعی اہم سوال ہے...... ممکن ہے وہ اس جگہ جا رہا ہو جہاں برٹ شا کو قید رکھا گیا ہے۔''

''اس کا تعاقب کر کے وہ جگہ معلوم کی جا سکتی ہے۔'' سفیر نے غور کیا۔

''کیوں نہیں۔'' میں نے جوش سے کہا۔ ''اگر ہم نے راجا کو اس بارے میں بتایا تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی قدم اٹھائے گا۔''

''برٹ شا کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ فتح خان کی قید سے نکل کر راجا کی قید میں چلا جائے گا۔'' مونا نے کہا۔

''نہیں، مجھے امید ہے راجا اسے قید نہیں کرے گا، وہ اعلیٰ ظرف انسان ہے۔ وہ برٹ شا کو رہا کرا کے اسے اس کے سفارت خانے کے حوالے کر دے گا۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''یا ممکن ہے، اس سے ہیروں والی جگہ اگلوانے کی کوشش کرے۔ آخر دولت سے کسے دلچسپی نہیں ہوتی؟''

سفیر کی اس بات پر میں نے کہا۔ ''راجا سے مجھے ایسی امید نہیں ہے، اس پر بھی اس نے برٹ شا سے

سلوک کیا تو وہ حق بجانب ہوگا کہ کیونکہ برٹ شا نے اس سے کہیں برا سلوک کیا تھا۔ اس کی چیزیں بھی چرانے کی کوشش کی تھی اور اسے چور بھی قرار دیا تھا۔

اس پر بات اس پُر اسرار تصویر کی طرف مڑ گئی جو فی الحال ڈیوڈ شا کے قبضے میں تھی۔ مونا نے پُر اسرار سے انداز میں ہی پوچھا۔ ''کیا یہ تصویر واقعی کسی انجانی سرزمین سے متعلق ہے۔ جہاں پُر اسرار اشیاء اور جانور پائے جاتے ہیں؟''

''مجھے راجا نے یہی بتایا تھا اور میں اس کی بات پر یقین کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ اسے اس بارے میں مجھ سے غلط بیانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے یہ چالاک گورا خاندان جس طرح اس تصویر کے پیچھے پڑا رہا ہے، اس سے بھی لگتا ہے، بات میں کسی نہ کسی درجے کی صداقت ہے لیکن محض ایک تصویر کی بنیاد پر میں پُر اسرار اشیاء اور جانوروں کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ جبکہ راجا عمر دراز نے بھی ان کا سرسری ساذکر کیا تھا۔''

''وہ جو تمہیں اپنے سفر کی رُوداد سنا رہا تھا؟'' مونا نے یاد کیا۔

''ہاں، لیکن ابھی اس کی پہلی قسط ہی سنائی ہے اور باقی آئندہ...... اس کے بعد مجھے راجا عمر دراز سے ملاقات کا موقع ہی نہیں ملا۔''

''اب ہم اس کے پاس جارہے ہیں۔ اس سے پوری کہانی سنیں گے۔'' مونا بولی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے بے زاری سے کہا۔ ''اس کہانی کا ہمارے ساتھ براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''ہو سکتا ہے، ہو ہی جائے۔'' سفیر قالین پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب......؟''

''سوچ......! ڈیوڈ شا کو ہم سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے...... وہ ہمارے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے؟''

''شاید میرے ہاتھ کی وجہ سے۔'' میں نے غور کیا۔ ''وہ اس کا تجزیہ کرانا چاہتا تھا۔''

''اس کام کے لئے تم نے کافی تھے...... ہمیں کیوں اغوا کرایا؟'' اس بار مونا نے پوچھا۔

''تم دونوں کو یرغمال کے طور پر رکھنا تھا۔'' میں نے وضاحت پیش کی۔

''نہیں، یار! یہ بات دل کو نہیں لگتی...... اگر اسے پتھر چاہئے تو اس کے لئے اور بھی طریقے ہیں، ہمیں اغوا کر کے ہم سے یہ کام لینا خاصا مشکل طریقہ کار نہیں ہے؟''

''ہاں، یہ تو ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے والی بات ہے۔'' میں نے غور کیا۔ ''دوسرے طریقے سے یہ کام زیادہ آسانی سے اور خاموشی سے کیا جا سکتا تھا۔''

''ممکن ہے اس نے دوسرا طریقہ آزما لیا ہوں'' مونا بولی۔ ''اس میں ناکامی کے بعد اس نے ہمیں پکڑا ہو۔''

''سب ممکن ہے۔'' میں بھی دراز ہو گیا۔ اس سفر نے جوڑوں کا حشر کر دیا تھا۔

کچھ دیر بعد مالک گل کمبل لے آیا پھر اس نے تسلہ لا کر ہمارے ہاتھ دھلائے۔ آخر میں کھانا آیا جو ساگ سبزی، باجرے کی روٹی اور مکھن پر مشتمل تھا۔ سبزی گلی ہونے کے باوجود لذیذ ثابت ہوا۔ کھانا کھا کر ہم

سب اپنی اپنی جگہوں پر دراز ہو گئے۔ اس کے بعد آنکھ کھلی تو صبح نمودار ہو چکی تھی، کم سے کم مکان کے اندر آتی زنانہ آوازوں سے یہی لگ رہا تھا۔ مونا غائب تھی۔ دوسری خاتون یا خواتین یقیناً مالک گل کے خاندان کی عورتیں تھیں۔ جیسے ہی میں اٹھا، مالک گل جن کی طرح نمودار ہوا، اسے نہ جانے کیسے ہماری بیداری کی اطلاع ملی تھی۔

''چلو صیب!'' اس نے چھوٹی انگلی سے اشارہ کیا۔ ''ابی جانا بی اے۔''

مالک گل کی رہنمائی میں ہم حوائج ضروریہ سے فارغ ہوئے۔ یہ مرحلہ خاصی دقت سے سر ہوا گو کہ مکانات ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے مگر ہم اس ماحول کے عادی نہیں تھے، بہر حال ہم نے فرض کر لیا کہ پردہ آنکھ کا ہوتا ہے اور آنکھ ہر شخص کی ذاتی ذمے داری ہے۔ ناشتے میں مکئی کی موٹی سی روٹی تھی جس پر مکھن کا ڈلا پگھل رہا تھا، اس کے بعد حسبِ معمول قہوہ، ان علاقوں میں چائے کا رواج نہیں تھا۔ ناشتے کے فوراً بعد ہم روانگی کے لئے تیار ہوئے۔ مالک گل جیپ کا تیل پانی چیک کر رہا تھا۔ مونا اندر عورتوں میں تھی، وہ سب سے آخر میں ہنستی ہوئی برآمد ہوئی۔ ''بائی گاڈ! کتنی مزے کی ہیں، یہاں کی عورتیں۔'' اس نے ہمیں آگاہ فرمایا۔

''عورتیں......!'' میں نے انگریزی میں غور کیا اور بھول گیا کہ شمالی علاقے میں سیاحوں کے ساتھ کام کرنے والے اردو زبان سے واقف ہوں نہ ہوں، انگریزی ضرور جانتے ہیں۔ ''مالک گل کی کتنی بیویاں ہیں؟''

''دو صاحب!'' مالک گل نے انگریزی میں کہا تو میں شپٹا گیا تھا۔

''معاف کرنا یار! میں تمہارے گھر پر بات کر رہا ہوں۔''

وہ مسکرایا۔ ''آپ صیب اے......اچھا آدمی اے......آپ بات کر سکتا اے۔''

''میں تو صبح سویرے اٹھ گئی تھی۔'' مونا جلدی سے جیپ میں گھستے ہوئے بولی۔ اس نے اندر سے شیشہ بند کر لیا تھا۔ اگرچہ سورج پوری آب و تاب سے روشن تھا لیکن ہوا یخ تھی اور ہم گرم کپڑوں میں بھی ٹھٹھر رہے تھے۔ میں نے مالک سے پوچھا۔

''مالک! ابھی کتنا سفر باقی ہے؟''

''تین گھنٹے کا صیب!'' اس نے جواب دیا اور جیپ کا کھلا بونٹ بند کر دیا پھر اس کے انجن تلے رکھا ہوا آئل اسٹوو نکالا جو رات بھر کے جمے ہوئے اور سرد انجن کو گرم کر رہا تھا۔ اس کے بعد چند بار سیلف گھمانے سے انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ اسے چلتا چھوڑ کر وہ اسٹوو مکان میں رکھنے گیا۔ کچھ دیر بعد ہم مالک گل کے گاؤں سے سڑک کی طرف جا رہے تھے۔ جھٹکوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو سڑک آنے تک جاری رہا تھا۔ خدا خدا کر کے سڑک آئی۔

''کیا راجا عمر دراز اپنے محل میں ہوگا؟'' مونا نے فکرمندی سے پوچھا۔

''وہ نہ بھی ہوا تو اس کے سارے ملازمین مجھے جانتے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

جیپ دو جگہ اور راستے سے اتری۔ ایک جگہ سڑک بہا لے جانے والی آبشار کے راستے پر ہم پتھر جما کر گزرے اور ایک جگہ لینڈ سلائڈنگ سے بال بال بچے۔ ہم گزر رہے تھے کہ اوپر سے مٹی اور پتھر برس پڑے تھے۔

''مالک گل! تم لوگوں نے درختوں کا صفایا کر کے اپنے ماحول کو بگاڑ دیا ہے۔'' سفیر نے اس سے کہا۔

''اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ام نے خراب نہیں کیا اے پر......درخت تو شہر کا لوگ لے جاتا اے......ام

تھوڑا لکڑی کاٹتا...... وہ سارا جنگل لے جاتا۔"

"یہ درست کہہ رہا ہے۔" میں نے تائید کی۔ "اس علاقے میں فطرت کی تباہی میں مقامی لوگ بھی شامل ہیں لیکن اصل تباہی باہر کے لوگ لاتے ہیں۔"

"بار کا آدمی...... درخت کاٹتا اے...... بار سے سامان لاتا...... کچرا اور ڈالتا اے...... اور چلا جاتا اے۔"

وہ درست کہہ رہا تھا، بغیر کسی پلاننگ کے سیاحت سے اس علاقے کے فطری ماحول کو بہت نقصان ہو رہا تھا۔ میدانی علاقوں سے جب لوگ آتے تو سامان لاتے اور اسے استعمال کر کے کچرا اس جگہ پھینک جاتے تھے۔ ہمارے لوگوں کے مقابلے میں بیرون ملک سے جو سیاح اور مہماتی ٹیمیں آتی ہیں، وہ ماحول کی صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اپنے ساتھ جو بھی لاتی ہیں، اسے پیک کر کے واپس بھی لے جاتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ میں نے دیکھا ہے یہ لوگ حتی الامکان دوسروں کا پھیلایا ہوا کچرا بھی صاف کرتے ہیں۔ مغربی سیاحوں کی ایک ٹیم خاص طور سے اس لئے آئی تھی کہ کے ٹو اور اس کے آس پاس کی چوٹیوں کے گرد جو کچرا جمع ہو گیا ہے، اسے جمع کر کے واپس میدانی علاقے میں لے جایا جائے۔ افسوس کہ ان غیر ملکیوں کو دیکھ کر بھی ہمارے لوگ سبق سیکھنے کو تیار نہیں ہیں۔

مالک گل کی جیپ بظاہر کھٹارا تھی لیکن چلنے میں بہترین تھی۔ اس نے سوائے راستے کے دھکوں کے ہمیں اور کوئی تکلیف نہیں دی تھیں ہم نو بجے روانہ ہوئے تھے۔ مالک گل نے بارہ بجے تک پہنچنے کی نوید سنائی تھی لیکن ہم اندازے سے صرف ڈیڑھ گھنٹا لیٹ، راجا عمر دراز کے محل کو جانے والے پہاڑی راستے کے نیچے تھے۔ راستے میں سرمد علی کا گاؤں آیا تھا جو اب بھی ویسا ہی سکڑا سمٹا اور خوابیدہ تھا۔ جس میں زندگی کی واحد علامت یعنی بچے بھی نظر نہیں آتے تھے۔ بعد میں پتا چلا، بچے اسکول میں تھے۔ بالآخر راجا عمر دراز اپنے علاقے میں دو عدد اسکول کھولنے میں کامیاب رہا تھا۔ ایک لڑکیوں کے لئے جو ابھی پرائمری تک تھا جبکہ لڑکوں کے لئے موجود اسکول مڈل تک جا پہنچا تھا۔

مالک گل کو ہم نے نیچے سے رخصت کر دیا۔ کرائے کے اوپر مزید پانچ سو لے کر وہ بے حد خوشی خوشی رخصت ہوا تھا۔ سامان ہمارے پاس کچھ تھا نہیں، اس لئے بے فکری سے اوپر چل پڑے ابھی آدھے راستے میں تھے کہ اوپر سے دو ملازم آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے راجا کے محل کے ملازموں کی مخصوص وردی پہن رکھی تھی۔ یہ سرخ رنگ کے انگلش کوٹ اور سفید پتلون پر مشتمل تھی۔ ایسا لباس عام طور سے قیام پاکستان سے قبل معزز گورے پہنا کرتے تھے۔ گویا راجا نے ان سے انتقام لیا تھا۔ انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شہید کرنے کے بعد ان کا درباری لباس ملازموں کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ افسوس آج بھی کالے انگریز اپنے ملازموں کو یہی لباس پہناتے ہیں۔ راجا عمر دراز اپنے ملازموں کو انگریزوں کا لباس پہنا کر ان سے بدلہ لے رہا تھا۔

"آپ کون ہیں اور کس سے ملنے آئے ہیں۔" ان میں سے ایک نے صاف ستھری اردو میں دریافت کیا۔ "آپ محل جانے والے راستے پر ہیں۔"

"ہم محل میں جا رہے ہیں، راجا عمر دراز سے ملنے۔ کیا وہ محل میں تشریف رکھتے ہیں؟"

"جناب کا اسمِ گرامی؟" ملازم اچانک مؤدب اور محتاط ہو گیا تھا۔ راجا کا ذکر اتنی بے تکلفی سے کرنے

والے عام افراد نہیں ہو سکتے تھے۔

''شہباز ملک اور یہ میرے ساتھی ہیں......ہم راجا سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔''

''آئیں جناب!'' اس نے بغیر کوئی مزید سوال کئے ہماری رہنمائی کی۔ محل کی چار دیواری کسی قدر بلند ہو گئی تھی، البتہ اس کا گیٹ اور اس کے دائیں بائیں لگے شیروں کے مجسمے ویسے ہی تھے۔ ذیلی دروازہ کھلا اور ہم رنگ و بو کی ایک دنیا میں داخل ہوئے تھے۔ ایسی بھانت بھانت کی خوشبوئیں تھیں کہ انسان چکرا کر رہ جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ گزشتہ سالوں میں پھولوں کی تعداد اور اقسام میں اضافہ ہوا تھا۔

''میرے خدا!'' مونا نے گہری سانس لی۔ ''اتنی طرح کی خوشبوئیں؟''

''ان میں سے بیشتر پھول تم نے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔ ''حیرت انگیز طور پر بعض پھول دار پودے صرف دیوسائی کے میدان پر پائے جاتے ہیں لیکن راجا نے کسی ترکیب سے انہیں یہاں سات ہزار فٹ کی بلندی پر اُگا لیا ہے۔''

پختہ روشوں سے گزرتے ہوئے ہم محل کی عمارت تک پہنچے۔ شاید اس پر اسی سال ہلکا گلابی رنگ کیا گیا تھا کیونکہ رنگ بے حد تازہ لگ رہا تھا۔ راجا عمر دراز حسبِ معمول سامنے والے ٹیرس پر دھوپ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے محل کے معاملات نمٹا رہا تھا۔ یہ ٹیرس اس انداز میں بنایا گیا تھا کہ طلوعِ آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک اس کی روشنی ٹیرس پر رہتی تھی، بشرطیکہ آسمان پر بادل نہ ہوں۔ راجا کا سیکرٹری بیگ اس کے پاس کھڑا اسے بعض کاغذات ملاحظہ کرتے دیکھ رہا تھا۔ پہلے اس کی نظر ہم پر پڑی۔ وہ چونکا اور اس نے جلدی سے جھک کر راجا کے کان میں سرگوشی کی۔ راجا نے بے حد نارمل انداز میں ہماری طرف دیکھا اور کچھ کہا۔ بیگ اتر کر ہماری طرف آیا۔ اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''اخاہ......! شہباز صاحب، کیا حال ہیں؟''

''تمہارے سامنے ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا راجا صاحب اس وقت مصروف ہیں؟''

''جی ہاں، آیئے میرے ساتھ۔''

وہ ہمیں راجا کے پاس لے جانے کے بجائے محل کے بائیں طرف واقع مہمان خانے میں لایا۔ ''میرا خیال ہے......راجا صاحب کو ہمارا آنا پسند نہیں آیا ہے۔'' میں نے دانت پر دانت جما کر کہا۔

مونا اور سفیر بھی اس استقبال سے کسی قدر مشتعل تھے۔ ''اگر راجا کو ہمارا آنا ناگوار گزرا ہے تو ہمیں بھی ایسی مار نہیں پڑی ہے۔'' مونا غصے سے بولی۔

''بی بی! راجا صاحب کا احترام ملحوظِ خاطر رکھیں۔'' بیگ نے تنبیہ کی۔ ''اور ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بعض وجوہات کی بنا پر راجا صاحب آپ سے نہیں مل سکتے......لیکن آپ تازہ دم ہو جائیں اور کچھ کھا پی لیں، اس کے بعد راجا صاحب سے بھی ملاقات ہوگی۔''

''راجا صاحب کے انداز سے تو نہیں لگ رہا کہ وہ ہم سے ملاقات ضروری سمجھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ لوگ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔'' اس نے سمجھایا۔ ''میں نے کہا ناں......بعض وجوہات کی بنا پر راجا صاحب سب کے سامنے آپ سے ملاقات نہیں کرنا چاہتے۔''

میں نے غور کیا۔ ''تمہارا مطلب ہے، چبوترے پر جو لوگ راجا صاحب کے سامنے تھے، ان میں بیرون

محل کے لوگ بھی شامل ہیں؟"

"شکر ہے۔" بیگ نے گہری سانس لی۔" آپ میری بات تو سمجھے۔"

"ٹھیک ہے...... اس معاملے کو بعد میں دیکھیں گے، فی الحال تو ہمارے لئے کپڑوں کا بندوبست کرو۔"

بیگ نے ہمیں مہمان خانے کے ملازموں کے حوالے کیا۔ مونا کے لئے خاص طور سے ایک ملازمہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اگلے دو گھنٹوں میں ہم نہانے دھونے اور لباس کی تبدیلی سے لے کر طعام تک کے مراحل سے گزر چکے تھے۔ میرے لئے ایک شاندار قسم کا شلوار سوٹ تھا اور سفیر کو ایک کرتہ پاجامہ پورا آیا تھا البتہ مونا کو مقامی طرز کے لباس پر اکتفا کرنا پڑا تھا۔ اس کی ہیت کذائی دیکھ کر سفیر نے بلند آواز سے قہقہہ رسید کیا تھا۔ کڑھی ہوئی پھولدار قمیص اتنی لمبی تھی کہ ٹخنوں سے ذرا ہی اوپر تھی۔ پہلے مونا جھینپی پھر غصے میں آ گئیں "اپنے بارے میں کیا خیال ہے، پچھلی صدی کے لکھنوی نمونے!"

"میرا خیال ہے یہ راجا عمر دراز کا کوئی لباس ہے جو اس نے اس زمانے میں سلوایا تھا۔" میں نے بھی سفیر پر غور کیا۔

"میں نے ایک وارڈ روب سے خود نکالا ہے۔" سفیر نے اعلان کیا۔" ویسے اس میں ہر طرح کے لباس تھے مگر مجھے یہی پسند آیا۔"

سفیر نے کرتے پر صدری لے رکھی تھی۔ اس موسم میں اس کے بغیر گزارہ نہیں تھا۔ کھانا حسبِ روایت پُرتکلف تھا جو ہم نے چھوٹے طعام خانے میں کھایا۔ یہ مہمان خانے سے ملا ہوا تھا اور میرے لئے نیا تھا۔ اس سے فارغ ہوتے ہوئے شام کے چار بج گئے تھے۔ مجھے تعجب تھا کہ راجا نے ہم سے ملنے کے لئے کوئی بے تابی نہیں دکھائی اس وقت باہر کے لوگ آئے ہوئے تھے مگر انہیں گئے ہوئے بھی خاصی دیر ہو چکی تھی۔ مونا اور سفیر اس معاملے سے بے نیاز تھے۔ کھانے کے بعد وہ دونوں سٹرگشت کے لئے محل کے باغ کی طرف چلے گئے اور میں بستر پر دراز ہو گیا۔ نہا دھو کر اور کھا پی کر تھکن اتر گئی تھی۔ اب اکتاہٹ تھی۔ میں سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔" آ جاؤ" میں نے بلند آواز میں کہا۔ بیگ اندر آیا تھا، میں بستر پر بیٹھ گیا تھا۔

"آپ کو راجا صاحب نے یاد کیا ہے۔" اس نے کسی قدر شرمندگی سے کہا۔" شاید آپ آرام کر رہے تھے، میں مخل ہوا۔"

"اب تو ہو ہی گئے ہو۔" میں نے سرد آہ بھری۔

راجا عمر دراز اپنے خاص کمرے میں خاص انداز میں موجود تھا۔ یعنی شمال کی طرف والی کھڑکی کھلی تھی اور آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی۔ راجا نے مجھ سے ہاتھ ملایا لیکن اس کا رویہ گرم جوشی سے بالکل عاری تھا۔ مجھے پھر احساس ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ راجا سے ملے مجھے خاصا عرصہ گزر گیا تھا اور وہ شاید اس چکر سے بے ار ہو چکا تھا۔

"خیریت تو ہے راجا صاحب! آپ کچھ فکر مند نظر آ رہے ہیں؟" میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"ہاں، خیریت ہے۔" اس نے روکھے انداز میں کہا۔

"اور شاید آپ ہمارے سے آنے سے خوش بھی نہیں ہیں؟"

میری اس دوٹوک بات نے اسے چونکا دیا۔ ''تم نے ایسا کیوں محسوس کیا برخوردار!''

''آپ جو محسوس کرا رہے ہیں، میں وہی محسوس کروں گا۔'' میں نے بھی رکھائی سے کہا۔ ''ویسے آپ کو ہمارا آنا ناگوار گزرا ہے تو آپ صاف بتادیں۔''

''یہ بات نہیں ہے برخوردار! دراصل گزشتہ کچھ عرصے سے حالات عجیب سے چل رہے ہیں۔''

''ہاں اور مجھے ان عجیب حالات کا براہ راست تجربہ بھی ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ جانتے ہیں ڈیوڈ شا آپ کے علاقے میں ہے؟''

راجا عمر دراز عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''تو تمہیں یہ بات معلوم ہے؟''

''معلوم۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''جناب! ہم اس کی قید سے فرار ہو کر آ رہے ہیں۔''

''حیرت ہے، اس نے مونا اور سفیر کو کیسے آنے دیا؟'' راجا عمر دراز بولا تو مجھے پھر گڑبڑ کا احساس ہوا۔ میں نے گہری سانس لی۔

''راجا صاحب! بہتر ہوگا آپ کھل کر بات کریں۔''

''ٹھیک ہے..... بیگ اسے ریکارڈنگ سناؤ۔'' راجا عمر دراز نے اپنے سیکرٹری کو حکم دیا اور اس نے اپنے لبادے سے ایک ننھا سا ریکارڈر نکال کر اس کا پلے کا بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی کمرے میں میری اور ڈیوڈ شا کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ یہ وہی گفتگو تھی جو ڈیوڈ شا مجھ سے اس مخصوص پتھر کے بارے میں کر رہا تھا جو حکیم قادس اپنی معجزہ صفت دوائیوں میں استعمال کرتا تھا۔ دس منٹ کے اس ریکارڈ میں جو گفتگو تھی اس کے مطابق میں نہ صرف مونا اور سفیر کو بچانے کے لئے بلکہ مرشد علی سے جان چھڑانے اور ایک لاکھ برطانوی پاؤنڈز اسٹرلنگ کے بدلے میں ڈیوڈ شا کو وہ پتھر لے جا کر دینے پر آمادہ تھا۔ ظاہر ہے یہ جعلسازی تھی کیونکہ مجھ سے ہونے والی گفتگو میں ڈیوڈ شا نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی، یہ اضافہ اس نے بعد میں کیا تھا، اسے ایڈٹ کرتے ہوئے۔ میں اور راجا دونوں خاموشی سے سنتے رہے تھے حتیٰ کہ ریکارڈر چپ ہو گیا۔ راجا عمر دراز نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''کیا کہتے ہو برخوردار، اس کے بارے میں؟''

میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟''

''مجھے یہ ریکارڈنگ آج صبح ملی ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ان لوگوں کی ٹائمنگ پرفیکٹ ہے۔ غالباً انہیں یقین تھا، میں آپ کے پاس آؤں گا۔''

اس نے چبھتی نظروں سے دیکھا۔ ''شاید تم کہنا چاہ رہے ہو کہ یہ ریکارڈنگ غلط ہے؟''

''سوال یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے، میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں کہ یہ غلط ہے اور آپ کس طرح یقین کریں گے؟''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''میں بچہ نہیں ہوں، شبہات مجھے بھی ہیں۔''

''کہ میں معاہدے کے مطابق وہ پتھر لینے آیا ہوں۔''

''نہیں..... کیا یہ ریکارڈنگ جعلی ہے؟''

''معاف کیجئے گا راجا صاحب! آپ کا طرزِ عمل آپ کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔''

''اس قسم کے حالات میں ایسا طرزِ عمل لازمی ہے۔'' اس بار سیکرٹری بیگ بولا تھا۔

''پھر بھی میں اس قسم کے حالات کا عادی نہیں ہوں۔ اگر راجا صاحب مجھ پر شک کر رہے ہیں تو میرا یہاں سے رخصت ہو جانا بہتر ہے۔''

''میں تم پر شک نہیں کر رہا ہوں۔'' اس بار راجا نے نرمی سے کہا تھا۔

''تب بھی میرا یہاں سے چلے جانا بہتر ہوگا۔''

''تم کہیں نہیں جاؤ گے۔'' راجا نے مجھے ڈانٹا۔ اس کے لہجے میں شفقت بھی آ گئی۔ ''تم اتنے خود مختار کب سے ہو گئے ہو؟''

''راجا صاحب میں نے ہمیشہ آپ کی عزت کی ہے اس لئے نہیں کہ آپ دولت مند یا بااثر شخص ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ مجھ جیسے عام سے شخص کے ساتھ آپ نے شفقت اور ہمدردی کا برتاؤ کیا ہے، آپ بڑے انسان ہیں...... لیکن بہرحال انسان ہیں، جو بدگمان بھی ہو جاتا ہے۔''

''مجھے ڈیوڈ شا سے پہلے بھی خیر کی توقع نہیں تھی اور تمہاری بات سن کر مجھے بالکل یقین ہو گیا ہے۔''

راجا عمر دراز بولتے بولتے رکا اس نے بیگ کی طرف دیکھا۔ راجا کا نصف صدی کا راز داں اس کی آنکھ کا اشارہ سمجھ کر وہ خاموشی سے کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد راجا نے بات جاری رکھی تھی۔ ''تم نے درست کہا، میں عام انسان بھی ہوں، بدگمان بھی ہو جاتا ہوں لیکن تمہارے ساتھ اس طرزِ عمل کی ایک خاص وجہ اور بھی ہے۔ مجھے شبہ ہے محل میں ڈیوڈ شا کا کوئی جاسوس موجود ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں چونکا۔

''یہ ریکارڈر صبح ناشتے کی میز پر پایا گیا تھا۔''

''اور آپ کو اب بھی شبہ ہے؟'' میں حیران رہ گیا تھا۔

''ممکن ہے...... یہ کام کسی نے لالچ میں کر دیا ہو۔'' راجا نے کہا۔ ''صبح کے وقت تقریباً ایک درجن ملازمین کاموں کے لئے محل میں داخل ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی یہ کام کر سکتا ہے۔''

''ممکن ہے، صبح کے وقت ریکارڈر رکھنے کی وجہ یہی ہو کہ آپ کا شبہ ان جز وقتی ملازمین کی طرف جائے۔''

''سب کچھ ممکن ہے۔ عام طور سے عارضی ملازمین کو تلاشی کے بعد اندر آنے دیا جاتا ہے لیکن آج صبح بارش کی وجہ سے ملازمین کی سرسری تلاشی لی گئی تھی اس لئے عین ممکن ہے کوئی چھپا کر اندر لانے میں کامیاب ہو گیا ہو۔''

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''یعنی اب آپ کو مجھ پر شبہ نہیں ہے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم پر شبہ کرنے کا مطلب ہے میں انسانوں کو شناخت کرنے کی صلاحیت کھو چکا ہوں۔''

''آپ کو معلوم ہے کہ حکیم قادس زندہ ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ "یہ اندازہ مجھے ریکارڈر سنتے ہی ہو گیا تھا۔"

"ڈیوڈ شا میرے نہیں بلکہ حکیم قادس کے چکر میں تھا۔ اس نے اسے اغوا کرنے کے لئے یہ سارا چکر شروع کیا تھا۔ راجا صاحب آپ کو ماننا پڑے گا، ڈیوڈ شا اس پُر اسرار وادی اور اس کے عجائبات کے چکر میں ہے۔"

"ہاں، یہ بات ماننا پڑے گی۔" اس نے گہری سانس لی۔ "لیکن وہ ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔" وہ مسکرایا۔ "وہ احمق گورا بھی اسے نہیں سمجھ سکتا۔ وہ اسے اپنے انداز میں لے رہا ہے۔"

"کس انداز میں؟"

"مادی انداز میں...... یہ چیزیں مادی فائدہ حاصل کرنے کے لئے نہیں ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، وہ ان چیزوں کو روحانی لحاظ سے لے گا۔ نہیں جناب، وہ اسے کھوجنے اور جاننے کے بعد اپنے مفاد میں استعمال کرے گا۔ اس کا رویہ مغربی کلچر کے عین مطابق ہے۔ آپ اسے الزام نہیں دے سکتے۔ ہاں، آپ اسے روک سکتے ہیں لیکن کیسے...... یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔"

"میرا خیال ہے مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں راجا صاحب! کیا اس سے اس کی حوصلہ افزائی نہیں ہو گی۔ ڈیوڈ شا آپ کے خلاف مسلسل سرگرمِ عمل ہے۔ اس نے آپ کی تصویر حاصل کی، اس نے حکیم قادس کو اغوا کیا اور اب بھی وہ آپ کے محل اور اس کے پُر اسرار خزانوں میں نقب لگانے کی فکر میں ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں، اس کی وجہ ہے۔" وہ مسکرایا۔ "میں نے سب کچھ یہاں سے ہٹا دیا ہے۔ اب یہاں کچھ نہیں ہے اس لئے کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ رہا حکیم قادس تو وہ اس کے لئے بے کار ہے۔ وہ اپنی دواؤں میں جو اجزا استعمال کرتا ہے، وہ میرے پاس ہیں اور صرف مجھے معلوم ہیں کہ کہاں سے ملتے ہیں۔"

"اس پُر اسرار وادی سے۔" میں نے بچوں کی طرح سوال کیا۔

"وہ مسکرایا۔ "ڈیوڈ شا احمق ہے۔"

"ایسا مت کہئے جناب! ڈیوڈ شا ولیم شا کے خاندان سے متعلق ہے۔ جس طرح آپ نے اس جگہ کا سفر کیا تھا۔ اس نے بھی کیا تھا۔ کیا ڈیوڈ شا ان نشانات کے سہارے اس وادی تک نہیں جا سکتا ہے۔"

"اگر جا سکتا تو اب تک یہاں جھک نہ مار رہا ہوتا۔ گورے وقت ضائع نہیں کرتے اور تم اس معاملے میں زیادہ فکر مت کرو۔ ابھی کچھ دن تم میرے "عتاب" میں رہو گے، بظاہر تم پر باہر جانے کی پابندی بھی ہو گی لیکن صرف نمائشی...... اگر میرے محل میں ڈیوڈ شا کا کوئی جاسوس ہے تو وہ اس تک یہ اطلاع پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ میرے تمام آدمی زیرِ نگرانی ہوں گے۔"

اس کے بعد گفتگو کا رخ مجھے پیش آنے والے واقعات کی طرف مڑ گیا تھا۔ اگر چہ درمیان میں راجا

عمر دراز کو میرے بارے میں بارے میں اطلاعات ملتی رہی تھیں لیکن اسے زیادہ علم نہیں تھا۔ میں نے واقعات کا خلاصہ کر کے سنایا تھا، اس کے باوجود خاصی دیر لگ گئی۔ جب میں نے بات مکمل کی تو اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''کھانے کا وقت ہوگیا ہے، اب تم اپنے کمرے میں جاؤ اور ان دونوں کو بھی بتا دینا۔''

''ایک سوال اور ہے...... کیا آپ ڈیوڈ شا کے خلاف کارروائی نہیں کریں گے؟ جبکہ اس کا ایک ٹھکانا بھی آپ کے علم میں آ گیا ہے؟''

''نہیں، کیونکہ وہ یہاں سرکاری سرپرستی میں آیا ہے، اس لئے اس سے چھیڑ چھاڑ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ البتہ میرے آدمی اب اس کی نگرانی ضرور کریں گے۔''

''راجا صاحب، اس کے خلاف حکیم قادس کے اغوا کی رپورٹ......''

''ہرگز نہیں۔ اس صورت میں وہ اسے مار بھی سکتا ہے اور میں ہرگز ایسا نہیں چاہوں گا۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''وہ زیادہ دیر اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکے گا۔''

''اور میرے خیال میں وہ اسے اپنے پاس رکھنے کے لئے مرا جا رہا ہے، صرف حکیم کو نکال لے جانے کے لئے اس نے دو خوفناک کتوں کو مارا تھا۔''

''میں نے کہا ناں...... وہ احمق ہے۔'' راجا ناگواری سے بولا۔ ''تصویر اور حکیم کو حاصل کر کے وہ سمجھ رہا ہے اس نے خاص کارنامہ انجام دیا ہے۔''

اچانک مجھے برٹ شا کا خیال آیا، میں نے اس کے بارے میں اسے بتایا ہی نہیں تھا۔ ''راجا صاحب! ایک بات اور...... کیا آپ کے علم میں ہے کہ برٹ شا زندہ ہے؟''

''نہیں۔'' وہ حیران رہ گیا۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''وہ ایسے کہ میں خود اس سے مل چکا ہوں۔ وہ فتح خان کی قید میں ہے اور چالاک فتح خان نے ڈیوڈ شا کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔''

راجا عمر دراز ابھی تک حیران تھا۔ ''گیارہ سال سے فتح خان نے اسے قید کر رکھا ہے، کیوں......؟''

''آپ بھول رہے ہیں۔ برٹ شا کے پاس قیمتی ہیرے تھے۔ بین الاقوامی مارکیٹ میں ان کی قیمت آج کل کروڑوں ڈالرز میں ہے۔ جب آپ کے محل سے فرار کے بعد فتح خان نے مجھے پکڑ لیا تھا تو برٹ شا اور اس کی بیٹی ایمن بھی اس کے پاس تھے۔ فتح خان کو اتفاق سے ہیروں کا علم ہوگیا۔''

''اور وہ برٹ شا کے پیچھے پڑ گیا۔'' راجا عمر دراز نے زہر خند سے کہا۔ ''کیا برٹ شا کو علم نہیں تھا، فتح خان مجھ سے غداری کر کے اس سے ملا تھا اور ایسا شخص کسی کا وفادار نہیں ہو سکتا ہے۔''

''خاصی کش مکش کے بعد میں ایمن کو بچانے میں کامیاب رہا تھا لیکن برٹ شا غائب ہوگیا۔ ابھی تین دن پہلے تک میرا یہی خیال تھا کہ برٹ شا مارا گیا ہے۔ اس کی بیٹی کو بھی اپنے باپ کے مارے جانے کا بڑی حد تک یقین تھا۔ پھر بھی وہ اپنی تسلی کے لئے برطانیہ کی وزارت خارجہ کے توسط سے کیس ری اوپن کرا رہی ہے۔''

''ایمن شاہ...... میں نے دیکھا ہے اسے، بہت پیاری لڑکی ہے۔''

''پچھلے دنوں میری اس سے بات ہوئی تھی اور وہ پاکستان آنے والی تھی۔''

''وہ آچکی ہے۔'' راجا عمر دراز نے تصیح کی۔ ''گزشتہ رات وہ میریٹ ہوٹل اسلام آباد میں تھی۔''

''آپ کی انٹیلی جنس بھرپور طریقے سے کام کر رہی ہے۔''

''کام ہی نہیں...... میرے آدمی اس کی حفاظت بھی کر رہے ہیں۔ اسے کوئی خطرہ ہوا تو وہ حرکت میں آنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کریں گے۔''

''وسیم اور اس کی بہن کا پتا چلا؟''

''نہیں، میرے آدمی اسے بھی تلاش کر رہے ہیں۔'' راجا عمر دراز سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ''مجھے بھی اس کی فکر ہے خدا کرے وہ بچ گیا ہو۔''

''خدا کرے.....'' میں نے کہا لیکن وسیم کے غائب ہونے کا سن کر میرے اندر اندیشے جاگ اٹھے تھے۔ بے شک وہ لاہور سے نکل گیا تھا کیونکہ وہاں اس کا کوئی ساتھی باقی نہیں رہا تھا لیکن راولپنڈی میں اس کے ساتھی اور ان کے ٹھکانے موجود تھے۔ وہ ان کے پاس کیوں نہیں آیا؟ میں نے جب راجا عمر دراز سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔

''وسیم کے باقی ساتھی غائب ہیں اور ان کے ٹھکانے ویران پڑے ہیں۔''

''اوہ......'' میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''یہی وجہ ہے وسیم آپ سے رابطہ نہ کر سکا۔''

''نہیں، مجھ سے رابطہ کرنا کون سا مشکل تھا۔ میرے تمام رابطے اس کے علم میں ہیں۔''

''پھر اس نے رابطہ کیوں نہیں کیا؟'' میں ایک بار پھر فکر مند ہو گیا۔

اس کا ممکنہ جواب میرے اور غالباً راجا کے ذہن میں بھی تھا لیکن ہم نے زبان پر لانے سے گریز کیا تھا۔

☆======☆======☆

''کہاں غائب تھے جناب؟'' سفیر نے مجھے دیکھتے ہی خفگی سے کہا۔ ''پورے تین گھنٹے بعد تشریف آوری ہوئی ہے اور یہاں کوئی سیدھے منہ بات کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔''

''میں ایسے ماحول میں نہیں رہ سکتی۔'' مونا نے پاؤں پٹخے۔

''اور کیا میری نہ سہی...... اس کی عزت تو ہے۔'' سفیر نے اس کی تائید کی۔

''ایک منٹ پہلے میری سن لو، اس کے بعد بکواس کرنا۔''

''میں نے انہیں اپنے اور راجا عمر دراز کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ ریکارڈر کا سن کر وہ حیران رہ گئے تھے۔ سفیر نے طیش میں کہا۔ ''ڈیوڈ شا بڑا ہی حرام زادہ نکلا۔''

''اس جیسے آدمی سے ایسی چھوٹی حرکت کی توقع ہی تھی۔'' مونا بولی۔

''ان کے لئے کوئی حرکت چھوٹی بڑی نہیں ہوتی۔ دشمن کو بہر صورت ٹھکانے لگانا ان کا مقصد ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ مجھے ڈیوڈ شا سے اتنی احمقانہ حرکت کی امید نہیں تھی، آج کل یہ پتا چلانا بہت آسان ہے کہ ریکارڈنگ میں جعل سازی ہوتی ہے یا نہیں؟''

''مجھے راجا پر حیرت ہے، وہ اس کے خلاف کسی کارروائی کے لئے تیار نہیں ہے۔'' سفیر نے کہا۔ ''جبکہ حکیم قادس بھی اس کے قبضے میں ہے۔''

"مجھے لگ رہا ہے راجا کے ذہن میں کوئی خاص بات ہے لیکن ابھی وہ ہمیں بتانا نہیں چاہ رہا ہے، ممکن ہے کچھ دن میں بات واضح ہو جائے۔" میں نے سوچ کر کہا۔ پھر انہیں وسیم اور اس کے ساتھیوں کے بارے اَپ ڈیٹ کیا۔ آنے والے تین دن تک راجا کے سامنے نہ تو ہماری طلبی ہوئی اور نہ ہی ملازمین نے راجا کے بارے میں کوئی واضح جواب دیا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ راجا عمر دراز تخلیے میں ہے اور وہاں تک رسائی عام ملازمین کے بس کی بات نہیں تھی۔ صرف سیکرٹری بیگ راجا کے پاس جا سکتا تھا لیکن وہ بھی غائب تھا۔ اس لئے ان تین دنوں میں ہم نے آرام کیا۔ راجا کے محل میں فون کی سہولت نہیں تھی بلکہ اس پوری وادی میں دور دور تک فون یا بجلی کا نام و نشان نہیں تھا۔ مونا، سفیر اور میں صبح ناشتا کر کے مٹرگشت کرنے کے لئے نکل جاتے تھے۔ راجا کے دو مسلح محافظ ہمارے ساتھ ہوتے لیکن وہ دور دور سے نگرانی کرتے۔ ان تین دنوں میں ہم نے وادی کے چپے چپے کو چھان مارا تھا۔ تیسرے دن ہم وادی کے وسط میں قائم اسکول بھی ہو آئے اور مجھے سرمد علی کو لڑکوں کے اسکول کا ہیڈ ماسٹر دیکھ کر خوشی ہوئی تھی لیکن وہ اتنے عام سے بلکہ روکھے انداز میں ملا کہ مجھے خفت محسوس ہونے لگی۔ ظاہر ہے اس بے چارے کے خاندان کو گیارہ سال پہلے اس کی سوتیلی ماں کا کیا دھرا بھگتنا پڑا تھا اور اس داستان رسوائی کا ایک کردار میں بھی تھا۔ اگرچہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔

مونا لڑکیوں والے اسکول میں گئی اور اس نے وہاں اتنی دیر لگائی کہ میں اور سفیر تنگ آ کر ذرا دور ایک باغ کی منڈیر پر جا بیٹھے۔ یہ منڈیر کوئی ڈھائی فٹ چوڑی تھی اور سورج کی روشنی نے پتھروں کو معقول حد تک گرم کر دیا تھا۔ سفیر لیٹتے ہوئے کراہا۔ "بھوک سے برا حال ہے، یہ مونا کب نکلے گی وہاں سے؟"

"سمجھ لے...... میں بھی عنقریب فوت ہونے والا ہوں۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"اگر مونا آدھے گھنٹے کے اندر نہ آئی تو میں روانہ ہو جاؤں گا۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ہاں بھائی، آج کل مجنوں ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "وہ اپنا ایک لوکل عاشق تھا مہینوال...... سنا ہے ران کے کباب بنا کر کھلا دیئے تھے اور آپ......؟"

"فی الحال تو یہ حال ہے کہ اپنے کباب خود کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

اسی لمحے مونا اسکول سے نکلتی نظر آئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ ہم دونوں اس کی طرف لپکے "محل چلیں؟" سفیر کے اس سوال پر اس نے برا سا منہ بنایا۔ "مجھے پتا ہے دونوں بھوکے ہوں گے۔"

"آفرین ہے تم پر۔" میں نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔ "اگر ان پہاڑوں پر گھوم پھر کر بھی تمہیں بھوک نہیں لگ رہی ہے۔"

"نہیں، بھوک تو لگ رہی تھی لیکن اندر بچیوں کو پڑھانے والی دونوں استانیوں نے اصرار کر کے مجھے اپنے لنچ میں شامل کر لیا تھا۔"

سفیر بھنا گیا۔ "دیکھی تو نے اس کی خود غرضی؟"

میں نے بھی ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی، اکیلے اکیلے کھاتے ہوئے؟"

"ساگ، مکئی کی روٹی اور مکھن تھا۔" مونا نے جلانے والے انداز میں کہا۔

"شکر ہے۔" سفیر نے سکون کا سانس لیا۔ "اچھا کیا تم نے دعوت نہیں دی۔ یہ ساگ پات جیسی چیزیں

حلق سے نہیں اترتیں۔"

"ہم جا کر قورمہ اور پلاؤ کھائیں گے۔" میں نے بھی سفیر کی تائید کی۔

مونا نے بہت دور نظر آنے والے محل کی طرف دیکھا اور سر ہلا کر بولی۔ "چلو قورمے اور پلاؤ کا تصور تم لوگوں کو وہاں تک جانے کی ہمت تو دے گا۔"

"تم ہمیں کسی صورت دل برداشتہ نہیں کر سکتیں۔ مردوں کے لئے ایسی چھوٹی موٹی تکلیفوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔" سفیر نے بے نیازی سے کہا اور ہم نے محل کی طرف مارچ شروع کر دیا۔ فرق اتنا تھا کہ ہم کوئیک مارچ کرنا چاہ رہے تھے اور مونا سیاسی مارچ کر رہی تھی یعنی خراماں خراماں ٹہلتے ہوئے آ رہی تھی۔ اس نے رفتار تیز کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

"پیٹ بھر کر کھانے کے بعد مجھ سے تیز نہیں چلا جاتا۔"

"ٹھیک ہے، تم آتی رہنا، ہم جا رہے ہیں۔"

"اچھا......" مونا نے سفیر کو گھورا۔ "ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ مرد حضرات ایسی چھوٹی تکالیف کی پروا نہیں کرتے۔"

"تکالیف کی بات اور ہے......لیکن مسئلہ اس وقت فطرت کی پکار کا ہے۔"

مونا طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ "دونوں کو...... بیک وقت؟"

"احمق!" میں نے سفیر کو گھورا۔ "سوچے سمجھے بغیر مت بولا کرو۔"

سفیر بھی کھسیا گیا اور مونا بھی اپنے جملے پر شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم محل میں داخل ہوئے تو مجھے سچ مچ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بھوک سے فوت ہونے والا ہوں۔ میں نے اور سفیر نے سیدھا طعام خانے کا رخ کیا۔ خوش قسمتی سے باورچی خانے میں کھانا تیار تھا۔ اس لئے ہماری فرمائش پر فوری طور پر کھانا لگا دیا گیا۔ تھکن اور پُرخوری کے احساس کے ساتھ ہم سب نے اپنے کمروں کا رخ کیا۔ راجا عمر دراز نے محل میں بجلی کی سپلائی کا نظام بہتر کر لیا تھا۔ جنریٹرز اور بیٹریوں کی مدد سے ایسا نظام قائم کیا گیا تھا کہ محل میں چوبیس گھنٹے بجلی رہا کرتی تھی۔ میں سو گیا اور جب آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ یہاں پر سورج غروب ہوتے ہی منٹوں میں تاریکی چھا جاتی تھی۔ گھڑی دیکھی تو شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ میں نے لباس تبدیل کیا، راجا کے ملازمین نے ہمارے ناپ کے کئی لباس اور دوسری چیزیں مہیا کر دی تھیں۔ میں باہر ہی نکلا تھا کہ بیگ نظر آ گیا، وہ شاید میری طرف ہی آ رہا تھا۔

"جناب، راجا صاحب آپ تینوں کا چائے کی میز پر انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے رسمی علیک سلیک کے بعد کہا۔

"حیرت ہے، آج راجا صاحب نے کیسے یاد کر لیا؟"

"بس جناب، کچھ معاملات تھے۔ راجا صاحب مصروف تھے، اس وقت ایک ضروری معاملے پر بات کرنے کے لئے آپ کو بلایا ہے۔"

راجا عمر دراز اندرون خانہ کوئی کھچڑی بنا رہا تھا۔ میں نے مونا اور سفیر کو جگایا۔ وہ دونوں تیار ہوئے تو ان کو

لے کر راجا عمر دراز کے کمرا خاص کا رخ کیا۔ بیگ نے بتایا تھا، شام کی چائے کا بندوبست وہیں تھا۔ راجا ہمارا منتظر تھا۔ اس نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا تھا۔ ''آؤ میرے بچو! میں سب سے پہلے اس رویے کے لئے معذرت خواہ ہوں جو میں نے تم لوگوں سے روا رکھا۔''

''شرمندہ مت کریں راجا صاحب! آپ ہمارے محسن ہی نہیں، بزرگ بھی ہیں اور بزرگ اپنے بچوں سے معافی نہیں مانگتے۔'' مونا ادب سے بولی تو راجا عمر دراز خوش نظر آنے لگا۔

''جیتی رہو بیٹی! ماشاءاللہ بہت سعادت مند ہو۔''

مونا شرمائی۔ ''شکریہ راجا صاحب!''

''تم مجھے چچا بھی کہہ سکتی ہو۔'' راجا عمر دراز نے کمال شفقت سے کہا۔ ''تم میرے لئے بیٹی کی طرح ہو۔''

مونا نے پھر شکریہ ادا کیا اور سب کے لئے چائے بنانے لگی۔ ساتھ ہی میز پر کھانے پینے کے کئی لوازمات تھے۔ ان سے انصاف کرنے اور چائے نوشی کے دوران میں خاموشی رہی۔ میں منتظر تھا کہ راجا عمر دراز کب اس اہم معاملے کی طرف آتا ہے۔ آخر اس نے چائے کی پیالی رکھ کر منہ صاف کیا۔

''ایمن شا نے پاکستانی حکومت سے رابطہ کیا ہے۔''

''آپ اس کے معمولات سے باخبر ہیں؟'' میں نے کہا۔

''ہاں اور کل یا پرسوں تک وہ اس معاملے کو اٹھانے کے لئے سیکرٹری داخلہ سے ملاقات کرنے جا رہی ہے۔''

''وہ ہمارے سابق آقاؤں کی اولاد ہے وزیراعظم اور صدر تک سے مل سکتی ہے۔'' سفیر نے طنز کیا۔

''برخوردار! غیر متعلقہ باتوں سے گریز کرو۔ معاملہ بہت اہم ہے، فتح خان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آج کسی وقت اسلام آباد کے لئے روانہ ہوا ہے۔ میرے جاسوسوں نے اسے چیک پوسٹ سے گزرتے دیکھا ہے۔''

''میرے خدا! ایمن خطرے میں ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔ ''میں چاہتا ہوں، تم لوگ اسے بچانے کے لئے فوری طور پر روانہ ہو جاؤ۔''

''ہم لوگ!'' مونا نے ہچکچا کر کہا۔

''ہاں، میں اپنے آدمی بھی بھیج سکتا تھا لیکن ایمن ان پر اعتماد نہیں کرے گی۔ وہ صرف شہباز پر اعتماد کرے گی۔''

میں نے غور کیا۔ ''کیا اسے یہاں لانا ہے؟''

''لازمی بات ہے۔ فتح خان اور ڈیوڈ شا اس کے دشمن ہو رہے ہیں۔ حکومت اسے تحفظ نہیں دے سکتی۔ اس لئے ہم اسے تحفظ دیں گے۔''

''مجھے کب روانہ ہونا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں نہیں، ہم دونوں نے۔'' سفیر نے جلدی سے تصحیح کی۔

''نہیں، ہم تینوں نے۔'' مونا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

راجا عمر دراز ہماری نوک جھوک پر مسکرا رہا تھا۔ ''یہ فیصلہ میں تم لوگوں پر چھوڑتا ہوں کہ کون جائے گا۔ روانگی آج ہی ہے۔ میرا پانچ افراد پر مشتمل خاص دستہ تمہارے ساتھ جائے گا، یہ سب مار دھاڑ کے ماہر ہیں۔''

''آج ہی...... یعنی رات کو؟'' میں چونکا۔

''رات کا وقت ہی بہترین ہے، جیسے میرے آدمی اس علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں، اسی طرح دشمن کے جاسوس بھی ہوں گے۔ تمہارا ان کی نظروں سے بچنا بہت ضروری ہے۔''

''میرا خیال ہے مونا یہیں رہے۔'' میں نے ہچکچا کر کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' وہ غرائی۔ ''میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔''

''یار، تُو سمجھا اسے۔'' میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔

وہ ہنسا۔ ''یہ بھی ایک کہی تم نے...... اگر یہ میرے کہنے میں ہوتی تو آج ہم حویلی میں نہ ہوتے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''مونا...... تم نہیں جاؤ گی۔''

اس نے مجھے گھورا اور پھر پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔ عمر دراز جواب تک مسکرا رہا تھا، اس کے جاتے ہی سنجیدہ ہو گیا۔

''شہباز! یہ بہت مشکل کام ہے۔ اس میں خطرہ بھی ہے۔ خاص طور سے تمہارے لئے۔ پولیس کا خطرہ الگ ہے اور فتح خان بھی دشمن ہے، تم چاہو تو جانے سے انکار کر سکتے ہو۔''

''میں جاؤں گا راجا صاحب! اور اسے میں اپنا کام سمجھ کر کروں گا۔ خطرات کے بارے میں سوچنا پریشان ہونا میں بہت پہلے چھوڑ چکا ہوں۔''

راجا عمر دراز کا چہرہ کھل گیا تھا۔ ''دیکھو...... یہ ضروری ہے کہ ہم دشمن کو کامیاب نہ ہونے دیں، اسے اس کے مقاصد سے روکیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ فتح خان کیوں اسلام آباد گیا ہے لیکن ایمن کے آتے ہی اس کا وہاں جانا معنی خیز ہے۔ ممکن ہے اسے ڈیوڈ شا نے بھیجا ہو یا وہ خود اسے اغوا کرنے کی فکر میں ہو تاکہ اس کے باپ پر دباؤ ڈال کر اس سے ہیرے حاصل کر سکے۔''

''دونوں صورتوں میں ایمن کا ان کے ہاتھ نہ آنا ہماری کامیابی ہو گی۔'' میں نے کہا۔ ''ایمن کے ہمارے پاس ہونے کی صورت میں ڈیوڈ شا اور فتح خان دونوں کی پوزیشن کمزور پڑ جائے گی۔''

''ہم براہِ راست ان سے الجھے بغیر ان کے تمام خانے ایک ایک کر کے بند کر دیں گے اور ان کو شہ مات ہو گی۔'' راجا عمر دراز جوش سے بولا تھا۔

اگرچہ میں نے اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ زندگی شطرنج کی چالوں کی طرح محدود نہیں تھی، اس میں ایک خانہ بند ہوتا ہے تو دس خانے کھل جاتے ہیں۔ محض دفاعی چالوں سے حریف کو شکست دینا صرف اس وقت ممکن ہے جب آپ کے پاس وسائل لامحدود ہوں اور حریف مجبور ہو۔ اس میں نئے محاذ کھولنے کی سکت نہ ہو۔ جبکہ ڈیوڈ شا اور فتح خان کے پاس وسائل اور میدان کی کمی نہیں تھی۔ وہ ہمارے سامنے محدود یا مجبور نہیں تھے۔

بہر حال میں نے راجا صاحب کی بات سے اختلاف بھی نہیں کیا۔ اس وقت ایمن کو ان لوگوں کے چنگل میں جانے سے بچانا ضروری تھا۔ ''میرا خیال ہے، ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہئے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کے آدمی کہاں ہیں؟''

''وہ باہر ہائی وے پر ملیں گے۔ ایک جیپ تم کو وہاں تک پہنچا دے گی۔''

میں اور سفیر جلدی میں تیار ہوئے۔ کپڑے بدلے۔ مشن اور موسم کی مناسبت سے سیاہ اونی ٹراؤزر، ہائی نیک جرسی اور لیدر جیکٹ کے ساتھ پاؤں میں جوگرز تھے جو بھاگ دوڑ کے لئے بہترین تھے۔ جب ہم نکلنے لگے تو بیگ ہمیں باہر تک چھوڑنے آیا تھا، اس نے کہا۔ ''وہاں پر رہائش اور دوسرے انتظامات کی ذمے داری فرخ شاہ نامی شخص کے سپرد ہے۔ وہ آپ کو اس نمبر پر ملے گا۔'' بیگ نے ایک موبائل نکال کر اسکرین پر فرخ شاہ کا نمبر دکھایا اور موبائل میرے حوالے کر دیا۔ ''اسلام آباد پہنچ کر اس سے رابطہ کیجئے گا۔'' پھر اس نے ایک مستطیل اور کسی قدر موٹا پیکٹ میرے حوالے کیا۔ اس میں کچھ رقم ہے، آپ جانتے ہیں بہت ساری گتھیاں صرف زر کی انگلیوں سے کھولی جا سکتی ہیں۔''

''میری پوزیشن کیا ہوگی؟''

''سب آپ کے ماتحت ہیں اور اپنی حکمتِ عملی کے معاملے میں آپ آزاد ہوں گے۔''

جب ہم جیپ کے پاس پہنچے تو اس کے ڈرائیور نے سلام کیا اور میرے لئے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا، اندر بیٹھتے ہی مجھے عقبی نشست پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور وہاں مونا کو موجود پایا۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے خفگی سے کہا۔

''اسے چار سو بیسی کہتے ہیں۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''میں نے کہا تھا ناں...... تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔''

''میرے خدا، یہ موجود ہے۔'' سفیر عقبی دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

''ہاں...... اب چلو۔ رات سرد ہوتی جا رہی ہے۔'' مونا بولی، اس کے انداز سے لگ رہا تھا وہ کسی صورت واپس جانے کے لئے تیار نہیں ہوگی۔ مجبوراً میں نے سر پر اونی ٹوپی چڑھاتے ہوئے ڈرائیور کو چلنے کا حکم دیا۔ بیگ اندر جا چکا تھا۔ جیپ محل سے خاصی نیچے تھی، نہ جانے راجا نے محل تک جانے کے لئے راستہ کیوں نہیں بنوایا تھا جبکہ بیرونی سڑک سے وادی تک گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے کچی سڑک موجود تھی۔ اس کی حالت اتنی بہتر ضرور تھی کہ اس پر رات کی تاریکی میں بھی سفر کیا جا سکتا تھا۔ میری خاموشی اور غصے نے مونا کو ڈرا دیا تھا۔

''سوری شوبی!'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''میں نے تمہاری بات نہیں مانی۔''

''اب سوری کرنے کا فائدہ!'' میں نے رکھائی سے کہا۔

''تو کیا میری سوری کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ ''ٹھیک ہے، میں یہیں اتر جاتی ہوں۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' میں بھنا گیا تھا۔

''بس بھی کر یار!'' سفیر بول اٹھا پھر چپکے چپکے مونا کو تسلیاں دینے لگا جو رو رہی تھی۔ میں خاموشی سے

جیپ کے سامنے آنے والے راستے کو دیکھتا رہا۔ ہیڈ لائٹس کے علاوہ جیپ کے اوپر طاقتور لائٹس بھی لگی تھیں۔ جن کی روشنی میں راستہ دور دور تک صاف نظر آ رہا تھا۔ شدت کی سردی کی وجہ سے وادی بالکل سنسان لگ رہی تھی۔ لوگ سرِشام ہی اپنے گھروں میں چلے جاتے تھے۔ آوارہ جانور تک کونے کھدروں میں دبکے ہوئے تھے۔ جیپ میں ہیٹر تھا اس لئے ذرا سی دیر میں اندر کا ماحول خوشگوار حد تک گرم ہو گیا۔ جیپ نئی تھی اور اس کے شاک بھی بہترین حالت میں تھے۔ ایک گھنٹے بعد جیپ ہائی وے تک پہنچ چکی تھیں سڑک کے کنارے جیپ روک کر ڈرائیور نے ایک واکی ٹاکی نکال کر اس پر کسی کو کال کی۔

''مہمان آ گئے ہیں۔'' اس نے مختصراً کہا اور ریڈیو بند کر دیا پھر میری طرف دیکھا۔

''وہ کچھ دیر میں پہنچ جائیں گے جناب!''

اس کا اشارہ یقیناً راجا عمر دراز کے خصوصی دستے کی طرف تھا۔ مونا اور سفیر اب خاموش تھے۔ میں نے بھی انہیں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ دس منٹ بعد سامنے سڑک پر روشنی نمودار ہوئی۔ ڈرائیور نے اچانک پستول نکال لیا اور مجھ سے کہا۔ ''جناب! ہوشیار رہیں۔ دشمن بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہم صرف ہوشیار ہو سکتے ہیں...... ہمارے پاس اسلحہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''ڈیش بورڈ کے خانے میں دو عدد پستول ہیں۔ وہ نکال لیں...... آپ کے لئے ہی ہیں۔''

میں نے خانہ کھولا تو اعشاریہ چالیس کے پستول رکھے دیکھے۔ یہ کمیاب لیکن استعمال میں آسان تھے، ان کی ہلاکت خیزی بھی مسلمہ تھی، میں نے دوسرا پستول سفیر کی طرف بڑھا دیا۔ اندر دو عدد اضافی میگزین بھی تھے۔ جو میں نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لئے۔ ڈرائیور اتر کر آنے والی گاڑی کی طرف بڑھا۔ یہ ایک کوسٹر وین تھی۔ ڈرائیور نے جا کر اس کے ڈرائیور سے بات کی۔ کوسٹر کا عقبی دروازہ کھلا اور ایک طویل قامت شخص اتر کر جیپ کی طرف آنے لگا۔ اس نے چست لباس پہن رکھا تھا اور سر پر موسم کی مناسبت سے سیاہ گرم ٹوپی تھی، اس کے منہ سے بھاپ نکل رہی تھی۔ میں بھی نیچے اتر گیا۔ اس نے نزدیک آ کر مجھے سلیوٹ کیا۔

''کیپٹن نیک نام سر!''

''کیپٹن!'' میں حیران ہوا تھا۔ ''کیا تم آرمی سے ریٹائرڈ ہو؟''

''نو سر! افغان آرمی...... سولہویں انفینٹری سے میرے گروپ کا تعلق رہا ہے۔ میرے ساتھ ایک کارپول اور تین سارجنٹ ہیں۔''

اب مجھے سمجھ میں آیا کہ راجا عمر دراز نے اتنے یقین سے کیوں کہا تھا کہ وہ لڑائی بھڑائی کے ماہر تھے۔

''او کے کیپٹن! اب ہم ساتھ چلیں گے۔''

''ویلکم سر!'' اس نے کوسٹر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جیپ کا عقبی دروازہ کھولا۔

''نیچے آ جاؤ، ہمیں کوسٹر میں سفر کرنا ہے۔''

سفیر نیچے اترا۔ ''کیا یہ وہی ہیں؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔ راجا کے ڈرائیور نے بھی تصدیق کی ہے۔'' میں نے جوابی سرگوشی کی۔

''مونا نے اس طرح ساتھ آ کر اچھا نہیں کیا ہے۔'' سفیر نے کہا۔ ''لیکن اب اسے کچھ کہنا مت، آ ہی گئی

ہے تو اسے بھگتنا تو پڑے گا۔"

"یار، جب ڈیوڈ شا کے آدمی اسے لے گئے تو مت پوچھ میری اندر سے کیا حالت تھی۔ اب ایسی سچویشن کا سوچ کر ہی میں لرز جاتا ہوں۔"

"چلیں سر!" کیپٹن نیک نام نے ہمیں سرگوشیوں میں مصروف پا کر پکارا۔ "وقت کم ہے، ہمیں صبح سے پہلے اسلام آباد پہنچنا ہے اور راستے ٹھیک نہیں ہیں۔"

سفیر نے مونا کو اتارا اور ہم تینوں کوسٹر کی طرف آئے۔ اس کے اندر بڑی کشادہ اور آرام دہ نشستیں تھیں۔ ڈرائیور والی نشست کے عقب میں دو دو کر کے دو قطاروں میں نشستیں تھیں اور عقبی حصے میں ایک بڑی نشست تھی اس پر تین افراد آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔ مجموعی طور پر نو افراد کی گنجائش تھی۔ کیپٹن نیک نام ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر آ یا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وین حرکت میں آ گئی۔ میں ڈرائیور کے پیچھے والی نشست پر تھا۔ میرے برابر مونا تھی اور سفیر میرے پیچھے تھا۔ نیک نام نے تعارف کرانا شروع کیا۔

"ڈرائیور کارپول آدم خان۔"

"ہیلو سر!" اس نے کہا۔

"سارجنٹ شیر باز!"

"سارجنٹ محمد خان۔"

"اور سارجنٹ روحیل ایاز!"

یہ تینوں عقبی نشست پر ایک ساتھ تھے۔ ہر ایک اپنے نام پر ہیلو کا نعرہ بلند کرتا تھا۔ "ہمارا یہ گروپ آپ کی کمانڈ میں ہے۔" نیک نام نے آخر میں کہا۔ "آپ جو کہیں گے، ہم اس پر عمل کریں گے سر!"

"اگر میں کہوں کہ پہاڑ سے چھلانگ لگانی ہے تو......؟"

"سر! ہم لگا دیں گے۔ اِٹ از آور ڈیوٹی سر!"

راجا عمر دراز نے یہ کیا شے سر مار دی تھیں میں نے ذرا بے زاری سے سوچا۔ یہ میدانی جنگ میں لڑنے والے لوگ تھے، انہیں شہر میں ہونے والی کارروائیوں کا کیا پتا ہوگا؟ بہر حال ان کے تعارف کے بعد مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کسی ہالی وڈ کی فلم میں کام کر رہا ہوں جو جنگ و جدل سے بھرپور کسی مشن کے بارے میں ہے۔ میں نے نیک سے پوچھا۔ "کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے ہم لوگ اسلام آباد؟"

"دس سے بارہ گھنٹے میں سر!" اس نے جواب دیا۔

"خدا کے لئے یہ سر سر کے نعرے لگانا بند کر دو، تم میرا نام لے سکتے ہو، مجھے آپ جناب سے مخاطب کر سکتے ہو۔ یہ میرا حکم ہے۔ دوسرے فوجی نظر آنے کے بجائے عام فرد نظر آنے کی کوشش کرو۔ اسلام آباد میں یہ چیز ہمیں مشکل میں ڈال دے گی۔"

"یس سر! آئی مین جناب!" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں معلوم ہے اسلام آباد میں ہمیں کہاں جانا ہے؟" میں نے اسے ٹٹولا۔

"نہیں جناب! ہمیں آپ کو اسلام آباد تک پہنچانا ہے اس کے بعد ذمے داری آپ کی ہے۔" اس نے

جواب دیا۔ ''آپ لوگ چاہیں تو آرام کرلیں یا میں آپ کی خدمت میں کافی پیش کروں؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

کیپٹن نیک نام نے کاغذی کپوں میں بھاپ اڑاتی کافی نکالی۔ کار پول آدم خان اچھا ڈرائیور تھا۔ وین بھی اچھی حالت میں تھی اس لئے ہم جھٹکوں سے محفوظ تھے۔ کافی پی کر میں اونگھنے لگا تھا۔ مونا شاید سوگئی تھی یا آنکھ بند کیے پڑی تھی۔ سفیر تینوں سارجنٹس سے گپ شپ لگا رہا تھا۔ البتہ نیک نام خاموش تھا۔ وین کی نشستیں جہاز کی سیٹوں کی طرح کسی قدر پھیل جاتی تھیں۔ وین کبھی تیز رفتاری سے اور کبھی سُست رفتاری سے پہاڑی راستوں پر چلتی رہی۔ بعض مقامات آہ و فغاں کے بھی آئے لیکن وین بہ خیر و خوبی وہاں سے گزر گئی۔ رات بارہ بجے کے رات بارہ بجے کے قریب اچانک وین ایک روشن نظر آنے والی عمارت کی طرف گھوم گئی، اس کی پیشانی پر ہوٹل کا بورڈ جگمگا رہا تھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟'' مونا نے مجھ سے سوال کیا تھا۔

یہی سوال میں نے نیک نام سے کیا اس نے جواب دیا۔ ''جناب، یہ سارے سال اور چوبیس گھنٹے کھلا رہنے والا ہوٹل ہے۔ ہم اس وقت بھی یہاں ڈنر کرسکیں گے۔''

''اس وقت...... بارہ بجے......؟'' میں نے مشکوک لہجے میں کہا۔

''آزما کر دیکھ لیں۔ بس کچھ وقت دینا ہوگا۔''

گزشتہ کئی گھنٹے سے بندھے بندھے جسم سن ہوگیا تھا اور پھر بھوک بھی لگ رہی تھی اس لئے ہم بہت خوشی سے اترے۔ شیشے کے دروازے سے اندر آئے تو ایک گھنٹی بجی۔ چند لمحے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا۔ ہمیں دیکھ کر وہ چوکنا ہوگیا تھا۔ ''جی جناب! کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' اس نے مجھ سے کہا۔

''آٹھ افراد کے لئے ڈنر تیار کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ جلدی سے ہمیں میزوں کی طرف لایا۔ ''تشریف رکھیں جناب! آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ تب تک آپ چائے یا کافی سے دل بہلائیں۔ ٹی وی، ریڈیو بھی ہے۔''

نیک نام گروپ ایک الگ میز پر چلے گئے تھے۔ جب کہ ہم تینوں ایک ایسی میز کے گرد بیٹھ گئے جس کے چاروں طرف صوفے کی دائرہ نما نشست تھی۔ ہوٹل سینٹرلی ہیٹڈ لگ رہا تھا کیونکہ ہال معقول حد تک گرم تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ شمالی علاقے میں ایسا ہوٹل بھی پایا جاتا ہے ورنہ چند بڑے ہوٹلوں کو چھوڑ کر کوئی مرکزی گرمائی نظام نہیں رکھتا حالانکہ مرکزی گرمائی نظام رکھنے سے نہ صرف اخراجات کم ہوتے ہیں بلکہ ہوٹلوں کی ریپوٹیشن بھی بڑھتی ہے۔ مگر مسئلہ ایک تو ہوٹل مالکان کی اس ٹیکنالوجی کے بارے میں عدم واقفیت ہے۔ دوسرے وہ اسے بہت مہنگا سمجھتے ہیں حالانکہ یورپ اور کینیڈا میں شدید سردی کے موسم میں تین تین منزلہ اور بیس پچیس کمروں والے مکانات کو چوبیس گھنٹے میں صرف ڈیڑھ یا دو من لکڑی کے خرچ سے گرم رکھا جاتا ہے اور ان کی تعمیر اس طرح کی گئی ہوتی ہے کہ ان سے حرارت باہر نہیں نکل پاتی۔ افسوس کہ جب ہمارے ہوٹلوں کے مالکان ان کی تعمیر کراتے ہیں تو اس قسم کی باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔ سردیوں میں بھی بے شمار لوگ برف باری دیکھنے کے لئے جانا چاہتے ہیں اور وہ بے چارے، مری، ایوبیہ، نتھیا گلی اور پتریاٹہ ہو کر چلے جاتے ہیں اس سے آگے جانے کے لئے نہ تو راستے کھلے ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کو رہائش ملتی ہے۔ ایسے میں اس ہوٹل کی موجودگی حیران کن تھی۔

بیس منٹ بعد ایک ملازم نے چائے اور پیسٹریاں سرو کی تھیں۔ کھانے کے لئے ہم نے چکن کڑاہی اور اس سے پہلے چکن کارن سوپ کا آرڈر دیا تھا۔ جب تک ہم چائے پیسٹریوں سے فارغ ہوتے، گرما گرم چکن کارن سوپ آ گیا۔ جو لذیذ بھی تھا، بے حد خوشگوار ماحول میں ہم نے رات ڈیڑھ بجے ڈنر کیا تھا۔ کھانے کے دوران میں نے ہوٹل کے مالک کو تھرماس کافی سے بھرنے کو کہہ دیا تھا۔ کھانے کے ساتھ دوسری ضروریات سے فارغ ہو کر اور تازہ دم ہو کر ہم دو بجے ہوٹل سے روانہ ہوئے تھے۔ بل میں نے ادا کیا تھا جو خاصا بھاری تھا لیکن کھانے اور ماحول کو دیکھ کر برا نہیں لگ رہا تھا۔

اس بار ڈرائیونگ سارجنٹ روحیل ایاز کر رہا تھا اور آدم خان پیچھے سونے چلا گیا تھا۔ میں بھی کچھ دیر سو گیا تھا۔ اس وقت نیک نام جاگ رہا تھا۔ سیٹ کتنی آرام دہ سہی لیکن سفر پھر بھی سفر تھا۔ ہم سوتے جاگتے اور اونگھتے رہے۔ درمیان میں دو بار رکے کیونکہ راستہ صاف کیا جا رہا تھا۔ جس وقت صبح کی روشنی پھیلی، ہم اسلام آباد سے خاصے دور تھے اور تین چار گھنٹے سے پہلے وہاں پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ رات بھر سیٹ پر بیٹھے بیٹھے حشر ہو گیا تھا۔ اس لئے جب ایک ریستوران کے سامنے ناشتے کے لئے رکے تو شدید سردی کے باوجود ہم باہر نکل آئے تھے۔ ریستوران ابھی کھلا تھا اور ناشتے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ ہم تینوں باہر اوس سے بھیگی سڑک پر چہل قدمی کر کے اپنی کسل مندی دور کرنے لگے۔ "میرے خدا...... اتنا طویل سفیر!" مونا بولی۔ "مجھے تو لگ رہا تھا میری ٹانگیں سیدھی نہیں ہوں گی۔ کمر کا بھی حشر ہو گیا ہے۔"

"کیا خیال ہے، ذرا رننگ نہ کریں...... جسم کھل جائے۔" میں نے تجویز پیش کی جو مونا نے مسترد کر دی اور ریستوران کے اندر چلی گئی۔ وہ پانچوں بھی اندر تھے۔ میں اور سفیر جاگنگ کرنے لگے۔

"یار...... کہیں راجا ہمیں اپنے مقصد کے لئے استعمال تو نہیں کر رہا ہے؟" سفیر نے موقع میسر آتے ہی کہا۔

"میں بھی اس لئے رک گیا تھا۔" میں نے سر ہلایا۔ "آخر راجا عمر دراز کو ایمن سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ وہ ہم سے مخلص ہے لیکن ساتھ ہی وہ اپنے معاملات اور باتیں ہم سے چھپا رہا ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ مخلص بھی ہے اور بات چھپا بھی رہا ہے۔"

"ہاں، اندرون خانہ وہ ڈیوڈ شا کے خلاف کچھ کر رہا ہے، اس کے آدمی اس پر اور فتح خان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ آخر اسے دلچسپی ہے بھی تو جاسوس چھوڑ رکھے ہیں پھر یہ سابقہ فوجیوں کا دستہ بھی ہائر کر رکھا ہے اور ہمیں ان کے بارے میں بتایا بھی نہیں۔"

"خیر اس کی توقع تو رکھنی بھی نہیں چاہئے...... یہ بڑے لوگ ویسے بھی رازداری کے خبط میں مبتلا رہتے ہیں۔" سفیر نے کہا۔ "لیکن وہ اس سے کیوں انکار کر رہا ہے کہ اسے ڈیوڈ شا اور اس کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اور اس میں دلچسپی سامنے ہے۔" میں نے کہا۔ "تو سفیر جان...... اب ہمیں جو کرنا ہے پوری آنکھیں کھول کر کرنا ہے۔"

سفیر غور کر رہا تھا۔ "دیکھ، مرشد علی سے ہمارے معاملات ندیم طے کرا سکتا ہے۔ وہ وکیل ہے ایسے تمام

ہتھکنڈے جانتا ہے جن سے مرشد علی جیسے سانڈ بھی رام ہو جاتے ہیں ہمارا مسئلہ فتح خان اور ڈیوڈ شا ہیں۔ ویسے شوبی، میرا خیال ہے وہ ہیرے ہمارے قبضے میں آنے چاہئیں۔''

''ہیرے...... کیا تُو دولت کے چکر میں پڑ رہا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں...... فتح خان ان ہیروں کے پیچھے پاگل ہے۔ یہ ہیرے ہمارے پاس آ گئے تو سمجھ لو وہ ہمارا غلام بن گیا۔ پھر ہم اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتے ہیں۔ مرشد جیسے لوگ بدمعاش ہوتے ہیں اور صرف بدمعاش سے ڈرتے ہیں۔''

''بات تو، تُو نے پتے کی، کی ہے۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

''اب اندر چلا جائے۔'' سفیر نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ''بھوک کھل گئی ہے۔''

اندر ناشتا بس لگنے والا تھا۔ جب تک ہم واش روم سے ہو کر آئے، ناشتا لگ چکا تھا۔ اس بار نہ تو ماحول تھا اور نہ ہی ناشتا مزے دار تھا، بس زہر مار کر لیا البتہ کافی مزے کی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی ہم روانہ ہو گئے۔ ابھی کافی فاصلہ باقی تھا۔ اس بار ڈرائیونگ خود نیک نام کر رہا تھا اور میں اس کے برابر میں جا بیٹھا۔ ''افغان آرمی سے یہاں منتقلی کیسے ہوئی؟''

''طالبان کے کابل پر قبضے کے بعد...... ہم شمالی اتحاد والوں سے بھی نہیں ملنا چاہتے تھے۔ اس لئے اس طرف آ نکلے۔''

''فری لانسر ہو؟'' میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ اس نے سر ہلایا یعنی وہ راجا عمر دراز کے باقاعدہ ملازم نہیں تھے۔ ان کی خدمات معاوضے پر حاصل کی گئی تھیں۔ وہ پانچوں خوش باش تھے اور اردو، انگریزی روانی سے بولتے تھے کیونکہ افغانی اور پشتون تھے اس لئے پشتو اور دری بھی جانتے ہوں گے۔ اپنے انداز سے وہ تربیت یافتہ اور نظم و ضبط رکھنے والے لوگ تھے۔ یہ وین بھی خاص طور سے ان کے لئے بنائی ہوئی لگتی تھی، میں نے محسوس کیا کہ اس میں خفیہ خانے بھی تھے کیونکہ چھت اور پہلو میں بہت سارے حصے ابھرے ہوئے تھے۔ چھوٹے ہتھیار ان کے لباس میں تھے اور بڑے ہتھیار انہوں نے وین میں چھپا رکھے تھے۔

دو گھنٹے بعد ہم مری کے مضافات سے گزر رہے تھے اور مجھے وہ شام یاد آ گئی جب اس سارے چکر کا آغاز ہوا۔ نہ ہم لیٹ ہوتے اور نہ کھانے کے لئے مری کے مال روڈ پر رکتے اور نہ نادر علی اینڈ پارٹی سے ٹکراؤ ہوتا۔ بعض اوقات معمولی سی تاخیر انسان کی زندگی کا رخ بدل دیتی ہے۔ بہرحال کاتب تقدیر انسان کے لئے ایسے نشیب و فراز لکھتا رہتا ہے۔ کبھی نہ کبھی ہماری زندگی معمول پر آئے گی۔ جانے پہچانے مناظر سامنے آئے تو مونا اور سفیر میں بھی زندگی کے آثار نمایاں ہوئے تھے۔

''سفی...... وہ دیکھو...... ہم اس چٹان پر چڑھے تھے۔''

''ہاں...... تم نے اس جگہ جان بحق ہونے کی کوشش کی تھی۔'' سفیر نے یاد کیا۔ ''لیکن میں نے بچا لیا تھا۔''

''جی نہیں، میرا ذرا سا پاؤں پھسلا تھا اور میں فوراً سنبھل گئی۔''

''دس فیٹ نیچے جا کر۔'' سفیر نے معصومیت سے کہا۔

اب وین مری کی اترائیاں تیزی سے طے کر رہی تھیں اس جگہ اتنی مسلسل ڈھلان ہے کہ بعض چالاک

ڈرائیور ایندھن بچانے کے لئے انجن بند کر دیتے ہیں اور محض ڈھلان کی مدد سے دس بارہ کلومیٹر کا سفر طے کر لیتے ہیں۔ ہم تینوں رات بھر میں کچھ نہ کچھ سو لئے تھے، اس کے باوجود کچھ کسلمندی باقی تھی لیکن وہ پانچوں حیرت انگیز طور پر چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ حالانکہ وہ مسلسل جاگتے رہے تھے اور پوری طرح چوکنا تھے۔ نصف گھنٹے بعد ہم مری ٹول پلازا سے گزرے تو میں نے موبائل نکال لیا اور انتظار کرنے لگا کہ اس پر کب سگنل نمودار ہوتے ہیں۔ چند منٹ بعد سگنل نظر آنے لگے۔ اس وقت ہم بھارہ کہو کی آبادی سے کچھ دور تھے۔ میں نے نیک نام سے کہا۔ ''وین ایک طرف روک لو۔''

اس نے سڑک کے ساتھ ایک کچی ہموار جگہ دیکھ کر وین روک لی۔ میں نے موبائل میں موجود فرخ شاہ نامی شخص کا نمبر ملایا۔ اس نے فوری جواب دیا۔ ایک نرم اور شائستہ سی آواز آئی۔

''ہیلو......شہباز صاحب!''

''آپ جانتے ہیں؟'' مجھے جھٹکا لگا۔

''جی اس نمبر سے صرف آپ کال کر سکتے ہیں، فرمائیے کہاں ہیں؟''

''بھارہ کہو سے ذرا دور سڑک کے کنارے رکے ہیں۔''

''آپ نے اچھا کیا، اسلام آباد کی حدود میں داخل ہوئے بغیر مجھے کال کر لی۔ چند منٹ رکئے میں پہنچ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''یعنی آپ نزدیک ہی ہیں؟''

''جی، اسی آبادی میں رہائش پذیر ہوں۔ غریب خانہ یہیں ہے۔'' اس نے کہا اور کال ختم کر دی۔

''وہ آ رہا ہے۔'' میں نے نیک نام سے کہا۔ ''راجا صاحب کا مقامی ایجنٹ!''

''ہوشیار رہو۔'' اس نے اپنے آدمیوں سے کہا اور وہ وین سے اتر کر دائیں بائیں جھاڑیوں کے پیچھے چلے گئے تھے۔ ایک سڑک کے پار چلا گیا۔

''یہ کس لئے؟''

''ہمیں ہوشیار رہنا ہے۔ اب ہم دشمن کے قریب ہیں۔ ویسے احتیاط اچھی چیز ہے۔''

میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ خود نیک نام وین کے پاس رہا، میں اس کے ساتھ تھا۔ سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر آنے کے بعد سردی زیادہ نہیں رہی تھی اور پھر سورج بھی چمک رہا تھا۔ لیدر جیکٹ بوجھ لگنے لگی تھی۔ میں نے جیکٹ اتار دی اور پستول پتلون کی جیب میں ڈال لیا لیکن نیک نام اپنی جیکٹ میں رہا تھا۔ حد یہ کہ اس نے سر سے ٹوپی تک نہیں اتاری تھی۔ پندرہ منٹ بعد نیچے سے ایک کار آتی نظر آئی۔ ویسے گاڑیاں مسلسل گزر رہی تھیں لیکن کوئی ہمارے پاس رکی نہیں تھی۔ یہ کار وین کے نزدیک آ کر سست ہوئی اور پھر رک گئی۔ اس سے ایک نستعلیق قسم کا پروفیسر نظر آنے والا شخص نکلا۔ گول شیشوں کی عینک اور سادہ سی پتلون قمیص میں کسی قدر بڑے پیٹ کے ساتھ وہ بے ضرر اور عام سا فرد لگ رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ میرا ہاتھ جیب میں تھا اور میں نے موبائل کا ڈائل بٹن دبا دیا۔ چند لمحے بعد اس شخص کے لباس سے موبائل بجنے کی آواز آئی۔ میں نے موبائل فون نکال کر کال کاٹ دی اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''شہباز ملک!''

''سید فرخ شاہ!'' اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

مونا اور سفیر بھی وین سے اتر آئے تھے۔ میں نے ان کا تعارف کرایا پھر نیک نام کا تعارف کرایا۔ ''اپنے باقی ساتھیوں کا تعارف یہ خود کرائیں گے۔''

نیک نام نے اپنے آدمیوں کو سامنے آنے کا اشارہ کیا۔ سید فرخ شاہ نے ان کا بغور معائنہ کیا۔ ''کیا تم لوگوں کے پاس نارمل کپڑے ہیں؟''

''نو سر!'' نیک نام نے مستعدی سے کہا۔

''تب تم لوگوں کو یہاں انتظار کرنا ہوگا۔ میرا ایک ملازم تمہارے لئے لباس لے کر آئے گا تم ان کے ساتھ حلیہ بدل کر آؤ گے..... میری بات سمجھ رہے ہوناں......؟''

''جی سر!'' نیک نام نے کہا۔

''آپ لوگ میرے ساتھ آئیں۔'' فرخ شاہ اپنی کار کی طرف مڑا۔ ہم اس کے ساتھ کار میں جا بیٹھے۔

''آپ ذرا لیٹ ہیں۔'' اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، راستہ ذرا خراب تھا۔''

''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔'' وہ بولا اور اس کے بعد سارے راستے خاموش رہا تھا۔

آبادی سے ذرا پہلے اس نے کار بائیں طرف نکلنے والی ایک سڑک کی طرف موڑ دی۔ اس طرف عام رہائشی مکانات کے بجائے فارم ہاؤس تھے۔ کار ایک فارم ہاؤس کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور ایک خوبصورت سی دو منزلہ کوٹھی کے سامنے رکی۔ اس کے چاروں طرف روایتی لان کے بجائے باغ تھا جس میں بے شمار اقسام کے پھولدار اور غیر پھولدار پودے تھے۔

''تشریف لائیے۔'' اس نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔ پورچ میں دو افراد تھے۔ اس نے ایک کو بلا کر چابی اس کے سپرد کی۔ ''پانچ چادریں لے کر مری کی طرف جاؤ۔ تین کلومیٹر کے بعد ایک وین دائیں طرف کھڑی نظر آئے گی، چادریں ان افراد کے حوالے کرنا جو وین کے پاس ہوں اور پھر ان کو یہاں لے آنا..... پیچھے انیکسی میں ٹھہرانا۔''

''جی صاحب!'' ملازم نے چابی لی اور اندر چلا گیا۔

فرخ شاہ ہمیں اندر لایا۔ ''آپ نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں۔ اتنی دیر میں کھانا بن جاتا ہے۔''

ایک ملازم نے ہمیں کمرے دکھائے۔ یہاں موسم معتدل تھا۔ گرمی نہیں تھی اور خنکی خوشگوار حد تک تھی۔ نیم گرم پانی سے نہا کر طویل سفر کی کسل مندی خاصی حد تک دور ہوگئی تھی۔ باہر آیا تو فرخ شاہ نشست گاہ میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ ''اب بتائیے، آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے؟''

''راجا صاحب نے کچھ بتایا نہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''انہوں نے صرف آپ کے بارے میں بتایا تھا کہ آپ ایک اہم کام سے یہاں آ رہے ہیں۔ آپ کو پولیس اور بعض افراد کی طرف سے خطرہ ہے۔ آپ کو ہر ممکن سہولت دی جائے۔''

"مجھے سب سے پہلے ایک عدد باربر کی ضرورت ہے فوراً۔"

"ابھی آجاتا ہے۔" اس نے کہا اور گھنٹی بجا کر ایک ملازم طلب کر کے اسے باربر لانے کو کہا۔

"اس کے بعد مجھے کپڑے درکار ہیں۔ تھری پیس سوٹ ہو تو بہتر ہوگا۔ ایک کار بھی چاہیئے۔"

"ہو جائے گا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

حجام پندرہ منٹ میں آ گیا تھا اور اس نے میرے بال سلیقے سے تراشے اور شیو اس طرح بنائی کہ ٹھوڑی کے اطراف میں ایک منی سی فرنچ چھوڑ دی۔ قلمیں غائب کر دیں۔ سائیڈوں اور گدی سے بال مشین کی مدد سے مختصر کر دیئے تھے۔ اس کے بعد اس نے میری ہدایت پر میرے بالوں، مونچھوں اور فرنچ پر ہلکے سرخی مائل رنگ کا آکسائیڈ آزمایا جس میں سنہری رنگ بھی جھلک رہا تھا۔ اس سے میرا حلیہ خاصی حد تک بدل گیا تھا۔ سر اور منہ دھو کر میں نے لباس تبدیل کیا، کھانا کھایا اور کپڑے تبدیل کئے۔ فرخ شاہ نے مختصر سے وقت میں میرے لئے میرے ناپ کے مطابق تین عدد سوٹ، دو جوڑے جوتے اور دیگر سامان منگوا لیا تھا۔ اس میں ایک قیمتی رولیکس اور قیمتی سن گلاسز بھی تھے۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ مجھے میریٹ ہوٹل تک جانا ہے۔ اس لیے حلیہ بھی ایسا ہونا چاہیے تھا۔ میں نے نیک نام کو بلا کر اسے اپنی مہم کے بارے میں آگاہ کیا۔ "گاڑی میں گنجائش کم ہے صرف دو افراد جا سکتے ہیں۔"

"میں اور آدم خان جائیں گے۔" اس نے کہا۔ "باقی تین وین میں ہوں گے۔"

"میرے ساتھ سفیر بھی ہوگا لیکن تم دونوں کو سوٹ درکار ہوں گے۔"

"یہاں سے مل سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "آپ صرف ایک گھنٹا دیجئے۔"

ایک گھنٹے میں انہوں نے سوٹ بوٹ مہیا کر لئے تھے۔ میں نے سفیر کو خاموشی سے بتا دیا اور یہ اچھی بات تھی کہ مونا سو رہی تھی۔ سفیر البتہ کسی قدر فکر مند تھا۔ "کیا مونا کو یوں چھوڑ کر جا سکتے ہیں، ہم اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"یار، راجا عمر دراز کا خاص آدمی ہے۔ پھر بھی ایسا کر تُو رک جا۔"

"میں تجھے اکیلے جانے نہیں دوں گا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں اکیلا نہیں ہوں میرے ساتھ یہ پانچوں بھی ہیں۔" میں نے اصرار کیا۔ "تُو نے صحیح کہا ہے، ہم مونا کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے اور ویسے بھی خطرے کی جگہ سب کو اکٹھے نہیں جانا چاہئے چند لوگوں کا پیچھے رہنا بھی ضروری ہے۔ ریزرو دستے۔"

"او کے!" اس نے بادل نخواستہ کہا۔ "لیکن وعدہ کر کوئی بلا وجہ کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ یعنی بیل سے مارنے کی فرمائش نہیں کرے گا۔"

"نہیں کروں گا بابا اور تُو بھی ہوشیار رہنا۔ ممکن ہے دشمنوں کو ہماری آمد کی بھنک مل چکی ہو اور وہ ہماری تاک میں ہوں۔"

"مجھے زیادہ خطرہ پولیس سے ہے۔"

"اسی وجہ سے میں نے اپنا حلیہ اس حد تک بدل لیا ہے۔"

''ہاں، تجھے اب آسانی سے شناخت کرنا مشکل ہے۔ بالکل قوم کا خون چوسنے والا کوئی سرمایہ دار لگ رہا ہے۔''

فرخ شاہ نے ایک نئے ماڈل کی ہنڈا اسٹی کار ہمارے حوالے کی۔ ڈرائیونگ نیک نام کر رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور لینے سے انکار کر دیا جب ہم نے میریٹ ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں کار روکی اور اینٹرنس کی طرف بڑھے تو میں چونک گیا۔ دروازے پر موجود گارڈ اندر جانے والوں کے لباس سے میٹل ڈی ٹیکٹر لگا کر چیک کر رہا تھے۔ ہم دونوں کے پاس ہتھیار تھے۔ ''ہمیں اپنے پستول چھوڑنا پڑیں گے۔'' میں نے کہا۔

''مجبوری ہے۔'' نیک نام بولا۔ ''ہم نے واپس آ کر اپنے پستول کار میں چھوڑ دیئے۔ اندر آ کر ہم بیٹھ گئے۔

یہاں سے ریسیپشن اور داخلی دروازے پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ میں نے کافی کا آرڈر دیا اور آہستہ سے نیک نام سے کہا۔ ''سنو...... میں یہاں ایک لڑکی سے ملنے آیا ہوں۔ برٹش نیشنل ہے، مجھے اپنا دوست سمجھتی ہے۔ یہاں کچھ لوگ اس کی تاک میں ہیں۔ ممکن ہے اسے نکال کر لے جانا پڑے۔''

''رکاوٹ آ سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں...... میں تمہیں اور کس لئے ساتھ لایا ہوں...... ورنہ اکیلا نہیں آ سکتا تھا۔''

''لڑکی کہاں ہے؟''

''یہ معلوم کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا اور موبائل سے ہوٹل کا نمبر ملایا۔ کاؤنٹر کے ایک طرف فون بورڈ کے سامنے کھڑی لڑکی نے کال ریسیو کی اور میری آواز سن کر بولی۔

''یس سر! کین آئی ہیلپ یو؟''

''مجھے مس ایمن شاہ سے بات کرنی ہے۔''

''ون منٹ پلیز سر!'' اس نے کہا اور فون ہولڈ کرا دیا۔ میں دیکھ رہا تھا، اس نے کسی اور سے بات شروع کی تھی اگر وہ ایمن سے بات کر رہی تھی تو وہ ہوٹل میں ہی تھی۔ ایک منٹ بعد آپریٹر لائن پر آئی۔ ''سوری سر! مس شاہ کسی اجنبی سے بات نہیں کرتیں۔''

''میں اجنبی نہیں ہوں۔ میرا نام شہباز ملک ہے۔''

''سوری سر! انہوں نے نام بھی سننے سے انکار کر دیا ہے۔''

''پھر بھی ایک بار ان سے بات کر لیں۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر ریسیپشن کی طرف بڑھا۔

''اوکے سر! جسٹ فار یو۔'' اس نے کھنکتی آواز میں کہا۔ لڑکی پیاری تھی اور چست ٹراؤزر اور شرٹ میں اس کی نازک بدنی نمایاں تھی۔ میں نے ہولڈ کی آواز سنتے ہی موبائل ہتھیلی میں چھپا لیا تھا اور جب لڑکی نے بورڈ پر لگے نمبر دبائے تو میں نے دیکھ لیا، اس نے دو سو بارہ دبایا تھا۔ یعنی ایمن کا کمرا نمبر دو سو بارہ میں تھی۔ میرا کام بن گیا۔ اس لئے میں واپس لوٹ آیا۔ کاؤنٹر گرل غیر متوقع نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی، میرے پلٹ جانے سے اسے مایوسی ہوئی۔ جب تک میں اپنی نشست تک واپس آیا، آپریٹر لائن پر آ چکی تھی۔

''سوری سر! انہوں نے کسی شہباز ملک کو شناخت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔''

''نو پرابلم،شکریہ!'' میں نے کہہ کر کال کاٹ دی۔ نیک نام سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔
''میرا خیال ہے لڑکی خطرے میں ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔''اس نے مجھے شناخت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔''

''اوہ......یعنی دشمن اس تک آ چکا ہے۔''

''امکان یہی ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا لیکن پھر میں نے لفٹ استعمال کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لفٹ مین ہمیں دیکھ لیتا اور یہ بات بعد میں مسئلہ بن سکتی تھیں میں سیڑھیوں کی طرف گھوم گیا۔ دوسرے فلور پر سناٹا تھا۔ ویسے بھی سیاحوں کا سیزن ختم ہو چکا تھا اور ان دنوں ہوٹل کا کام ذرا سست ہو جاتا ہے۔ بیشتر کمرے خالی ہو جاتے ہیں۔''تم بائیں طرف دیکھو۔ میں دائیں طرف جاتا ہوں۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور نیک نام سر ہلاتا ہوا بائیں طرف چلا گیا۔ میں نے دائیں طرف کی راہداری کا رخ کیا۔ دو سو بارہ کمرا زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے موبائل نکالا اور اس میں کچھ چیک کرنے کے بہانے دروازے کے عین سامنے رک گیا۔ اندر خاموشی تھی۔ میں نے آہستہ سے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمایا مگر کمرا اندر سے بند تھا۔ یعنی ایمن اندر تھی۔ میں دروازے کے سامنے سے ہٹنے لگا۔ اس جگہ مستقل کھڑے رہنا بھی ممکن نہیں تھا۔ کوئی آ جاتا تو اسے شک ہو جاتا لیکن اس سے پہلے کہ میں دروازے کے سامنے سے ہٹتا، اچانک دروازہ کھلا اور سامنے ایک پستول بردار شخص نظر آیا۔ اس نے پستول میرے سینے سے لگایا اور کوٹ کا کالر پکڑ کر اندر کھینچ لیا، اگلے ہی لمحے دروازہ بند ہو گیا۔

''کک......کون ہو تم......اس طرح مجھے کیوں پکڑا ہے؟'' میں نے خوف زدہ لہجے میں ان دونوں سے کہا جنھوں نے ہوٹل کے اسٹاف کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دونوں مسلح تھے۔ ایمن ایک کونے میں کرسی پر سکڑی اور سہمی بیٹھی تھی۔

''تم دروازے کے سامنے کیوں رکے تھے؟'' مجھے اندر کھینچنے والے نے خوں خوار لہجے میں پوچھا۔

''میں......کب رکا تھا......میں تو فون کرنے جا رہا تھا۔'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے موبائل دکھایا۔
''اور تم لوگ کون ہو......ڈاکو ہو......میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔''

''بکواس مت کرو۔'' اس نے مجھے جھڑکا پھر ایمن کی طرف دیکھا۔''یہ تمہارا ساتھی ہے؟''

''نن......نہیں۔'' اس نے کہا۔

میرا خیال تھا، ایمن نے مجھے شناخت نہیں کیا۔ گیارہ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ وہ بھی خاصی بدل گئی تھی اور مجھ میں تو بہت ساری تبدیلیاں آئی تھیں۔ پھر میں نے بالوں، داڑھی اور مونچھوں کا رنگ بھی بدلوا لیا تھا۔ ایمن نے کمرے کی مناسبت سے شارٹس پر بنیان پہن رکھی تھی جس میں اس کی سڈول رانیں، بازو، گردن اور اس سے نیچے ڈھلان ہوتا بدن نمایاں تھا۔ مغربی خواتین کا یہ عام پہنوا تھا اس کے لئے تو یہاں کا موسم بھی گرم تھا۔ بازوؤں اور پیروں کی بے داغ جلد نمایاں تھی۔ بال ہلکے سنہری مائل سرخ ہو رہے تھے شاید اس نے ڈائی کرائے تھے۔ چہرہ عام انگریز لڑکیوں کے برعکس بے داغ اور شفاف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دونوں پیشہ ور افراد تھے اور ہماری طرف سے پوری طرح چوکنا تھے۔ ایمن کی کم لباسی ان کے نزدیک خاص اہمیت نہیں رکھتی

تھی۔ سوال کرنے والے نے غرا کر کہا۔ ''بکواس مت کرو، ابھی کچھ دیر پہلے دو دفعہ تمہارے لئے فون آیا تھا، وہ کون تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' ایمن نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''میں کسی شہباز ملک کو نہیں جانتی۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' سوال کرنے والا درشت لہجے میں بولا۔ ''جس شخص نے تمہاری جان بچائی تھی، تم اس کا نام ہی بھول گئی ہو؟''

''میرے خدا!'' ایمن چونکی۔ ''یہ وہ شہباز ہے؟''

''اسے دیکھو...... یہ کون ہے۔'' سوال کرنے والے نے میری طرف اشارہ کیا۔

''میں نے کہا ناں...... میں نہیں جانتی۔'' ایمن جھنجلا گئی۔ ''کون ہو تم، میرے کمرے میں کیوں گھس آئے ہو، کیا چاہتے ہو؟''

''ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔''

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' ایمن نے بپھر کر کہا۔

''اسی لمحے میں نے غیر محسوس انداز میں موبائل سے نیک نام کے موبائل کا نمبر دبایا اور اس کا اسپیکر اپنی ہتھیلی تلے دبا دیا۔ دوسرے آدمی نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''اس کا کیا کرنا ہے؟''

''مجھے شبہ ہے، یہ اس کا آدمی ہے یا دوسری پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے بھی لے جانا ہوگا۔''

''سوچ لو، دو افراد کو اس طرح بھرے پرے ہوٹل سے نکال لے جانا آسان نہیں ہوگا۔'' دوسرے نے خبردار کیا۔

''تم فکر مت کر، انہوں نے گڑبڑ کی تو یہیں گولی مار دیں گے اور جو راستے میں آیا اسے بھی اُڑا دیں گے۔'' سوال کرنے والے نے سفاکی سے کہا تھا۔

''تم کون ہو...... یہ تمہیں کیوں لے جا رہے ہیں؟'' میں نے ایمن سے پوچھا۔

''میں برٹش سٹیزن ہوں۔ ایک کام سے آئی ہوں، مجھے نہیں معلوم یہ کون ہیں اور مجھے کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟'' وہ بولی اور اس بار اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ میری آواز سن کر وہ چونکی تھی غالباً اسے شک ہو گیا تھا۔

''مس شا...... جلدی سے کپڑے بدل لو۔'' سوال کرنے والے نے اسے حکم دیا۔ ''ابھی ہم نے یہاں سے نکلنا ہے، ہری اَپ!''

لیکن اس سے پہلے کہ ایمن اپنی جگہ سے اٹھتی...... مجھے عجیب سی بُو محسوس ہوئی اور میرا سر چکرانے لگا غالباً ایسی ہی کیفیت دوسرے بھی محسوس کر رہے تھے۔ میری نظر دروازے کے قفل کے سوراخ سے نکلتے دھوئیں پر پڑی، اسی لمحے سوال کرنے والے نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وہ گالی دے کر دو چار قدم چلا تھا کہ زمین پر ڈھیر ہو گیا خود میں بھی چکراتے ہوئے فرش پر بیٹھا اور نہ جانے کس وقت لڑھک گیا۔

☆======☆======☆

میں بے ہوش نہیں ہوا تھا، بس ایسا لگ رہا تھا جیسے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ ریشے ریشے سے توانائی خارج ہو چکی ہو۔ میں نے بمشکل سر گھما کر دیکھا، ایمن کرسی پر بے بسی کی حالت میں پڑی تھی جبکہ وہ دونوں (ال

پر پڑے حرکت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے پستول ان کے سامنے پڑے تھے۔ کمرے میں ائیرکنڈیشننگ سسٹم کام کر رہا تھا اس لئے گیس کی بو رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ حتیٰ کہ غائب ہوگئی، میں گھڑی نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اندازہ تھا کہ ہمیں بے بسی کی حالت میں پڑے ہوئے پندرہ منٹ گزر چکے ہیں۔

چند لمحے بعد دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا اور جو چہرہ نظر آیا اسے دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ اندر آ کر نیک نام نے فضا سونگھی اور مطمئن ہو کر اندر سے دروازے کو کنڈی لگا دی۔ اس کے بعد وہ سیدھا ان دونوں کے پاس گیا اور ان کے ہتھیار اپنے قبضے میں لے کر ان کی تلاشی لی، سوال کرنے والے کے پاس سے ایک عدد چھوٹا سا پستول نکلا تھا۔ یہ سب نیک نام نے ایک کونے میں پھینک دیا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس سے صرف دو عدد موبائل نکلے جو نیک نام نے اپنی جیب میں ڈال لئے۔ اس کے بعد اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا ان ہیلر نکالا اور اسے میری ناک سے لگا کر اس کا بٹن دبا دیا، ایک میٹھی اور تازہ خوشبو میرے احساسات سے ٹکرائی اور مجھے اپنی توانائیاں بحال ہوتی محسوس ہوئیں۔ یہ اس گیس کا توڑ لگتا تھا۔ ایک منٹ بعد اس نے ان ہیلر ہٹا لیا اور میں ذرا سی کوشش سے اٹھ بیٹھا۔ ''یہ کیا تھا؟''

''نروگیس!'' اس نے مختصر جواب دیا۔ ''واش روم میں جا کر جتنا پانی پئیں گے طبیعت اتنی جلدی بحال ہو گی۔'' اس نے ایمن کی ناک سے ان ہیلر لگا دیا۔ میں نے واش روم میں جا کر واش بیسن کے نل سے پانی پیا۔ اگر چہ مجھے پیاس نہیں تھی اس کے باوجود میں خاصا پانی پی گیا۔ نتیجتاً میں نے اپنی طبیعت میں واضح بہتری محسوس کی۔ باہر آ کر میں نے ایمن کے لئے بوتل میں پانی لیا۔ نیک نام اسے ان ہیلر دے چکا تھا۔ میں نے بوتل اس کے لبوں سے لگا دی۔ ''پانی پیو، اس سے طبیعت جلدی اچھی ہو جائے گی۔''

اس نے لرزتے لبوں کے ساتھ جلدی جلدی بڑے گھونٹ لئے۔ نصف بوتل خالی کر کے اس نے منہ سے ہٹا دی۔ ''کون ہو تم...... یہ آدمی کون ہے؟''

''فکر نہ کرو، ہم تمہارے ہمدرد ہیں، ان سے بچانے آئے ہیں، یہ ڈیوڈ شا کے آدمی ہیں۔''

''ڈیوڈ!'' اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''وہ شیطان یہاں ہے؟''

''خاصے عرصے سے......'' میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ ''اگر تم اپنی طبیعت میں بحالی محسوس کر رہی ہو تو جلدی سے چینج کر لو اور اپنی اہم چیزیں لے لو۔''

''کیوں؟''

''ایمن! میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''دشمن تمہارے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے۔ ایک بار ان کے ہاتھ آ گئیں تو اپنے باپ کی طرح ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاؤ گی۔''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ ''تم نے میرے باپ کا حوالہ کیوں دیا؟''

''کیونکہ میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔''

''تم شہباز ہو ناں......'' اس نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

''اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تیاری کرو، ان کے اور ساتھی بھی ہوں گے، وہ آ گئے تو ہم آسانی سے نہیں نکل سکیں گے۔''

''میں جانے کے بجائے ہوٹل کی سکیورٹی کیوں نہ بلالوں؟''

''تمہاری مرضی......اس صورت میں، مَیں چلا جاؤں گا تم جانتی ہو......میرا ذرا مسئلہ ہے۔''

''تم شہباز ہی ہو۔'' اس نے مسرت آمیز لہجے میں کہا اور میرے گلے لگ گئی۔

''پلیز، وقت کم ہے۔'' میں نے اسے اگلے مرحلے میں جانے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہمارے ساتھ چلنا ہے تو فوری فیصلہ کرو اور تمہارے باپ کے بارے میں میرے پاس ایک اطلاع ہے۔''

''ڈیڈی کے بارے میں......'' وہ چونکی۔ ''وہ زندہ ہیں؟'' اس کے لہجے میں بے تابی آ گئی تھی۔

''وہ اطلاع صرف ساتھ چلنے کی صورت میں دے سکتا ہوں۔ دوسری صورت میں تمہارے لئے بے کار ہوگی۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''میں......میں تیار ہوں۔'' اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ باپ کے بارے میں سن کر وہ ہیجان میں آ گئی تھی۔ اس نے الماری سے لباس نکالا اور واش روم میں چلی گئی۔ چند منٹ میں اس نے لباس تبدیل کیا، اپنے پاسپورٹ اور دوسرے اہم کاغذات، ٹریولرز چیکس اور اپنا لیپ ٹاپ ساتھ لیا۔ میں نے اسے سوٹ کیس لینے سے منع کیا تھا۔ ''بے کار ہے، اس سے تم غیر ضروری طور پر ہوٹل اسٹاف کی نظروں میں آ جاؤ گی۔ نیچے جا کر چابی کاؤنٹر پر دو اور نکل کر باہر پارکنگ میں آ جاؤ۔ ہم وہاں ہوں گے، سمجھ گئیں؟''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا۔

ان دونوں کو کمرے میں چھوڑ کر ہم باہر آئے، ایمن لفٹ سے نیچے گئی جبکہ ہم نے سیڑھیوں کا رخ کیا، جب اتر کر باہر جا رہے تھے تو ایمن کاؤنٹر پر کھڑی تھی۔ میں نے نیک نام کو گاڑی اینٹرنس پر لانے کو کہا اور خود لابی کا معائنہ کرنے لگا۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ ایک شخص ایمن کو دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر تشویش کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے، اس نے لباس سے خود کو معزز بنانے کی کوشش کی تھی لیکن چہرے پر غنڈوں کی چھاپ صاف نظر آ رہی تھی۔ ایمن کاؤنٹر سے ہٹ کر باہر جانے لگی، میں بھی ٹہلتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ وہ شخص بھی تیزی سے ایمن کی طرف لپکا تھا اور میں نے بروقت ٹانگ آگے کر دی۔ وہ جیسے ہی الجھ کر سامنے کرسی پر بیٹھی عورت کی گود میں گرا اور اس نے چیخ کے ساتھ چائے کا گرم کپ اس پر الٹا اور میں نے باہر کا رخ کیا، نیک نام کار لا رہا تھا، ایمن کا بازو پکڑتے ہوئے میں باہر آیا۔

''یہ کون تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے ان کا ساتھی تھا، تمہیں روکنے آ رہا تھا میں نے بروقت ٹانگ اڑا دی۔''

''جیسے ہی نیک نام نے کار روکی۔ میں اور ایمن اس میں گھس گئے۔ ''چلو......چلو......رکو مت، وہ پیچھے ہیں۔'' میں نے کہا۔

نیک نام نے کار کو چوتھے گیئر میں ڈالا اور گولی کی طرح پارکنگ سے نکلتا چلا گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ خاتون کی گود میں گر کر چائے سے غسل کرنے والا بوکھلائے انداز میں باہر آیا تھا۔ اس نے بے بسی سے دور جاتی کار کو دیکھا۔ ''تمہارے آدمی کہاں ہیں؟''

''ہمارے پیچھے آئیں گے۔ اگر کسی نے تعاقب کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے روکیں گے۔'' میں عقب

میں دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی کار سڑک پر آئی تھی، ایک سیاہ مزدا پک اَپ بھی سڑک پر آئی۔ اس کے انداز سے مجھے شبہ ہوا تھا۔

''نیک نام! شاید یہ مزدا پک اَپ تعاقب میں ہے؟''

''سیاہ پک اَپ کو چیک کرو۔'' نیک نام نے اپنے کوٹ کے کالر میں کہا۔ اس نے شاید مختصر فاصلے پر استعمال ہونے والا ٹرانسمیٹر لگا رکھا تھا۔

ہم کوئی ایک کلومیٹر دور گئے ہوں گے کہ میں نے مزدا پک اَپ کو لڑکھڑاتے دیکھا۔ مگر وہ سڑک سے اتری نہیں رک گئی تھی، نیک نام نے اطلاع دی۔ ''اس کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔''

''شہباز، یہ سب کیا ہے؟'' ایمن نے کہا، وہ سخت متوحش نظر آ رہی تھی۔

''فکر مت کرو، اب سب ٹھیک ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''ڈیوڈ شا میرے پیچھے کیوں ہے؟'' اس نے سوالات کا آغاز کیا۔ ''ڈیڈ کے بارے میں تمہارے پاس کیا اطلاع ہے؟''

''سب بتاؤں گا لیکن پہلے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں۔'' میں نے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا، مجھے خدشہ تھا کوئی اور تعاقب میں نہ ہو لیکن اب دور تک سڑک صاف تھی۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''اطمینان رکھو، میں تمہیں اغوا نہیں کر رہا ہوں۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''ذرا اپنی زبان کو آرام دو۔''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا تھا لیکن اس کے بعد کچھ کہا نہیں۔ نیک نام زیر لب مسکرا رہا تھا۔ نصف گھنٹے بعد ہم فرخ شاہ کے فارم ہاؤس میں داخل ہو رہے تھے۔ نیک نام کے ساتھیوں کی وین ہمارے تعاقب میں تھی۔ میں ایمن کو لے کر اندر آیا اور مہمان خانے کا رخ کیا۔ وہاں ایک چھوٹی سی نشست گاہ تھی جہاں سفیر اور مونا پہلے سے تشویش ناک صورت بنائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھے۔

''شکر ہے۔'' مونا نے بے تابی سے میرا ہاتھ تھاما پھر ایمن کو دیکھ کر رک گئی۔ ''یہ کون ہے؟''

''مس ایمن شا!'' میں نے تعارف کرایا۔ 'اور ایمن' یہ میرے ساتھی سفیر شایان اور مس مونا۔''

''ہیلو!'' ایمن نے گرم جوشی سے ان دونوں سے ہاتھ ملایا۔ ''نائس ٹو میٹ یو!''

سفیر نے خوش اخلاقی سے جواب دیا تھا لیکن مونا کا انداز سرد تھا۔ اس نے بے حد خشک سے لہجے میں ''می ٹو۔'' کہا تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں ایمن کو نکال لانے کی کارروائی سنائی۔ مونا نے شکر ادا کیا۔ ''اچھا ہوا، کسی خون خرابے کی نوبت نہیں آئی۔''

''اس خوشی میں چائے کیوں نہ ہو جائے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

اور مونا نے انٹرکام پر کچن سے چائے لانے کو کہا، ایمن بے چین ہو رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ''پلیز شہباز مجھے ڈیڈی کے بارے میں بتاؤ۔ تم نہیں جانتے میں کتنی بے تاب ہوں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا میں نے ایمن سے کہہ تو دیا تھا کہ اسے اس کے باپ کے بارے میں ایک اہم بات بتاؤں گا۔ لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ اسے بتانا مناسب تھا بھی یا نہیں۔ اگر میں اسے بتا دیتا کہ برٹ شا زندہ

ہے اور فتح خان کی قید میں ہے۔تو میں بھی اس معاملے میں ملوث ہو جاتا۔ایمن انتظامیہ سے رابطہ کرتی اور گواہ کے طور پر مجھے پیش کرتی جب کہ میں فی الحال پولیس یا انتظامیہ کے سامنے نہیں جا سکتا تھا اور نہ وہ برٹ شا کو بھول جاتے اور مجھے پکڑ لیتے۔دوسرے میں نے برٹ شا کو زندہ ضرور دیکھا تھا لیکن میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ فتح خان نے اسے کہاں رکھا ہے۔اس لیے میں اس کی نشان دہی بھی نہیں کر سکتا تھا۔اگر برٹ شا نہ ملتا تو ایمن کی نظروں میں میرا امیج متاثر ہوتا اور عین ممکن ہے وہ مجھے جھوٹا اور راجا عمر دراز کا ایجنٹ سمجھتی جس نے اسے اپنے قبضے میں کرنے کے لیے یہ سارا چکر چلایا۔لیکن اسے بھی کچھ نہ کچھ بتانا ضروری تھا۔میں نے کہا۔

''ایمن بات یہ ہے کہ...... میرے خیال میں برٹ شا زندہ ہے۔''

''ڈیڈی زندہ ہیں؟'' اس کے ہونٹوں کے گوشے کپکپائے۔

''ہاں......اور شاید فتح خان کی قید میں ہیں۔''

''فتح خان!'' اس نے دہرایا،اس کا چہرہ ست گیا تھا۔اس نے نفی میں سر ہلایا۔''نہیں اگر ڈیڈی اس کے قبضے میں ہیں تو اس نے کب ان کو زندہ چھوڑا ہوگا؟ تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''میں چند دن پہلے خود فتح خان کی قید میں تھا اور اس نے مجھے ایک ویران جگہ رکھا ہوا تھا۔میں نہیں جانتا کہ وہ جگہ کہاں ہے لیکن وہاں کوئی اور بھی تھا جسے الگ جگہ رکھا گیا تھا۔وہ پاگل ہو گیا تھا اور کبھی کبھی انگریزی میں شور شرابا کرتا یا شکسپیر کے ڈراموں کے ڈائیلاگ گاتا تھا۔''

''ڈیڈی کو شکسپیر بہت پسند ہے؟'' وہ بے تابی سے بولی۔''شہباز،تم سچ کہہ رہے ہو ناں......؟''

''اسی سے مجھے شبہ ہوا کہ وہ برٹ شا ہو سکتا ہے مگر میں پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں نے دیکھا نہیں ہے صرف سنا ہے۔''

''اگر وہ ڈیڈی ہی ہیں تو فتح خان نے ان کو کیوں قید رکھا ہے؟''

''شاید تم ان ہیروں کو بھول رہی ہو جنہیں برٹ شا نے چھپایا تھا۔ممکن ہے فتح خان نے ہیرے حاصل کرنے کے لیے برٹ شا کو قید رکھا ہو۔''

''اگر ڈیڈی زندہ ہیں......تو انہیں وہ لعنتی ہیرے دے دینے چاہیے تھے۔''

''یقین کرو ایمن،اگر تمہارا باپ زندہ ہے تو صرف اس لیے کہ اس نے ہیرے فتح خان کے حوالے نہیں کیے۔ورنہ وہ اب تک موت کی نیند سو چکا ہوتا۔فتح خان نے صرف ہیروں کی امید میں اسے زندہ رکھا ہوگا۔''

''تم نے بتایا کہ وہاں موجود انگریز پاگل ہے؟'' ایمن نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے مسلسل قید اور فتح خان کے تشدد نے اسے پاگل کر دیا ہو۔یا وہ ڈرامہ کر رہا ہو اس لیے فتح خان نے اس سے ہیرے نکلوانے کے لئے دوسرے طریقوں کے بارے میں سوچا ہو۔''

''ایمن چونکی۔''تمہارا مطلب ہے کہ وہ لوگ فتح خان کے آدمی تھے۔''

''ممکن ہے ڈیوڈ شا کے آدمی ہوں۔''

''اس میں کیا فرق ہے؟'' اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔''ابھی تم کہہ رہے تھے،فتح خان ڈیوڈ کے لئے کام رہا ہے۔''

''ہاں......لیکن برٹ شا کے معاملے میں دونوں الگ ہوں گے۔ فتح خان نے ڈیوڈ شا کو اس کے کزن کے بارے میں ہوا بھی نہیں لگنے دی ہوگی کیونکہ فتح خان اس سے ہیرے چاہتا ہے اور ڈیوڈ شا یقیناً اسے قتل کرنا پسند کرے گا۔ برٹ شا کی واپسی کی صورت میں وہ خطاب اور جاگیر سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔''

ایمن بات کو سمجھ رہی تھی اس نے سر ہلایا۔ ''لیکن ڈیوڈ شا کو مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''تم نے برٹ شا کا کیس ری اوپن کرا کے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا ہے اس لئے وہ اس کے آدمی بھی ہو سکتے ہیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے۔'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

اسی لمحے ملازم ٹرالی میں چائے اور دوسرے لوازمات لے آیا۔ اس نے چائے بنا کر سب کو سرو کی اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ایمن کے سوال کا جواب دیا۔ ''مجھے فتح خان پر شبہ ہے بلکہ عین ممکن ہے۔ وہ ڈیوڈ شا کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلا رہا ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ ڈیوڈ شا کو برٹ شا کی خبر دیئے بغیر تمہیں اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ تمہارے باپ پر دباؤ ڈال سکے۔ تم سوچو اگر تمہاری جان پر بن آئے تو کیا برٹ شا ہیرے فتح خان کے حوالے نہیں کرے گا؟''

''بالکل کرے گا۔'' ایمن نے فوراً کہا۔

''اس کا مطلب ہے میں نے تمہیں یہاں لا کر غلطی نہیں کی؟''

''ہاں، اب مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''لیکن میں تمہاری حکومت سے رابطہ کر کے بھی سکیورٹی مانگ سکتی ہوں۔''

''ہوٹل میں سکیورٹی بھی کم نہیں ہوتی ہے۔ باہر اسلحہ چیک کرنے کے آلات ہیں۔ اس کے باوجود دو مسلح افراد تمہارے کمرے تک جا پہنچے اور وہ تمہیں اغوا کر کے بھی لے جاتے اگر ہم بروقت نہ پہنچتے۔''

''لیکن پولیس سکیورٹی......''

''معاف کیجئے گا مس شا!'' سفیر نے بات کاٹی۔ ''آپ ہماری پولیس کی کارکردگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ حالات ذرا سے خراب ہوں تو ان کو خود اپنی سکیورٹی کی فکر پڑ جاتی ہے دوسروں کو یہ کیا سکیورٹی دیں گے؟''

''ہم پر اعتماد کرو۔'' مونا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''ہم تمہارے بھلے کے لئے یہاں لائے ہیں۔ اس جگہ تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''بات خطرے کی نہیں ہے، میں پاکستان اپنے ڈیڈی کی بازیابی کے لئے آئی ہوں۔ اس طرح سب سے چھپ کر میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔''

''سرکار برٹ شا کو بازیاب کرانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتی ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''یہ کیس بھی تمہارے ملک کی وزارتِ خارجہ کے دباؤ میں ری اوپن کیا جا رہا ہے اور اس معاملے میں صرف رسمی خانہ پری ہو گی۔''

''اگر حکومت اسے تلاش کر سکتی تو بہت پہلے کر چکی ہوتی۔'' مونا بولی۔

''اگر برٹ شا زندہ ہے تو اسے صرف ہم ان لوگوں کے چنگل سے آزاد کرا سکتے ہیں۔'' میں نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ ''کیونکہ ہم ان لوگوں سے بہتر طور پر نمٹ سکتے ہیں۔''

''اس نے بے بسی سے ہم تینوں کو دیکھا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔''

''فی الحال تم اپنے ذہن سے ان سب باتوں کو نکال دو۔ ایک دو دن ہمارے ساتھ رہو۔ اس کے بعد تم بہتر فیصلہ کر سکو گی۔ اگر تم جانا چاہو گی تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔''

''تم میرے لئے یہ سب کیوں کر رہے ہو؟''

''یہ میں تمہیں رات کے کھانے کے بعد بتاؤں گا۔'' میں نے گھڑی دیکھی۔ ''فی الحال تم کچھ آرام کر لو۔ اگرچہ یہاں الگ کمرے بھی ہیں لیکن تمہارا مونا کے کمرے میں ٹھہرنا مناسب ہوگا۔''

''اور تم الگ رہنا چاہو تو یہ بھی ممکن ہے۔'' مونا بولی۔

''نہیں، میں تمہارے ساتھ رہنا چاہوں گی۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''آؤ میرے ساتھ...... کچھ آرام کر لو تو بہتر محسوس کرو گی۔'' مونا اسے ساتھ لے گئی۔

''یار راجا کو اس سے......'' سفیر نے کہنا چاہا۔

لیکن میں نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''یار، اندر مجھے گھٹن ہو رہی ہے، آؤ ذرا باہر لان تک ہو آئیں۔''

''چلو......'' سفیر سمجھ گیا۔

ہم باہر لان پر نکل آئے۔ ''اندر بات کرتے وقت محتاط رہا کر۔'' میں نے کہا۔ ''خاص طور سے راجا عمر دراز کے بارے میں بات کرتے ہوئے۔''

''یار، مجھے شک ہو رہا ہے، راجا محض انسانی ہمدردی کے تحت ایمن کے کام نہیں آ رہا ہے۔''

''پھر تیرا کیا خیال ہے؟''

''مجھے لگ رہا ہے، وہ ہیروں کے چکر میں ہے۔'' سفیر نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''کروڑوں ڈالر کم نہیں ہوتے، روپے میں اربوں روپے سمجھ لے۔ اتنی رقم کس کے لئے پُرکشش نہیں ہوتی!''

''خود میرے ذہن میں بھی یہی خیال آ رہا ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح شاید راجا برٹ شا سے اس حرکت کا انتقام بھی لے لے۔''

''کون سی حرکت؟'' سفیر چونکا۔

''اس نے راجا عمر دراز کے محل سے تصویر اور ایک خاص پتھر چرانے کی کوشش کی تھی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''اس لحاظ سے برٹ شا راجا کا دشمن ہے۔''

''ہاں، یہ ممکن ہے۔'' سفیر نے غور کیا۔ ''لیکن وہ ایمن کے ساتھ کیا کرے گا؟''

''تمہارا مطلب ہے وہ ایمن کو کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے؟''

''بالکل۔'' اس نے سر ہلایا۔

''ممکنہ طور پر اسی مقصد کے لئے...... جس کے لئے فتح خان ایمن کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔''

سفیر کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''یعنی وہ بھی اسے استعمال کر کے برٹ شا سے ہیرے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔''

''شاید......'' میں نے کہا اسی لمحے میری نظر نیک نام پر پڑی۔ وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ ''اب اس موضوع پر بات مت کرنا۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' سفیر نے سر ہلایا۔

نیک نام نزدیک آیا۔ ''جناب، مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''ضرور لیکن مجھے بھی کچھ پوچھنا ہے۔''

''ضرور جناب!''

''وہ کیا چیز تھی، کوئی گیس جس نے ہمیں مفلوج کر دیا تھا۔''

''وہ ایک قسم کی نروگیس ہے۔'' اس نے کہا اور جیب سے ایک چھوٹا سا سلنڈر نکال کر دکھایا۔ یہ مشکل سے چھ انچ لمبا تھا۔ ''اس میں اتنی گیس ہے جس سے سو مربع میٹر کے رقبے میں ہر جاندار بے حس و حرکت ہو سکتا ہے۔ مجھے صرف ایک چھوٹا سا پائپ اس کے ساتھ لگا کر کی ہول سے داخل کرنا پڑا تھا۔''

''اور جو ہماری ناک سے ان ہیلر لگایا تھا؟''

''وہ اس گیس کا توڑ ہے۔'' نیک نام نے جواب دیا۔ وہ کچھ بے چین نظر آ رہا تھا۔

''ہاں، تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟''

''جناب، کیا ہم جس کام کے لئے آئے تھے، وہ ہو گیا ہے؟''

''تقریباً۔'' میں نے مبہم جواب دیا۔

''یعنی اس لڑکی کا حصول ہمارا مقصد تھا؟''

''ہاں، تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''اس صورت میں ہمیں فوری طور پر واپسی کا سفر شروع کرنا چاہئے۔''

''ابھی اس میں کچھ مسئلہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''واپسی کا فیصلہ ایک دو دن میں ہوگا۔''

''جناب، یہ وقت زیادہ ہے۔''

''اس مشن کا انچارج کون ہے؟'' مجھے اس کے انداز پر غصہ آ گیا تھا۔

''آپ جناب۔''

''اس لئے فیصلہ بھی مجھے کرنا ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ناؤ گو...... اور میرے آئندہ احکامات کا انتظار کرو۔''

''یس سر!'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اباؤٹ ٹرن کے انداز میں گھوم کر کوٹھی کے عقبی حصے میں چلا گیا۔

''تو نے بالکل ٹھیک سلوک کیا اس کے ساتھ۔'' سفیر نے ہنس کر کہا۔

''مجھے اس کے تیور بدلے ہوئے لگ رہے ہیں۔'' میں نے تشویش سے کہا۔

''کیا یہ ہمیں بائی پاس کرنے کی کوشش کریں گے؟''

''ممکن ہے......اب میں کسی بھی شے یا واقعے کے لئے تیار رہتا ہوں۔ کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔''

''ہم پر بھی نہیں؟'' سفیر نے دل گرفتگی سے کہا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ''مونا اور تُو میرے وجود کا ایک حصہ ہو۔''

''اندر چل، سردی بڑھ رہی ہے۔'' اس نے میری کمر پر ہاتھ رکھ کر دھکیلا۔

ڈنر ہم نے مہمان خانے کے ڈائننگ روم میں کیا تھا۔ ملازم نے فرخ شاہ کی طرف سے معذرت کی تھی، وہ کسی تقریب میں شرکت کرنے گیا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے کافی نشست گاہ میں منگوائی تھی۔ باہر بارش شروع ہوگئی تھی اور سردی کی شدت میں یکلخت اضافہ ہوگیا تھا۔ ایمن منتظر تھی کہ میں اسے بتاؤں کہ میں اس کی مدد کیوں کر رہا تھا؟ کیا میری کوئی غرض ہے یا میں بے لوث تھا؟ میں نے کہا۔ ''ایمن! اگر میں کہوں کہ میں بے غرض ہوں تو یہ غلط ہوگا۔ اس معاملے سے میری غرض ہے۔ تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں بتایا کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔ کیسے میں ایک سیدھے سادے کاروباری سے آج اس مقام پر ہوں کہ دشمن سے بچنے کے لئے میں اپنی جان دے سکتا ہوں اور اس کی جان لے بھی سکتا ہوں۔''

''ہاں......میں نے آج بھی دیکھا تھا......یہ لوگ کون ہیں؟''

''میرے ہمدرد ہیں۔ ڈیوڈ شا اور اس کے مقامی ساتھی جو میرے اصل دشمن ہیں، ان سے مقابلہ کرنے کے لئے مجھے ہمدردوں کی ضرورت ہے۔ یہی نہیں اور بھی بہت سارے لوگ ہیں جو میرے ساتھ ہیں، اب میں اکیلا نہیں ہوں۔''

''مورشید آلی۔'' اس نے اٹک کر کہا۔ ''یہی نام ہے ناں تمہارے دشمن کا؟''

''ہاں، وہی میری دربدری کا ذمے دار ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''مجھے شبہ ہے، تمہیں اغوا کرنے کے لئے آنے والے افراد اصل میں مرشد علی کے آدمی تھے۔''

''ڈیوڈ سے اس شخص کا کیا تعلق ہے؟''

''دونوں ایک جیسی مجرمانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ڈیوڈ شا اور مرشد علی کے درمیان تعلق کیسے شروع ہوا لیکن راجا عمر دراز سے تصویر حاصل کرنے کے لئے ڈیوڈ نے مرشد علی اور فتح خان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ فتح خان سے تم اچھی طرح واقف ہو۔''

''اس خوف ناک آدمی کو میں کیسے بھول سکتی ہوں؟'' اس نے جھرجھری لی۔ ''اگر تم نہ ہوتے تو میرا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔ اس شخص کی نیت مجھ پر خراب تھی۔'' اس نے سادگی سے کہہ دیا اور مونا جھینپ گئی تھی۔ کافی آئی، مونا نے ٹرالی لے کر ملازم کو رخصت کر دیا اور خود کافی بنانے لگی۔

''مجھے معلوم نہیں تھا ڈیوڈ اس حد تک گر سکتا ہے۔'' کچھ دیر بعد ایمن نے کہا۔ ''وہ میرے پیچھے کیوں ہے؟''

''میں نے کہا ناں، وہ تمہیں روکنا چاہتا ہے مگر اصل خطرہ تمہیں فتح خان سے ہے۔ وہ بے حد مکار شخص

ہے، تمہیں یرغمال بنا کر وہ تمہارے باپ سے ہیرے نکلوائے گا اور پھر شاید تم دونوں کو ختم کر دے گا۔"

کافی نوشی کے دوران میں اسے مرشد علی، ڈیوڈ شا اور فتح خان سے مقابلے کی رُوداد سناتا رہا۔ باتیں ہوتی رہیں...... رات سرد ہوتی جا رہی تھی۔ گرج چمک کے ساتھ دھیمی بارش مستقل جاری تھی۔

"شہباز...... مجھے کسی حد تک سمجھ میں آ رہا ہے لیکن میں تمہارے ساتھ رہوں تو تم میری مدد کس طرح کرو گے؟ میرے ڈیڈی کو فتح خان کے چنگل سے کیسے نکالو گے؟"

"فی الحال اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ایمن تم ہمارے ساتھ رہو یا نہ رہو لیکن ہم ان کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے اور اس سلسلے میں جو کچھ بن پڑا کریں گے۔"

اس نے سر ہلایا تھا۔ مونا نے جماہی لی۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔" اس نے منمنا کر کہا۔

"تم لوگ جا کر سو جاؤ۔" میں نے سفیر کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

"ہاں یار، میرا تو برا حال ہے، اس لئے میں چلا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

مونا بھی کھڑی ہو گئی۔ "میں بھی جا رہی ہوں، ایمن تم آ جانا۔"

"او کے گڈ نائٹ!" اس نے سر ہلایا۔

اصل میں، مَیں نے محسوس کیا تھا کہ ایمن ان دونوں کے سامنے کھل کر بات کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ شاید وہ ان سے بے تکلفی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر خاموش رہی تھی پھر اس نے میری طرف جھکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔ "میں تمہیں یاد رہی تھی؟"

"ہاں...... تم بھولنے والی چیز نہیں ہو۔" میں نے کسی قدر بوکھلا کر کہا۔

"اچھا، میری کیا چیز یاد رہی۔"

"سب کچھ...... مطلب یہ کہ خصوصیت سے نہیں۔" میں نے نظریں چرائیں۔

"اس وقت کے مقابلے میں مجھ میں کیا تبدیلی آئی؟" اس کا سوال اکسانے والا تھا کہ مجھے دیکھو اور موازنہ کرو۔ سچی بات ہے، وہ گیارہ سال پہلے کی نوخیز ایمن کے مقابل میں میچور اور بھرپور جوان عورت میں بدل چکی تھی۔ اس وقت وہ جسمانی لحاظ سے متناسب تھی تو اب متناسب ترین ہو گئی تھی لیکن میں نے ان خصوصیات کا ذکر نہیں کیا اور متانت سے جواب دیا۔ "تم ذہنی لحاظ سے میچور اور مضبوط ہو گئی ہو۔"

"صرف ذہنی لحاظ سے؟" اس نے پھر اکسانے والے انداز میں پوچھا۔

"نہیں اور لحاظ سے بھی۔" میں نے بادل ناخواستہ جواب دیا اور موضوع بدل دیا۔ "ایمن...... کیا تم مجھ پر اعتماد کرتی ہو۔"

"ہاں، کیوں نہیں ورنہ میں کسی اور کے ساتھ اس طرح آ سکتی تھی؟" اس نے آنکھیں پھیلا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے دل میں اعتراف کرنا پڑا۔ مغربی حسن کا اتنا مکمل نمونہ کم ہی میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ حالانکہ سیاحوں کی صورت میں آئے دن میرا واسطہ گوریوں سے پڑتا رہتا تھا لیکن ان میں کوئی ایمن جیسی نہیں تھی۔

"تب مجھ پر بھروسا بھی کرو۔ میں تمہارے باپ کو فتح خان کے چنگل سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا

اگر وہ زندہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔''

''کہاں؟'' اس نے پوچھا۔

''راجا عمر دراز کے پاس۔''

''اوہ نو......! میں اس پر اعتماد نہیں کر سکتی۔''

''ایمن! راجا اچھا آدمی ہے۔ اُس وقت بھی وہ چاہتا تو تم اتنی آسانی سے ملک سے نہیں جا سکتی تھیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو تمہارے باپ نے غلط کام کیا تھا۔ راجا کے محل سے چوری کروائی تھی۔ اگر وہ رپورٹ کروا دیتا تو آج تم اور برٹ شا پاکستانی پولیس کو مطلوب ہوتے۔''

''پھر بھی، میں اس پر اعتماد نہیں کر سکتی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے یقین ہے، اس نے ہمیں دل سے معاف نہیں کیا ہے۔ میرے دادا بتاتے تھے، راجا عمر دراز سخت دل قبائلی تھا۔''

''تم راجا نہ سہی...... مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''ہاں، میں تم پر اعتماد کر سکتی ہوں۔''

''ایمن تمہارے لئے واپسی کا راستہ کھلا رہے گا۔ دیکھو، تم اپنے باپ کو تلاش کرنے آئی ہو اور دشمن تمہاری راہ پر لگ گئے ہیں۔ اب تم صرف راجا کے محل میں محفوظ رہ سکتی ہو اور ہم برٹ شا کو تلاش کر سکتے ہیں۔''

''میں سمجھ گئی۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''لیکن شوبی، میں صرف تم پر اعتماد کر سکتی ہوں۔''

میں چونکا ''ارے تمہیں کیسے پتا چلا کہ میرا نِک نیم شوبی ہے.... مونا نے بتایا ہے؟''

''مجھے تو نہیں معلوم۔'' وہ حیران ہوئی۔ ''میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا، اِٹس ریئلی!''

''ہاں...... یہ حقیقت ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''مونا نے یہ نام رکھا تھا۔''

''یہ لڑکی کون ہے؟'' اس نے سرسری انداز میں پوچھا لیکن اس کے لہجے سے حسد کی بو صاف آ رہی تھی۔

''آئی مین...... تمہاری کیا لگتی ہے؟''

''کچھ نہیں اور سب کچھ۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''کیا مطلب......؟'' اس کے انداز میں تشویش آ گئی تھی۔

''میری دوست ہے، بہن ہے اور جب سفیر کی بیوی بھی بن جائے تو بھابی بھی ہو گی۔''

''اچھا!'' اس نے سکون کا سانس لیا اور دلچسپی سے بولی۔ ''یہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں؟''

''ہاں...... لیکن اظہار نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کے سامنے اعتراف کرتے ہیں۔ تم اس معاملے میں محتاط رہنا۔ اشارتاً بھی اس بارے میں کوئی بات مت کرنا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''تمہاری شادی نہیں ہوئی...... لیکن کیا تم نے کسی کو پسند بھی نہیں کیا؟''

''پسند......'' میں نے سر کھجایا۔ ''اصل میں فرصت ہی نہیں ملی۔ کاروبار میں لگا رہا، بہت مصروفیات والا کام تھا۔ یعنی ٹورا یجنسی چلانا۔''

''اب تمہارا کام کون چلا رہا ہے؟''

''کوئی بھی نہیں۔ صرف اسکردو اور گلگت والے دفاتر کام کر رہے ہیں۔ یہاں کا آفس بھی جلا دیا دشمنوں

نے۔ میرا چوکیدار بھی مارا گیا۔"

"اوہ......" اس نے افسوس کیا۔ "اس چکر میں تمہیں بہت دھچکا لگا ہوگا۔"

"ہاں...... یہ تو ہے...... لیکن جو خدا کی مرضی......" میں نے گہری سانس لی۔

نشست گاہ کے ایک طرف شیشے کی دیوار تھی جس سے کوٹھی کے بائیں طرف کا باغ نظر آتا تھا۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی اور باغ میں تاریکی تھی کیونکہ کھمبوں پر بلب لگے تھے، بارش کی نمی سے ان کے کنکشن شارٹ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے شاید اسی لئے تمام بلب بند تھے۔ بارش کی بوندیں اندر کی روشنی میں برستی نظر آ رہی تھیں۔ باہر ایک نظر ڈال کر میں ایمن کی طرف مڑنے والا تھا کہ اچانک باغ کے ایک گوشے میں چند لمحے کے لئے روشنی لہرائی اور پھر بجھ گئی۔ میں چونکا۔ اس وقت باغ میں کون ہوسکتا تھا؟ میں نے اٹھ کر شیشے سے باہر دیکھا۔ جہاں اب تاریکی تھی۔

"تم نے باغ میں کوئی روشنی دیکھی؟" میں نے ایمن سے پوچھا۔ "چند لمحے کے لئے۔"

"نہیں۔ میرا اس طرف دھیان نہیں تھا۔"

میں اس روشنی کو اپنا وہم سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ حالات نے مجھے محتاط ہی نہیں شکی بھی بنا دیا تھا۔ کوٹھی یا فارم ہاؤس کا کوئی فرد اس موسم اور سردی میں باہر کیوں جانے لگا۔ جا بھی سکتا تھا۔ میرے دل نے دلیل دی اور ذہن نے اسے مسترد کر دیا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ایمن سے کہا۔ "تم یہاں رکو، میں ابھی آتا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟" وہ میرے انداز سے بھانپ گئی۔ "کوئی خاص بات ہے؟"

"مجھے شبہ ہے باغ میں کوئی مشکوک فرد ہے۔" میں نے اپنی لیدر جیکٹ پہنی اور پستول نکال لیا۔ ایمن کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"میں بھی چلوں گی؟" اس نے کہا۔

"نہیں، تم اندر رہو۔" میں نے کہا پھر مجھے خیال آیا۔ "ہاں...... میرے ساتھ آؤ، تم دروازہ اندر سے بند کر لینا۔"

"مہمان خانے کا ایک دروازہ باہر باغ میں بھی کھلتا تھا۔ میں نے راہداری کی روشنی بند کر دی اور دروازہ کھولنے سے پہلے ایمن سے کہا۔ "میرے باہر جاتے ہی دروازہ بند کر لینا اور جب تک میں دستک نہ دوں، دروازہ مت کھولنا۔"

"مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم دستک دے رہے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں...... میں تین بار ہلکی سی دستک دوں گا اور اگر باہر سے فائر کی آواز آئے تو مونا اور سفیر کو اٹھا دینا۔"

"شوبی، اپنا خیال رکھنا۔" ایمن کا لہجہ لرز رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر تاریکی میں رینگ گیا۔ بارش کا پانی یخ بستہ تھا۔ اگر میں نے گلے تک جیکٹ کی زپ نہ بند کر رکھی ہوتی تو لمحوں میں شرابور ہو جاتا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا باغ کے اس حصے کی طرف جانے لگا جس طرف مجھے روشنی نظر آئی تھی۔ اگرچہ تاریکی میں نہ تو کچھ نظر آ رہا تھا اور نہ ہی بارش

کے شور میں کوئی آواز سنائی دے رہی تھی، اس کے باوجود میری چھٹی حس خطرے کا اشارہ دے رہی تھی۔ اچانک بجلی چمکی اور سارا ماحول لمحے بھر کے لئے روشن ہو گیا۔ میں نے کسی کو دائیں طرف پھولدار پودوں کے عقب میں جاتے دیکھا۔ یہ خاصے اونچے اور گھنے پودے تھے۔ میں نے فوری طور پر حرکت کرنے سے گریز کیا۔ جیسے میں نے اس شخص کو دیکھ لیا تھا، ممکنہ طور پر اس نے یا کسی دوسرے نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور اس کا فوری ثبوت بھی مل گیا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ کوئی شے میرے برابر میں دیوار سے ٹکرائی۔ اگلے ہی لمحے میں نیچے گر گیا اور شاید اسی وجہ سے میری جان بچ گئی تھی۔ کھٹا کھٹ کر کے ایسی ہی کئی گولیاں دیوار سے ٹکرائی تھیں۔ کوئی بے آواز ہتھیار سے فائر کر رہا تھا۔ میں لیٹے لیٹے واپس کھسکنے لگا۔ میں اگلی بار بجلی چمکنے سے پہلے کسی محفوظ جگہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی، میرے دشمن یہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے کسی طرح سے ہمارا ٹھکانہ ڈھونڈ نکالا تھا، میں اس سے بے خبر تھا۔

میرے پاس اعشاریہ اڑتیس والا پستول تھا اور یہ خاصا زوردار دھماکا کرتا تھا۔ نیک نام اور اس کے ساتھیوں کے پاس بے آواز ہتھیار بھی تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس اس طرف آئے۔ اگر حملہ آوروں سے نمٹنے کے لئے فائرنگ کرنا پڑتی تو یہ بات بھی یقینی تھی کہ اس کے بعد ہمیں یہاں سے فرار ہونا پڑتا۔ عمارت کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ حملہ آوروں کے لئے اندر گھسنا آسان نہیں تھا۔ میں اندر جا کر نیک نام کو بھی خبردار کر سکتا تھا۔ وہ لوگ زیادہ بہتر طور پر ان سے نمٹ سکتے تھے۔ اچانک کسی نے میری گردن پر کوئی شے رکھ دی۔

''خبردار! حرکت......''

اس کا جملہ ابھی منہ میں تھا کہ میں پھرتی سے گھومتے ہوئے بیٹھ گیا اور اپنے سر سے اس کے پیٹ میں ٹکر ماری۔ وہ کراہ کر جھکا تھا کہ میں نے سر کے اوپری حصے کو اندازے سے اس کے منہ پر مارا اور وہ ناگفتنی بکتا ہوا نیچے گرا۔ میں نے پستول کا دستہ اس کے سر پر مارا اور اس کی بک بک ایک دم رک گئی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے بغیر کسی تاخیر کے اسے کھینچنا شروع کر دیا۔ اس کا ہتھیار اندھیرے میں کہیں رہ گیا تھا۔ میں اسے دروازے تک لایا اور پھر آہستہ سے تین بار دستک دی۔ ایمن شاید دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا اور آہستہ سے بولی۔ ''شہباز!''

''پیچھے ہٹو'' میں نے کہا اور بے ہوش شخص کو کھینچتا ہوا اندر لے آیا۔ ''دروازہ بند کر دو...... جلدی۔'' میں نے کہا اور راہداری کی روشنی جلا دی۔ ''جا کر سفیر اور مونا کو بیدار کرد۔ کوٹھی میں شاید مسلح افراد گھس آئے ہیں۔''

ایمن جلدی سے کمروں کی طرف چلی گئی۔ میں نے اس شخص کا جائزہ لیا۔ جوان آدمی تھا۔ صورت اور حلئے سے نچلے طبقے کا لگ رہا تھا۔ سر پر ضرب کے نشان سے گومڑ بن گیا تھا۔ اتنے میں سفیر اور مونا بھی دوڑے آئے۔ ''کیا ہوا؟'' سفیر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ کون ہے؟''

میں نے مختصر الفاظ میں انہیں صورتِ حال بتائی اور بولا۔ ''نیک نام اور اس کے ساتھیوں کو ہوشیار کرنا پڑے گا۔''

میں نے فون ملایا۔ نیک نام نے دوسری بیل پر کال ریسیو کی۔

''یس سر!''

''خطرہ...... کچھ لوگ کوٹھی کے باغ میں ہیں۔ میں باہر گیا تھا، مجھ پر فائرنگ ہوئی۔ ان کے پاس بے آواز ہتھیار ہیں۔ ایک میرے ہتھے چڑھ گیا ہے اسے اندر لے آیا ہوں۔''

''میں سمجھ گیا...... آپ سب اندر رہیں...... اور کسی کو اندر نہ آنے دیں، کوئی ایسی کوشش کرے تو اسے شوٹ کر دیں۔''

''فائرنگ کی آواز گونجے گی تو ہم بھی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔''

''میں سمجھ گیا جناب!'' اس نے کہا اور کال ختم کر دی۔

''ہمیں ہوشیار رہنا ہے۔'' میں نے ان تینوں سے کہا۔ ''اپنے ہتھیار نکال لو۔ اگر کوئی اندر آنے کی کوشش کرے تو ہمیں اسے روکنا ہوگا۔''

''اندر آنے کے صرف دو راستے ہیں۔ یہ دروازہ اور دوسرا جو کوٹھی کے اندر کھلتا ہے۔''

''اسے بھی بند کر دو۔'' میں نے سفیر سے کہا اور وہ دروازہ بند کرنے چلا گیا۔

''یہ کون ہو سکتے ہیں؟'' ایمن نے سوال کیا۔

''ظاہر ہے، ہمارے دشمن...... ڈاکو بے آواز ہتھیار لے کر نہیں آتے ہیں اور نہ ہی بلاوجہ فائر کرتے ہیں کچھ دیر پہلے میں بال بال بچا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' مونا چونکی۔

''کسی نے اندھیرے میں مجھ پر بے آواز ہتھیار سے فائر کئے تھے۔ بس اللہ نے بچا لیا۔''

ایمن کا چہرہ فق ہو گیا تھا، اس نے میرا بازو تھام کر جذباتی انداز میں کہا۔ ''اب تم باہر نہیں جاؤ گے۔''

اس پر مونا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ''جب تک میرا آخری وقت نہیں آئے گا، تو صدر بش بھی مجھے نہیں مار سکتا۔''

ایمن نے منہ بنایا۔ ''یہ نام مت لو...... مجھے نفرت ہے اس شخص سے۔''

''اس لئے کہ ابھی تم ہمارے پاس ہو؟'' مونا نے طنز کیا۔

''نہیں۔'' ایمن غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یہ شخص شروع سے ناپسند ہے۔''

میں نے ملامت آمیز نظروں سے مونا کو دیکھا۔ ''اس شخص کو کوئی بھی معقول شخص پسند نہ کرے، خیر چھوڑو......'' میں نے کہا۔

اور اس شخص کو کھینچ کر دائیں طرف کے ایک کمرے میں لایا۔ یہ کمرا اس لحاظ سے محفوظ تھا کہ اس کا کوئی دروازہ یا کھڑکی باہر کی طرف نہیں کھلتا تھا۔ نہ جانے نیک نام اور اس کے ساتھی باہر کیا کرتے پھر رہے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ہم باہر نہ آئیں، اچانک باہر سے کسی نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ اندر تک صاف سنائی دی۔ مونا اور ایمن نے پوچھا۔ ''یہ...... یہ کیسی آواز تھی؟''

''یہ کس نے چیخ ماری؟'' مونا بولی۔

''دیکھ کر آتا ہوں۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو مونا اور ایمن نے بیک وقت دائیں بائیں سے پکڑ لیا۔

''تم باہر نہیں جاؤ گے۔'' مونا بولی۔
''نو......نو......'' ایمن کے لہجے میں اضطراب تھا۔
''تو مجھے کیا معلوم کس نے چیخ ماری تھی!'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''اب آپ دونوں ذرا چپ بیٹھیں۔''
''یار اس کا کیا کرنا ہے؟'' سفیر بولا۔ وہ بے ہوش شخص کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔
میں نے اس کا معائنہ کیا۔ بے ہوشی خاصی گہری تھی اور ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے اس کے ہوش میں آنے کے کوئی امکانات نہیں تھے، میں نے اسے باندھنے کی تجویز پیش کی سفیر نے دروازے کے سامنے لگے پردے کو پھاڑ کر اس کی پٹیاں بنالیں اور ان پٹیوں سے۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے ایک طرف ڈال دیا۔ ہمارے پاس کل تین پستول تھے اور ایمن خالی ہاتھ تھی۔
اگر کوئی ہتھیار ہے تو مجھے بھی دو۔'' اس نے مطالبہ کیا۔ ''میں نے باقاعدہ تربیت لی ہے۔''
''افسوس کہ ہمارے پاس کل یہی ہتھیار ہیں اور اتفاق سے ہم تینوں کو چلانا بھی آتے ہیں۔'' میں نے معذرت کی۔
اس چیخ کے بعد مزید کوئی آواز نہیں آئی۔ اچانک گیلری میں باہر کھلنے والے دروازے پر کسی نے پے در پے فائر کئے۔ غالباً لاک توڑنے کے لئے۔ اس بار بھی ہتھیار بے آواز تھا، صرف دروازے سے گولیاں ٹکرانے اور اس کی کھپچیاں اُڑنے کی آواز آئی تھی۔ میں نے کمرے کے دروازے سے جھانکا۔ دروازے کا لاک ٹوٹ گیا تھا اور دروازہ جھول رہا تھا۔ کسی نے دروازے پر لات ماری اور فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے مونا سے اس کا اعشاریہ بتیس کا پستول لیا، اس کی آواز زیادہ نہیں تھی۔ اگر فائر کرنا پڑتا تو امید تھی کہ آواز فارم ہاؤس سے باہر نہیں جائے گی۔ جیسے ہی پہلے شخص نے اندر گھسنے کی کوشش کی، میں نے اس کے پیروں پر فائر کیا اور دروازے پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا اسے پھلانگ کر اندر آیا تھا اور چند ثانیے میں دروازے تک آ سکتا تھا۔ احتیاط کا وقت نہیں تھا، میں نے اس بار اوپر فائر کیا اور وہ سینہ تھام کر ڈھیر ہو گیا۔ دو سپاہی ناکارہ ہونے کے بعد حملہ آور سپاہ کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ٹانگ پر گولی کھانے والا رینگتا ہوا باہر جا رہا تھا۔ میں نے اسے جانے دیا۔ سینے پر گولی کھانے والا اوندھے منہ ساکت پڑا تھا۔ اس کے بعد مزید کسی نے اندر آنے کی کوشش نہیں کی۔
مجھے نیک نام سے بات کئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ بے حد ٹینشن کی کیفیت میں ہم انتظار کر رہے تھے کہ اس کی طرف سے پیغام ملے۔ میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ ''یار! کہیں ان لوگوں کے ساتھ مسئلہ نہ ہو گیا ہو؟''
''عین ممکن ہے، آنے والے مسلح اور جان کی بازی لگانے والے لگتے ہیں۔ ورنہ یہ اس طرح بے دریغ اندر نہ آتے۔'' اس نے مرنے والے کی طرف اشارہ کیا۔
''اس صورت میں ہم اس جگہ محصور ہو جائیں گے۔'' میں نے تشویش سے کہا۔ ''ایک دستی بم ہم سب کا خاتمہ کرنے کے لئے کافی ہے۔''
یہ بات میں نے آہستہ سے کہی تھی لیکن کونوں میں دبکی خواتین نے سن لی تھی۔ ایمن نے گھبرا کر کہا۔
''اوہ نہیں کچھ کرو شوبی!''

''شوبی!'' سفیر نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔'' خاتون بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔ اتنی جلدی شوبی تک آ گئیں۔''

''بکواس نہ کر...... وہ موٹا نے بولا تھا تو میرے نِک سے واقف ہو گئی۔'' میں نے جھینپ کر کہا۔

''فکر مت کرو۔'' سفیر نے ایمن کو تسلی دی۔'' وہ تمہیں زندہ لے جانے کے لئے آئے ہیں۔ ورنہ ہمارے لئے وہ راکٹ لانچر یا توپ لاتے۔''

''مورشید اتنا خطرناک آدمی ہے؟'' ایمن نے حیرت سے پوچھا۔

''سفاک سمجھ لو۔ اپنے مقصد کے لئے انسان کو بے دردی سے استعمال کرنے والا۔ جیسے چنگیز خان یا ہٹلر تھے۔''

''اتنا خطرناک ہے؟'' ایمن دنگ رہ گئی تھی۔

''لیکن تمہارے چچا ڈیوڈ شا سے کم...... اس نے محض ایک تصویر کی خاطر کئی درجن افراد مروا دیئے تھے۔ کتنے ہی گھر اجاڑ دیئے، تبھی تو وہ مرشد علی کا باس بنا ہوا ہے۔''

ایمن نے جھرجھری لی۔'' مجھے پتا نہیں تھا کہ ڈیوڈ شا اتنا بھیانک ہو گا؟''

اسی لمحے دروازے کے باہر آہٹ ہوئی اور ہم چوکنے ہو گئے پھر ہم نے نیک نام کی آواز سنی۔'' میں ہوں...... سب ٹھیک ہے۔''

اس کے باوجود میں نے پہلے احتیاطاً جھانکا۔ کوئی نیک نام کی کمر پر پستول رکھ کر بھی یہ بات کہلوا سکتا تھا لیکن وہ اکیلا تھا۔ وہ اندر کمرے میں آیا۔'' کیا حالات ہیں؟''

''کوٹھی میں اس وقت کوئی حملہ آور نہیں ہے۔ دو باہر مارے گئے ہیں اور ایک یہاں پڑا ہے۔ باقی شاید فرار ہو گئے ہیں۔ ان میں کچھ زخمی بھی ہوں گے۔''

''انہیں جہنم میں جھونکو۔ فرخ شاہ کے ملازمین اور چوکیدار کیا کر رہے ہیں؟''

''چوکیدار مارا گیا ہے۔'' نیک نام نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔'' ملازمین اپنے کوارٹروں میں ہیں، انہیں معاملے کی خبر نہیں ہے اور وہ سب خیریت سے ہیں۔''

چند منٹ بعد فرخ شاہ بھی وہاں موجود تھا۔ اسے سوتے سے اٹھا کر لایا گیا تھا۔ اس کے اہلِ خانہ کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ کوٹھی میں اکیلا رہتا تھا اور اس وقت بھی اکیلا تھا۔ حملہ آوروں کے بارے میں سن کر وہ پریشان نظر آنے لگا اور چوکیدار کے مرنے کا سن کر اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ اس نے کراہ کر کہا۔'' میرے خدا اب پولیس آئے گی۔''

''پولیس تو بہر صورت آتی۔'' میں نے راہداری میں پڑی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، انہیں ہم ٹھکانے لگا دیتے۔'' نیک نام نے اختلاف کیا۔'' لیکن چوکیدار کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس کے اہلِ خانہ بھی ساتھ رہتے ہیں۔''

''پولیس کا سامنا ہم کسی صورت نہیں کر سکتے۔'' میں نے غور کیا۔

''اس لئے ہمیں یہاں سے جانا ہو گا۔'' نیک نام بولا۔

''اس وقت......اتنی بارش میں۔'' مونا نے پریشانی سے کہا۔

''یہاں سے دو کلو میٹر اوپر میری ایک عمارت ہے۔'' فرخ شاہ نے کہا۔''فی الحال تم لوگ وہاں چلے جاؤ۔''

''جب دشمن فارم ہاؤس کے بارے میں جانتے ہیں تو اس عمارت کے بارے میں بھی جانتے ہوں گے۔'' نیک نام بولا۔''ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے، میرا خیال ہے، ہمیں یہاں سے رخصت ہو جانا چاہئے، آخری فیصلہ شہباز صاحب کریں گے۔'' اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

میں نے غور کیا اور نیک نام سے کہا۔'' جا کر ملازموں کو لو اور پورے فارم ہاؤس کو دیکھو۔ گاڑیوں کو خاص طور سے چیک کرنا۔ بوبی ٹریپ یا کوئی ڈی ٹیکٹر لگانا بہت آسان کام ہے۔''

وہ چلا گیا۔ میں نے فرخ شاہ کی طرف دیکھا۔'' آپ پولیس کو نصف گھنٹے بعد کال کیجئے۔ تب تک ہمیں غور کرنا ہے۔ اپنے کسی ملازم سے کافی بھجوا دیں۔''

وہ سمجھ دار آدمی تھا، یہ کہتا ہوا چلا گیا۔''میں ابھی بھجواتا ہوں۔''

میں ان سب کو لے کر اپنے کمرے میں آیا۔ ایمن جانے کے ذکر سے پریشان تھی۔''یہ آدمی کہاں جانے کی بات کر رہا تھا؟''

میں نے اس سے چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔''راجا عمر دراز کے پاس...... کیونکہ اب یہاں پولیس آئے گی اور ہم پولیس کا سامنا نہیں کر سکتے۔ پولیس حملہ آوروں کے بارے میں تو کیا ہی تفتیش کرے گی، ہمیں ضرور مال غنیمت میں لے جائے گی۔''

''اوہ......'' اس نے آہستہ سے کہا۔''لیکن مجھے راجا پر اعتماد نہیں ہے۔''

''تم اس پر نہیں، ہم پر اعتماد کرو۔'' میں نے نرمی سے سمجھایا۔

مونا اس معاملے میں بولنے کے لئے کچھ بے چین نظر آ رہی تھی۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔''اگر تم ہم پر اعتماد نہیں کرتیں تو جو مرضی آئے کرو۔''

''مونا۔ خدا کے لئے چپ رہو۔'' سفیر نے اسے ڈانٹا تو وہ چپ ہو کر منہ بنانے لگی، میں نے بھی اسے تیز نظروں سے گھورا۔

''ایمن تمہیں جلدی فیصلہ کرنا ہے اور ہمارے ساتھ جانا ہے۔ میں تمہیں کسی صورت چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

''اوہ اچھا...... کیوں؟'' وہ کھل اٹھی تھی۔

''بس مجھے تمہارا خیال ہے۔'' میں نے بوکھلا کر مونا اور سفیر کی طرف دیکھا۔''ایک بار تم پولیس کے ہاتھ آ گئیں تو مرشد علی کے توسط سے جلد ڈیوڈ شا تک پہنچ جاؤ گی۔''

''اوکے...... میں تمہارے ساتھ چلوں گی لیکن ایک بار پھر کہہ رہی ہوں، میں راجا پر اعتماد نہیں کر سکتی صرف تمہارے بھروسے پر جا رہی ہوں۔''

ملازم کافی لے آیا۔ کافی پی کر ہم نے کپڑے بدلے۔ اپنا سامان پیک کیا۔ صرف ایمن خالی ہاتھ تھی۔

اس کے پاس ہینڈ بیگ تھا جس میں اس کی ضروری اشیاء تھیں۔ کپڑے نہیں تھے۔ فرخ شاہ نے اس کے لئے ایک زنانہ کوٹ مہیا کر دیا تھا۔ اسے پہن کر وہ سردی سے کسی قدر محفوظ رہ سکتی تھی۔ نیک نام نے اپنے آدمیوں اور فرخ شاہ کے ملازمین کی مدد سے پورے فارم ہاؤس کی تلاشی لے لی تھی اور حملہ آوروں کا کوئی آدمی نہیں ملا تھا، وہ تین لاشیں اور ایک زخمی چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ ''اسے بھی لے کر چلنا ہے۔'' میں نے بے ہوش زخمی کی طرف اشارہ کیا۔

''اوکے۔'' نیک نام نے اپنے آدمیوں کو کہا اور وہ اسے لے گئے۔ ''اسے لے جا کر کیا کرنا ہے۔''

''اس سے پوچھ گچھ کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور اس کے بعد؟''

''یار! بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ اب جا کر چلنے کی تیاری کرو۔'' میں نے جھلا کر کہا۔

نیک نام کے جانے کے بعد میں نے سفیر اور دونوں خواتین سے کہا۔ ''ہمیں طویل سفر کرنا ہے اور راستے میں کم سے کم رکنا ہے۔ بہتر ہے کھانے پینے کی اشیاء اور چائے کافی تیار کر لی جائے۔ راستے میں خطرہ ہوگا۔''

''دشمن تعاقب کرے گا؟'' سفیر نے غور کیا۔

''اگر نہ کرے تو احمق ہوگا۔'' وہ یہاں سے نکلنے کے راستوں پر گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔''

''تب وہ ہمیں روکنے کی کوشش کریں گے۔''

''لازمی بات ہے لیکن اس ہزیمت کے بعد امید ہے وہ اتنی جلدی ہمارے سامنے آنے کی کوشش نہیں کریں گے۔''

فرخ شاہ نے نیک نام کو متبادل راستوں کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ فارم ہاؤس کے عقب سے گھومتا مری ہائی وے پر جا نکلتا تھا۔ ''یہ راستہ خراب اور اس موسم میں اس پر سفر کرنا آسان نہیں ہوگا۔''

''ہم اس سے نہیں جائیں گے۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''اگر میں دشمن کی جگہ ہوتا تو اپنی ساری طاقت اس راستے پر لگا دیتا، ہم سامنے کی طرف سے جائیں گے۔''

نیک نام فکر مند نظر آنے لگا۔ ''کیا ایسا کرنا مناسب ہوگا؟''

''بالکل...... کیونکہ اس خراب راستے پر دشمنوں نے ہمیں گھیر لیا تو فرار کی گنجائش کم ہو گی، جب کہ ہائی وے پر ہمارے پاس بہتر موقع ہوگا۔''

''شہباز صاحب درست کہہ رہے ہیں۔ اس طرف گھات لگانے کے مواقع کم ہیں۔'' فرخ شاہ نے کہا۔

''میں اپنے آدمی بھیجتا ہوں...... اگر کوئی مشکوک فرد ہوا تو ہمیں پتا چل جائے گا۔''

فرخ شاہ نے اپنے ایک ملازم کو طلب کر کے اسے ریکی کے مشن پر روانہ کیا۔ اس دوران میں کھانے کا سامان تیار ہو رہا تھا۔ فرخ شاہ کے باورچی نے فٹافٹ پیزا اور ایگ سینڈوچز بنا کر ایک بڑے سائز کے ہاٹ پاٹ میں پیک کر دیئے تھے۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ راستے میں دوبار آرام سے کھا سکتے تھے۔ دو بڑے سائز کے تھرماس چائے اور کافی سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بسکٹ اور پیسٹریاں بھی تھیں۔ جب تک فرخ شاہ کا ملازم واپس آیا۔ ہم پورچ میں روانگی کے لئے تیار تھے۔ اس نے رپورٹ دی۔ ''جناب، دور تک کوئی نہیں ہے۔

سڑکیں اور راستے ویران ہیں، مجھے راستے میں ایسی کوئی گاڑی نظر نہیں آئی جس میں کوئی فرد ہو۔"

"پھر بھی کوئی نہ کوئی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اصل گھات انہوں نے دوسرے راستے پر لگائی ہوگی۔ ہمیں تیزی سے نکل جانا چاہئے۔"

"نیک نام نے اتفاق کیا۔ میں نے فرخ شاہ سے ہاتھ ملایا۔ "مسٹر شاہ! میں تمہارا شکر گزار ہوں، تم نے میری مدد کی۔"

"نو پرابلم!" اس نے گرم جوشی سے کہا۔ "مجھے امید ہے تم دوبارہ اس طرف آئے تو مجھ سے ضرور ملو گے۔"

"ان شاء اللہ۔" میں نے کہا اور وین میں بیٹھ گیا۔

نیک نام نے اپنے ڈرائیور کو روانگی کا حکم دیا۔ "سوائے ہیڈ لائٹس کے تمام روشنیاں بجھا دو۔"

آدم خان نے تمام فالتو روشنیاں بجھا دیں۔ باہر جانے والا راستہ بارش کی وجہ سے خراب تھا۔ جا بجا گڑھوں میں پانی بھرا تھا۔ اس وقت بھی ہلکی بارش جاری تھی۔ باہر ہائی وے تک آنے کے بعد صاف سڑک ملتے ہی آدم خان نے رفتار بڑھا دی۔ اس دوران میں نیک نام آنکھوں پر نائٹ وژن گاگلز لگائے راستے کا جائزہ لے رہا تھا، اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "ایک گاڑی آ رہی ہے، اندازاً سو میٹر دور ہے۔ رفتار تیز کروں۔"

"نہیں اسی رفتار سے چلتے رہو...... وہ نزدیک آنے کی کوشش نہیں کر رہی ہے۔"

"اسپائنگ پھینکوں......؟" آدم خان نے پھر پوچھا۔

"نہیں...... ممکن ہے ابھی کچھ اور بھی ہوں۔" نیک نام نے جواب دیا۔ "صورتِ حال پوری طرح واضح ہونے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔"

"پیچھے آنے والی گاڑی دشمن کی ہے؟" مونا نے سادگی سے پوچھا۔

"ظاہر ہے ورنہ اس موسم میں کون ہیڈ لائٹس آف کر کے سفر کرتا ہے۔" سفیر نے کہا

"اوہ...... ہاں۔" مونا خفیف ہو گئی تھی۔

"سر، آگے رکاوٹ ہے۔" اچانک آدم خان بولا۔

میں نے آگے ہو کر دیکھا۔ ہیڈ لائٹس کی طاقتور روشنی میں ایک تنگ مقام پر ایک بڑی جیپ اس طرح کھڑی تھی کہ وین کے گزرنے کا راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ نیک نام نے فوراً کہا۔ "اُڑا دو اور وین کو بلٹ پروف کر دو۔"

آدم خان نے پتا نہیں کیا، کیا کہ وین کے تمام شیشوں پر فولادی چادر چڑھ گئی۔ حد یہ کہ ونڈ شیلڈ پر بھی ایک فولادی چادر اس طرح آئی تھی کہ صرف ڈرائیور کے دیکھنے کے لئے سات آٹھ انچ قطر کا سوراخ تھا لیکن آدم خان نے اس سے دیکھنے کے بجائے چھت سے کچھ کھینچ کر نیچے کیا۔ ایک دوربین نما شے نیچے آئی۔ وہ بالکل اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔

"یہ آبدوز کی دوربین کی طرح ہے۔" نیک نام نے مجھے بتایا۔ "اس سے باہر کا سارا منظر صاف نظر آتا ہے۔"

آدم خان نے وین کی رفتار کسی قدر تیز کی۔ ہم سب نے پہلے ہی سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔

''ہوشیار...... آگے جھک جائیں۔'' آدم خان نے تیز لہجے میں کہا، اسی لمحے وین نے جست بھری، لوہے سے لوہا ٹکرانے کا اور شیشہ بکھرنے کی سمع خراش آواز آئی۔ اس آواز میں ٹائروں کی آواز دب گئی تھی۔ گولیاں وین کی فولادی چادر سے ٹکرائی نہیں لیکن ان کی حیثیت کسی بدمست ہاتھی پر پھینکی جانے والی کنکریوں سے زیادہ نہیں تھی۔ شیشہ بکھرنے کے بعد میں نے چند افراد کے چلانے کی آواز سنی جو یقیناً جیپ میں تھے۔ وین نے اسے سڑک سے نیچے دھکیل دیا۔ وہ قلابازیاں کھا گئی تھی۔ یہ سب بعد میں آدم خان نے بتایا تھا۔ اس نے جیپ کو ٹکر مارنے کے بعد کمال مہارت سے وین کو قابو کر لیا تھا۔ اسے سڑک سے اترنے نہیں دیا تھا۔ راستہ صاف ہوتے ہی نیک نام نے حکم دیا۔ ''اسپائک گرادو۔''

آدم خان نے ڈیش بورڈ کا ایک بٹن دبایا اور اس کے ساتھ ہی عقب سے فائرز کی آواز آئی تھی۔ وین کی چادر سے گولیاں ٹکرائیں اور حسبِ سابق اس کا کچھ بگاڑنے میں ناکام رہیں ایک موڑ کاٹتے ہی آدم خان نے شیشوں سے فولادی چادریں ہٹا دیں تھیں۔ اندر کی روشنی بجھا کر نیک نام نے پھر نائٹ ویژن گاگلز لگائی تھیں۔ اس نے عقب کا جائزہ لیا، اب راستے گھومنا شروع ہو گئے تھے اس لئے تعاقب کا درست طور سے اندازہ لگانا دشوار تھا۔ خاصی دیر بعد نیک نام نے کہا۔ ''میرا خیال ہے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ روشنی بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔''

''اس قسم کے راستوں پر روشنی بجھا کر ڈرائیو تو کی جا سکتی ہے لیکن تعاقب نہیں۔ آدم خان سے کہو تیز ڈرائیو کرے، جس حد تک بھی ممکن ہو۔ اس طرح پیچھے اگر کوئی روشنی بجھا کر ڈرائیو کر بھی رہا ہو تو وہ زیادہ دیر ہمارے پیچھے نہیں رہے گا۔''

''میرا خیال ہے، کیلوں نے کام کر دیا ہے۔'' آدم خان نے کہا۔

''یہ کیلیں کیا ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''گوکھرو ٹائپ کی کیلیں ہیں۔ وین کے پیچھے ایک خانے میں بھری ہیں، جسے بٹن دبا کر کھولا جا سکتا ہے۔ کیلیں سڑک پر بکھر کر تعاقب میں آنے والی گاڑی کے ٹائر برسٹ کر دیتی ہیں۔''

''خاصے عجائب رکھتی ہے تمہاری یہ گاڑی!'' سفیر نے تبصرہ کیا۔ جواب میں نیک نام مسکرایا تھا۔ بلندی پر آنے کے بعد بارش رک گئی تھی۔ خشک سڑک پر سفر کرنا نسبتاً آسان تھا۔ مری جانے کے بجائے ہم ایک سڑک سے نتھیا گلی کی طرف مڑ گئے تھے۔ اس طرف سے کئی راستے تھے جن میں ایک کاغان کی طرف بھی جاتا تھا۔ سفیر میرے برابر میں ڈرائیور سے عقب والی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس نے جھک کر آہستہ سے کہا۔ ''کیا ہم خطرے کی حدود سے باہر ہیں؟''

''میرا خیال ہے، نہیں۔'' میں نے بھی آہستہ سے کہا۔ ''دشمن احمق نہیں ہیں اور میں کم سے کم خان اور ڈیوڈ شا کو احمق سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اب مجھے خیال آ رہا ہے، وہ حملہ اس لئے کیا گیا تھا کہ ہم فارم ہاؤس سے نکل بھاگیں اور ہمیں راستے میں گھیر لیا جائے۔''

''جس قسم کے حالات پیش آئے ہیں، اس سے تو یہی لگتا ہے۔'' سفیر نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ''مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، یہ خود آنے کے بجائے پولیس کو بھی بھیج سکتے تھے۔ ظاہر ہے اس کا سامنا

کرنے پر بھی ہم بھاگ نکلنے کو ترجیح دیتے۔''

''ممکن ہے اتنی جلدی میں پولیس سے معاملہ نہ بنا ہو۔ مرشد علی کا اثر رسوخ مسلم ہے لیکن پولیس کے محکمے میں سب اس کے باپ کے غلام نہیں ہیں۔ اس لئے اندر آنے والے بے آواز ہتھیار لے کر آئے تھے۔ اگر فائر کرنا بھی پڑے تب بھی پولیس متوجہ نہ ہو۔''

''اور ان لوگوں کو ہمارا سراغ کیسے ملا؟''

''اب مجھے خیال آ رہا ہے۔ ہم نے فرخ شاہ کی گاڑی استعمال کر کے بے وقوفی کی تھی۔ دشمنوں نے یقیناً اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا اور پر اس کے سہارے فرخ شاہ کے فارم ہاؤس تک آ پہنچے تھے۔''

''آپ نے درست کہا، ایسا ہی ہوا ہوگا۔'' نیک نام نے مداخلت کی۔

''بس اس معمولی سی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔''

''میرے ذہن میں تھی یہ بات...... لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شاہ صاحب درست نمبر پلیٹ والی گاڑی دے دیں گے۔''

''نیک نام! اس راستے سے منزل تک پہنچنے، میں کتنی دیر لگے گی؟''

''راستہ طویل ہے اور راستہ بھی خراب ہو سکتا ہے۔ اس لئے زیادہ ٹائم بھی لگ سکتا ہے، ممکن ہے ہمیں راستے میں رکنا پڑے۔''

''تب اس ہوٹل میں رکنا جس میں ہم نے آتے ہوئے ڈنر کیا تھا۔''

''ہاں، وہ راستے میں آئے گا۔'' نیک نام بولا۔ ''لیکن ابھی ہوٹل تک بھی چھ سات گھنٹے کا سفر باقی ہے۔''

ہمارے پاس سوائے آرام کرنے یا سونے کی کوشش کرنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ عقبی نشستوں پر مونا اور ایمن آپس میں سر جوڑے محو گفتگو تھیں۔ ابتدائی کشیدگی کے بعد ان کے درمیان دوستانہ رویہ جھلک رہا تھا۔ میں نے نشست کو ذرا دراز کیا اور پشت سے سر ٹکا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ چند منٹ بعد مجھے سچ مچ نیند آ گئی۔ ہیٹر کی وجہ سے وین کے اندر خوشگوار گرمی تھی ورنہ باہر کا درجۂ حرارت یقیناً نفی میں تھا۔ جب وین کسی ناہموار راستے سے گزرتی تو خفیف جھٹکوں سے میری نیند متاثر ہوتی تھیں مگر میں دوبارہ سو جاتا۔ ایک بار دھچکے سے آنکھ کھلی تو ونڈ اسکرین کے باہر ہلکی روشنی میں، مَیں نے ہوٹل کی عمارت دیکھی، اس کے نیون سائن بجھے ہوئے تھے۔ ''ہم اتنی جلدی ہوٹل آ گئے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''جناب، آپ چھ گھنٹے سوتے رہے ہیں۔'' نیک نام ہنسا۔ میں نے دیکھا سفیر، مونا اور ایمن بھی بے خبر سو رہے تھے۔ البتہ نیک نام اور اس کے ساتھی جاگ رہے تھے۔ بلاشبہ وہ فرض شناس اور محتاط رہنے والے لوگ تھے شاید اس لئے اب تک زندہ تھے۔ میں نے ان تینوں کو جگایا۔

''اٹھ جاؤ۔ ہوٹل آ گیا ہے، باقی کسر یہاں پوری کر لینا۔''

اندر ہال سرد تھا لیکن باہر کے مقابلے میں یہ سردی بہت کم تھی۔ اندر ایک ملازم موجود تھا اور کاؤنٹر کے پاس اونگھ رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز نے اسے ہوشیار کر دیا۔ ''آیئے جناب...... ! ناشتے میں کچھ دیر ہے ابھی۔''

''ہمیں کمرے بھی چاہئیں۔'' میں نے کہا۔

''مل جائیں گے لیکن لائٹ نہیں ہے۔ کہیں تار ٹوٹ گئی ہے۔''

''کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیں بھی آرام کرنا ہے۔'' میں نے کہا اور کمرے بک کرانے لگا۔

کل چار کمرے بک کرائے تھے، تین ڈبل بیڈ کے اور ایک ٹرپل بیڈ کا۔ شمالی علاقے کے ہوٹلوں میں چار اور پانچ بیڈ کے کمرے بھی مل جاتے ہیں۔ بلکہ میں نے چھ اور سات بیڈ کے کمروں والے ہوٹلز بھی دیکھے ہیں۔ کاغذی کارروائی کے بعد ملازم نے جا کر مالک کو اٹھایا اور وہ ہمارے لئے ناشتا بنانے میں لگ گیا۔ سینڈوچز ٹھنڈے ہو چکے تھے اس لئے کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا، سب نے گرم ناشتے کو ترجیح دی۔ پہلے مونا اور ایمن نے خستہ پراٹھوں اور فرائی انڈوں کا ناشتا کیا اس کے بعد میری اور سفیر کی باری آئی اور جب تک ہم نے ناشتا ختم کیا، نیک نام اور اس کے ساتھیوں کو ناشتا مہیا کیا جانے لگا۔ جو ناشتا کر لیتا، اس کے لئے کچن سے گرم گرم چائے یا کافی آ جاتی۔ ایمن اور مونا اپنے مگ لے کر اوپر چلی گئی تھیں۔ سفیر بھی کافی پی کر اٹھ گیا۔

''مجھے تو شدت سے نیند آ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟'' میں نے نیک نام سے پوچھا۔

''ہم بھی سوئیں گے لیکن میرے دو آدمی احتیاطاً جاگتے رہیں گے۔ ہمارے لئے چار چار گھنٹے کی نیند کافی ہوتی ہے۔ شام تین بجے ہم پھر روانہ ہوں گے۔''

میں مطمئن ہو کر اوپر کمرے میں آ گیا۔ کھانے اور دوسرے انتظامات کی طرح کمروں کا معیار بھی اچھا تھا۔ صاف ستھرے بستر اور بو سے پاک تکیے اور کمبل تھے۔ سفیر ایسے ہی پورے کپڑوں میں لیٹ کر خراٹے لے رہا تھا، میں نے کپڑے بدلے۔ ایک سوتی پاجامہ اور جرسی پہن کر لیٹ گیا۔ اپنا لباس میں نے کمرے میں گرم ہوا کے داخلے کے سوراخ کے پاس رکھ دیا تھا تاکہ وہ گرم رہے اور پھر کمبل میں لپٹ کر بے خبر ہو گیا۔ پھر کسی وجہ سے میری آنکھ کھلی تھی۔ ابھی میں اس وجہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے بستر چھوڑا اور دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''سر، میں ہوں...... نیک نام۔'' دوسری طرف سے اس کی مدھم آواز آئی۔

میں نے پھر بھی کیٹ آئی سے جھانکا۔ ''نیک نام ہی تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ تیزی سے اندر آیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بج رہے تھے۔ ''خیریت...... کوئی خاص بات!''

''خاص الخاص جناب! ادھر آئیں۔'' اس نے کہا اور کھڑکی کے پاس آ کر پردہ ذرا سا سرکایا۔

''وہ دیکھیں سڑک کے دوسری جانب سرخ پتوں والا درخت نظر آ رہا ہے۔''

''سردی سے سارا جنگل سرخ ہو رہا ہے۔'' میں نے غور کیا۔

''نہیں جناب، وسط میں دیکھیں، ایک درخت زیادہ ہی سرخ ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

واقعی ایک درخت گویا شعلے اگل رہا تھا اور شاید چنار کا تھا۔ ''ہاں، ہے تو......''

ہمیں ہوٹل کے سامنے والے حصے میں دوسری منزل پر کمرے ملے تھے۔ ہوٹل سڑک سے ذرا ہٹ کر تھی۔ کوئی سو گز کا فاصلہ تھا۔ نیک نام نے مجھے ایک چھوٹی سی اور طاقتور دوربین تھما دی۔ ''اس سے دیکھیں۔''

''یار، اتنا سسپنس مت پھیلاؤ...... کیا دشمن ہے؟'' میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔
''خاصی حد تک امکان ہے۔ ٹارگٹ درخت کو بنائیے گا۔'' اس نے کہا۔
میں نے دوربین سے دیکھا۔ فوکس واضح تھا۔ ظاہر ہے نیک نام نے دیکھا ہو گا۔ درخت تلاش کرنے میں ذرا دیر لگی لیکن اس کے تلے چھپائی گئی جیپ فوراً ہی نظر آ گئی۔ اس جیسی ڈھلان پر کوئی فور وہیل ڈرائیو جیپ ہی چڑھ سکتی تھی۔ دو افراد اس کے سامنے کھڑے تھے۔ سر سے پاؤں تک گرم کپڑوں میں ملبوس انہوں نے شانوں پر ایم سولہ رائفلیں لٹکا رکھی تھیں۔ ایم سولہ ایک طرح سے روسی کلاشنکوف کا جواب ہے اور اس سے زیادہ جدید اور بہتر رائفل مانی جاتی ہے۔ مگر ہمارے ملک میں اس کا رواج کم ہے کیونکہ روسی اسلحہ بہتات سے اور بہت کم نرخوں پر دستیاب ہے۔
''دو آدمی ہیں۔'' میں نے کہا۔
''کم سے کم دو اور ہیں۔'' نیک نام بولا۔ ''اور یہ بھی دوربین سے ہوٹل کی عمارت کا جائزہ لے رہے تھے، ممکن ہے ان کے اور ساتھی بھی ہوں۔''
میں نے ان دونوں کا جائزہ لینے کے بعد دوربین سے اس ڈھلانی جنگل کا جائزہ لیا۔ ایک جگہ مجھے کسی کی جھلک نظر آئی، میں نے اس جگہ دوربین فوکس کی۔ ایک شخص درخت کے عقب میں تھا لیکن اس کا جسم جھلک رہا تھا اور خاص بات تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی جس کی نال بھی نظر آ رہی تھی، میں نے نیک نام کو دکھایا۔
''ایک آدمی اور ہے۔''
''نیک ناک نے دوربین سے دیکھا۔'' ہاں، یہ بھی مسلح ہے۔''
''اس کا مطلب ہے، دشمن مسلسل ہمارے تعاقب میں رہا ہے۔'' میں نے گہری سانس لی۔
''شاید لیکن ہم راستے بھر چوکنا رہے تھے۔'' نیک نام نے تشویش سے کہا۔
''کیا تمہارے آدمیوں نے اپنی وین میں بوبی ٹریپ کے ساتھ سگنل دینے والا آلہ بھی تلاش کیا تھا؟''
''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وین میں ایسے آلات نصب ہیں جو سگنل دینے والے آلات کی فوری نشان دہی کرتے ہیں۔''
''خیر، یہ اتنا مشکل نہیں ہے۔ یہ فتح خان کا علاقہ ہے اور اس کے لئے بہت آسان ہے کہ مختلف جگہوں پر اپنے آدمی تعینات کر دے۔ اس علاقے میں رسائی کے چند ایک راستے ہیں اور ہمیں ان میں سے کسی نہ کسی سے گزرنا ہی تھا۔ اس راستے پر بھی ان کے آدمی گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔''
''ایسا ہی ہوا ہو گا۔''
''اب سوال یہ ہے کہ ان سے چھٹکارا کیسے پایا جائے؟'' میں نے کہا۔
وہ مسکرایا۔ ''یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے جناب! آپ میری وین کی کارکردگی دیکھ چکے ہیں۔ ہم انہیں اپنے پیچھے لگا کر ویرانے میں لے جائیں گے اور ٹھکانے لگا دیں گے۔''
''ہم بھی چلیں گے۔''
''نہیں، آپ لوگ فی الحال یہیں رکیں۔'' اس نے سوچ کر کہا۔ ''ابھی ہمیں جانے دیں۔''

''ادھر تم انہیں ٹھکانے لگانے کے لئے لے جاؤ اور ادھر ان کے دوسرے ساتھیوں نے ہوٹل پر دھاوا بول دیا تو......؟''

''ہاں، یہ امکان بھی ہے۔'' وہ بولا۔ ''اس صورت میں ہمیں کم سے کم یہ شو کرنا ہوگا کہ ہم سب جا رہے ہیں۔''

''اور اس کے لئے رات کا وقت بہتر ہے۔'' میں نے غور کیا۔ ''نیک نام دشمن کو کبھی کمزور یا بے وقوف مت سمجھو۔ اس لئے ہر پہلو سے غور کر لو۔ تمہاری وین کی خصوصیات ان کے علم میں آ چکی ہیں اور ممکن ہے انہوں نے اس کا کوئی توڑ نکال لیا ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وین کی فولادی چادر گولیاں روک سکتی ہے لیکن انہوں نے راکٹ لانچر جیسی کوئی شے استعمال کر لی.....؟''

''ہاں، اس کا خطرہ ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''بہرحال ہمارا کام تو خطروں سے کھیلنا ہے، میں سارے امکانات اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھتا ہوں۔ ہم کوئی نہ کوئی پلان بنا لیں گے۔''

''اگر انہوں نے رات سے پہلے ہوٹل کا رخ کیا تو؟''

''میرا نہیں خیال کہ وہ تاریکی سے پہلے اس طرف آئیں گے۔ دن کی روشنی میں ہم انہیں بہ آسانی اپنا شکار بنا سکتے ہیں۔ ویسے میرے دو آدمی مستقل نگرانی پر ہیں۔''

میں نیک نام کے ساتھ اس کے کمرے تک آیا۔ اس کے ساتھی مسلح حالت میں کسی بھی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھے۔ وہاں ہمارے درمیان مختصر سی بحث ہوئی اور سب سے پہلے ہوٹل کا جائزہ لینے کا فیصلہ ہوا۔ دشمن کن راستوں سے حملہ کر سکتا تھا۔ میں اور نیک نام پہلے نیچے آئے۔ ہم نے گھوم پھر کر ہوٹل کے اندر باہر کا جائزہ لیا۔ عقبی سمت میں ڈھلان تھی اور پھر چار دیواری تھی یعنی اس طرف سے حملہ آسان نہیں تھا۔ ڈھلان کے نیچے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ''اس طرف سے رسائی آسان نہیں ہے۔'' نیک نام نے کہا۔ ''بظاہر گاؤں کی طرف سڑک سے کوئی راستہ نہیں جا رہا ہے۔''

''راستہ ہوگا جو آگے پیچھے نکلتا ہوگا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر انہوں نے بھرپور حملے کا فیصلہ کر لیا تو وہ عقب سے بھی آ سکتے ہیں۔''

''تو آپ کا خیال ہے وہ حملہ کریں گے؟''

''امکان ہے لیکن یہ دل کو لگ نہیں رہا ہے۔ وہ ہمیں باہر سڑک پر گھیرنے کی کوشش کریں گے، جہاں سے ہمارے بچ نکلنے کا امکان کم ہوگا۔''

''ممکن ہے۔'' نیک نام نے کہا اور اوپر چلا گیا۔ ہوٹل کے باہر دو عدد گاڑیاں کھڑی تھیں اور درجن بھر افراد کھانے کے منتظر تھے۔ ہوٹل کا مالک جو منیجر بھی خود تھا۔ چھوٹے قد کا مدقوق شخص تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ میرے پاس آیا۔

''اور صاحب کیسا ہے...... لنچ میں ابھی تھوڑا ٹائم لگے گا۔ ابھی ان لوگوں کو لنچ دے دیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں ہے...... ابھی میرے اکثر ساتھی سو رہے ہیں۔'' میں نے کہا اور ہوٹل کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ سامنے والے حصے میں ایک طرف پارکنگ تھی اور دوسری طرف سرسبز لان تھا جس پر چلغوزے، اخروٹ اور چیری کے درخت لگے تھے۔ میں نے خطرہ مول لیا تھا۔ مجھے دور سے گولی بھی ماری جا سکتی تھیں میرے دشمن میرے خون کے ایسے ہی پیاسے ہو رہے تھے۔ مرشد علی سے تو کبھی خیر کی توقع نہیں رہی تھی مگر اب ڈیوڈ شا اور فتح خان بھی مجھے کوئی رعایت دینے کو تیار نہ ہوتے، ایمن کو ان سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے میں ان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا، موقع ملنے پر وہ مجھے راستے سے ہٹانے سے ذرا نہ چوکتے۔

مگر اس وقت ان کے لئے اہم ترین فرد ایمن تھی۔ مجھے مارنے سے ان کا مقصد خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ سڑک سے جو راستہ ہوٹل کی طرف آتا تھا، وہ ایک چھوٹے سے نالے پر سے گزرتا تھا۔ یہ اصل میں ایک ٹیلا تھا جس پر ہوٹل قائم تھا۔ برساتی نالے کے اوپر لکڑی سے بنا مضبوط پل تھا جس پر بھاری سے بھاری گاڑی گزر سکتی تھی۔ نالے کی چوڑائی بیس پچیس فٹ سے زیادہ نہیں تھی اور اس وقت نالے میں بارش کا پانی کسی قدر تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جبکہ مجھے یاد تھا، صبح اس نالے سے پانی بہنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اوپری علاقوں میں بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے نالے میں پانی آیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اگر نالے کا پل توڑ دیا جاتا تو ہم ہوٹل میں محصور ہو کر رہ جاتے لیکن دشمن ایسا کیوں کرنے لگا۔ وہ تو ہمیں یہاں سے نکالنے کی فکر میں تھا۔ میں واپس آیا تو سفیر جاگ رہا تھا۔ میں نے اسے تازہ ترین حالات سے باخبر کیا۔ ''یار، یہ ہمارا پیچھا چھوڑیں گے بھی یا نہیں؟''

''جب تک زندہ ہیں، تب تک تو ممکن نہیں ہے۔''

''مونا اور ایمن کو بتایا؟''

''وہ ابھی سو رہی ہیں اور بلاوجہ ہراساں کرنے کا فائدہ! جب وقت آئے گا تو ان کو بھی پتا چل جائے گا۔''

''نیک نام کیا کہتا ہے؟''

''اس کا خیال ہے وہ اور اس کے ساتھی ہمیں چھوڑ کر اور وین لے کر نکلیں۔ دشمن تعاقب کرے گا۔ ذرا آگے جا کر ان کا قلع قمع کر دیں گے۔''

''اگر دشمن کا داؤ چل گیا تو ہمارا کیا بنے گا؟''

''سفیر.... یار، اتنا فکر مند کیوں ہو رہا ہے، کیا ہمارے بازو میں زور نہیں ہے؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''نیک نام تو ابھی آیا ہے جو خدا پہلے بھی بچاتا آیا ہے، وہی آگے بھی بچائے گا۔''

''سوری یار! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' سفیر شرمندہ ہو گیا۔

''چل دیکھتے ہیں، نیک نام نے کیا پلان کیا ہے؟'' میں نے موضوع بدل دیا اور ہم نیک نام کے کمرے میں آئے۔ وہ کھڑکی سے دوربین لگائے دیکھ رہا تھا۔

''ایک گاڑی اور آئی ہے۔'' نیک نام نے ہمیں مطلع کیا۔ ''ان افراد کی تعداد کم سے کم سات آٹھ ہے، اور وہ سب مسلح ہیں۔''

''کیا ہم کسی اور راستے سے نہیں نکل سکتے؟'' سفیر نے سوال کیا۔

''اس راستے کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہو تو بتائیں؟'' نیک نام ملائمت سے بولا۔

''تب ہمیں جلد از جلد نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔''

''شہباز صاحب کا خیال ہے رات کا وقت بہتر رہے گا۔'' نیک نام نے میری طرف اشارہ کیا۔

سفیر نے مجھے گھورا۔ ''رات تک وہ نہ جانے کتنی مدد حاصل کر چکے ہوں گے۔''

''دن میں انہیں دھوکا دینا مشکل ہے۔'' میں نے کہا۔ ''درحقیقت صرف نیک نام اور اس کے ساتھی جائیں گے جب کہ دشمن کو ایسا تاثر دینا ضروری ہے جیسے ہم سب جا رہے ہیں۔''

''باہر جا کر تم کیا کرو گے؟'' سفیر نے نیک نام سے پوچھا۔

''وہی جو پہلے تعاقب کرنے والوں کے ساتھ کیا تھا۔'' نیک نام مسکرایا۔

سفیر کے ذہن میں بھی وہی خیال آیا جو میرے ذہن میں آیا تھا۔ ''اس بار وہ زیادہ تیاری سے آئیں گے، معاملہ الٹ نہ جائے۔''

''ایسا ممکن ہے، اس صورت میں آپ لوگ ہوٹل کی عقبی طرف والی ڈھلان سے اتر کر ان سے دور جانے کی کوشش کیجئے گا۔''

''ہمیں اسلحہ بھی درکار ہے۔'' میں نے کہا تو نیک نام نے اپنے ایک آدمی کو وین سے اسلحہ لانے کے لئے روانہ کیا۔

''دشمن کا جو آدمی ہمارے پاس تھا، اس کا کیا ہوا؟'' مجھے خیال آیا تھا۔

''وہ وین میں محفوظ ہے۔ میرے آدمی اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔''

''یعنی تمہاری وین میں خفیہ خانے بھی ہیں؟'' سفیر بولا۔

''ذرا دیر میں جمعہ خان نامی شخص ایک بیگ لایا جس میں دو عدد چھوٹی ساخت کی کلاشنکوف رائفل تھیں۔ یہ کلاشنکوف سیریز کی مختصر اور ہلکی شکل اے کے چوہتر تھی۔ نیک نام نے کہا۔ ''ان کی مار اور درستی دونوں اے کے سینتالیس سے بہتر ہیں۔''

دو رائفلوں کے ساتھ چار عدد اضافی میگزین بھی تھے۔ مجھے خودکار رائفل چلانی آتی تھی۔ سفیر کو جمعہ خان چلانے کی تربیت دینے لگا۔ میں نے نیک نام سے کہا۔ ''میرا خیال ہے لنچ کے لئے کہہ دیا جائے، یہاں شام تیزی سے ہوتی ہے اور تاریکی ہوتے ہی ہمیں حرکت میں آ جانا ہوگا۔''

نیک نام نے اتفاق کیا۔ میں نے جا کر مونا اور ایمن کے کمرے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد مونا نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ ''کچی نیند سے اٹھا دیا۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''اب سونے کا وقت نہیں ہے، تیار ہو کر لنچ کے لئے نیچے آ جاؤ۔''

''اچھا!'' مونا نے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے نیچے کا رخ کیا اور ہوٹل کے مالک کو کھانے کا آرڈر دیا۔ ہال میں اب چار افراد تھے جو فارغ ہو کر چائے پی رہے تھے۔

''جناب کچھ دیر لگے گی۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''ویسے دال چاول اور چکن کڑاہی ہے۔ اس کے علاوہ جو آرڈر کریں گے، اس میں پون گھنٹا لگے گا۔''

''فی الحال یہی لے آؤ۔ پھر دیکھیں گے۔'' میں نے کہا۔ کچھ دیر میں سفیر اور دونوں خواتین بھی نیچے آ گئی تھیں۔ چاول اور اس کے ساتھ مسور کی دال تھی۔ دونوں کا ذائقہ لاجواب تھا۔ ساتھ ہی چکن کڑاہی تھی۔ ہم سب نے حالات کی کشیدگی بھلا کر پیٹ بھر کر کھایا۔ اتنے میں ان پانچوں نے اپنا کھانا اوپر منگوا لیا تھا۔ غالباً وہ کھانے کے ساتھ نگرانی بھی جاری رکھنا چاہتے تھے۔ نیچے آنے کی صورت میں نگرانی کرنا ناممکن تھا، کھانے کے بعد ہم نے چائے منگوائی۔ ایمن نے بدقسمتی سے سبز مرچوں کی چٹنی خاصی ڈال لی تھی، اوپر سے کڑاہی بھی خاصی چٹ پٹی تھی لیکن وہ کھانا ترک کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو ٹشو سے صاف کرتے ہوئے کھانا جاری رکھا۔ چائے پیتے ہوئے اس نے اعلان کیا۔ ''بائی گاڈ! اتنا مزے کا اور اتنا خوف ناک کھانا میں نے پہلے کبھی نہیں کھایا۔''

''ابھی تو تم نے ہماری طرف کی دھواں دھار نہاری اور حلیم نہیں کھایا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسے کھا کر انسان کے کانوں سے دھواں نکلنے لگتا ہے۔''

''ریئلی!'' اس نے شوق سے کہا۔ ''میں کھاؤں گی۔''

''ہاں، جب کھانے میں ہم وزن مرچ پڑی ہو تو دھواں نکلے گا۔'' سفیر نے اسے ڈرایا۔

''ہم وزن مرچ...... یہ کون ڈالتا ہے؟'' اس نے حیران ہو کر کہا۔ ''اتنی مرچ کھاتا کون ہے؟''

''کھانے والے کھاتے ہیں۔'' مونا نے چٹخارا لیا، وہ خود تیز مرچ کی شوقین تھی۔

''تم لوگ اتنی مرچ کیوں کھاتے ہو؟'' ایمن نے پوچھا۔

سفیر نے شرارت سے مونا کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے ہاں خواتین کا خیال ہے، مرچ کھانے سے زبان تیز ہوتی ہے اور گفتگو میں کاٹ آتی ہے۔''

''وہ تو دنیا کی ہر عورت کی زبان میں ہوتی ہے۔'' مونا خفگی سے بولی۔ ''جو بالکل بھی مرچ نہیں کھاتی ہیں۔''

''یعنی تم اعتراف کرتی ہو؟'' سفیر خوش ہو گیا۔

''جی نہیں، میں نے کوئی اعتراف نہیں کیا ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''مجھے تم لوگوں کے بعض رواج حیران کرتے ہیں۔'' ایمن نے کہا۔ ''پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ثقافت بدل جاتی ہے۔ لباس، خوراک، رسم و رواج اور زبان، سب بدل جاتی ہے اس کے باوجود تم سب خود کو پاکستانی کہتے ہو؟''

''کہتے نہیں ہیں...... پوز کرتے ہیں۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''جس دن سے خود کو پاکستان سمجھنا شروع کر دیا اس دن ہمیں دنیا پر چھانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

اس نے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ''جب تم اندر خود کو پاکستان نہیں مانتے ہو تو پھر کس چیز نے تمہارے ملک کو ایک رکھا ہے؟''

''اس نے، جس نے یہ ملک بنایا ہے، یعنی خدا کی ذات نے، کیونکہ نہ تو منطقی اعتبار سے اس ملک کا بننا سمجھ میں آتا ہے اور نہ ہی قائم اور مضبوط رہنا۔''

''منطقی وجہ....؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں.... جب تحریک پاکستان چل رہی تھی تو مسلمان کمزور اور اقلیت میں تھے۔ انگریز با اختیار اور ہندو ہر لحاظ سے مسلمانوں سے آگے تھے۔ اس کے باوجود وہ ہمیں پاکستان دینے پر مجبور ہوئے پھر مغربی دنیا کی آنکھوں میں کوئی مسلم ملک اتنا نہیں کھٹکتا ہے جتنا کہ پاکستان! تمام سپر طاقتوں نے اسے توڑنے کی سازش کی، آج بھی پاکستان ان کو قبول نہیں ہے۔ اندرونِ ملک اختلافات ہیں، مسائل حد سے زیادہ ہیں اوپر سے دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ بھی ہماری سرزمین پر جاری ہے۔ اس کے باوجود یہ ملک قائم ہے۔ ورنہ ایسا بھی ہوا کہ ملک میں ایک خاص طرز حکمرانی ختم ہوا تو ملک ہی بکھر گیا۔ سوویت یونین اور یوگوسلاویہ اس کی مثال ہیں۔ کتنے ہی طاقتور ممالک تھے۔ جن کے بڑی طاقتوں نے دو ٹکڑے کر دیئے۔ موجودہ حالات میں کسی ملک کا بکھر جانا بہت آسان ہے، اسے قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔''

پتا نہیں بات ایمن کی سمجھ میں آئی یا نہیں آئی۔ تاہم وہ چپ ہو گئی تھی۔ سفیر نے تالیاں بجائیں۔ ''تو، تو لیڈر بنتا جا رہا ہے۔''

''بکواس نہ کر.... میں لیڈر ہوتا تو اس طرح در بدر مارا مارا پھرتا؟ لندن یا دبئی میں عیش نہ کرتا۔''

پلیز اسٹاپ دی پولیٹکس۔'' ایمن نے ہاتھ اٹھایا۔

''مشکل ہے، ہم سیاست شروع کرنے کے قائل ہیں اسے ختم کرنے کے نہیں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''حضور والا، دشمنوں کی فکر کریں جو باہر گھیرا ڈال کر بیٹھے ہیں۔'' سفیر نے آہستہ سے کہا۔

مونا کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ ''میرے خدا...... اور ہم اتنے سکون سے کھا نا کھا رہے ہیں۔''

ایمن اردو سے نابلد تھی لیکن ہمارے تاثرات اور لہجے سے بھانپ گئی تھی۔ ''کوئی مسئلہ ہے؟''

میں نے اسے مختصراً بتایا کہ وہ لوگ پھر سے ہماری راہ پر تھے جن سے اسلام آباد میں پیچھا چھڑا کر یہاں آئے تھے۔ ایمن کا ردِعمل زیادہ شدید تھا۔

''یہ میری وجہ سے تمہارے پیچھے ہیں؟''

''نہیں...... وہ ہمارے بھی دشمن ہیں۔ تم خود کو قصوروار مت سمجھو۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''نیک نام ان سے نمٹ لے گا۔''

چائے پی کر ہم اوپر آئے۔ مونا اور ایمن تیار ہونے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ہم نے اپنے کمرے میں آ کر کپڑے بدلے۔ نیک نام اپنے کمرے میں تھا۔ میں چینج کر کے اس کے پاس آیا۔

''کیا پروگریس ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم تیار ہیں۔'' اس نے پستول اپنی بیلٹ میں لگایا۔ ''جیسے ہی تاریکی ہو گی، ہم باہر نکلیں گے۔ وین ہوٹل کے دروازے کے سامنے آئے گی۔ آپ چاروں نمایاں ہو کر وین کی طرف آئیں گے اور چھپ کر واپس چلے جائیں گے۔''

''وہ کیسے.... کیا ہوٹل کا مالک یہ سب نہیں دیکھے گا؟'' میں نے اعتراض کیا۔

''اس کی فکر مت کریں، میں نے اس سے بات کر لی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ تعاون کرے گا۔'' نیک نام

نے اپنی جیکٹ پہنی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ''سورج ڈوبنے والا ہے۔''

''اگر تمہارے جانے کے بعد کوئی ہوٹل چیک کرنے آ جائے تو ہوٹل کا مالک اسے کیسے روکے گا؟''

''وہ انکار کر دے گا۔''

''اسلحے کے سامنے کون انکار کر سکتا ہے؟''

''اس صورت میں آپ انہیں کنٹرول کریں گے۔'' نیک نام نے جواب دیا۔ ''میرا مشورہ ہے، آپ دوسری منزل پر رہئے گا۔ باہر کی صورتِ حال پر نظر رکھنے کے لئے آپ کا کمرا بہترین ہے۔''

''اگر ان کے پاس بھی نائٹ وژن دوربین ہوئی تو وہ ہمارا چکر بھانپ جائیں گے۔''

''نائٹ وژن وین کے اندر دیکھ سکے گی اور اگر کمرے میں کوئی آدمی آیا بھی تو ان کو کیا معلوم وہ کون ہو گا؟''

''ہاں، لیکن اس صورت میں کمروں کی روشنی بجھانا ہو گی۔ ظاہر ہے ہوٹل والے بلاوجہ روشنی نہیں کرتے۔''

''جناب، یہ باتیں اتنی اہم نہیں ہیں۔'' نیک نام جھنجلا گیا۔

''حیرت ہے، تم نے پلان بنا لیا اور اس کی باریکیوں پر غور نہیں کیا۔ جب ہم ہوٹل میں رکیں گے تو ہمارے لئے سب سے محفوظ جگہ ہوٹل کا تہ خانہ ہوگا۔ وہاں دیکھنے کا خیال کسی کو مشکل سے آئے گا۔''

''اور شبہ ہو گیا تو آپ چاروں پھنس جائیں گے۔''

''پھنسنے کا امکان تو اوپر بھی ہے۔ تہ خانے کے بارے میں میرا خیال ہے، اس سے باہر جانے کے لئے اور بھی راستہ ہوگا، تم کنفرم کرو۔''

دس منٹ میں نیک نام نے تصدیق کر لی۔ ہوٹل کا ایک چار بائی چار کا خانہ عقبی ڈھلان پر کھلتا تھا، اس سے کچرا اور بوائلر کو گرم کرنے والی لکڑی کی راکھ وغیرہ باہر پھینکی جاتی تھی۔ درحقیقت انہی چیزوں کا سوچ کر میں نے تہ خانے کے دروازے کا اندازہ لگایا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس دروازے تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ یعنی ہم فرار ہونا چاہتے تو کوئی ہمیں روک نہیں سکتا تھا۔

''تاریکی ہونے والی ہے۔'' نیک نام نے ایک بار پھر کھڑکی سے جھانکا۔

''میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نیچے آتا ہوں۔''

''آپ دس منٹ بعد آیئے گا۔'' نیک نام نے کہا۔

میں کمرے میں آیا تو مونا، ایمن اور سفیر تیار بیٹھے تھے۔ ''کیا خبریں ہیں دوست! روانگی کا کیا پلان ہے؟''

''میں نے انہیں پلان سے آگاہ کیا اور گھڑی دیکھی۔ ''پانچ منٹ بعد ہمیں نیچے جانا ہے۔''

''فرض کرو...... یہاں سے نکل گئے تب بھی دشمن نے آگے گھات نہیں لگائی ہو گی۔'' سفیر نے اچانک کہا۔ ''ہم کب تک اس سے بچتے رہیں گے!''

''یار، یہ سوال تو میرے ذہن میں بھی آ رہا ہے لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''واپس!'' میں حیران رہ گیا تھا۔ ''کہاں......؟''

''میدانی علاقے کی طرف...... وہاں میرے بے شمار دوست ہیں...... ہم کہیں بھی پناہ لے سکتے ہیں۔''

''معاملہ پناہ کا نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے، پناہ ہمیں کہیں بھی مل سکتی ہے...... مگر یہ ہمارے مسائل کا حل نہیں ہوگا۔''

''راجا عمر دراز کے پاس تیرے مسائل کا حل ہے!''

''میرے نہیں...... ہمارے مسائل کا حل...... اور میں نے راجا سے بھی توقع نہیں لگائی ہے۔ پر یار، ہمارے اردگرد ایک کہانی چل رہی ہے اور اس کہانی کا مرکز فی الحال راجا عمر دراز ہے۔ ہم اس سے دور رہ کر...... اس کہانی سے کٹ جائیں گے۔ ہمارا اس سے جڑے رہنا ضروری ہے۔ یاد رکھو، جتنی ضرورت ہمیں راجا کی ہے، اتنی ہی ضرورت اسے ہماری بھی ہے۔ اس کہانی کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے...... ہم اپنے مفاد اسی صورت میں حاصل کرسکیں گے، جب ہم مرکز کے قریب رہیں۔''

مونا نے سفیر کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی، شوبی کا نہیں یہ ہماری بقا کا سوال بھی ہے۔''

''بی بی، تم ہمیشہ کی طرح غلط سمجھ رہی ہو۔'' سفیر بھنا گیا تھا۔

''میرا خیال ہے اس بحث کو یہیں چھوڑو...... نیچے جانے کا وقت ہوگیا ہے۔'' میں نے گھڑی دیکھی۔ ہم سب نے اپنے بیگ اٹھائے اور کمروں سے نکل آئے۔ ہوٹل کے داخلی دروازے کے عین سامنے وین موجود تھی۔ میں نے کاؤنٹر پر ادائیگی کی۔ مالک رسید کاٹتے ہوئے فکرمند نظر آرہا تھا۔

''جناب!'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''خطرے کی بات تو نہیں ہے؟''

''اگر ہے بھی تو ہمارے لئے ہے، تمہارے لئے نہیں۔'' میں نے سخت اور جارحانہ انداز میں کہا۔ ''تم اس چکر میں مت پڑو، جیسا کہا جارہا ہے، ویسا کرو۔ یہ پانچ ہزار اور رکھو۔''

''یہ کس لئے جناب!'' اس نے نوٹ لینے کے بعد پوچھا۔

''اس زحمت کے بدلے جو تم ہمارے لئے کرنے جارہے ہو۔''

میں ان تینوں کے ساتھ باہر آیا۔ نیک نام کے آدمی چوکس انداز میں وین کے اردگرد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں صرف ہتھیاروں کی کمی تھی ورنہ ان کا انداز کمانڈوز والا تھا۔ ہم یکے بعد دیگرے وین کے کھلے دروازوں سے اندر گئے۔ دروازے دونوں طرف سے کھلے تھے۔ پھر جیسے ہی مخالف سمت کے دروازے بند ہو گئے، نیک نام نے ہمیں اشارہ کیا۔ ہم سر جھکائے اور اپنے بیگ لئے اترے اور ہوٹل کے کھلے دروازے سے اندر گھس کر فوراً اس دیوار کی آڑ میں ہوگئے جس کے پیچھے آ کر ہم باہر والوں کی نظروں سے محفوظ ہو گئے تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ہم کھسکتے ہوئے کاؤنٹر تک آئے۔ اسی لمحے باہر وین اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ ہوٹل کا مالک ہمیں کاؤنٹر کے برابر میں تہ خانے کو جانے والی سیڑھیوں تک لایا۔

''آپ لوگ نیچے چلے جائیں۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''اگر اوپر کوئی آپ کو پوچھتا آیا تو میں بٹن دباؤں گا، نیچے گھنٹی بجے گی۔ آپ لوگ ڈھلان والے راستے سے باہر جاسکتے ہیں۔''

''تم جانتے ہو۔ ہمارے دشمن ہمارے پیچھے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''جی صاحب، اور یہ آپ رکھ لیں۔'' اس نے پانچ ہزار میری طرف بڑھائے۔ ''اب میں خلوص سے آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں، اب کیا ہوا ہے؟'' میں نے رقم نہیں لی۔

''مجھے معلوم ہے، آپ کے پاس اسلحہ ہے۔ آپ چاہتے تو کرایہ بھی نہیں دیتے، ہمیں یرغمال بنا لیتے مگر آپ نے اتنی شرافت دکھائی اس لئے......''

''ٹھیک ہے..... لیکن یہ رکھو..... میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔'' میں نے اس کا شانہ تھپکا اور سیڑھیوں سے اتر گیا۔ اوپر کے شاندار ہوٹل کے مقابلے میں اندر کا حصہ بہت سادہ اور عام سا تھا، نیچے کچن کے علاوہ اسٹور روم، ملازموں کی رہائش اور بوائلر روم تھا۔ اس جگہ سے پوری عمارت کو حرارت کے ساتھ گرم پانی بھی فراہم ہوتا تھا۔ اس جگہ وہ دروازہ تھا جو کبھی ڈھلان کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کیا تھا، چارپائی جار کا لکڑی کا تختہ تھا جسے اٹھا کر ایک طرف کر کے خانہ کھولا جا سکتا تھا۔ اندر اس پر لوہے کی مضبوط کنڈی لگی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اسے کھول کر دیکھا۔ باہر سے یخ بستہ ہوا کا جھونکا آیا تھا۔ نیچے طویل ڈھلان تھی جو فی الحال تاریکی میں تھی لیکن میں اندازہ لگا سکتا تھا اس ڈھلان پر کتنا کچرا جمع ہوگا۔

مونا نے بھی آ کر جھانکا۔ ''سوال یہ ہے کہ وقت پڑنے پر کیا ہم اس ڈھلان سے نیچے جا سکتے ہیں؟''

''یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔'' میں نے تختہ بند کر دیا۔ ''ممکن ہے ڈھلان اتنی خطرناک نہ ہو جتنی کہ دن کے وقت اوپر سے نظر آ رہی تھی۔''

''ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے۔'' سفیر نے کہا۔ ''یا کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں سب سے پہلے نیچے آنے والے دروازے بند کرنا ہوں گے۔''

''خدا کے لئے..... تم تو ایسے بات کر رہے ہو، جیسے دشمن ابھی آنے ہی والا ہو۔'' مونا نے کہا۔

''ہمیں تیار اسی طرح رہنا چاہئے۔'' سفیر نے اصرار کیا۔

ایمن ایک طرف رکھی لکڑی کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ مونا نے جا کر کچن میں جھانکا اور وہاں کام کرنے والے ملازم سے کافی کے بارے میں دریافت کیا۔ ''ابھی لاتا ہوں میم صاحب!'' اس نے جواب دیا۔

اسی لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے زمین ہل گئی ہو۔ یہی بات دوسروں نے بھی محسوس کی تھی۔ ''میرے خدا، یہ کیا ہے؟'' ایمن بولی۔ ''کیا زلزلے کا جھٹکا تھا۔''

''نہیں..... ایسا لگ رہا ہے بہت بڑا دھماکا.....'' میں کہتے کہتے رک گیا پھر اوپر کی طرف لپکا تھا۔

''اوہ بھائی، کیا ہوا ہے؟'' سفیر میرے پیچھے آیا تھا۔

ہوٹل کا مالک مجھے سیڑھیوں کے سامنے ملا تھا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ ''جناب! سڑک کی جانب سے دھماکے کی آواز آئی ہے۔ میرے ملازم نے شعلہ اٹھتے دیکھا تھا۔''

''کہاں..... کس طرف.....'' میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

ہوٹل کے مالک نے ڈائننگ ایریا کی روشنیاں بند کر دی تھیں اس لئے ہمارے دیکھ لئے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ شیشے کی دیوار کے عقب سے دور سڑک پر کسی جگہ آگ جل رہی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ آگ

کیسے لگی تھی، اس نے کسے چاٹ لیا تھا۔ نیک نام کو یا ہمارے دشمنوں کو۔ یہ بات یقینی تھی کہ آگ کسی گاڑی میں لگی تھی۔ میں نے باہر جانا چاہا تو سفیر نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "آپ کہاں چلے؟"

"میں دیکھنے جا رہا ہوں۔"

"نیک نام کے انجام سے سبق پکڑیں۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "آ بیل مجھے مار کی پالیسی ترک کر دیں۔"

"تو کہنا کیا چاہ رہا ہے؟"

"میرا خیال ہے دشمن اس طرف آنے والا ہے۔ انہوں نے تصدیق کے بعد کہ ہم وین میں نہیں ہیں، وین اڑا دی ہے۔" سفیر نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا اور سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں رائفلیں لے کر آیا۔ ہوٹل کے مالک کی یہ ہتھیار دیکھ کر ہی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اس نے ایک رائفل مجھے دی اور بھنائے ہوئے انداز میں کہا۔ "نیک نام کا یہی انجام ہونا تھا۔ ہمیں دوپہر میں ہی نکل جانا چاہئے تھا۔ پلان بنانے کے چکر میں اس نے دشمنوں کو پلاننگ کرنے کا پورا وقت دیا تھا۔"

میں نے محسوس کیا، وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، ایک بار دُشمن کی موجودگی کا علم ہونے کے بعد اس جگہ رُکے رہنا حماقت تھی، ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔ "تو یہ رائفلیں کس خوشی میں لایا ہے؟"

"مقابلہ کرنے کے لئے اور کس لئے!" وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔

"احمقانہ باتیں مت کرو، اگر انہوں نے نیک نام کی وین اُڑا دی ہے تو کیا ہم دو رائفلوں سے ان کا مقابلہ کر سکیں گے؟"

"پھر کیا کریں؟"

"نیچے جاؤ...... ان لوگوں سے کوئی طویل رسی لو اور اس کی مدد سے ڈھلان پر اترنے کا بندوبست کرو، ہمیں فرار ہونا ہے۔"



اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

کاشف زبیر کے قلم سے ایک تیز رفتار ایکشن سے بھرپور ناول

سوداگر

ایک الگ انگ، انوکھا، تیز آہنگ سلسلہ

- کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کون سا واقعہ مستقبل میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔
- انسانی عقل و فہم محدود ہے۔ وہ صرف محدود دائرے میں مخصوص زاویہ نظر رکھتی ہے۔
- خیر و شر کی اس ازلی جنگ کا قصہ جس کے بغیر فلسفۂ حیات کے اسرار و رموز سے آگاہی ممکن نہیں۔
- اس نوجوان کی کہانی جس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو قتل و غارت گری، تباہی و بربادی اس کی منتظر تھی۔
- اس کی زندگی کے لیے بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی لیکن قدرت کو شاید اس سے کوئی اہم کام لینا مقصود تھا۔
- چنانچہ وہ زندہ رہا اور اپنے دشمنوں کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوا۔

علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 37247414
E-mail: alimian_publications@yahoo.com